

گھر کے ہر فرد کے لئے

کراچی

پاکینہ

ماہنامہ

دسمبر 2012

نگرانِ اعلیٰ
معمران جرسول

PDFBOOKSFREE.PK

عمیرہ احمد ناہید سلطانہ اختر

اس کا قوری و دیگر کہنے مشق کھاریوں کی ہا وائیں
اور قبول مہر و نعت ملان کا خستہ ہی نہ دیو اندوئی نہ نعت پڑھیں



- 167 صباح يوسف
209 شیریں حیدر
265 شمع خانم

خصوصی مضامین

- 274 نزهت اصغر
286 شائستہ زریں
290 مونا شہاب

مستقل عنوانات

- 16 ادارہ
292 مدیرہ
302 عظمیٰ آفاق سعید
286 انجم انصار
307 پاکیزہ بھنیں
308 صغریٰ زیدی
309 ادارہ
310



مدیرہ اعلیٰ
عذرا رسول

مدیرہ
انجم انصار
معاون
آمنہ حیدر

اداریہ

- 15 مدیرہ
مجھے کچھ کہنا ہے

سلسلے وار ناول

- 18 عمیرہ احمد
134 ناہید سلطانہ اختر
زنگی

مکمل ناول

- 170 صائمہ اکرم
222 شوکت رانا الطاف
مجھے زنگ لگے

ناولٹ

- 68 کہیں نہ پکے جانے والے قیصرہ حیات
111 فیصلہ کی سلیپر
اسما قادری

افسانے

- 103 عقیلہ حق
مجھے نظر ہے

شعبہ نمبر اشتہارات 0333-2256789 نمبر ادارہ 0333-2168391 محمد رمضان خان
اشہارات نمبر ادارہ 0332-4214400 رانا حمید 0323-2895528
ماڈل: مایا میک اپ: روز بیومی پارلر فوٹو گرافر: موسیٰ رضا



جلد 40 • شماره 09 • دسمبر 2012 • ذریعہ سالانہ 700 روپے • قیمت فی پرچہ پاکستان 60 روپے
پتا: پوسٹ بکس نمبر 662 کراچی 74200 فون: 35895313 (021) نیکیس 35802551 (021) E-mail: dpigroup@hotmail.com

پبلشر و پریپر انٹر: عذرا رسول • مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمیشن ایریا مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی



اسلام کے معنی ہیں کامل اطاعت، مکمل سپردگی..... اسلام سے سچی و فاداری اور قربانی کا بے مثل عمل وہی کر سکتا ہے جو واقعتاً اپنی پوری زندگی کے ہر کردار کے حوالے سے اللہ تعالیٰ کا مکمل اطاعت گزار ہو۔ یہی وجہ ہے کہ امام حسینؑ کا پورا کردار ہمارے پیارے نبیؐ کی بے مثل تربیت کا شاہد ہے۔ کر بلا کی جنگ ایک سچائی کی جنگ تھی۔ حق و باطل اور سچ و جھوٹ کے درمیان ایک فیصلہ کن جنگ۔ جس نے پوری دنیا کو حیران کر دیا۔ اگر یہ لوٹ مار اور جھوٹ فریب کی جنگ ہوتی تو حسینیت کے تمام کردار دنیا والے فراموش کر دیتے۔ اسی لیے واقعہ کر بلا جہاں ایک طرف حصول رضائے الہی کی انتہا ہے وہیں دوسری طرف مصائب کی بھی انتہا ہے۔ وہ لب جنہیں محبوبؑ دو جہاں چوما کرتے تھے، وہ بچہ جس کے لیے سجدے کو طول دے دیا کرتے تھے۔ جسے اپنے دل کا کلوا سمجھتے تھے انہیں اسی رسولؐ کی امت کے لوگ اس قدر مصائب میں دھکیل دیتے ہیں۔ وہ معتبر خواتین جن کے حرم میں فرشتے بھی بغیر اجازت داخل نہیں ہوتے تھے، ان کے حقوق کی پامالی کی جاتی ہے مگر اس کے باوجود ان کا ہر عمل انسانیت کے لیے مشعل راہ ثابت ہوتا ہے۔ واقعہ شہادت امام حسینؑ ایک ایسے آفاقی مظہر کی حیثیت سے ذہن انسانی پر مرقم ہوا جس کی مثال تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔ میدان کر بلا میں امام حسینؑ اور ان کے اصحاب کی سیاسی حکمت عملی ایک نئے باب کا آغاز کرتی ہے اور واقعہ کر بلا یہی پیغام ہے کہ انسانی بستیوں پر ظالم حکومت نہیں کر سکتے۔ کوئی حکومت جس کی بنیاد جبر و تشدد پر ہو سبھی اسلامی نہیں ہو سکتی.....!

مدیرہ
انجم انصار

بے شک (اے نبی ﷺ) ہم نے تمہاری طرف (بھی ویسی ہی) وحی بھیجی ہے جیسی نوح کی طرف اور (ان) پیغمبروں کی طرف جو نوح کے بعد ہوئے بھیجی تھی اور (جیسی) ابراہیم اور اسماعیل اور اسحق اور یعقوب اور اولاد یعقوب اور عیسیٰ اور ایوب اور یونس اور ہارون اور سلیمان کی طرف وحی بھیجی اور (جیسے) داؤد کو ہم نے (کتاب) زبور عنایت فرمائی (۱۶۳) (اور تمہیں بھی ویسا ہی پیغمبر کیا ہے جیسے) اور پیغمبروں کو تم سے پہلے (مبعوث کیا تھا) جن کا حال ہم نے تم سے بیان کیا ہے اور جیسے ان پیغمبروں کو جن کا حال تم سے نہیں بیان کیا۔ اور اللہ، موی سے اچھی طرح ہم کلام ہوئے (۱۶۴) (اور ہم نے) بشارت دینے والے اور ڈرانے والے پیغمبر اس لیے (بھیجے) کہ پیغمبروں کے (بھیجے کے) بعد لوگوں کا اللہ پر کوئی الزام نہ رہ جائے اور اللہ غالب (اور) حکمت والا ہے (۱۶۵) لیکن (یہ کافر اس پر بھی نہیں مانتے تو نہ مانیں) جو کچھ تمہاری طرف نازل کیا گیا ہے اللہ اس پر (خود) گواہی دیتا ہے کہ اس نے اس کو اپنے علم سے نازل فرمایا ہے اور فرشتے بھی گواہی دیتے ہیں اور اللہ گواہ بس ہے (۱۶۶) بے شک جن لوگوں نے (ہمارے انبیاء کا) انکار کیا اور (لوگوں کو) اللہ کی راہ سے روکا وہ یقیناً راہ (راست) سے بہت دور ہٹ گئے ہیں (۱۶۷) بے شک جن لوگوں نے (ہمارے پیغمبروں کا) انکار کیا اور (لوگوں کو) ستایا اللہ (ایسا) نہیں ہے کہ ان کو بخش دے اور نہ (ایسا ہے کہ) انہیں راہ راست پر لے آئے (۱۶۸) (سورہ نسا آیت نمبر ۱۶۳ تا ۱۶۸)



آنحضرت ﷺ کے اسمائے گرامی سیدنا محمد ﷺ

خصوصیت عدد ۳

اس عدد کا تعلق قمر سے ہے۔ ۲۰ زوج ہے اور دوتی کا مظہر ہے۔ جب علم الاعداد کے نقشے پر ۲۰ کا عدد نمایاں ہوتا نظر آتا ہے تو دل و دماغ پر دوتی کے جذبات کا احساس چھا جاتا ہے اس عدد سے تعلق رکھنے والے افراد نہایت بروہار اور سنجے ہوئے خیالات کے مالک ہوتے ہیں۔ ان لوگوں کے اندر بڑی اعلیٰ پایہ کی روحانی صفات موجود ہوتی ہیں۔ اس عدد کا حامل اپنی شخصیت سے بچوں، بڑوں اور جانوروں تک کو متاثر کر سکتا ہے ہر شخص یہاں تک کہ جانور بھی فی الفور اس کی تابعداری کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ اس شخص کی صفات اور طریقے سب پر غالب رہتے ہیں اس کی زندگی ہر لحاظ سے کامیاب رہتی ہے۔

اسم مبارک 'محمد' عدد ۲۰ کی صفات کا مظہر عدد ۲۰ کی اوپر بیان کردہ تمام صفات حضور ﷺ کی ذات اقدس میں موجود تھیں۔

آپ ﷺ کی بلند پایہ روحانی صفات سے کس کو انکار ہے۔ آپ ﷺ تو اللہ کی ذات کا پرتو ہیں اور آپ ﷺ کی ذات اقدس تمام کائنات کی ناظرہ و غیر ناظرہ مخلوق کے لیے محبت، مودت، شفقت، رحم دلی اور مہربانی کا سرچشمہ تھی۔ آپ ﷺ کی ذات اقدس تمام مخلوقات کے لیے تسکین قلب و روح تھی۔ کتب میں مذکور ہے کہ بارہا جانور آپ ﷺ کے سامنے سر جھکا دیتے تھے اور اپنی تکالیف بیان کرتے ہوئے روڑتے تھے۔ کیونکہ وہ بھی جانتے تھے کہ آپ ﷺ نے بڑھ کر ان کا تمسک، مددگار اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ آپ ﷺ کی بردباری، دوتی، محبت، ہمدردی و شفقت اور مددگارانہ صلاحیتوں نے سب کو آپ ﷺ کا مطیع بنا دیا۔

قیصرہ حیات کی کتاب انوار اسماء النبی ﷺ سے اقتباس



عکس آخری قسط عمیرہ احمد

آج کی زندگی تیز رفتار ہے، اس کے تجربے بڑی تیزی سے
گردواروں کے تہ رخ سے متعارف کراتے ہیں۔ اس تیز رفتار
زندگی میں چونکادینے والے موڑ بھی ہوتے ہیں... اور
پراسراریت بھی... کہیں گردواروں کے حوالے سے تو کبھی
ماحول کے حوالے سے... عمیرہ احمد کے اس ناول میں نہ
صرف آپ تیز ترین، سنسنی خیز اور چونکادینے والے موڑ
دیکھیں گے بلکہ ان کی مہارانہ چابک دستی کے ساتھ ان کے
گردواروں کی تہ داری کے بھی قائل ہو جائیں گے... یوں بھی اپنا
عکس اور اپنا سایہ ہر شخص کے ساتھ رہتا ہے... مگر ان کی
کہانیاں جتنا چٹا ہوتی ہیں... کہیں ایسا تو نہیں... ہماری
یہ مایہ ناز مصنفہ... کوئی ایسا ناسور دکھانا چاہتی
ہیں... جس کا آپریشن بھی ضروری ہو... بقول
شاعر...
اس کائناتِ محبت میں ہم مثلِ شمس و قمر کے ہیں
اک رابطہ مسلسل ہے اک فاصلہ مسلسل ہے



ہوتے تو میں اور ابراہیم تو کبھی یہاں نہ رہتے۔“ وہ اب کس کو بتا رہی تھی وہ دلچسپی سے سننے لگی۔ ”آپ نے کبھی اس گھر کے بارے میں کچھ نہ سنا تھا؟“ مثال نے اب کس سے ڈائریکٹ پوچھا۔

”مثلاً کیا؟“ عکس نے دہمی آواز میں اس سے نظر ملانے بغیر کہا۔ یہ جاننے کے باوجود کہ مثال نے اس گھر کے بارے میں کیا سنا ہوگا۔

”بہت ساری باتیں کہہ رہے ہیں ملازم لیکن سب سے عجیب و غریب بات یہ ہے کہ وہ کہہ رہے ہیں کہ اس گھر میں جو کچل بھی رہتا ہے ان کا break up ہو جاتا ہے۔ کتنی خوفناک بات ہے ناں میں۔ میں تو ڈر رہی تھی یہ سن کے لیکن ابراہیم کو بالکل یقین نہیں ہے ایسی باتوں پر۔ آپ یقین کرتی ہیں ایسی باتوں پر؟“ اس نے عکس کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”نہیں۔“ عکس نے بلا توقف کہا۔ مثال نے ایک کہانی مسکراہٹ کے ساتھ عکس کو دیکھا۔

”مجھے پتا تھا، آپ کہاں یقین کرنے والی ہیں ایسی باتوں پر۔ ابراہیم بھی آپ ہی کی مثال دیتا ہے کہ وہ کچلے ہوئے کٹی ہار Serve کر چکی ہیں اس شہر میں۔ اگر ایسا کچھ ہوتا تو ان پر بھی کوئی effect ہوتا۔ لیکن وہ تو ہمیشہ کھر جوڑنے والی رہی ہیں۔ ان کو تو ہمیشہ فائدہ ہی ہوا ہے اس گھر میں۔ ہے ناں میں؟“ اس نے بات کے آخر میں استغناء میں انداز میں عکس سے پوچھا۔ وہ مسکرا دی۔ پھر وہ آہستہ قدموں کے ساتھ برآمدے سے باہر نکل آئی۔ مثال بھی اس کے ساتھ باہر آگئی تھی۔ وہ دونوں اب ساتھ چلتے ہوئے گھر کے بالکل سامنے موجود لان میں آگئی تھیں۔ عکس نے لان میں پہنچ کر پلٹ کر روپکلی دھوپ میں روشن اس قدیم گھر کو دیکھا۔ مثال بھی اس کی نظروں کے تعاقب میں اس گھر کو دیکھنے لگی۔ عکس نے چند لمحے اس گھر کو دیکھتے رہنے کے بعد کہنا شروع کیا۔

”اس گھر میں اور زندگی میں کوئی فرق نہیں ہے۔ کم از کم میرے نزدیک۔ اس گھر میں داخل ہونا جیسے دنیا میں آنے کے برابر ہے۔ دنیا میں کچھ اچھے لوگ ملتے ہیں، کچھ برے لوگ۔ اچھوں کی اچھائی بھی زندگی بدل سکتی ہے، بُروں کی برائی بھی۔ ہر جگہوں میں کچھ نہیں ہوتا۔ جو بھی کچھ ہوتا ہے وہاں بسنے والے انسانوں کی وجہ سے ہوتا ہے۔ تمہیں سمجھ آ رہی ہے میری بات؟“ عکس نے گردن موڑ کے برابر کھڑی مثال کو دیکھا۔ وہ جواباً مسکرائی۔

”سمجھنے کی کوشش کر رہی ہوں۔“ عکس بھی اس کی بات پر مسکرائی۔ پھر وہ دوبارہ گھر کو دیکھنے لگی۔

”گھروں میں کچھ نہیں ہوتا، وہ انسانوں کو جوڑنے یا توڑنے کی صلاحیت نہیں رکھتے، وہ بس اینٹوں، سینٹ، سرے اور کڑی کی ایک عمارت کے علاوہ کچھ نہیں ہوتے۔ ان کے اندر آکر رہنے والے انسان اپنی سوچ، عمل اور رویوں سے اپنی زندگی بناتے یا بگاڑتے ہیں۔“ مثال بہت سنجیدگی سے عکس کی بات سن رہی تھی وہ ہمیشہ اس کی بات اسی سنجیدگی اور انتہاک سے سنا کرتی تھی، عکس مراد علی اس کا آئیڈیل تھی۔ وہ ہمیشہ اس جیسا بننا چاہتی تھی۔ لیکن ہر بار وہ یہ اعتراف کرتی تھی کہ ان جیسا بننا بہت مشکل کام تھا۔ کم از کم مثال شیردل کے لیے۔ یا کسی کے لیے بھی۔ مثال نے زندگی میں عکس مراد علی جیسی کوئی شخصیت نہیں دیکھی تھی اور اسے فخر تھا وہ ”شخصیت“ اس کی زندگی کا حصہ تھی، اس کی ماں تھی۔

”میں اس گھر کے ایک کوارٹر میں پیدا ہوئی تھی۔ وہ کوارٹر اب وہاں ہے بھی نہیں۔“ عکس نے دوبارہ کہنا شروع کیا۔ ”میں نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ اس کوارٹر سے باہر نکل کے میں بھی اس گھر میں آ کے رہوں گی۔ اس گھر میں اپنی ماں اور نانا کے ساتھ آیا کرتی تھی۔ وہ دونوں کام کرتے تھے یہاں۔ یہاں پوسٹ ہونے والے آفیسر زاوران کی فیملیز کی خدمت کیا کرتے تھے۔ میں اس back ground کے ساتھ اس گھر میں آئی تھی پھر اس گھر میں رہنے والے ایک پبل نے مجھے اچھی تعلیم دلوانے کے میرے نانا کے خواب کو پورا کرنے میں ان کی مدد کی۔ اس گھر میں میری زندگی کی بنیادیں ہیں۔ وہ بنیادیں جن پر آج میری زندگی کی عمارت کھڑی ہے۔ یہاں پر میں اپنے بہترین دوست اور جیون ساتھی سے ملی۔ یہاں میری پہلی اولاد ہوئی۔ میری زندگی کے بہت سارے Milestones اس گھر سے وابستہ ہیں۔“

”آپ کے لیے تو یہ گھر بڑا Lucky رہا ہے پھر۔“ مثال نے مرحوب انداز میں کہا۔ عکس اس کی بات پر ہنس پڑی اور اس نے اس طرح مسکراتے ہوئے اس گھر کو دوبارہ دیکھا پھر کہا۔

”اس گھر میں، میں نے اپنے باپ کو کھویا، اپنی زندگی کے سب سے قیمتی اثاثے، اپنے نانا کو کھویا۔ یہاں میں اپنے بچپن میں Child abuse کا شکار ہوئی۔ بہت ذلت اور بے عزتی کی حالت میں اپنی فیملی کے ساتھ دھکے دے کے

”کیا دیکھ رہی ہیں آپ اس آئینے میں؟“ مثال نے کچھ تجسس آمیز انداز میں عکس سے پوچھا جو اس Cheval mirror کے سامنے کھڑی اس آئینے کے فریم کو اپنی انگلیوں سے غیر محسوس انداز میں پوچھ رہی تھی جیسے اس کے ہونے کا احساس چاہتی ہو۔ فریم پر موجود پارکری جانے والی پالش بھی اب اس کی بوسیدگی اور خشکی کو چھپانے میں ناکام ہو رہی تھی۔

”میں اس آئینے میں تاریخ دیکھ رہی ہوں۔“

”کیسی تاریخ؟“ مثال کا تجسس کچھ اور بڑھا۔

”اپنی زندگی کی تاریخ۔ اپنا ماضی۔ اس ماضی سے جڑے چہرے۔“ اس نے فریم سے اپنا ہاتھ ہٹاتے ہوئے آئینے میں جھٹکتے اپنے عکس کو ایک بار پھر دیکھا پھر اپنے برابر میں کھڑی مثال پر ایک مسکرائی ہوئی نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

”اچھا۔“ مٹی بھی اس آئینے کے سامنے اسی طرح فریز ہو گئی تھی جس طرح آپ ہوئی ہیں۔ میں نے ان سے بھی پوچھا تھا کہ وہ اس میں کیا دیکھ رہی ہیں؟“ مثال نے اسی دلچسپی سے اس آئینے پر نظر دوڑاتے ہوئے آئینے میں نظر آتی ہوئی عکس سے نظریں ملاتے ہوئے کہا۔

”کیا کہا انہوں نے؟“ عکس نے اس بار پلٹ کر مثال کو دیکھا۔

”انہوں نے کہا وہ اس آئینے میں مستقبل کو دیکھ رہی ہیں۔ آنے والے دنوں کا عکس جو اس میں کہیں چھپا ہے۔ عجیب بات ہے ناں۔ آپ اس میں ماضی دیکھ رہی ہیں۔ مٹی مستقبل۔ مجھے کیا دیکھنا چاہیے۔ حال؟“ مثال نے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ کہا۔ عکس اس کی بات پر مسکرا دی پھر اس نے پلٹ کر دوبارہ آئینے کو دیکھا۔

”میرا بچپن اس آئینے کے ساتھ گزرا ہے۔ میرا شہر بانو اور شیردل تینوں کا بچپن دیکھا ہے اس نے۔“

”مٹی آپ بھول رہی ہیں۔ میرا، طفیل اور باڈل کا بچپن بھی تو دیکھا ہے اس نے۔“ مثال نے اسے ٹوکا۔

”ہاں اور تم بھول رہی ہو کہ تو ان کا بچپن بھی تو دیکھ رہا ہے یہ۔“ اس نے مثال کو جیسے یاد دلایا۔

”اوہ ہاں۔ یہ آئینہ تو واقعی ہماری فیملی heritage کا ایک حصہ بن گیا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے اسے یہاں نہیں ہمارے خاندانی گھر میں ہونا چاہیے۔“

”آئینہ یا برا نہیں ہے لیکن سرکاری ملکیت ہے یہ۔“ عکس نے کہا۔

”مٹی میں اور ابراہیم گھر کو renovate کرنے والے ہیں۔ فرنیچر بھی بدلا جائے گا اور کاشٹ کباڑ میں یہ آئینہ بھی نکالنے والے ہیں ہم۔ بہت زیادہ پرانا اور outdated ہو گیا ہے یہ۔“ مثال نے اس کے ساتھ جیسے اپنا پلان شیئر کیا۔

”کیوں۔۔۔ ابھی تو ٹھیک ہے یہ۔“ عکس نے اعتراض کیا۔

”مٹی ٹھیک نہیں ہے۔ کم از کم سو سال پرانا ہو گیا ہے یہ۔ میں اور ابراہیم تو حیران تھے اس بات پر کہ آخراً تک بگاڑ کیسے ہوا ہے یہ۔ کسی آفیسر یا اس کی وائف نے بنایا کیوں نہیں اسے یہاں سے۔ نانا، نانی سے لے کر آپ اور پاپا تک کسی کو بھی اسے یہاں سے ہٹانے کا خیال نہیں آیا۔“ وہ کچھ حیرانی سے کہہ رہی تھی۔ عکس نے ایک پراسرار مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

”میں نے جنہیں بتایا ہے ناں یہ ہماری زندگیوں کا حصہ رہا ہے۔ اس میں ہم لوگ اپنا، اپنا عکس دیکھتے رہے ہیں۔ اپنی اپنی زندگیاں بناتے یا بگاڑنے والے چہروں کا عکس۔“ مثال کو لگا عکس بات کرتے کرتے جیسے کچھ سنجیدہ ہو گئی تھی۔

”آپ نے اس میں کوئی ایسا چہرہ دیکھا جس نے آپ کی زندگی بگاڑی ہو؟“ مثال نے دلچسپی سے کچھ سوچے کچھ بغیر اپنی طرف سے ایک معمول کا سوال کیا تھا۔ اس سوال نے عکس کو کچھ دیر کے لیے بٹھکے نہیں دیا۔ اس کے لیے اس سوال کا جواب بہت مشکل تھا۔ وہ ہاں کہتی اور مثال اس سے اس شخص کا نام پوچھتی۔ وہ جھوٹ جو اسے بعد میں بولنا تھا وہ شاید پہلے ہی بول دینا چاہیے تھا۔

”آپ کیا سوچ رہی ہیں؟“ مثال نے اسے دوبارہ مخاطب کیا۔ عکس نے چونک کر اسے دیکھا۔

”میں نے اس چہرے کو اپنی زندگی بگاڑنے نہیں دی۔“ وہ عکس کی بات پر تجسس آمیز انداز میں مسکرائی۔

”یعنی آپ نے بھی اس آئینے میں کوئی ایسا چہرہ دیکھا تھا؟“ وہ اب جیسے زور دینے والے انداز میں بولی تھی۔ ”آپ کو پتا ہے ہم لوگوں نے اس گھر کے بارے میں جیسا ملازموں سے بہت عجیب و غریب باتیں سنی ہیں۔ پاپا اور آپ یہاں نہ رہ چکے

طرف تھا۔ اس نے عجیب تلی دینے والے انداز میں کچھ بے قرار ہو کر اس کا ہاتھ پکڑا تھا۔ عکس نے جواباً مسکرا کر اسے دیکھا..... تم آنکھوں والی مسکراہٹ کے ساتھ.....

”زندگی میں انسانوں کے شر سے بڑھ کر خوفناک چیز کوئی نہیں، کوئی بھوت، بلا یا بونا برائی میں انسان کا مقابلہ نہیں کر سکتا اور زندگی میں انسانوں کی ہمت اور دلیری کے سامنے کوئی آسیب نہیں ٹھہر سکتا۔ وہ لوگ بے وقوف اور بزدل ہوتے ہیں جو گھروں اور جگہوں میں جن، بھوت، بونے، ڈھونڈتے رہتے ہیں اور پھر ان کے ہونے یا نہ ہونے پر اپنی زندگی کی خوش قسمتی یا بد قسمتی کو طے کرتے ہیں۔“ مثال کے عکس مراد لی کو کہتے سنا۔ وہ نصیحت نہیں بھی، تجربہ تھا اور اسے..... دلیل کی مانند نہیں ماری جاسکتی تھی۔

”اس گھر کے بونوں سے مجھے بھی تکلیف نہیں پہنچی لیکن انسانوں کی شکل میں ملنے والے بہت سے بونوں سے مجھے بہت تکلیف پہنچی۔“ وہ اب بھی مدہم آواز میں کہہ رہی تھی۔ ”اور پتا ہے میں نے ایسے ہر بونے سے ملنے کے بعد بھی اس جیسا نہ بننے کا سوچا اور ہر بونے سے ملنے کے بعد میں نے سوچا میں اپنی ذات سے ایسی تکلیف ایسا نقصان..... کبھی کسی دوسرے انسان کو نہیں پہنچاؤں گی میں کبھی دوسرے کسی انسان کے لیے بونا نہیں بنوں گی..... میں اس کے لیے انسان ہی رہوں گی..... وہ روپ جو اللہ نے ہمارے لیے پسند کیا ہے اور جس میں ہمیں زمین پر بھیجا ہے۔“ مثال پلٹیں جھپکائے بغیر کسی معمول کی طرح پاکستان بیورو کے کسی کی اس قابل ترین خاتون پورو کر بیٹ کے الفاظ سن رہی تھی۔ 22 گریڈ میں بیٹھنے والی اس پشیمانی خاتون DMG آفیسر کے لفظوں میں اسے جو پرکار دانا لگتی تھی وہ میراث تھی، حاصل نہیں تھی..... وہ خیر دین کی نوا سی تھی اور اس کی گفتگو میں اب اتنی دباہوں کے بعد خیر دین کے حوالے نہیں ہوتے تھے..... وہ خود بولنے لگا تھا۔

☆☆☆

”نانا مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے؟“ خیر دین اس وقت ابھی مغرب کی نماز سے فارغ ہی ہوا تھا جب عکس اس کے کمرے میں چلی آئی تھی۔ اس نے ڈنکا انتظار بھی نہیں کیا تھا۔ خیر دین کو اس کی آمد کی توقع تھی اور اس سے اس جملے کی بھی تصحیح ہاتھ میں لیتے ہوئے وہ مصلے سے اٹھ گیا اور اس صوفے پر جا کر بیٹھ گیا جس کے دوسرے کنارے پر چند لمحے پہلے وہ آکر بیٹھی تھی۔

”مجھے بھی تم سے بات کرنی تھی۔ اچھا ہوا تم خود آگئیں.....“ خیر دین نے مدہم آواز میں بات کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

”یہ ٹھیک نہیں ہے نانا۔“ عکس نے تمہیدوں کا وقت گزر چکا تھا۔

”کیا برائی ہے اس میں؟“ خیر دین نے جواباً گل سے پوچھا۔ آپ مجھ سے پوچھ رہے ہیں؟“ عکس نے انہیں بتایا۔

”ہاں، تمہارے پاس مجھ سے بہتر جواب ہونے لگے ہیں اب۔“ انہوں نے مدہم مسکراہٹ کے ساتھ اسے جیسے خراج تحسین نہیں پیش کیا تھا اپنی کمزوری کا اعتراف کیا تھا۔

”پر جو سوال اس بار آپ مجھ سے کر رہے ہیں اس کا کوئی جواب ہی نہیں ہے میرے پاس۔“ اس نے خیر دین کی ستائش کو مکمل طور پر نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

”اس رشتے سے جو خرابی ہو سکتی ہے، آپ جانتے ہیں..... مجھ سے زیادہ بہتر جانتے ہیں۔“ وہ عجیبہ تھی اور وہ ان چند مواقع میں سے ایک تھا جب وہ خیر دین سے بالکل متفق نہیں تھی۔ وہ ان کا فیصلہ بدلنے کی نیت سے آئی تھی۔

”ہر فیصلے میں کچھ اچھائی اور کچھ برائی ہوتی ہے، برائی کا اندازہ اگر پہلے سے ہو جائے تو انسان اپنے آپ کو نقصان سے بھی بچا سکتا ہے اور تکلیف سے بھی۔“ خیر دین نے اس سے کہا۔

”آنکھوں دیکھی کبھی ننگے کے لیے جس حماقت انگیز دلیری کی ضرورت ہے وہ مجھ میں نہیں ہے۔“ عکس نے ان سے جواباً کہا۔

”میں صرف تمہاری خوشی چاہتا ہوں چڑیا..... زندگی میں آج تک تمہاری خوشی سے بڑھ کر کوئی چیز اہم نہیں رہی میرے لیے۔“ خیر دین نے اپنی لالچ کی جڑ نکال کر اس کے سامنے رکھ دی تھی۔ وہ نہیں بھی کہتا تو بھی عکس جانتی تھی۔

”شیر دل میری خواہش نہیں رہا نانا..... اس سے شادی میری زندگی کے مقاصد یا حرقوں میں بھی شامل نہیں رہی۔“ اس نے مدہم آواز میں خیر دین سے کہا۔ اس آدمی کی منطق ہمیشہ کی طرح آج بھی اس کے کندھوں کے بوجھ بڑھانے لگی تھی۔

”لیکن تم اس کے لیے میرے سامنے روئیں۔“ اس نے نظریں اٹھا کر خیر دین کے چہرے اور اس معصومے رنگ کو اس

نکالی گئی۔ میرے کیرئیر میں واحد معطلی بھی اسی گھر میں ہوئی۔“ عکس نے مسکراتے ہوئے مثال کو دیکھا۔ وہ اب الجھی ہوئی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ ”اب تم سوچ رہی ہو گی کہ نہیں، یہ گھر تو میرے لیے بہت Unlucky ثابت ہوا۔“ مثال کچھ بے بسی سے مسکرائی تھی۔ ”میں نے تم سے کہا تھا، گھروں میں کچھ نہیں ہوتا۔ انسان نے چوٹ کھا کے گرنا یہ یا تکلیف پہنچے ہوئے بھی کھڑے رہتا ہے؟ یہ فیصلہ اس کی ہمت کرتی ہے، گھر نہیں۔“ عکس نے مسکراتے ہوئے اس سے کہا۔

”لیکن می اسی گھر کے ملازم کہتے ہیں کہ یہاں انہوں نے بونے دیکھے ہیں، اور ہم نے بھی کچھ عجیب عجیب آوازیں اور چیزیں experience کی ہیں۔“ مثال کی بات نے عکس مسکرائی اور اس نے کہا۔

”میں بھی بچپن میں یہاں بہت عجیب چیزیں دیکھی تھی۔“ مثال اس کے اس غیر متوقع جملے پر کچھ حیران ہوئی پھر اسی جہانی سے کہا۔

”اوہ، رینلی می۔“ عکس مثال کو دیکھنے لگی۔

”ہاں۔“ پھر اس نے مدہم آواز میں کہا۔

”آپ نے کبھی یہاں بونے دیکھے؟“ مثال نے بڑے تجسس سے پوچھا۔ اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے عکس کی آنکھوں کے سامنے پتا نہیں کیا کچھ گزر کر چلا گیا تھا۔ وہ سارے Mental Block چند لمحوں کے لیے جیسے بالکل بیکار ہو کر رہ گئے تھے، جس سے اس نے اپنی زندگی کی اس سیاہ ترین رات کو چھایا ہوا تھا۔

”آپ خاموش کیوں ہیں می؟“ مثال نے اسے خاموش دیکھ کے جیسے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کرانے کی کوشش کی، عکس نے چونک کر اسے دیکھا۔

”بتائیں ناں، آپ نے کبھی اس گھر میں بونے دیکھے؟“

”ہاں۔“ عکس نے مدہم آواز میں کہا۔ مثال یکدم excited ہوئی۔

”Oh my God..... آپ نے واقعی بونے دیکھے؟“ عکس نے سر ہلایا۔ اس نے اسی انداز میں عکس سے پوچھا۔

”ایک۔“ عکس نے مدہم آواز میں کہا۔ مثال نے ایک بار پھر excited انداز میں کہا۔ ”wow! وہ بونا دیکھنے میں کیا تھا؟ آپ کو ڈر لگا اس سے؟“ اس نے آپ سے کچھ کہا.....؟ کچھ کیا؟“ مثال نے جیسے سوالوں کی بوجھ ڈر کر دی تھی۔

عکس نے ایک گہری سانس لی۔

اتنے بہت سارے سوالوں کا جواب اور وہ بھی اس کے بچپن کے اس تکلیف دہ واقعے کے بارے میں جس کو سوچنا زخموں پر پاؤں رکھ کر گزرنے جیسا تھا۔

”آپ کو اس کی شکل یاد نہیں آ رہی؟“ مثال نے اسے خاموش دیکھ کر کُریا۔ وہ اس کا چہرہ دیکھ کر مسکرا دی۔ وہ جیسے اسے سوال کا جواب نہ دینے کا موقع دے رہی تھی۔

”بعض چہرے انسان چاہے تو بھی نہیں بھول سکتا۔“ اس نے مدہم آواز میں کہنا شروع کیا۔ ”وہ بونا بہت خوب صورت تھا..... اچھی شکل صورت کا..... انسانی شکل صورت اور وجود..... بہت دراز قد.....“

”مہمی میں بونے“ کی بات کر رہی ہوں..... ”مثال نے عکس کو ٹوکا۔ مافوق الفطرت، خوفناک چیز..... آسیب ٹائپ کی۔“ اس نے عکس کو اپنے ذہن میں آنے والی ہر مثال دے کر سمجھانے کی کوشش کی۔ اسے لگا تھا کہ عکس بونے کے بارے میں بتاتے بتاتے کسی اور چیز کے بارے میں بتانے لگی تھی۔

”ہاں، بونے ہی کے بارے میں بتا رہی ہوں تمہیں..... خوفناک، مافوق الفطرت، آسیب ٹائپ کی چیز.....“ عکس نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔

”لیکن بونوں کے قد لیے کیسے ہو سکتے ہیں؟“ مثال اس کے بیان سے الجھی گئی تھی۔

”بعض بونوں کے قد لمبے ہوتے ہیں، خوب صورت ہونے کے باوجود ان سے کراہیت محسوس ہوتی ہے۔ انسانی شکل صورت میں ہونے کے باوجود ان سے خوف آتا ہے۔ مافوق الفطرت نہ ہونے کے باوجود ان سے خوف آتا ہے۔ مافوق الفطرت نہ ہونے کے باوجود دوسروں کی زندگی کو آسیب زدہ کر دیتے ہیں۔“ مثال کو یک دم احساس ہو گیا تھا کس کا اشارہ کس

واقف ہوں..... جانتی ہوں کہ دوسری بار گھر بنانا مرد اور عورت دونوں کے لیے مشکل ہوتا ہے۔ وہ جو پہلا جیون ساتھی ہوتا ہے وہ اچھا ہو یا برا مگر وہ زندگی سے جاتا بھی نہیں..... ساری عمر مقابلوں اور موازنوں کا حصہ بننا پڑتا ہے۔ وہ اب خیر دین کو اس کی گہرائی اور اس کے اندر موجود خطرات و مشکلات کے بارے میں آگاہ کر رہی تھی۔ جس میں اس نے چڑیا کو سوجھے بغیر اتارا تھا۔

”میں جانتا ہوں چڑیا لیکن زندگی موازنوں اور مقابلوں کے علاوہ اور کچھ ہے ہی نہیں..... تمہیں لگتا ہے مرد یا عورت اپنے پہلے جیون ساتھی کا موازنہ کسی سے نہیں کرتے..... کرتے ہیں، پریشانی کی بات تب ہے جب ہم ان موازنوں میں بدتر ثابت ہونے لگیں اور ہوتے ہی رہیں..... تب تشویش بھی ہونی چاہیے اور تکلیف بھی لیکن اگر ہم اس موازنے کو اپنے حق میں کر لیں تب تو وہ تشویش کا باعث نہیں رہتا۔“ خیر دین اسے کہہ رہا تھا۔

”یہ آسان کام نہیں ہوتا نا..... یہ اتنا آسان کام نہیں ہے نا جتنا آپ کہہ رہے ہیں۔“ وہ ایک گہری سانس لیتے ہوئے بولی۔

”تم نے زندگی میں آسان کام کب کیے ہیں چڑیا.....؟ سارے امتحان مشکل آئے..... سارے کام مشکل ہی تھے جو تم نے کیے۔“ خیر دین نے عجیب فخر سے ہنس کر کہا۔

”ہاں لیکن بھی تمہارا انسان آسانیاں بھی چاہتا ہے۔“ اس نے کسی نفعے بچے کی طرح خیر دین سے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔

”چڑیا تم جس مرد کی زندگی کا حصہ بنو گی وہ بڑا خوش قسمت ہو گا..... تم کہیں بھی کسی کے ساتھ بھی ایک اچھا گھر بنا سکتی ہو ایک اچھی زندگی گزار سکتی ہو..... کیونکہ تم اچھی لڑکی ہو اور شیر دل بھی اچھا لڑکا ہے اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو میں یہ فیصلہ چاہتے ہوئے بھی نہ کر پاتا لیکن شیر دل تمہاری قدر کرے گا..... ویسی ہی قدر جیسی میں کرتا ہوں۔“ عکس کی آنکھوں میں آنسو جھلملائے تھے۔

”آپ جیسی قدر میری کوئی نہیں کر سکتا۔ شیر دل بھی نہیں..... آپ جیسا تو کوئی نہیں اور کبھی نہیں ہو سکتا۔“ اس نے خیر دین کا ہاتھ پکڑ کر اپنے دونوں ہاتھوں میں چھپاتے ہوئے کہا تھا۔

”ہاں لیکن میری خواہش اور دعا ہے شیر دل مجھ سے بڑھ کے تمہاری قدر کرے اور کرے گا۔“ خیر دین نے اسے اپنے ساتھ لگایا۔

وہ اس دن عجیب بوجھ لیے خیر دین کے پاس سے آئی تھی۔ نا نا اسے وہ کھلونا دے بیٹھے تھے جو اس کے لیے خطرناک تھا اور وہ اپنی محبت اور جوش میں اس بات کا اندازہ ہی نہیں کر سکتے تھے۔ شیر دل سے ان حالات میں عکس کی شادی دونوں کو بری طرح اسکینڈل لڑنے والی تھی۔ خاص طور پر تب، جب وہ ایک ہی ڈویژن میں کام کر رہے تھے اور دو قریبی شہروں میں پوسٹر رہے تھے۔ شیر دل اور شہر بانو کے درمیان ہونے والا جھگڑا ان کے تمام سوشل سرکل میں ہر ایک کی زبان پر تھا لیکن ابھی تک اس سارے جھگڑے میں کوئی شیر دل پر انگلی نہیں اٹھا سکا تھا لیکن اب چند بیٹیوں کے اندر ہی عکس کے ساتھ شادی کی صورت میں صرف شیر دل ہی نہیں بلکہ خود اس کی سادھ اور نام بھی بری طرح خراب ہونے والا تھا اور الزامات و تہزوں کا یہ طوفان کتنا شدید ہو سکتا تھا۔ خیر دین کو اس کا اندازہ نہیں تھا، عکس کا اندازہ تھا۔ خیر دین کا فیصلہ اس کے لیے ایک بہت غلط اور خطرناک فیصلہ تھا اور اپنے کمرے میں آنے کے بعد وہ بیٹیوں کے معصزات کو ہی سوچتی رہی تھی۔ وہ اپنے لیے خود بھی وہ فیصلہ کرنے کی ہمت نہیں کر سکتی تھی جو خیر دین نے کر دیا تھا اور وہ خیر دین کو let down نہیں کر سکتی تھی اس کے آگے کنواں اور پیچھے کھائی آگے تھے اور اسے اگر اس وقت کسی سے کھلی محسوس ہوئی تھی تو وہ شیر دل تھا۔ وہ اگر خیر دین کے پاس نہ آتا تو یہ مسئلہ کڑا نہ ہوتا یا کم از کم وہ آنے سے پہلے اس سے بات کر لیتا تو وہ اسے وہ سب کچھ سمجھا اور دکھائی پاتی جو وہ یقیناً کیوتی کی طرح آنکھیں بند کر کے نظر انداز کر رہا تھا۔

☆☆☆

”مجھے حیرت ہے عکس کا نا نا اس رشتے پر کس طرح تیار ہو گیا؟“ منزہ نے عکس کے گھر نسبت طے کر کے واپس آنے کے بعد لاؤنج میں بیٹھ کر کہا۔ وہ اور بختیار ابھی کچھ دیر پہلے واپس آئے تھے اور شیر دل بھی وہیں بیٹھا ہوا تھا۔

کی آنکھوں میں دیکھا جسے اس کے آنسوؤں نے خیر دین کے اندر پیدا کیا تھا۔ بہت دیر وہ خیر دین کے سامنے اسی دل شکستہ انداز میں کوئی ایک لفظ کے بغیر بیٹھی رہی۔ کیا سمجھائے اور کیا نہ سمجھائے۔ کیا بتائے اور کیا نہ بتائے..... خیر دین کے ایک جملے نے جیسے اسے کچھ دیر کے لیے اس مرد کے سامنے گونگا کر دیا تھا جس نے اسے پالا تھا۔

”میرے رونے کو جانے دیں آپ..... وہ آنسو کی خواہش کا اظہار نہیں تھے.....“ اس نے بالآخر لفظوں کو ڈھونڈ لیا تھا بات شروع کرنے کے لیے۔

”میں نے تمہیں اس کے لیے جتنا پریشان دیکھا ہے اس سے پہلے صرف تب دیکھا تھا جب ایک یاد ہے تمہارا میڈیکل کالج والا کلاس فیلو.....“ عکس نے خیر دین کو بات مکمل نہیں کرنے دی تھی۔

”اس کا ذکر رہنے ہی دیں۔ اس پریشانی اور اس پریشانی کا آپس میں کوئی تعلق نہیں..... میں پریشان ہوں شیر دل کے لیے اور اسے نظر انداز کرنا بھی میرے لیے مشکل ہے لیکن وہ ٹھیک ہو رہا ہے..... ٹھیک ہو جائے گا اور میری پریشانی بھی ختم ہو جائے گی۔“ اسے اندازہ تھا اس کی ساری باتیں جھوٹ کا پلندہ لگ رہی ہیں اس کے منج کے باوجود.....

”میں نے شیر دل سے تمہارا رشتہ طے کر دیا ہے۔“ خیر دین نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ عکس نے عجیب حیرت سے..... خیر دین کو دیکھا۔ وہ اس سے یہی بات کرنا چاہتی تھی لیکن خیر دین جیسے اس سے اس معاملے پر بحث نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ”میں بس یہ نہیں چاہتا چڑیا کہ میں زندگی میں کوئی پچھتاوا سمیٹوں صرف اپنی انا اور ضد کی وجہ سے اور مجھے لگا تھا میری شیر دل سے شادی سے انکار وہ واحد معاملہ ہو سکتا ہے میرے لیے پچھتاوے کا۔“ خیر دین کہہ رہا تھا۔ ”میں نہیں چاہتا کسی اور سے شادی کرنے کے بعد راتوں کو اس طرح سے بے چین پھر دو جس طرح تم آج کل پھر رہی ہو۔ اولاد کی خوشی کے سامنے انسان انا کا جھنڈا گاڑ کے تو نہیں بیٹھ سکتا..... بیٹھ جائے تو نقصان دونوں کا ہوتا ہے۔ میری بس اب یہی خواہش ہے کہ تم خیر حیرت سے اپنے گہریاری ہو جاؤ اور خوش رہو..... اور میں جانتا ہوں تم شیر دل کے ساتھ بہت خوش رہو گی..... وہ اچھا لڑکا ہے۔“ خیر دین صبح کے دانے گھماتا ہوا کہتا گیا تھا۔ عکس اسے صرف دیکھ کر رہ گئی۔ وہ اس سے بحث کر کے اس کا فیصلہ تبدیل کروانے آئی تھی مگر وہ اس سے بحث نہیں کر سکی۔

”شیر دل کے ماں، باپ بہت مشکور ہو کر گئے ہیں یہاں سے..... آج بھی ماضی میں ہونے والی اپنی تمام کوتاہیوں کے لیے معذرت کر کے گئے ہیں..... بہت وعدے دے کر گئے ہیں تمہارے لیے کہ تمہیں بہت خوش رکھیں گے۔ اپنے خاندان میں بہت عزت دیں گے..... اب اس طرح زبان دینے کے بعد میں اپنی زبان سے کیسے پھر جاؤں اور کھوں چڑیا نہیں مان رہی۔“ خیر دین نے کہا..... عجیب معصوم اور سادہ انداز تھا اس کا..... چڑیا کے لیے انکار کو نامکمل کر دیا تھا اس نے..... وہ کسی سے بھی شادی کا کہنا اس طرح تو وہ کر لیتی ہے تو پھر شیر دل تھا..... جس سے وہ محبت کرتی تھی۔

”تمہیں اب بھی اعتراض ہے؟“ خیر دین نے اس سے گفتگو کے آخر میں پوچھا۔

”نہیں، ٹھیک ہے اگر آپ یہ چاہتے ہیں تو میں اعتراض کیسے کر سکتی ہوں۔“ اس نے خیر دین کو دم آواز میں جواب دیا۔ وہ کڑوی گولی خیر دین نے اس کے لیے لگی تھی۔ اپنے کندھوں کا بوجھ اس کے لیے بڑھا تھا ایک بار پھر اور اس احساس نے عکس کو سر اٹھانے کے قابل تک نہیں چھوڑا تھا۔ وہ تشکریا احسان مند ہی نہیں تھی صرف شرمندگی تھی۔

”وہ تمہیں بہت خوش رکھے گا، وہ کہہ کے گیا ہے۔“ خیر دین نے دعا دینے والے انداز میں بہت محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا تھا۔

”شیر دل آیا تھا؟“ عکس نے کچھ حیرانی سے خیر دین کو دیکھا۔

”کل آیا تھا۔“ اس نے بتایا۔ ”بہت پریشان لگ رہا تھا وہ۔“ خیر دین کی آواز میں تھکر جھکا تھا۔ ”اللہ کسی کو بھی اولاد کی پریشانی نہ دکھائے۔“ پتا نہیں اس نے کس کے لیے دعا کی تھی۔ شیر دل کے لیے..... یا اپنے لیے.....؟ ”گھر ٹوٹا کوئی اچھی بات نہیں ہوئی..... برآمدے کا کھونسلہ ٹوٹ جائے تو وہ کتنے دن وہیں اڑتا..... لگتا ہے انسان کی تکلیف تو جانور کی تکلیف سے زیادہ ہوتی ہے۔“ وہ اب کہہ رہا تھا۔ ”تم اس کے ساتھ بہت اچھا گھر بنانا۔“ خیر دین جیسے اسے نصیحت کر رہا تھا۔

”بڑا مشکل کام دے رہے ہیں آپ مجھے نا نا۔“ وہ کہے بغیر نہیں رہ سکی۔ ”میں پرندہ نہیں ہوں اور میں ہی نہیں جانتی کہ پرندہ جب دوسری بار گھر بناتا ہے تو اس کے احساسات کیا ہوتے ہیں لیکن میں انسانوں کے جذبات اور احساسات سے ضرور

”تمہیں وجہ جان کر کیا کرنا ہے؟“ بختیار نے ٹوک دیا تھا۔

”حیران ہوں بہت اس لیے پوچھ رہی ہوں۔“ منزہ نے کہا۔

”حالانکہ تمہیں حیران ہونے کے بجائے خوش ہونا چاہیے۔“ بختیار نے ان سے کہا۔

”اتنی خوش ہوں میں کہ مجھ سے بڑھ کر تو شاید آپ کا بیٹا بھی خوش نہیں ہے۔“ منزہ نے فوراً کہا۔ شیر دل نے ماں کے اس تبصرے پر بے حد تنبیہ کی سے انہیں دیکھا۔

”میں پہلی شادی نہیں بے مری۔ نہ ہی بہت خوشگوار حالات میں ہو رہی ہے۔ میں نہیں جانتا کوئی ایسی شادی پر کسی طرح بہت خوش ہو سکتا ہے یا آپ مجھے ہیں میں انسانی صفات نہیں رکھتا۔“ وہ اتنا bitter تلخ نہیں بڑبڑاتا تھا جتنا ہو گیا تھا۔ منزہ نادم سی ہو گئی۔

”میں نے ویسے ہی ایک بات کہی ہے کوئی غلط معنی مت لو۔ تمہاری مرضی سے ہو رہا ہے جو بھی ہو رہا ہے کوئی زبردستی تو نہیں ہو رہی۔ تم نے خود فیصلہ کیا ہے کس سے شادی کا۔ خود ہمیں اس کے گھر جانے کا کہا۔“ منزہ نے جیسے مدافعتی انداز میں کہا۔ وہ جواب میں کچھ کہنے کے بجائے ایک دم وہاں سے اٹھ کر چلا گیا۔

”کیا ضرورت تھی تمہیں اس طرح ڈسکشن دوبارہ شروع کرنے کی؟“ وہ اگھر گھر دوبارہ آکر کرنے پر تیار ہو گیا۔ یہ کافی نہیں ہے کیا تمہارے لیے؟“ یا یہ ضروری ہے کہ تم ایک بار پھر سے کیوں اور کیسے کے چکروں میں پڑو۔“ بختیار نے شیر دل کے اس طرح وہاں سے اٹھ کر جاتے ہی بہت ناگواری اور کھٹکی سے منزہ کو نظر پیا ڈالتے ہوئے کہا۔

”اور اب کس سے بھی کسی طرح کی کوئی بحث نہ کرنا، وہ ہمارے خاندان کا حصہ بننے جاری ہے، تمہاری کسی بات سے اس کی دل کھٹکی نہیں ہونی چاہیے ابھی۔ نہ ان دونوں کی شادی کے بعد۔ ان لوگوں کی اتنی favour بہت ہے کہ انہوں نے ماضی کو بنیاد دینا کر کسی اور تنازعے کو کھڑا کرنے کے بجائے ہماری بات مان لی۔ ہمارے divorced اور بچے والے بیٹے کے ساتھ وہ اپنی بیٹی کی شادی کرنے پر تیار ہو گئے۔ ہمیں اس کے لیے ان کا شکر گزار ہونا چاہیے اور بس۔“ بختیار نے بھی جیسے بات ہی ختم کر دی گئی اور وہ بھی وہاں سے اٹھ گئے تھے۔

منزہ بہت دیروہیں ہے مقصد بھی نہیں رہیں۔ شادی کا یہ سلسلہ انہوں نے شروع کیا تھا اور وہ خوش اور مطمئن بھی تھیں کہ شیر دل کا گھر دوبارہ آباد ہو جائے گا لیکن اس احساس کے باوجود کس مراد علی سے انہیں عجب سے خدشات تھے اور وہ ان خدشات کو کوئی نام نہیں دے پا رہی تھیں۔ کوئی دوسرا کوشش کرتا تو یہ کام بڑی آسانی سے کر لیتا۔ وہ شکست خوردگی کے احساس سے دوچار ہو رہی تھیں یا آسان لفظوں میں انہیں اپنا تھوکا چٹا کر رہا تھا۔ حسب نسب کی وہ اونچی دیواریں جنہیں اپنے گرد کھڑا کر کے وہ فخر محسوس کرتی تھیں ان پر بہت بری طرح چوٹ پڑی تھی۔ ایسی زوردار چوٹ کہ ان دیواروں میں آجانے والی دراڑیں زمین تک پہنچ گئی تھیں۔

انسان تقدیر کے سامنے بے بس ہوتا ہے۔ اپنی تقدیر کے سامنے بھی اور دوسرے کی تقدیر کے سامنے بھی۔ وہ نہ اپنی... جبرستی کو خوش قسمتی میں بدل سکتا ہے نہ دوسرے کی خوش قسمتی کو بد قسمتی میں۔ اور نہ ہی اس بے بسی کے احساس کو ختم کر سکتا ہے جو اسے اس صورت حال میں ہوتا ہے۔

☆☆☆

”شیر دل سے بات ہوئی تمہاری؟“ نانا نے دو دن بعد صبح ناشتے کے بعد پوچھ میں اسے آفس کے لیے رخصت کرتے ہوئے اس سے پوچھا تھا۔

”نہیں نانا۔“ وہ ایک لمحے کے لیے جھجکی پھر اس نے خیر دین کو جواب دیا۔ ”لیکن میں کرلوں گی، ابھی مصروف ہوں۔“ اس نے خیر دین کے مزید کچھ کہنے سے پہلے ہی وضاحت اور جواب دیا تھا۔

”اس کا مجھے فون آیا تھا کل۔ تمہارا پوچھ رہا تھا۔“ خیر دین نے اسے بتایا اس نے جواباً کچھ نہیں کہا۔ اسے اگر واقعی کس سے بات کرنی ہوئی تو خیر دین کے فون پر کال کر کے اس کا پوچھنے کے بجائے سیدھا سیدھا وہ اس کے فون پر کال کر سکتا تھا مگر وہ بھی اس سے بات کرنے میں متاثر تھا، وہ محسوس کر سکتی تھی۔

”میں اس سے ایک دو دن میں بات کرلوں گی۔“ کس نے گاڑی میں سوار ہونے سے پہلے خیر دین سے کہا۔ خیر دین نے

عکس

اسے جواباً کچھ نہیں کہا تھا۔ جھکن کا ایک عجیب سا احساس تھا جو پہلے سے اسے اپنی گرفت میں لیے ہوئے تھا۔ خوشی کی کوئی رفق اسے کہیں ڈھونڈنے سے بھی نہیں مل رہی تھی۔ وہ سجاد سے شادی کی تیاری میں بھی بہت زیادہ ایکساٹنڈ نہیں تھی لیکن کم از کم اس کے ساتھ شادی ملے پانے نے اسے اس طرح کی کیفیت سے دوچار نہیں کیا تھا جس طرح کی کیفیت کا شکار وہ اب ہو رہی تھی۔

حلیہ اب خیر دین کے ساتھ ساتھ اس سے بھی بری طرح کھٹکی ہو گیا تھا کہ اس کا خیال تھا کہ خیر دین کے ساتھ ساتھ اس کا دماغ بھی خراب ہو گیا تھا کہ وہ خیر دین کو کچھ سمجھانے یا قائل کرنے کے بجائے اس کے کہنے پر ایک طلاق یافتہ ایک بچے کے باپ سے شادی پر تیار ہو گئی تھی اور وہ بھی اس خاندان میں جس نے ان کی زندگی میں تکلیف اور تباہی لانے کے سوا کچھ نہیں کیا تھا۔ وہ دو دن سے مسلسل خیر دین اور کس کے ساتھ بحث و مباحثے میں مصروف تھی اور اب دو دن کے بعد ان میں سے کسی کو بھی قائل کرنے میں ناکام ہونے کے بعد اس نے اپنی کوششوں کو بالآخر ترک کر دیا تھا لیکن اس کی کھٹکی اسے اپنے عروج پر تھی۔ اسے اپنی سرسراہٹ میں شدید قسم کی کھٹکی اور تنقید کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ اس رشتے کے اس طرح اچانک بغیر کسی وجہ کے کارڈ ز بانٹنے کے بعد ختم کرنے پر۔ اور وہ نہ صرف نادم اور شرمندہ تھی بلکہ اس معاملے پر اس تنقید اور مخالفت کو بالکل جائز بھی سمجھ رہی تھی۔ خیر دین پر یک دم پورے خاندان میں تنقید اور الزامات کی بوچھاڑ شروع ہو گئی تھی۔ نہ صرف حلیہ کے سسرالی رشتے دار بلکہ خیر دین کا اپنا خاندان بھی اس تنقید میں پیش پیش تھا۔

ان کے خاندان میں شادی کے کارڈ بھی تقسیم ہو جانے کے بعد کسی لڑکی کی شادی ٹرگ جانے کا یہ پہلا واقعہ ہوا تھا اور ہر ایک کے پاس کہنے اور اندازے لگانے کے لیے بہت کچھ تھا اور یہ ساری باتیں حلیہ، خیر دین تک بھی پہنچا رہی تھیں۔ وہ تنقید اور مخالفت کے اس طوفان کی توقع رکھنے کے باوجود کسی نہ کسی حد تک ان باتوں سے ہرٹ ہوا تھا لیکن یہ پہلا موقع تھا جب اسے کسی پر غصہ اور کسی سے گلہ نہیں ہوا تھا۔ اپنے فیصلے پر پھر رہنے کے باوجود اسے احساس تھا کہ جو کچھ اس نے کیا تھا وہ غلط تھا۔ سجاد کی فیملی کے ساتھ زیادتی ہوئی تھی اس سارے معاملے میں اور خیر دین کو اگر کسی بات پر شدید رنج اور شرمندگی تھی تو وہ یہی ایک بات تھی۔ ورنہ وہ اپنے خلاف جو کچھ کہ رہا تھا اسے اس سب کی پروا نہیں تھی۔ اس کے لیے اتنا کافی تھا کہ وہ چڑیا کی ایک اور خواہش پوری کرنے جا رہا تھا۔ اسے وہ دے رہا تھا جو اس کے دل کی خواہش تھی۔

اور کس اس سارے معاملے میں ایک خاموش تماشا کی طرح ماں اور نانا کے درمیان میں ہونے والی اس جنگ کو دیکھ رہی تھی۔ زندگی میں پہلی بار اس نے حلیہ اور خیر دین کے درمیان کوئی اختلاف دیکھا تھا اور وہ بھی اپنی وجہ سے اور وہ یہ بھی جانتی تھی کہ خیر دین نے اس کی خوشی کی خاطر خود کو ہیر و پیر کر لیا تھا لیکن وہ خود اس سے کم از کم اس فیصلے پر متفق نہیں تھی اس کے باوجود حلیہ کی حمایت بھی نہیں کر سکتی تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ ماں بھی جو اسٹینڈلے رہی تھی وہ اس کی محبت میں ہی لے رہی تھی۔

اور ان تمام خاندانی جنگوں کے درمیان اسے ایک لمحے کے لیے بھی شیر دل کا خیال نہیں آیا تھا۔ نہ اس کا خیال آیا تھا نہ اس سے بات کرنے کی خواہش ہوئی تھی۔ حالانکہ وہ بونی چاہے تھی، خیال بھی آنا چاہیے تھا لیکن پتا نہیں شیر دل ایک دم جیسے ایک اجنبی کی صورت میں اس کے سامنے آئے لگا تھا۔ وہ کچھ دیر کے لیے جیسے اس کا بہترین دوست بھی نہیں رہا تھا۔ اس سے بات کرنا ضروری تھا لیکن موضوع صرف ایک رہ گیا تھا اور وہ صرف اسی ایک موضوع پر اس سے بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔ زندگی میں کبھی اسے شیر دل سے ایسی بیزاری نہیں ہوئی تھی جیسی ان چند دنوں میں ہوئی تھی۔

زندگی میں ہر انسان سے ہر فیصلہ صحیح نہیں ہو سکتا تھا بعض فیصلے انسان غصے اور جلد بازی میں کرتا ہے اور بعض جذبات میں مجبور ہو کر۔ اور کہیں نہ کہیں عقل و ہوش کچھ دیر کے لیے انسان کا ساتھ ضرور چھوڑ دیتے ہیں۔ کبھی نہ کبھی حماقت، عقل پر قبضہ ضرور کر لیتی ہے چاہے وہ چند لمحوں کے لیے ہی کیوں نہ ہو۔

وہ آفس میں سارا دن بیٹھے دفتری کام انجام دیتے ہوئے خیر دین کے اس فیصلے سے ممکنہ نقصانات کے بارے میں سوچتی رہتی تھی اور damage control کے طریقے بھی۔ نقصان تو ہونا تھا لیکن کم سے کم کیسے کیا جاسکتا تھا سجاد اور نانا بہت بڑی چیزیں تھیں اور اب وہ دونوں چیزیں داؤ پر لگنے والی تھیں۔ شیر دل مرد تھا بہت سی چیزیں اس کے لیے matter ہی نہیں کرتی تھیں جس کے پیچھے بختیار شیر دل کا خاندان تھا جہاں وہ خود بخوبی مسکوتا تھا۔ اس کا خاندان اسے بجا لیتا۔ کوئی اس کے اسکیڈ لائز ہونے پر اس کے خاندان کے بارے میں سوال کرنے اور اٹھانے والے نہیں تھا۔ وہ ایک فرد کی غلطی تھی اور error of judgement (فیصلے کی غلطی) سمجھ کر معاف کر دی جاتی۔

شیردل اس وقت نہا کر نکلتا تھا اور ابھی اپنے بیڈروم میں آیا ہی تھا جب اس کا سیل فون بجنے لگا تھا۔ caller ID نہیں آتی تھی یعنی کارکن سرکاری نمبر سے کال کر رہا تھا اس نے تو لیا کر سی پر رکھتے ہوئے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف عکس کے آفس کا آپریٹر تھا جس نے اسے ایمر جنسی کی اطلاع دیتے ہوئے فوری طور پر کس سے connect کیا تھا۔ وہ بھی کچھ تشویش میں مبتلا ہو گیا تھا۔ بیٹھے بیٹھے اتنی صبح، صبح کیا ایمر جنسی آگئی تھی۔

”تم نے کسی سینٹری ورکر کو معطل کیا تھا؟“ عکس نے اس کی آواز سنتے ہی علیک سلیک اور تمہید کے بغیر پوچھا۔

”کہاں..... تمہاری جگہ پر؟“ شیردل نے جبرانی سے اس کا سوال سنا۔

”ہاں.....“

”شاید..... کیوں، کیا ہوا؟“ شیردل کو فوری طور پر کوئی معطلی یاد نہیں آئی لیکن اس نے انکار بھی نہیں کیا تھا۔

”وہ میرے آفس کی چھت پر چڑھا ہوا ہے اور خود کشی کی دھمکی دے رہا ہے۔“ عکس نے جوابا کہا۔ ”شیردل نے بے اختیار ایک گہری سانس لی۔

”الو کونسا..... جبک صبح.....“ اسے نہ صرف وہ سینٹری ورکر یاد آ گیا تھا بلکہ اس کا نام بھی.....

”جبک صبح نام ہے..... اوکے..... کیا کیس تھا اس کا؟“ عکس کے لہجے میں غلت تھی۔

”کیا کیس ہوتا ہے؟ دو دفعہ کوڑے کے ڈرم اکھاڑ کر لے جاتے ہوئے پکڑا گیا، میں نے وارننگ دے کر چھوڑ دیا، تیسری بار میرے آفس کے ہاتھروم میں فٹنگ کے لیے آیا ہوا کچھ سامان غائب کر دیا اس نے..... انکوائری میں اس پر الزام ثابت ہو گیا تو بھی میں نے معطل نہیں کیا اسے..... pay ضبط کی اس کی۔“ شیردل اسے کچھ حق کی کے عالم میں بتا رہا تھا۔

”لیکن سب تو کہہ رہے ہیں وہ suspend (معطل) ہونے کی وجہ سے یہ سب کر رہا ہے۔“ عکس نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

”suspend (معطل) میں نے اسے ڈی سی آفس کی چھت پر چڑھ کر خود کشی کی دھمکی دینے پر کیا تھا۔ pay کاٹے جانے پر چھت پر چڑھ گیا تھا اور پتا نہیں کہاں سے تقریر لکھوا کر لایا تھا۔ کوئی دس صفحوں کی، وہ پڑھنا شروع کر دی تھی۔“ شیردل نے بتایا۔ ”تو میں نے اس جرم میں suspend (معطل) کیا تھا اسے۔“

”اب بھی یہی کر رہا ہے وہ..... لیکن زبانی کر رہا ہے تقریر۔“ وہ صورت حال مضحکہ خیز تھی لیکن اب لگنے لگی تھی۔

”تم کیا کر رہی ہو؟“ شیردل نے جوابا پوچھا۔

”میں نے فائر بریگیڈ والوں کو بلا دیا ہے، سیڑھی اور نیٹ لانے کے لیے..... ایبولینس کو بھی بلوایا ہے۔ میرا اسٹنٹ کمشنر میگا فون پر اس سے دروازہ کھولنے اور نیچے آ جانے کے لیے کہہ رہا ہے اور اب میں سوچ رہی ہوں کہ اس کی suspension (معطلی) ختم کر دوں کہ وہ نیچے تو آئے..... ابھی کوئی میڈیا ٹیم یہاں آگئی تو اور مسئلہ ہو جائے گا..... تم نے کیا، کیا تھا جب وہ اس طرح چھت پر چڑھ گیا تھا۔“ عکس نے تشویش کے عالم میں تفصیلات بتاتے ہوئے اس سے پوچھا۔

”میں نے اسے کہا تھا کہ کوڈ چاؤ اور اگر پھر بھی بچ گئے تو میں تمہیں suspend (معطل) کروں گا کم از کم ایک سال کے لیے اور پھر میں اندر چلا گیا تھا۔“ عکس کو لگا وہ مذاق کر رہا ہے۔

”تم کو اس کر رہے ہو۔“ اس نے بے ساختہ کہا۔ ”یہاں مجھے مصیبت پڑی ہوئی ہے تمہاری وجہ سے اور تمہیں مذاق سوچ رہا ہے۔“ وہ نہ جانتے ہوئے بھی خفا ہوئی تھی۔

”میں نے وہی کہا تھا جو میں نے تمہیں بتایا ہے۔ جو تم کر رہی ہو اس کے بعد تو وہ سارا دن چھت پر بیٹھا ہے گا اور نیچے کراؤ بڑھتا چلا جائے گا اور میڈیا والوں کو دیر نہیں لگے گی وہاں پہنچنے میں۔“ شیردل نے سنجیدگی سے اس سے کہا۔

”تم نے اسے کہا کہ کوڈ چاؤ اور وہ نیچے آ گیا؟“ عکس کو اب بھی یقین نہیں آیا۔

”ہاں..... چندہ منٹ میں نیچے آ گیا تھا، اس کے بعد میں نے اسے دو دن تھانے میں رکھوایا پھر suspend کر کے گھر بھجوا دیا۔ تمہاری طرح اسے چھت پر چڑھا دیکھ کر تمنا ثانی اٹھنے نہیں کرنے دیے۔ تم عورتوں نے شہر سنبھالنا ہے.....؟ ایک جبک صبح تو کنٹرول ہوتا نہیں تم سے۔“ شیردل کے آخری جملے میں موجود طور کو اس نے نظر انداز کر دیا تھا۔ وہ پہلا موقع نہیں تھا جب وہ اس طرح صحت شاؤنزم دکھا رہا تھا۔

عکس مراد علی عورت تھی، سیلف میڈیٹی اور ایک کمتر خاندان سے تعلق رکھتی تھی اس کی غلطی پر اس کے بجائے اس کے خاندان کے بارے میں سوال جواب اور تھرے ہوتے..... اپنے کیریئر کے اتنے سالوں میں بھی اس کا کوئی اسکینڈل نہیں آیا تھا اور اس ایک اسکینڈل کے بعد ڈاکٹر کس مراد علی کا نام جہاں بھی آتا ہی حوالے سے آتا۔ وہ عزت اور احترام جس کے ساتھ سب اس کا نام لیتے تھے وہ تعجب ایک آئینہ میں اور تھروں میں تبدیل ہونے والی تھی اور یہ بہت بڑی قیمت تھی جو اسے شیردل کے ساتھ کے بدلے میں ادا کرنی تھی..... خیر دین نے جذبات میں یہ نہیں سوچا تھا اس نے صرف ایک نانا بن کر اپنی نواسی کی خوشی کا سوچا تھا لیکن نواسی یہ سب سوچ رہی تھی کیونکہ وہ عورت ہوتے ہوئے بھی جذباتی نہیں رہی تھی۔ جذبات سے فیصلے وہ پہلے بھی کم ہی کرتی تھی لیکن اس پروفیشن میں آنے کے بعد اس نے جذبات کو سناٹا بند دے کر سلا دیا تھا۔ وہ اب جانتی تھی تو جذبات کو عقل پر ترجیح نہیں دے سکتی تھی اور اب اسے یہی کرنا پڑ رہا تھا..... خیر دین کی محبت میں آنکھوں دیکھی وہ بھی لگتا بڑ رہی تھی جس سے اسے کم از کم بدمعاشی تو ضرور ہوتی اگر کوئی بڑی بیماری نہ بھی ہوتی تو..... وہ اس دن بھی اسی شش مش میں چھٹی آفس پہنچی تھی جب تک بریک کے دوران اسے آفس کے باہر شور کی آواز آئی تھی اس نے انٹر کام اخٹا کر PA کو اس شور کی وجہ معلوم کرنے کو کہا، وہ پانچ دس منٹوں کے بعد بے حد پوٹھلا ہوا آفس میں آیا تھا۔

”میڈم وہ ایک آدمی خود کشی کرنے کے لیے آپ کے آفس کی چھت پر چڑھ گیا ہے اس نے چھت کا دروازہ اندر سے بند کر لیا ہے اور اب وہ کہہ رہا ہے کہ وہ وہاں سے کود کر جان دے دے گا۔“ عکس کو چند منٹوں کے لیے جیسے بات کی سمجھ نہیں آئی تھی اور جب سمجھ میں آئی تو وہ بہت panicked ہو کر فوری طور پر آفس سے باہر نکل آئی تھی۔ اس کے آفس کے ارد گرد موجود جگہ میں اب ایک مجمع تھا جو چھت پر موجود کسی آدمی سے بد آواز بلند بات چیت کرنے میں مصروف تھا۔ اسے آتے دیکھ کر اس کا اپنا اسٹاف اور گاڑی بھی پہنچ گئے تھے۔ باہر موجود لوگوں کے جھوم کو انہوں نے ہٹانا شروع کر دیا تھا جو زیادہ تر ان افراد پر مشتمل تھا جو DC آفس اور اس کے آس پاس موجود دوسرے انتظامی عہدے داران کے آفسز میں اپنے کاموں کے سلسلے میں آئے ہوئے تھے یا پھر درجن چہارم کے ملازمین جو ان دفتروں میں کام کرتے تھے اور انہیں صبح ہی منسکی خیز تفرق میرا آگئی تھی۔

وہ آفس سے برآمدے اور برآمدے سے باہر نکل آئی تھی..... دو منزلہ عمارت کی چھت پر اس وقت ایک آدمی موجود تھا جو چھت کے بالکل ہرے پر تھا۔ صرف عکس نے اس آدمی کو نہیں دیکھا تھا، اس آدمی نے بھی اسے دیکھ لیا تھا اور وہ چلا چلا کر کچھ کہنے لگا تھا جو شاید اسے سمجھ میں آ جاتا اگر نیچے کھڑا مجمع بھی بھانت بھانت کی بولیاں نہ بول رہا ہوتا۔

”میڈم کوئی سینٹری ورکر ہے پہلے بھی ایک بار اسی طرح اوپر چڑھ گیا تھا بڑی مشکل سے اتارا تھا اسے۔ پچھلے ڈی سی صاحب نے معطل کیا ہوا ہے اسے اور کئی مہینوں سے اس کی pay بھی رکی ہوئی ہے۔“ اس کے اسٹنٹ کمشنر نے اسے دیکھتے ہی بتانا شروع کر دیا تھا، وہ اس کے جینچے سے پہلے ہی وہاں موجود تھا اور صورت حال کے بارے میں معلومات اور اس آدمی کے کوائف حاصل کر چکا تھا۔

”میگا فون پر اسے بتاؤ کہ وہ نیچے اترے اور آکر بات کرے..... اس کے دونوں مسئلے حل ہو جائیں گے لیکن اس طرح نہیں۔“ اس نے ایک نظر اس مجمع پر ڈالی جس میں سے اب آدھے اس کی طرف متوجہ تھے اور آدھے اس آدمی کی طرف جو چھت پر چڑھا ہوا تھا۔

عکس اسٹنٹ کمشنر کو ہدایات دے کر وہاں رکی نہیں تھی۔ یہ جیسے اپنے آپ کو تمنا ثانیانے والی بات تھی۔ چھت پر چڑھا ہوا آدمی اسے اپنے اسٹاف کے ساتھ وہاں سے غائب ہوتے دیکھ کر جیسے مزید جوش میں آ گیا تھا۔ اس نے کچھ اور بلند آواز میں وہ تقریر جاری رکھی جو وہ اس سٹم اور اسے چلانے والے آفیسروں کے خلاف کر رہا تھا جو سب حکومت کے آلہ کار بن کر غریبوں کا خون چوس رہے تھے اور ان پر ظلم کر رہے تھے۔

عکس کے لیے یہ صورت حال سنگین ہونے سے زیادہ مضحکہ خیز تھی۔ اسے اندازہ تھا کہ کسی خاتون آفیسر کے ساتھ اس طرح کی صورت حال پیش آنے پر اس کی انتظامی صلاحیتوں پر سوالات اٹھنے کے ساتھ ساتھ اس پر پھپھیاں گنے کا بھی ایک اچھا موقع ہوتا تھا۔ آج تاہم وہ اور جو یقیناً آ گیا تھا۔

☆☆☆

اولا کوکر کے تم نے شیر دل اور ہماری فیملی کو سوشل اور پروفیشنل سرکلو میں کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا۔ شیر دل نروس بریک ڈاؤن کی وجہ سے مرتے مرتے بچا ہے۔ کوئی چھوٹا mess تو create نہیں کیا تم نے ہمارے لیے۔“ شہر بانو کو عجیب سا اضطراب ہوا۔

”نروس بریک ڈاؤن.....“ شیر دل اتنا کمزور نہیں تھا یا شاید اس نے اسے ضرورت سے زیادہ مضبوط سمجھ لیا تھا۔

”اب وہ ٹھیک ہے؟“ اس نے ایک دم منہ کو لوک کر پوچھا۔

”ہاں ٹھیک ہے لیکن جو مہینے میں نے اسے سنبھالنے گزارے ہیں، وہ میں ہی جانتی ہوں اور خدا نہ کرے کسی ماں کو اپنی اولاد کو اس طرح تکلیف میں دیکھنا پڑے۔“

”میں نے جو بھی کیا میں اس کے لیے بہت شرمندہ ہوں اور مجھے افسوس ہے۔ آپ ٹھیک کہتی ہیں مجھے اتنی جلد بازی میں اسے بڑے بڑے فیصلے نہیں کرنے چاہیے تھے لیکن میں غصے میں بعض دفعہ انسان کو کچھ سمجھ نہیں آتا۔“ شہر بانو نے جیسے کچھ بے بس انداز میں اعتراف نہایت کیا تھا۔ اسے کم از کم اس بات کا اعتراف کرنے میں کوئی جھجک نہیں تھی کہ اس نے شیر دل کو ہر طرح سے نقصان پہنچانے کی کوشش کی تھی۔ اس نے اس بات کی پروا نہیں کی تھی کہ وہ جس طرح اس کا گھر چھوڑ کر جا رہی ہے اس سے شیر دل کو لوگوں کا سامنا کرنا مشکل ہو جائے گا اور اب جب وہ اپنے لائے ہوئے طوفان کے گزر جانے کے بعد ہونے والی تباہی دیکھ رہی تھی تو وہ پہلی بار نہایت کا شکار ہو رہی تھی۔ وہ دینے تازہ جس پر اس نے اتنا بڑا طوفان اٹھایا تھا اب اتنی infuriating (طیش میں لانے والی بات) نہیں لگ رہی تھی بلکہ بھگانے لگ رہی تھی۔

”اچھی بات ہے تم شرمندہ ہو لیکن اب کچھ ہو نہیں سکتا۔ شیر دل کی شادی طے کر دی ہے میں نے..... اگلے مہینے ایک سادہ سی تقریب میں نکاح ہے اس کا۔“ شہر بانو کو توقع ہوئی چاہیے تھی کہ اگر وہ move on کر رہی تھی تو یہ کام شیر دل بھی کر سکتا تھا۔ وہ اس کی زندگی سے نکل رہی تھی تو وہ اس جگہ کو کسی دوسری عورت سے پُر کر دیتا۔ وہ پھر بھی چند سینکڑوں کے لیے جیسے سانس لیتا ہی بھول گئی تھی۔ شیر دل اپنی زندگی میں کسی اور عورت کو لارہا تھا۔ اسے جیسے یقین نہیں آیا تھا۔ عجیب بھگانہ جذباتیت کا شکار ہوئی تھی وہ۔ شیر دل وہ کھلوتا تھا جسے اس نے پھینک دیا تھا لیکن اب (محض خیال ہی میں) کسی دوسرے کو اس کھلونے سے کھیلنے ہونے دیکھ کر اسے ایک دم وہی کھلونا اچھا لگنے لگا تھا۔ وہی کھلونا چاہیے تھا۔ منہ نے دانستہ اس کے سامنے یہ انکشاف کرتے ہوئے عکس کا نام نہیں لیا تھا اور شاید زندگی میں پہلی بار عقل مند کی مظاہرہ کیا تھا۔

”میں پھر بھی یہ کہوں گی کہ تم شیر دل کو نون کرو..... اس سے بات کرو..... اگر کوئی ایسا حل نکل آتا ہے کہ تم اور وہ دونوں اکٹھے رہ سکو یہ مثال کے لیے بہت اچھا ہے لیکن ایسا کوئی حل شیر دل ہی نکال سکتا ہے، میں کچھ نہیں کر سکتی۔ تم پاکستان آ جاؤ تو شاید یہ مسئلہ جلد اور زیادہ بہتر طریقے سے حل ہو جائے۔“ شیر دل، مثال کو دیکھ کر اس کا دل بھی نرم پڑے گا۔ ”منہ اسے نہ چاہتے ہوئے بھی امیدیں دلا رہی تھیں اور لاشعوری طور پر جیسے وہ، وہ کہنا شروع ہو گئی تھیں جو وہ چاہتی تھیں۔ ایک سانس میں شیر دل کی شادی کی اطلاع اور دوسری سانس میں یہ دہلی ہوئی خواہش کہ ایسا نہ ہو..... اور شیر دل، شہر بانو کی طرف لوٹ جائے اور اس لاشعوری سوچ کے پس منظر میں عکس کے حوالے سے ان کی ازلی نا پسندیدگی کا فرما بھی۔ اگر ضرورت کے وقت گدھے کو باپ بنا لینے کا کوئی عملی مظاہرہ کرنا ہوتا تو منہ وہ بلا مقابلہ جیت جاتیں۔ شہر بانو پر انہیں غصہ تھا، خفگی تھی..... شرمین سے انہیں نفرت تھی لیکن اس کے باوجود شہر بانو ان کے خاندان کا حصہ تھی..... ان جیسا حسب نسب رکھنے والی..... ان کا اپنا خون..... عکس ساری زندگی ان کے لیے احساس شکست کے سوا کچھ نہیں رہتی..... انہوں نے شیر دل کی زندگی کی خاطر اس کے سامنے جھکتا قبول کیا تھا اور اب اگر انہیں دوبارہ اس کے سامنے کھڑا ہونے کا موقع مل رہا تھا تو وہ ہر قیمت پر اس موقع کو استعمال کرنا چاہتی تھیں۔

”شیر دل کس سے شادی کر رہا ہے؟“ وہ جواب جو انہوں نے خود شہر بانو کو دینے سے گریز کیا تھا وہ اس نے خود پوچھ لیا تھا۔

☆☆☆

”تم شیر دل سے شادی کر رہی ہو؟“ عکس کو غنی کے غیر متوقع سوال پر کرنٹ لگا۔ اس نے کچھ دیر پہلے ہی فون کیا تھا اور دو چار دھرا دھری باتوں کے فوراً بعد اس نے عکس سے ایک دم یہ سوال کر دیا تھا۔

”یعنی میں اسے کہہ دوں کہ وہ کوڈ جائے تو وہ نیچے اتر آئے گا؟“ عکس نے جیسے اس سے یقین دہانی چاہی تھی۔

”ہاں..... لیکن اس سے پہلے نیچے موجود اس سارے کراؤ کو ہٹا دو وہاں سے۔“ شیر دل نے کہا اور چند اور جملے کہہ کر عکس نے فون بند کر دیا۔ فون بند ہونے کے بعد بھی شیر دل مسلسل اسی صورت حال کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔ تقریباً بیس منٹ بعد اس نے کچھ اضطراب اور جس کے عالم میں updates لینے کے لیے عکس کو دوبارہ فون کیا تھا۔ چند لمحے فون بچتا رہا لیکن اس نے کال ریسپونڈ کی اس سے پہلے کہ وہ ایک بار پھر نمبر رٹائی کرتا اسے عکس کا ٹیکٹ آ رہا تھا اور ٹیکٹ پر ایک نظر ڈالنے ہی اس کا دماغ جیسے بھک سے اڑ گیا تھا۔

”مدد کا شکریہ..... عجیب کوڈ گیا۔“

☆☆☆

منہ کو شہر بانو کی آواز سن کر جتنا شاک لگا تھا اتنا ہی شاک انہیں اس کا وہ جملہ سن کر لگا تھا جو اس نے ابتدائی رسمی جملوں کے بعد یکدم منہ سے کہا تھا۔

”میں شیر دل سے reconciliation مصالحت چاہتی ہوں، واپس آنا چاہتی ہوں۔“ منہ کچھ دیر کے لیے جیسے کچھ بولنے کے قابل ہی نہیں رہی تھیں۔ وہ اسے مہینوں سے ان سے بات کرنے پر تیار نہیں تھی۔ مثال کی آواز تک انہیں سنانے کو تیار نہیں تھی..... اور اب طلاق کا اپنا حق استعمال کر لینے کے بعد وہ شیر دل سے مصالحت چاہتی تھی۔ آخر بیٹھے بٹھائے ایسا کیا ہو گیا تھا کہ داؤد کے ساتھ شادی کرنے کے بجائے وہ واپس شیر دل کی طرف آنا چاہتی تھی۔ وہ طلاق کا تقویض شدہ حق استعمال کرنے کے بعد اگر واپس شیر دل کے ساتھ مصالحت کرنا چاہتی تو کسکتی تھی کیونکہ ان کے درمیان علیحدگی تقویض شدہ طلاق کے ساتھ ہوئی تھی اور وہ بھی ایک طلاق کے ساتھ..... مرد کی طرف سے تین بار دے دی جانے والی تین طلاوتوں کے ساتھ نہیں۔ شہر بانو چاہتی تو اس طلاق کو واپس لے کر حلالہ کے بغیر شیر دل کے ساتھ دوبارہ صرف نکاح کر کے رہ سکتی تھی اور ان دونوں کی طلاق ہو جانے کے بعد بھی منہ کچھ عرصہ یہ کوشش کرتی رہی تھیں کہ شہر بانو اس طلاق کو واپس لے لے اور شیر دل کے ساتھ مصالحت کر لے۔ یہ صرف شرمین کا اعلان تھا کہ وہ داؤد کے ساتھ شہر بانو کی شادی کرنے والی تھیں جس کے بعد منہ نے مصالحت کی کوششوں کو بالآخر بے حد مایوسی کے عالم میں ترک کر دیا تھا۔

اور اب اتنے مہینوں کے بعد جب وہ عکس اور شیر دل کی شادی طے کر آئی تھیں تو شہر بانو ایک بار پھر ان کے خاندان میں لوٹنے پر تیار ہو گئی تھی اور اس کی آفر نے منہ کو یک دم بہت مشکل میں ڈال دیا تھا۔

”شرمین نے بتایا تھا کہ تم داؤد کے ساتھ شادی کرنے والی تھیں؟“ منہ پوچھے بغیر نہیں رہ سکی۔

”اب نہیں کر رہی۔“ اس نے جوابا کہا۔ منہ کو کچھ نہیں آیا کہ وہ اس سے مزید کیا کہیں۔ شہباز حسین کی اگلی اولاد اور نشانی ہونے کی وجہ سے شہر بانو انہیں ہمیشہ عزیز تھی۔ شیر دل کے ساتھ اس کی شادی پر وہ اس سے زیادہ وہ خوش تھیں اور ان دونوں کے درمیان ہمیشہ سے بہت (قریب) closeness رہی تھی۔ شہر بانو ایک بار پاکستان آ جانے کے بعد شرمین کے بجائے منہ پر زیادہ rely (انحصار) کرنے لگی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ مصالحت کا فیصلہ کرنے کے بعد شیر دل کو نون کرنے کے بجائے اس نے منہ کو نون کیا تھا۔

”تمہیں میں نے کتنا سمجھانے کی کوشش کی تھی، کتنا منع کیا تھا کہ چلو ناراضی ٹھیک ہے، میاں بیوی میں ہو جاتی ہے تم کچھ وقت گزرنے دو لیکن اتنا بڑا قدم نہ اٹھاؤ..... تم نے میری کسی بات کی پروا نہیں کی۔ شرمین کی طرح سوچے سمجھے بغیر جودل میں آیا کرتی چلی گئیں۔ اس نے بھی شہباز سے اختلافات کے بعد اپنا اہارن کر دیا تھا۔ divorce تو چلو جو ہوئی تھی ہوئی لیکن اس بچے کا تو کوئی قصور نہیں تھا۔ تم نے بھی یہی کیا۔ یہ جاننے کے باوجود کہ شیر دل مثال کے بغیر نہیں رہ سکتا، وہ اس سے بڑی طرح الجھڑ ہے تم بچی کو لے گئیں اور وہ بھی اس طرح کہ تم نے نہ ہمیں، نہ شیر دل کو اس سے ملنے دیا، شکل تک دیکھنے کے لیے ترسا دیا تم نے۔“ شہر بانو خاموشی سے منہ کے نکلے شکوے سنتی رہی اسے اندازہ تھا کہ یہ ساری گفتگو اور باتیں اسے سننی پڑیں گی۔ بعض دفعہ ہم کی کی ایک بات سننے پر تیار نہیں ہوتے اور پھر ہمیں زندگی بھر اسی بات پر توجہ مرکوز کرتے ہیں کہ ہم اسی شخص کی ہزار باتیں سننے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

”تم نے یہ بھی نہیں سوچا کہ تمہاری اس جذباتیت سے شیر دل کی زندگی کس طرح متاثر ہوگی امریکن ایجنسی کو اس طرح

”تو کیا فرق پڑتا ہے؟ تمہیں کیا لگتا ہے کہ انواہیں صرف جب پہیلی ہیں جب واقعی کچھ ہو رہا ہو؟ ایسا نہیں ہے۔ کوئی بات نہ ہو تب بھی باتیں کی جاسکتی ہیں اور بہت باتیں بتائی جاسکتی ہیں۔ یہ انسانوں کی پسندیدہ activity ہے۔ ویسے بھی جو قوم چٹنی فارغ ہو، اس کے پاس بات کرنے کے لیے اتنا ہی زیادہ فالتو وقت ہوتا ہے جتنے ہمیں پروا کرنے کی زیادہ ضرورت نہیں ہے۔“ غنی نے بے پروائی سے اس کی بات کے جواب میں کہا۔

”تم مجھے سپورٹ کیوں کر رہے ہو؟ اس مسئلے پر؟“ عکس تھوڑا سا مسکرائی۔

”تمہیں، غلط فہمی بالکل نہیں ہونی چاہیے کہ میں تمہیں سپورٹ کر رہا ہوں۔ تم نے کون سا مجھ سے پوچھ کر شادی کا فیصلہ کیا ہے۔ تم تو سب کچھ مجھ سے اس طرح چھپائے ہوئے نہیں جیسے مجھے بھی کچھ پتا ہی نہیں چلے گا لیکن دیکھ لو، میں جانتا ہوں اور بہت دیر سے جانتا ہوں۔“

”تم جانتے ہو، تو اور لوگ بھی جانتے ہوں گے، ہمارے batch mates میں سے؟“ عکس نے اس کی بات غور سے سنتے ہوئے اس سے کہا۔

”یقیناً جانتے ہوں گے تو کیا ہوا؟ تم خائف کیوں ہو اس بات سے؟“ غنی ایک لمحے کے لیے رکا، پھر اس نے کہا۔

”خائف ہونے والی بات ہے، اس لیے خائف ہوں۔“ اس کی بات سن کر عکس نے ایک گہری سانس لی اور کہا۔

”تم سول سروس میں جس سے بھی شادی کرتیں، تمہارے بارے میں کچھ نہ کچھ افواہیں بنی۔ کہیں باہر کرتیں تو شاید بیچ جاتیں۔ اب شیردل کے ساتھ کر رہی ہو تو بھی تھوڑی بہت باتیں تو ضرور ہوں گی۔ ہم فرشتے نہیں ہیں، جن کے بارے میں لوگ بات نہ کریں اور اگر کریں تو ہمیشہ اچھی بات ہی کریں۔ شیردل کی شادی ختم ہونے کی جو بھی وجوہات ہوں لیکن وہ ختم ہوگئی ہے۔ اس لیے تم شہر یا نو اور شیردل کے بریک اپ کو اپنے اعصاب پر سوار کیے بغیر اس رشتے کو شروع کرو۔“ وہ بڑی سنجیدگی سے اسے نادانستی میں بہت ساری ایسی چیزیں سمجھا گیا تھا جو عکس کو کسی دوسرے سے سمجھ میں نہ آتیں۔

”تمہیں شادی کی خبر کس نے دی ہے؟“ عکس نے پوچھا۔

”شیردل نے ایک دو batch mates سے ڈکریا ہے کل۔ مجھے انہی میں سے ایک سے پتا چلا تو میں نے تڑپ کے تمہیں فون کیا۔ آخر تم میرے ساتھ بے وفائی کیسے کر سکتی ہو؟“

”اس طرح کی باتیں کسی دوسرے کے سامنے کی ناں تم نے تو شیردل تک بھی پہنچیں گی۔ اس کے بعد تم خود اندازہ لگا سکتے ہو کہ وہ کیا کرے گا تمہارے ساتھ۔“ وہ اس کے آخری جملے پر ہنس بڑی تھی۔

”میں اپنے جذبات کا اظہار بھی نہیں کر سکتا کیا؟ اور شیردل کی دھمکیاں دینا بند کر دو۔“ غنی نے مصنوعی سنجیدگی کے ساتھ کہا۔

”تم اپنے جذبات کا اظہار اپنی بیوی سے جا کے کیا کرو یا پھر میں خود تانہ کو فون کر کے تمہارے جذبات پہنچاؤں اس تک؟“ عکس نے جوابا کہا۔

”تم اب مجھے میری بیوی سے جوتے پڑوانا چاہتی ہو۔ اسے پہلے ہی تم سے شدید قسم کی insecurity ہے۔“ غنی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اس insecurity کی وجہ تم خود ہو اور دوسرے فہم تو تمہاری بیوی خود مجھ سے کہہ چکی ہے کہ میں بڑی سمجھدار اور خوش قسمت تھی کتنی کی کوشش کے باوجود اس سے شادی نہیں کی۔ کاش وہ بھی ایسی عقل مند کی کا مظاہرہ وقت پر کر دیتی۔“ غنی نے اس کی بات سے ذرہ برابر بھی متاثر نہ ہونے کے بغیر کہا۔

”وہ ہراس لڑکی سے ایسی ہی باتیں کرتی رہتی ہے جس کے بارے میں اسے تھوڑا سا بھی یہ شک ہو کہ میں کبھی اس کو پسند کرتا تھا۔ عورتوں کی عادت ہوتی ہے ایک دوسرے کے سامنے اس طرح کی باتیں کرنے کی۔“

”تانہ کے سامنے تمہاری بوٹی بند ہو جاتی ہے یہ مثالیں اس کے سامنے بھی نہیں سنیں تمہارے منہ سے۔“ عکس نے اسے tease کیا تھا۔

”میں بے وقوف نہیں ہوں صرف شوہر ہوں۔“ غنی نے مسکراتے ہوئے کہا ساتھ ہی اس سے پوچھا۔ ”اس کی فیملی جہیں قبول کر لے گی؟“

”تم سے کس نے کہا؟“ وہ جواب دینے سے ہچکچائی تھی۔ بی اے اس کی ٹیبل پر اس کے دستخط لینے کے لیے کچھ کاغذ رکھ رہا تھا۔ اس نے فون کان سے لگاتے ہوئے ہاتھ کے اشارے سے اسے جانے کے لیے کہا۔ اس وقت جبک صبح کے ساتھ معاملے کو نپٹانے میں سارا دن کھپانے کے بعد غنی نے اس سوال نے اس کے جیسے چودہ طبق روشن کر دیے تھے۔ وہ خبر اگر اسلام آباد میں بیٹھے غنی تک پہنچ گئی تھی تو وہ خبر اس سے کہیں زیادہ برق رفتاری سے سفر کر رہی تھی جتنا اس نے سوچا تھا۔

”یقیناً تم کر رہی ہو؟“ غنی نے اس کے سوال کے جواب میں کہا۔

”ہاں۔“ اس بار عکس نے بالآخر تمہید اور کسی جھجک کے بغیر کہا۔ غنی کے سامنے تمہیدوں کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

”اچھا فیصلہ ہے۔“ اس کے اگلے جملے نے عکس کو حیران کر دیا تھا۔ وہ کم از کم غنی سے اس جملے کی توقع نہیں کر سکتی تھی۔

”اوہ۔۔۔۔۔ تمہیں واقعی لگتا ہے اچھا فیصلہ ہے یا تم صرف طنز کر رہے ہو؟“

”طنز کیوں کروں گا میں۔۔۔۔۔ تمہاری زندگی ہے ہمیں حق ہے اسے بارے میں بہتر فیصلہ کرنے کا۔۔۔۔۔ اور شیردل مجھے برا لگتا ہے لیکن تمہارے لیے اچھا ہے وہ۔“ غنی کا لہجہ بے تاثر تھا، وہ کوشش کے باوجود کسی قسم کا طنز یا گلہ کہیں ڈھونڈ نہ سکی تھی۔

”میں ویسے بھی بہت عرصے سے اس خبر کی توقع کر رہا تھا تم سے لیکن میں اگر حیران تھا تو صرف اس بات پر کہ شہر بانو کے ہوتے ہوئے۔۔۔۔۔ تم شیردل سے شادی کرنے پر تیار ہو گئی لیکن۔۔۔۔۔“ غنی نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا عکس نے بے اختیار گہری سانس لی۔ بالآخر وہ کاٹا کھٹے کاٹا جواب چھپا ہوا تھا۔

”تم کیوں اس خبر کی توقع کر رہے تھے؟“ اس نے بڑی سنجیدگی سے غنی سے پوچھا۔

”مجھے جواد نے تم دونوں کے بارے میں ایسی کچھ باتیں کہی تھیں جس کے بعد مجھے توقع تھی تمہاری طرف سے ایسی کسی خبر کے آنے کی۔ میں نے جواد سے تب صرف اس لیے بات کی تھی کہ اگر ممکن ہو سکے تو میں تم دونوں کے درمیان Patchup کر اسوں۔ تمہیں تو پتا ہے ناں، اس کی فیملی کو ہم اچھی طرح جانتے ہیں۔ لیکن جواد نے جواباً کچھ بتایا اس کے بعد مجھے لگا کہ اس کے ساتھ منگنی ختم کرنا تمہاری خواہش تھی، اس کی نہیں۔“ عکس خاموشی سے اس کی بات سنتی رہی وہ اگرچہ کچھ تلخ باتیں کہہ رہا تھا لیکن اس کا انداز دوستانہ تھا۔ تلخی نام کی کوئی شے اس میں نہیں تھی۔ عکس نے اس کی بات ختم ہونے پر بڑی متانت سے اس سے کہا۔

”میں جواد کی کسی بات پر Comment نہیں کروں گی کیونکہ جواد کی بات ہے تبصرہ کرنا بیکار ہے۔ لیکن میں اس بات پر ضرور حیران ہوں کہ تم دوست ہوتے ہوئے بھی جواد کی یہ ساری باتیں سن کے مجھ سے بات کرنے کے بجائے خاموش رہے۔ کم از کم تمہیں اس وقت مجھ سے پوچھنا تو چاہیے تھا کہ میں نے تمہارے بارے میں یہ سنا ہے۔ بیٹھے بٹھائے خود سے کچھ بھی assume کر لینا کم از کم مجھ سے اس چیز کی توقع نہیں تھی۔“ غنی نے بھی اس کی بات اسی خاموشی سے سنی تھی جس طرح وہ اس کی بات سنتی رہی تھی۔

”تمہارا ذاتی مسئلہ تھا اور میں اگر حیران تھا تو صرف اس بات پر کہ بیٹھے بٹھائے تمہیں شیردل سے شادی کرنے کا شوق کیسے پیدا ہو گیا۔ اگر ایسا کچھ تھا تو تمہیں بہت پہلے اس سے شادی کر لینی چاہیے تھی جب ابھی وہ غیر شادی شدہ تھا۔“ جب عکس نے اپنی بات ختم کر لی تو غنی نے کہا۔

”اس کی شادی میری وجہ سے ختم نہیں ہوئی تھی۔“ عکس نے بڑی سنجیدگی سے اس سے کہا۔ ”کم از کم میرے اور شیردل کے درمیان ایسا کوئی تعلق نہیں تھا جسے بنایا بنا کر اس کی بیوی اس سے علیحدہ ہوتی۔ لیکن میں یہ مانتی ہوں کہ شہر بانو میرے حوالے سے کچھ خدشات کا شکار ہوئی، یا شاید مجھے یہ کہنا چاہیے کہ وہ کچھ غلط فیصلوں کا شکار ہوئی۔۔۔۔۔ میں directly نہ سہی لیکن Indirectly ان دونوں کی شادی ختم ہونے کا باعث بن گئی اور مجھے اس کا افسوس بھی ہے۔“ غنی نے اس کی بات کاٹی۔

”یار! چھوڑو اب اس سارے افسوس وغیرہ کو، ان دونوں کی طلاق ہوگئی، بات ختم ہوگئی۔“

”بات ختم نہیں ہوئی، ختم ہو بھی جائے، تو بھی اس کی بازگشت بہت دیر تک گونجتی رہتی ہے۔ جس طرح تم نے منہ اٹھا کے کہہ دیا کہ تم شیردل اور میرے بارے میں بہت دیر سے جانتے تھے اور سوچ رہے تھے کہ ہم دونوں عترت شادی کر لیں گے۔ اس طرح اور بھی ڈھیروں لوگ یہاں اسی طرح کی باتیں سوچ رہے ہوں گے۔“ عکس نے اس سے کہا۔

تم شیردل سے چاہتے ہو۔“ وہ کہتی گئی تھی۔ ”تم دونوں کے خاندان کے درمیان ماضی میں کسے اختلافات رہے ہیں اور تم شیردل ایک دوسرے کو کیوں پسند نہیں کرتے مجھے اس سب کی تاریخ جاننے میں کوئی دھچکی نہیں ہے اور نہ ہی میں چاہتا چاہتی ہوں۔“ اس نے بات ختم کی۔

”تم سیریس ہو گئیں میں مذاق کر رہا تھا۔“ غنی نے یک دم اس سے کہا۔

”میں چاہتی ہوں اب تم اپنے تمام jokes میں سے شیردل کو نکال دو۔۔۔۔۔۔ دنیا میں اور بہت سی چیزیں اور لوگ اس سے زیادہ funny ہیں تم چاہو تو میں کچھ لوگوں کے نام نہیں بتا سکتی ہوں۔“ وہ بہت سہولت سے گفتگو کو اس موضوع سے ہٹا کر غنی کی جس پر وہ بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔ غنی نے بھی موضوع بدلنے دیا تھا۔ وہ شیردل کا خیر خواہ کر کے بھی نہیں ہوسکتا تھا لیکن وہ عکس کو بھی نقصان نہیں پہنچا سکتا تھا اور یہ بات عکس جانتی تھی عجیب بات تھی، لیکن زندگی میں اس کی ساری دوستیاں ہمیشہ لڑکوں سے ہی ہوتی رہی تھیں۔۔۔۔۔۔ کم دوستیاں لیکن بہت مضبوط اور قابلِ بھروسہ تعلقات۔۔۔۔۔۔ اسکول میں پھر بھی کسی حد تک اس کی کچھ چھوٹی موٹی دوستیاں لڑکیوں سے رہی تھیں لیکن میڈیکل کالج، اکیڈمی اور پھر چاب میں آنے کے بعد اس کے دوستوں کا سب سے قریبی سرکل مردوں پر مشتمل رہا تھا۔ کئی بار اس نے بیٹھ کر اس چیز analyse بھی کیا تھا اور ہر بار اسے اس کی ایک ہی وجہ سمجھ آتی تھی۔۔۔۔۔۔ خیر دین۔۔۔۔۔۔ اس کی زندگی پر حلیہ کے بجائے خیر دین کا اثر رہا تھا۔ اس کا پورا انجین ایک مرد کے گرد گھومتا رہا تھا۔ جو اس کے ساتھ صرف ایک خونی رشتہ نہیں رکھتا بلکہ اس کا بہترین دوست اور استاد بھی تھا اور جس نے اسے زندگی میں کبھی انسانوں کو صنف کی بنیاد پر تعصب کا شکار ہونے نہیں دیا تھا جس نے اچھائی اور برائی کے بارے میں بات کرتے وقت اس کے سامنے ہمیشہ انسانوں کی اچھائی اور برائی کی بات کی تھی مردوں یا عورتوں کی نہیں، اپنی زندگی میں مردوں سے ہونے والے تمام تجربات کے باوجود اگر عکس مردوں کی بات کے لیے کوئی رول ماڈل نہ رکھتے تو مرد ہی رہے تھے۔۔۔۔۔۔ خیر دین کی شکل میں، میڈیکل کالج کے پروفیسر کی شکل میں۔۔۔۔۔۔ اکیڈمی میں انسٹرکٹر اور پروفیسر لائف میں سینئر آفیسر کی شکل میں۔۔۔۔۔۔ شیردل اور غنی کی شکل میں، چند عزیز ترین دوستوں کی شکل میں جن کے مشوروں اور رائے کو وہ ہمیشہ بہت اہمیت دیتی رہی تھی لیکن اپنی زندگی میں مردوں کی اتنی مثالیاں اہمیت اور اثر ہونے کے باوجود ایک عورت کے طور پر اس نے نہ اپنی شخصیت پر صنف مخالف کی کوئی چھاپ لی تھی نہ وہ صنف نازک ہونے کی وجہ سے ذہنی طور پر کسی عدم تحفظ اور کمپلیکس کا شکار تھی۔ وہ ایک عورت اور ایک انسان کے طور پر اپنی انفرادیت کو برقرار رکھے ہوئے تھی۔۔۔۔۔۔ اور وہ کتنا مشکل کام کر رہی تھی خود اسے بھی سمجھی اس کا اندازہ نہیں ہوا تھا۔

☆☆☆

کسی کی زندگی سے خود نکل جانا اور بات ہے لیکن اپنی جگہ کو بڑی آسانی سے پرہوتے دیکھنا اور بات۔۔۔۔۔۔ کسی سے نفرت ہوتو بھی تکلیف ہوتی ہے اور وہ شخص جو اپنی زندگی میں آپ کو replace کر رہا ہو وہ آپ کی پہلی اور آخری محبت ہوتو پھر صرف تکلیف نہیں ہوتی۔۔۔۔۔۔ انسان سولی پر لٹک جاتا ہے، نہ بھول سکتا ہے نہ نظر انداز کر سکتا ہے۔۔۔۔۔۔ صبر کر لیتا تو ناممکنات میں سے ہوتا ہے۔

شیر بانو بھی عکس اور شیردل کی شادی کی خبر سن کر کچھ ایسی ہی تکلیف سے گزر رہی تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ عکس کی جگہ شیر دل کی زندگی میں کوئی اور عورت آتی تو اس کا رد عمل کیسا ہوتا۔۔۔۔۔۔ تکلیف تو اسے یقیناً تب بھی ہوتی لیکن یہ غصہ اور غم جو وہ اپنی چیز اس شخص کی ہوتی دیکھ کر محسوس کر رہی تھی جس سے اس نے زندگی میں سب سے زیادہ نفرت کی تھی۔ یہ غصہ شاید وہ تب محسوس نہ کرتی کہ وہ شیردل کو چھوڑتے ہوئے اسے option دے آئی تھی کہ وہ عکس سے شادی کر لے کیونکہ وہ اس سے نہیں عکس ہی سے محبت کرتا تھا لیکن اب جب وہ ہونے جارہا تھا تو وہ عجیب صدمے اور بے بسی کی کیفیت سے دوچار تھی۔۔۔۔۔۔ کہیں نہ کہیں اسے امید تھی کہ اس ایڈپشن پر اس کی طلاق ہونے کے بعد شیردل کسی سے بھی شادی کرنا لیکن عکس سے شادی نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن نہ کہیں اسے یقین تھا منہ اور بہت ترس بھی عکس کو اپنی بہو بنانے پر رضامند نہیں ہو سکتے تھے خاص طور پر اس بیک گراؤنڈ اور اس ٹریجڈی کے بعد جس کا ایک کردار اگر عکس تھی تو دوسرا کردار شہباز حسین تھا۔ اس کا باپ۔۔۔۔۔۔ منہ کا اکلوتا بھائی۔۔۔۔۔۔ اس خاندان کا چھوڑ آنے کے باوجود وہ توقع کر رہی تھی کہ وہ اپنی اور غیروں میں فرق رکھیں گے۔۔۔۔۔۔ جنہیں وہ ناپسند کرتی تھی وہ سب بھی ان کے لیے اتنی ہی ناپسندیدگی اور بے مہری رکھیں گے۔۔۔۔۔۔ اور اب جب سب کچھ اس کی توقعات اور

”اس کی فیملی ہی نے initiate کیا ہے یہ جو کچھ بھی ہوا ہے۔“ عکس بھی سنجیدہ ہو گئی۔

”یہ سب کچھ ویسے بہت ناقابلِ یقین ہے۔“ غنی نے کہا۔

”کیوں۔۔۔۔۔۔؟“ وہ غنی کی بات کے جواب میں کہنا چاہتی تھی کہ تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن وہ جواب سوال کر بیٹھی تھی۔

”are you sure“ کہ اس شادی کے پیچھے کوئی اور مقصد نہیں ہے؟“ غنی اگر ایسا سوچ رہا تھا تو اتنا غلط نہیں

سوچ رہا تھا۔ جو خاندان اپنی ناک پر کبھی بھی نہیں بیٹھنے دیتا ہو وہ ایک دم آنکھوں دیکھی کھٹے پر تیار ہو جائے تو یہ بات کسی کو بھی شک و شبہ اور الجھنے میں ڈال سکتی ہے۔

”قمت میں ہے اس لیے ہو رہا ہے یہ سب کچھ۔۔۔۔۔۔ ان کی نیت اور ارادے پر تو مجھے کوئی شک نہیں۔“ عکس نے اپنی ہونے والی سسرال کی حمایت کی۔

”شیردل کا بہت بڑا ہاتھ ہوگا انہیں قائل کرنے میں۔“ غنی نے یک دم کہا۔

”ہاں یقیناً شیردل نے ہی قائل کیا ہوگا انہیں۔“ وہ چاہتے ہوئے بھی نہیں کہہ سکی کہ یہ محبت سے زیادہ ضرورت تھی جو اس رشتے اور تعلق کے پیچھے محرکات میں سے ایک تھی۔ اسے شیردل کی اپنے لیے ٹینگو پر بھی کوئی شبہ نہیں رہا تھا لیکن اسے شیر دل کے ماں، باپ کے حوالے سے کوئی خوش بھی نہیں تھی۔ وہ جانتی تھی شیردل اگر اس طرح پیار نہ بڑاتا تو اس کے والدین بھی اس رشتے پر رضامند نہیں ہوتے۔ غنی سے اس کی بہت دوستی تھی لیکن وہ غنی سے یہ سب شہر نہیں کر سکتی تھی۔ کچھ باتیں انسان اپنے آپ سے بھی نہیں کہہ پاتا خود بھی جھٹلاتا رہتا ہے وہ بھی ایسی ہی بے قدر کی ایک بات تھی جو وہ کسی دوسرے سے نہیں کہنا چاہتی تھی خاص طور پر اس خاندان کے ایک شخص سے جو شیردل اور اس کے خاندان کا rival تھا۔

”شیردل سے شادی کے ساتھ ہی یقیناً تمہاری اور میری دوستی کا خاتمہ بھی ہو جائے گا۔“ غنی نے بالآخر اس خدشے کا اظہار کیا جسے ڈسکس کرنے کے لیے اس نے اسے فون کیا تھا۔

”کیوں۔۔۔۔۔۔ بیٹھے بیٹھے یہ دوستی کا کیا مسئلہ ہو گیا تمہیں؟“ عکس ہنس دی تھی اسے اچانک احساس ہوا غنی کے خدشات کچھ ایسے غلط بھی نہیں تھے۔

”مجھے بیٹھے بیٹھے کوئی مسئلہ نہیں ہوا۔۔۔۔۔۔ تمہیں ہونے والا ہے بلکہ تمہیں نہیں، تمہارے ہونے والے شوہر کو ہونے والا ہے۔“ غنی نے بہت جتنا والے انداز میں کہا۔

”شیردل پیچور ہے۔“ عکس نے بہت کھرا بات کی تھی۔ غنی جواباً ہتھیہ مار کر ہنسا۔

”تم ایک انتہائی خبیث آدمی ہو۔“ وہ بھی کچھ شرمندہ انداز میں ہنس دی۔

”شیردل سے بہت کم،“ غنی نے ترکی بہ ترکی کہا۔

”تم جسے خبیث کہہ رہے ہو وہ میرا ہونے والا شوہر ہے۔“ وہ خفا ہوئی تھی۔

”اور میں تمہارے ہونے والے شوہر کو تب سے جانتا ہوں جب اسے جوتے کے laces تک ٹھیک سے باندھنے نہیں آتے تھے خیر وہ تو شاید اب بھی ٹھیک سے نہ باندھ سکے اگر laces والے شوہر پہننے پڑ جائیں تو۔۔۔۔۔۔“ غنی نے بے حد اطمینان سے کہا تھا۔

”تم اگر اس طرح کی باتیں کیا کرو گے اب میرے ساتھ تو تمہاری اور میری دوستی واقعی نہیں رہے گی۔“ اس بار عکس اس کے مذاق سے محظوظ نہیں ہوئی تھی۔

”مجھے اسی بات کا خدشہ ہے کہ اب تم شاہ سے زیادہ شاہ کی وفادار بننے کی کوشش نہ کرنے لگو۔“ غنی نے اسی انداز میں کہا تھا۔

”غنی تم میرے اچھے دوست ہو اور میں کبھی تم جیسے دوست کو کھونا نہیں چاہوں گی، تمہیں خائف ہونے یا خدشات کا شکار ہونے کی بھی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ شیردل سے شادی ہو جانے کا مطلب ہے کہ وہ مجھے ہر اس شخص سے بات کرنے سے منع کر دے گا جسے وہ پسند نہیں کرتا۔“ اس نے بہت نرمی اور متانت سے غنی کی بات کے جواب میں اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ ”لیکن جہاں تک وفاداری کا سوال ہے تو ظاہر ہے شوہر کے طور پر اس کے ساتھ میری وفاداری کی نوعیت کسی دوست کے ساتھ وفاداری کی نوعیت سے مختلف ہو جائے گی اور میں چاہتی ہوں تم بھی اس معاملے پر اپنی ہی سمجھداری کا مظاہرہ کرو جتنا

اندازوں کے برعکس ہوا تھا تو وہ سکتے سے زیادہ صدمے میں بیٹھی تھی۔
غلط تو قعات، غلط اندازے، غلط فیصلے اور جلد بازی ہی شہر بانو کی زندگی کو define کرتے تھے۔ ضرورت سے زیادہ حساسیت اور اتنا پرستی وہ دوسرے مسائل تھے جن سے وہ دوچار تھی اور وہ ان میں سے کسی ایک خامی کو بدلنے کی طاقت نہیں رکھتی تھی کیونکہ وہ اپنی شخصیت میں ان خامیوں کی بھی نشاندہی کر ہی نہیں پاتی تھی۔ سب سے آسان کام وہ تھا جو وہ بھی بے وقوف کی طرح کرتی تھی۔ اپنی زندگی میں پیدا ہونے والے ہر مسئلے کی ذمہ داری دوسروں کے سرھانہ دینا۔ خود ہر ترس کھانا اور کھاتے ہی چلے جانا۔ اور وہ ہمیشہ سے ایسی ہی تھی۔ کہانی کی پرنسپل ہیرون۔ بے پناہ حسین، نازک خاندانی، کمزور، بات بات پر گھبرا کر رو دینے والی، مصیبتوں میں گھری ہوئی۔ اور ہمیشہ کسی ایسے شہزادے کی شہر جو اس کی زندگی کے ہر مسئلے اور مصیبت سے بچا کر اپنے ساتھ اپنے محل میں لے جاتا جہاں وہ دونوں ہمیشہ بکسی خوشی زندگی گزارتے۔ اور پڑھنے والے ایک اطمینان بھری سانس اور مسکراہٹ کے ساتھ کہانی کا آخری صفحہ پلٹ کر کتاب بند کرتے۔ اور ناظرین اپنی آنکھوں میں خوشی کے آنسو لیے تالیاں پیٹ پیٹ کر اور اپنی سیٹوں سے کھڑے ہو کر سینما سکرین پر ابھرنے والے اس خوش و خرم جوڑے کے آخری shot پر داد دیتے جس میں وہ اپنے محل کی بالکونی سے ایک دوسرے کی بانہوں میں بالکونی کے نیچے موجود لوگوں کی طرف ہاتھ ہلاتے۔

زندگی کا مسئلہ ہوتا ہے کہ یہ ہمیشہ کہانی کے آخری صفحے سے شروع ہوتی ہے اس میں بعض دفعہ شہزادے کی آمد بھی ہیرون کا مسئلہ حل نہیں کر سکتی۔ سادہ سادگی یا برعکس میں پہنچ جانے کے بعد بھی ہیرون اپنے لیے مصیبت کا انبار کھڑا کر لیتی ہے۔ شہر بانو نے بھی یہی کیا تھا اور اب وہ سچ بتا رہی تھی لیکن شہزادے کی دوبارہ آمد نہیں ہوتی نظر نہیں آ رہی تھی۔
”تو تم اب کیا کرنا چاہتی ہو؟“ شرمین نے یہ سب کچھ جاننے کے بعد اس سے پوچھا تھا۔ شہر بانو کو کم از کم ماں کو اپنی mental anguish (ذہنی اذیت) کے بارے میں بتانے کے لیے کچھ بھی کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کا چہرہ اور پورا وجود بے ہمتا رہا تھا۔

”میں شیردل سے پھر بھی رابطہ کروں گی شادی کے لیے نہیں۔۔۔۔۔ لیکن میں چاہتی ہوں مثال اس سے ملتی رہے۔“ زندگی میں شاید پہلی بار اس نے کوئی صحیح فیصلہ کیا تھا اور شرمین نے اسے ٹوکا نہیں تھا اس نے بس ایک سوال کیا تھا۔
”مثال سے کیسے ملے گا وہ؟ وہ یہاں آئیں سکتا۔۔۔۔۔ تو کیا تم وہاں جاؤ گی؟ اور اگر جاؤ گی تو پھر داؤد اعتراض کر سکتا ہے۔“

☆ ☆ ☆
”am so sorry“ امیرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ اس طرح کی حرکت کر سکتا ہے۔ میرا مطلب ہے میں بے سمجھ نہیں پار ہا کہ اتنی جرات کیسے آئی اس میں، سچ سے اسی ایک بات کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔“ ایک شیردل بہت معذرت خواہانہ انداز میں اس سے کہہ رہا تھا۔ وہ محل سے اس کی بات سنتی رہی وہ اس وقت ڈنکر کرنے کے بعد اپنے بیڈروم میں آئی تھی جب شیردل نے اسے کال کیا تھا۔ اس نے آفس میں بھی کئی بار اسے فون کیا تھا لیکن عکس اس قدر مصروف اور ابھی ہوئی تھی کہ اس نے شیردل کی کال نہیں لی۔ شیردل کو کال نہ لینے کی وجہ اس کا وہ مشورہ تھا جو عکس کو پہنچا کر گیا تھا۔ وہ اس لیے بھی کچھ panicked پریشان تھا کہ اس نے اسے یہ نہیں بتایا تھا کہ کوڈن کے بعد جب تک سچ کا بتانا تھا۔ اس کے بہت دفعہ کے text کے بعد بھی عکس نے اسے جواب نہیں دیا تھا اور اس کی خاموشی نے شیردل کو کچھ پریشان کر دیا تھا۔ ڈی سی آفس کی چھت سے کوڈر کسی کامر جانا اس صورت میں اور بھی سنگین معاملہ تھا اگر یہ رد عمل ڈی سی کے کوڈ جاؤ۔۔۔۔۔ کے اعلان کے بعد ہوا تھا۔ اور خاص طور پر ایک خاتون آفسر کی طرف۔۔۔۔۔ عکس کے جواب نہ دینے کے باوجود اس نے اپنے اسٹاف کے ذریعے یہ معلوم کر لیا تھا کہ جب تک سچ خود کشی کی اس کوشش کے باوجود زندہ سلامت تھا اور شیردل نے اس خبر کے ملنے کے بعد جیسے سکون کی سانس لی تھی لیکن اس کے باوجود عکس سے بات کر کے معذرت کرنا ضروری ہو گیا تھا۔
”تو کیا نتیجہ اخذ کیا تم نے اتنی لمبی سوچ بچار کے بعد؟“ اس کا لب و لہجہ طنزیہ نہیں تھا لیکن شیردل جانتا تھا کہ وہ طنزیہ تھا۔

”میرا خیال ہے وہ کسی عورت کی طرف سے کہے ہوئے اس چیلنج کو برداشت نہیں کر سکا اگر تمہاری جگہ کوئی مرد اسے یہ

کہتا تو وہ کبھی نہ کہتا لیکن۔۔۔۔۔ تم نے کہا تو اس کے لیے یہ عزت کا مسئلہ بن گیا۔“ شیردل نے سنجیدہ لہجے میں مذاق کیا تھا۔
”مجھے تم سے اسی طرح کے نتیجے کی امید تھی۔“ عکس نے اسی محل سے کہا۔
”یاد مذاق کر رہا ہوں میں۔“ شیردل فوراً سنبھلا تھا اسے احساس ہوا شاید یہ کوئی زیادہ مناسب موقع نہیں تھا ایسی بات کے کہنے کا۔
”وے for you kind information میں نے تمہارے مشورے پر عمل نہیں کیا تھا۔“
”اوہ اچھا تو میں خواہ مخواہ شرمندہ ہو رہا ہوں۔“ شیردل ایک دم مطمئن ہوا تھا۔ ”لیکن پھر کیوں کوڈا وہ؟“
”کیونکہ کوڈن نے ہی آیا تھا۔۔۔۔۔ سچ اس لیے کیا کیونکہ مجھے فائر بریگیڈ والوں نے net لگایا ہوا تھا۔ they scooped him in time“ ”لیکن میں نے بہر حال اسے جاب پر بحال کر دیا ہے۔“
”ویری گڈ۔۔۔۔۔ اب تم دیکھنا جس کے خلاف بھی کوئی disciplinary action (تادیبی کارروائی) ہوئی وہ سیدھا تمہارے آفس کی چھت پر اسی کام کے لیے پہنچ جائے گا۔“ شیردل نے ناپسندیدگی سے کہا۔
”اب تم کہہ دو poor woman, poor management“ عکس نے بے ساختہ کہا۔ وہ جوابا ہنس دیا۔

”تم ہر بات کو اب زیادہ ہی دل پر لینے لگی ہو۔“ وہ اب ہلکی ہلکی گفتگو کرنے لگا تھا۔
”ہاں دماغ نے کام کرنا چھوڑا ہوا ہے میرے آج کل۔۔۔۔۔ اس لیے دل پر بوجھ ڈال دیا ہے سارا۔“ اس نے جوابا کہا۔
”وے بھی تم ہونا دماغ استعمال کرنے کے لیے۔۔۔۔۔ آج کل بہت سارے نئے نئے کاموں میں دماغ لگا رکھا ہے تم نے۔“ عکس نے دوسرے جملے میں اسے چوٹ کی تھی۔ شیردل کو ریفرنس بوجھنے میں سیکنڈ لگے۔
”بعض نئے کام“ بہت پہلے ہو جاتا تو نہ تمہارا دماغ کام کرنا چھوڑتا نہ میرا دل۔“
”ساری عمر تم مجھے اسی ایک بات کے طعنے دو گے۔“ وہ ہنس پڑی تھی۔
”میں اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتا۔“

”نانا کے پاس آنے سے پہلے تمہیں مجھ سے بات کرنی چاہی تھی۔ مجھ سے پوچھنا چاہیے تھا۔۔۔۔۔ تم نے میرے لیے بہت مشکل صورت حال پیدا کر دی ہے۔“ شیردل اس کی بات کے جواب میں کچھ دیر خاموش رہا۔
”اب کوئی فائدہ ہے ان باتوں کا۔۔۔۔۔ دوبارہ زیرو سے بات شروع کریں کیا؟“ پھر ایک گہری سانس لے کر شیردل نے کہا۔
”ہاں، اب کوئی فائدہ نہیں ہے ان باتوں کا نانا نے ہاں کی ہے میں ان کی بات بھانڈوں گی۔“ اس نے جوابا کہا۔
”اوہ۔۔۔۔۔ صرف نانا کی بات بھانڈو گی۔۔۔۔۔ ورنہ تو تمہیں مجھ میں کوئی دھچکی نہیں ہے۔۔۔۔۔ نہ پہلے تھی۔ نہ اب ہے۔ نہ آئندہ ہوگی۔“ شیردل کے لہجے میں شکوہ نہیں تھا جتنی بھی اور عکس حیران رہ گئی تھی، وہ چوٹی سی بات پر سچ ہو جانے کا عادی نہیں تھا یہ ایک نئی عادت تھی اس کی یا حالات کا نتیجہ۔ چند لمحوں کے لیے عکس کو واقعی کچھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہے۔
”تم اظہار محبت چاہتے ہو مجھ سے؟“ اس نے چند لمحوں کے بعد۔۔۔۔۔ مدھم آواز میں کہا۔
”تمہیں اعتراض ہے کیا؟“ اس نے جوابا کہا۔ عکس نے جواب نہیں دیا۔ کہنے کو بہت الفاظ تھے عکس کے پاس پرکھ دینے کی ہمت نہیں تھی۔
”تم بہت بڑی قربانی دے رہی ہو میرے لیے۔“ شیردل نے چند لمحوں بعد کہنا شروع کیا۔ ”زندگی میں ایک بہت مشکل سوڈ پر میرا سامنی بننے کا فیصلہ کیا ہے، وہ بھی میرے بارے میں سب کچھ جاننے کے باوجود۔۔۔۔۔ ایک بہتر آپشن ہو چھوڑ کر تم میری طرف آ رہی ہو اور میں اس کی بہت قدر کرتا ہوں۔“ وہ خاموشی سے اس کی بات سنتی رہی، اس کے لہجے میں ٹھکن تھی یا شاید ادا تھی اور عکس کو حیرت نہیں ہوئی تھی۔ زندگی کا سامنی بار چھنا اور اس طرح چھنا کسی کے لیے بھی بہت خوشگوار فیصلہ نہیں ہوتا۔

اس کائناتِ محبت میں ہم مثلِ شمس و قمر کے ہیں

40 ماہنامہ پاکیزہ - دسمبر 2012ء

ماہنامہ پاکیزہ — دسمبر 2012ء 41

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لیے اس کا چہرہ دیکھ کر رہ گئیں۔ شہر بانو نے کیا شیردل سے مصالحت کے حوالے سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ انہوں نے بے حد الجھ کر سوچا۔

میز پر چند لمبے خاموشی رہی پھر منزہ نے بے حد سنبھل کر اس سے کہا۔

”اب وہ واپس آ رہی ہے تو ہو سکتا ہے تمہارا اور اس کا patch up ہو جائے بلکہ میں چاہتی ہوں ایسا ہو ہی جائے تم لوگوں کے ساتھ ساتھ مثال کی زندگی پر بھی اثر پڑ رہا ہے۔“

”آپ نے اسے میری اور عکس کی شادی کے بارے میں بتایا؟“ شیردل نے ان کی بات کے جواب میں ان سے پوچھا تھا۔

”نہیں، میں نے نہیں بتایا..... لیکن مجھے لگا اس کی ضرورت نہیں تھی اگر تمہاری اور شہر بانو کی مصالحت ہو جائے تو.....“ شیردل نے ماں کی بات بے حد درجہ تنگی سے کاٹی۔

”میری اور شہر بانو کی divorce ہو چکی ہے اور میری اور عکس کی شادی بھی طے ہو چکی ہے۔ آپ کو کون سی مصالحت کی بات کر رہی ہیں؟“ منزہ نے بختیار کو دیکھا ان کے ماتھے پر بھی ویسے ہی ہل تھے جیسے شیردل کے ماتھے پر تھے۔

”شہر بانو بہت شرمندہ ہے، اس نے مجھ سے معافی مانگی ہے۔ وہ سب کچھ بھول کر واپس آنا چاہتی ہے۔ تمہارے ساتھ رہنا چاہتی ہے..... تم بھی جانتے ہو، تم دونوں اگر چاہو تو صرف نکاح کر کے دوبارہ اپنا گھر آباد کر سکتے ہو۔“ منزہ نے بالآخر ہمت کر کے وہ بات کہہ دی جو وہ کہنا چاہتی تھیں۔ شیردل ساکت بیٹھا ماں کو دیکتا رہا..... بے حس و حرکت پلکیں جھپکائے بغیر اس کے دماغ نے جیسے کچھ دیر کے لیے کام ہی کرنا چھوڑ دیا تھا۔

”اور میں ایسا نہیں چاہتا، آپ کو لگتا ہے کہ میں ایک ایسی عورت کو دوبارہ اپنے گھر میں لا کر آپا دو کروں گا جس نے گھر چھوڑے ہوئے شہر میں میرے اشتہار لگا کر مجھے نہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا۔“ اس نے بے حد تنگی سے ماں سے کہا تھا۔

”وہ بہت شرمندہ ہے بیٹا۔“ اس نے ماں کو بات مکمل کرنے نہیں دی۔

”اس کو میری اور عکس کی شادی کے بارے میں پتا چل گیا ہوگا اور اس نے سوچا ہوگا یہ بہت پر فیکٹ موقع ہے ایک بار پھر مجھے ایہوشی بلیک میل کرنے کا..... اولاد کا ہتھیار استعمال کر کے۔“

”تم غلط سمجھ رہے ہو شیردل اسے تو.....“ منزہ نے شہر بانو کی صفائی دینے کی کوشش کی تھی۔ شیردل نے خشکی سے ایک بار پھر ان کی بات کاٹی۔

”مئی میں عکس کے ساتھ شادی کرنے والا ہوں آپ لوگ اس کی فیملی کے ساتھ تاریخ طے کر کے آئے ہیں اور میں اپنے وعدے کو dishonour بھی نہیں کر سکتا۔“ اس نے دو ٹوک انداز میں ماں سے کہا۔

”تم مثال کا سوچو.....“ شیردل نے ایک بار پھر بہت تندہ لہجے میں ماں کی بات کاٹی۔

”مئی وہ میری اولاد ہے اور آپ اسے اولاد رہنے دیں، مجھے بلیک میل کرنے کا ہتھیار مت بنائیں، شہر بانو اور میری شادی ختم ہو چکی ہے وہ چھوڑا اب دوبارہ مجھے نہیں کھل سکتا۔“ وہ کہتا ہوا ہاں سے اٹھ کر چلا گیا۔

”آپ ہی کچھ سمجھاتے اسے۔“ منزہ نے اس کے جانے کے بعد قدرے بے بسی سے بختیار سے کہا۔

”سمجھانے کی ضرورت اسے نہیں تھیں ہے..... تم نے اور تمہاری فیملی کی عورتوں نے شادی کو کیا سمجھ رکھا ہے.....

مذاق.....؟“ بختیار نے بہت سخت الفاظ میں انہیں سرزنش کی تھی۔ ”مجھ ماہ جس طرح پوری فیملی شہر بانو کے پیچھے خوار ہوئی رہی ہے وہ تمہیں یاد نہیں ہے؟ اور اب اگر وہ دوبارہ اپنا گھر بنانے کی کوشش کر رہا ہے تو تمہیں ایک بار پھر اپنی بیٹی یاد آگئی ہے اور تم نے یہ سوچا ہے کہ ہم لوگ عکس کی فیملی سے کیا کہیں گے؟ کیا apology (معذرت) دے کر رشتہ ختم کریں گے؟“ بختیار، شیردل ہی کی طرح برہم تھے۔

”میں عکس کے نانا سے پہلے ہی بات کر آئی ہوں۔“ منزہ نے یک دم کہا۔ ”شاید وہ خود ہی رشتہ ختم کر دیں..... مجھے لگتا

ہے۔“ بختیار نے بے یقینی سے اپنی بیوی کا چہرہ دیکھا۔ وہ منزہ بختیار کا چہرہ نہیں تھا..... وہ خود غرضی اور طبقائی تعسیم کو پتھر کی لکیر

ماننے والے ایک موقع پرست کا چہرہ تھا۔



”ہانا آپ مجھ سے کچھ چھپا رہے ہیں؟“ عکس نے خیر دین سے پوچھا۔

”نہیں۔“ خیر دین نے نظریں ملانے بغیر انکار کیا۔

”شیر دل یہاں آتا ہے آپ مجھے نہیں بتاتے، اس کی کمی آتی ہیں آپ مجھے نہیں بتاتے..... میں شیر دل سے پوچھتی ہوں وہ کچھ نہیں بتاتا..... ان بے مقصد ملاقاتوں کی کوئی وجہ نہیں ہے؟“ عکس کو خیر دین کی بات پر یقین نہیں آیا تھا۔ اسے پچھلے دو تین دنوں میں وہاں آنے والے لوگوں کی تفصیلات آج کی میں اب اگر ان کے لیے وہ لوگ یہاں آ جا رہے ہیں تو اس میں ایسی کیا بات

”خیر دین نے نالے نالے انداز میں کہا۔
”لیکن آپ پریشان کیوں لگ رہے ہیں پچھلے چند دن سے؟“ عکس نے کریدا۔

”تمہارا وہم ہے۔“

”میں آپ کا چہرہ پڑھ سکتی ہوں۔“ وہ نہیں مانی تھی۔

”تمہاری شادی کا سوچ کر اداس ہوں۔“ خیر دین نے کہا اس نے یقین نہ آنے والے انداز میں خیر دین کو دیکھا۔

”میں شادی کے بعد بھی آپ کو اپنے ساتھ ہی رکھوں گی۔ میں شیر دل سے یہ بات کر چکی ہوں۔“ عکس نے کہا۔

”نہیں چڑیا میں اب.....“ عکس نے خیر دین کو بات مکمل کرنے نہیں دی اس نے بہت مستحکم آواز میں خیر دین سے کہا۔

”ہانا مجھ سے وہ روایتی باتیں مت کیجیے گا کہ بنیوں کے گھر رہنا مناسب نہیں۔ وغیرہ وغیرہ..... نہ میں روایتی ہوں نہ میں ایسی روایات پر یقین رکھتی ہوں جو انسانیت اور اخلاقی قدروں کے بجائے تعصبات پر بنائی گئی ہوں۔ میں اس عمر میں آپ کو تنہائی کے کسی عذاب کو اکیلا جھیلنے کے لیے نہیں چھوڑ سکتی خاص طور پر اس صورت میں جب آپ بیمار بھی ہیں اور شیر دل روایتی مرد نہیں ہے، اس کو کوئی اعتراض نہیں ہے آپ کے ہمارے ساتھ رہنے پر..... ہو گا بھی تو میں دور کر سکتی ہوں۔“ عکس نے دو ٹوک انداز میں خیر دین سے کہا اور خیر دین چاہتے ہوئے بھی اس سے بحث نہیں کر پایا تھا۔ وہ جانتا تھا وہ اسے اکیلا نہیں چھوڑے گی وہ لاکھ کوشش کرتا تب بھی نہیں۔



لاہور کے علامہ اقبال انٹرنیشنل arrival launge اتر پورٹ کے باہر نکلنے سے بھی پہلے مثال نے شیر دل کو دور سے دیکھ لیا تھا..... ہمیشہ کی طرح اس نے شہر بانو سے اپنا ہاتھ چھڑانے اور باہر نکلنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ اگر کوئی شیر دل کو پہلی نظر میں نہیں پہچان سکا تھا تو وہ شہر بانو تھی۔ وہ پہلے سے بہت کمزور ہو گیا تھا۔ اس کی رکت زرد، آنکھوں کے گرد حلقے اور سر میں جا بجا سفید بال تھے۔ وہ بازو مثال کے استقبال کے لیے پھیلائے گھٹنوں کے بل عجیب بے اختیاری کے عالم میں لاؤنج کے بالکل سامنے بیٹھا تھا۔ مثال لپکتی ہوئی اس کی گود میں ساگتی تھی۔ شیر دل زندگی میں پہلی بار آتے جاتے لوگوں کے جھوم میں اپنے جذبات پر قابو نہیں پاسکا تھا۔ مثال کو اپنے بازوؤں میں بٹھنے پر رو بڑا تھا۔ وہ اتنے دنوں سے ہر روز فون پر مثال سے بات کر رہا تھا۔ اس کے باوجود اسے اپنے سامنے دیکھ کر اپنے آپ پر قابو نہیں رکھ سکا تھا۔ شہر بانو اپنا بیگ سنبھالے ہوئے باہر اس کے نزدیک آ گئی تھی۔ شیر دل نے اس کی طرف دیکھا تک نہیں تھا، وہ مثال کو اپنے بازوؤں میں سینے اسی طرح اٹھ کر کھڑا ہو گیا نہ اس نے شہر بانو سے ملک سلیک کی، نہ اس کا حال پوچھا، نہ اس کا سامان پکڑا۔ مثال کو اٹھائے وہ پلٹ گیا تھا۔ شہر بانو جیسے ڈھکیوں کی طرح اس کے پیچھے چلنے لگی تھی..... ایک وقت وہ تھا جب وہ اس کے پیچھے پیچھے آتا تھا اور وہ اس کا ہاتھ جھٹک کر تنفر سے چلتی رہتی تھی اور ایک وقت یہ تھا جب وہ یہ دیکھنے کی زحمت تک نہیں کر رہا تھا کہ وہ اس کے ساتھ تھی یا نہیں۔

گاڑی کے پاس پہنچ کر ڈرائیور نے اس سے سامان لے لیا تھا۔ شیر دل ہمیشہ کی طرح اس کے ساتھ پیچھے نہیں بیٹھا تھا۔ وہ مثال کو لیے اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا تھا۔ پورا راستہ صرف مثال بولتی رہی تھی۔ اتنے مہینوں میں شہر بانو نے اسے پہلی بار اس طرح خوش ہو کر باتیں کرتے دیکھا تھا..... بالکل اسی طرح جیسے وہ ہمیشہ کرتی تھی۔ پیچھے تھوڑا دیکھ اور گہرا ہوا تھا۔ گھر پہنچنے پر مزہ نے اس کا استقبال کیا تھا۔ گرم جوشی دکھانے کی شدید کوشش کے باوجود شہر بانو کو ان کے انداز میں ششک نظر آئی تھی۔ وہ گھر کچھ عرصے پہلے اس کی سرال تھا، وہ وہاں ملکیت کے احساس کے ساتھ آئی تھی آج وہ وہاں صرف

ایک مہمان کے طور پر آئی تھی..... ایک ہفتے کے لیے۔

عکس، شیردل کی زندگی میں آج بھی اس کا اندازہ اسے گاڑی میں ہی ہو گیا تھا جب اس نے عکس کی کال ریسیو کی تھی اور اسے فلائٹ کے آنے اور گھر کی طرف روانگی کے بارے میں بتاتے ہوئے اس سے کچھ اور باتیں کی تھیں۔ ایک وقت تھا جب وہ سوچتی تھی شیردل کی زندگی میں کوئی اور عورت آگئی تو وہ جیسے مر ہی جائے گی، وہ سانس بھی نہیں لے سکے گی شیردل کا نام کسی اور عورت کے نام کے ساتھ دیکھ کر..... اور اب..... وہ زندہ بھی ان دونوں کی چٹو مٹ کی وہ گفتگو سنتی رہی تھی اور زندہ بھی رہی تھی اور سانس بھی لیتی رہی تھی..... آسمان بھی نہیں ٹوٹا تھا..... زمین بھی نہیں پھٹی تھی..... شہر بانو، شیردل سے وہ ایک بار پھر شہر بانو شہباز ہو چکی تھی اور وہ نام کی اور کے نام کے ساتھ لگ چکا تھا۔

”تم کوئی جاب کیوں نہیں کرتیں..... اتنی اچھی ڈگری ہے تمہارے پاس اور یہاں تو اس ڈگری کی بہت ویلجہ ہے۔“ داؤد نے شادی کے چند ہفتے بعد ہی اس سے ایک رات کہا تھا۔ وہ ابھی بھی مومن سے واپس آئے تھے اور شہر بانو، مثال کو شرمین کے گھر سے اپنے گھر لے کر آئی تھی۔

”جاب؟“ شہر بانو نے کچھ جراتی سے اسے دیکھا۔ ان کی اتنے مہینوں کے ٹیل ملاپ میں کبھی جاب کا تذکرہ نہیں ہوا تھا نہ داؤد نے کیا تھا نہ ہی اس نے کیا تھا۔

”ہاں۔“ داؤد نے کہا۔

”میں نے تو انٹرن شپ کے بعد کبھی جاب کی ہی نہیں۔“

”ہاں لیکن اس کی وجہ یہ تھی کہ تم شادی کر کے پاکستان چلی گئی تھیں اگر امریکا میں رہ رہی ہو تیں تو یقیناً کرتیں۔“ داؤد نے اس کا جملہ چکا۔

”گھر اور جاب دونوں کو اکٹھے چلانا بہت مشکل ہے۔“ اس نے اپنی عدم دلچسپی کا اظہار کیا۔

”اسی (80) فیصد عورتیں جو یہاں رہتی ہیں وہ یہ مشکل کام بڑی آسانی اور مہارت سے کرتی ہیں تم کرنا شروع کر دو گی تو تمہیں بھی آسان لگنے لگے گا۔“ داؤد اپنی بات پر ہنسا ہوا تھا۔ ”ویسے بھی یہاں صرف ایک پائشر کے کام کرنے سے گزارہ نہیں ہوتا۔ میں نے نیا نیا گھر mortgage کیا ہے اس کی بہت heavy instalments دے رہا ہوں ابھی نئی گاڑی لی ہے اس کا کبھی قرض ہے میرے سر پر..... صرف میرے کام کرنے سے یہ گھر نہیں چل سکے گا۔“ وہ پلٹیں بھپکائے بغیر اس کی بات سنتی رہی۔ وہ نے تلتلفظوں میں اسے کیا بات صاف صاف بتا رہا تھا وہ کچھ کتنی تھی..... کہ اسے بھی اس کے ساتھ کام کر کے گھر میں contribute کرنا پڑے گا ورنہ وہ اس کے اور اس کی بیٹی کے اخراجات نہیں اٹھائے گا۔ وہ امریکا تھا اور وہاں داؤد کا وہ مطالبہ غلط نہیں تھا مگر وہ کچھ دیر کے لیے سکتے میں ضرور آئی تھی۔ سالوں گھر بیٹھے رہنے کے بعد اگر یک دم کوئی نوکری تلاش کرنے کے لیے کہتا تو کوئی بھی اس کی طرح پریشان ہوتا بعد میں اس نے سوچا اسے کام کرنا ہی چاہیے۔ شیردل، مثال کے اخراجات کے لیے اسے دم دے رہا تھا مگر وہ نہیں جانتی تھی اب شادی کر لینے کے بعد کچھ عرصہ گزار جانے کے بعد وہ اسے کچھ بتا دینا تھیں، اس وقت اس کا ذہن شیردل کو اچھی طرح جاننے کے باوجود اس کی جانب سے شکوک و شبہات کا شکار تھا۔

داؤد اور مثال کے درمیان بھی اس طرح کا کوئی رشتہ نہیں بن سکا تھا جس خواہش اور امید میں شہر بانو نے داؤد کے ساتھ شادی کی تھی۔ داؤد کے پاس بیوی کی سابقہ شوہر سے ہونے والی اولاد کے ساتھ وقت گزارنے یا اس کے ساتھ اچھے تعلقات بنانے کی کوشش سے زیادہ دلچسپی اور اہم کام تھے۔ مثال اس کے نزدیک ایک unfriendly چائلڈ تھی جس کو بگاڑنے کا سارا کرڈٹ وہ شہر بانو کے ناز و نعم کو دیتا تھا۔ اس کا خیال تھا اسے مثال کے پیچھے ہر وقت بھاگتے رہنے کے بجائے اسے وہ سب کرنے کی آزادی دے دینی چاہیے تھی جو وہ کرنا چاہتی تھی..... شہر بانو، مثال کے حوالے سے اس کے مشوروں اور رائے پر کان بھی نہیں دھرتی تھی۔ وہ اس کی اولاد نہیں تھی اور وہ نہ اولاد کی اہمیت کو سمجھتا تھا، نہ ہی اپنی اولاد پیدا کرنے میں زیادہ دلچسپی رکھتا تھا اور یہ ایک اور مسئلہ تھا جو شہر بانو کو اس کے ساتھ پیش آیا تھا۔ داؤد کو زارا کے ساتھ بھی یہی مسائل تھے جب وہ اولاد چاہتی تھی اس وقت داؤد کو اس میں دلچسپی نہیں تھی اور جب داؤد کو اس کا خیال آیا، اس وقت زارا کو اپنے کیریئر کے علاوہ کسی چیز میں دلچسپی نہیں رہی تھی اور زارا کے ساتھ ہونے والے بریک اپ کے بعد داؤد کو اب اگر کسی چیز میں دلچسپی تھی تو وہ اپنی ذات، اپنی خوشی، اپنی خواہشات تھیں۔ شادی سے پہلے وہ جس طرح شہر بانو کو شادی پر آمادہ کرنے کے لیے اس کے آگے پیچھے بھرتا، اس کی ناز برداریاں کرتا بھرتا، شادی کے بعد سب سے پہلے غائب ہونے والی چیز وہ ناز برداریاں ہی تھیں۔ وہ اب جیسے ایک بار پھر سے اپنی زندگی جینے لگا تھا جو میں، مجھے، میرا اسے شروع ہو کر وہیں ختم ہوتی تھی۔ زندگی میں آنے والا وہ دوسرا مرد کسی طرح سے شہر بانو کے لیے دلا سے کا باعث نہیں بناتا تھا..... صرف اس کے پیچھتاوے میں اضافے کا باعث بن گیا تھا پہلے پیچھتاوے اور شیردل کو چھوڑنے کا تھا..... اب پیچھتاوا اتنی جلد بازی میں داؤد کو اپنی زندگی میں شامل کر لینے کا بھی تھا۔

☆☆☆

منزلہ اور اس کے درمیان ایک ہفتے کے قیام کے دوران کی قسم کا کوئی دستکش نہیں ہوا اور یقیناً منزلہ کو اس کے لیے خاص طور پر ہدایات دی گئی تھیں ورنہ وہ کچھ نہ کچھ کہنے سے باز رہنے والی نہیں تھیں۔

اپنی زندگی کا ایک اور مشکل ہفتہ وہاں گزار کر وہ روٹی دھونی مثال کو لے کر واپس امریکا آگئی تھی اور واپس آنے کے بعد ایک بار پھر سے مثال اسی روئے کا مظاہرہ کرنے لگی تھی جو وہ یہاں آنے کے بعد کر رہی تھی، شیردل سے فون پر ہر روز بات کرنے نے بھی اس کے مزاج میں کوئی تبدیلی نہیں کی تھی..... وہ شہر بانو کی اکلوتی اولاد تھی اور وہ شہر بانو سے بے حد ناخوش تھی..... وہ ”پاپا“ کے پاس رہنا چاہتی تھی۔ مہی کے پاس نہیں اور اسے مہی میں کوئی دلچسپی نہیں تھی اور اس کی ناخوشی اور عدم دلچسپی میں اس وقت اور اضافہ ہو گیا تھا جب اس کی ”مہی“ نے داؤد کو اپنی زندگی میں شامل کر لیا اور انہیں بانو کا گھر چھوڑ کر ایک نئے گھر میں شفٹ ہونا تھا۔ وہ عکس سے نہیں ملتی تھی نہ ہی شیردل نے اس سے ”نئی مہی“ اور اپنی شادی کا ذکر کیا تھا اس لیے پچھ سالہ اس بیٹی کی نظروں میں باپ اچھا تھا صرف ماں بری تھی جو اسے ہر اس جگہ اور شخص سے ٹوٹنے اور الگ کرنے کا باعث بنی تھی جس سے وہ پیار کر رہی تھی۔

داؤد کے ساتھ شادی ایک مشکل فیصلہ تھا خاص طور پر اب جب شہر بانو کو اپنی بہت سی غلطیوں کا احساس ہو رہا تھا لیکن اب اس کے پاس جو اس نہیں رہی تھی۔ شیردل کی زندگی کا آغاز کر چکا تھا اور وہ کسی کہانی کی ہیروئن ہوتی تو اسے کیلئے زندگی گزارنے کا فیصلہ کر لیتی لیکن وہ حقیقی زندگی میں شرمین کے گھر پر اکیلے نہیں رہ سکتی تھی خاص طور پر شادی کے لیے شرمین کے دباؤ کی وجہ سے بھی۔

اس کی زندگی داؤد سے شادی کے بعد بھی تسخیل نہیں سکتی تھی بس اس کی زندگی اور ذات میں ایک اور خانے کا اضافہ ہو گیا تھا جس میں وہ ایک بیوی تھی کچھ دیتے دار یوں کا بھی اضافہ ہو گیا تھا اور بس..... اور کچھ نہیں ہوا تھا۔ نہ داؤد، شیردل جیسا ساتھی تھا، نہ اسے داؤد سے محبت ہو سکتی تھی اور نہ داؤد شیردل کی جگہ لے پایا تھا۔ وہ شہر بانو سے صرف شادی کے لیے ایسا کیڑا تھا، شادی ہو جانے اور اسے اپنے گھر لے آنے کے بعد وہ یک دم ہی اس کے لیے ایک بہت ناخوشی کی چیز بن گئی تھی۔ یہ وہ داؤد بھی نہیں تھا جسے وہ اتنے سالوں سے جانتی تھی، اس داؤد اور اس داؤد کی زندگی، ترجیحات اور دلچسپیوں میں زمین آسمان کا فرق تھا اور اس رشتے میں زمین شہر بانو تھی۔

تھا وہ اسے ملامت کر رہی تھی، شرم دل رہی تھی، عقل دے رہی تھی اور شیر دل کو انہی چیزوں کی ضرورت تھی۔
”وہ مجھے مثال سے دوبارہ ملنے نہیں دے گی اگر اس بار وہ اسے لے گی تو.....“ اس نے بالآخر جیسے ایک توجیہ دینے کی کوشش کی تھی اپنے ان اقدامات کے لیے۔

”یہ تمہاری assumption ہے اور ایک وہم کی بنیاد پر تم اپنی بیٹی اور سابقہ بیوی کو کورس کے دھکے نہیں کھلو سکتے۔ تم تو کورس میں جاتے ہو وہاں کا سسٹم اور حال دیکھا ہے تم نے..... تم شہر بانو کو وہاں کے چکر لگوانا چاہتے ہو؟“ وہ اب پچھتائیں بول رہا تھا۔

”جب وہ نہیں ملنے دے گی تو دیکھا جائے گا ابھی تو وہ ابھیہ طریقے سے اسے نہیں لائی ہے، یہاں رہ رہی ہے اگر اس نے تم سے مثال کو دور رکھنا ہوتا تو وہ اب بھی اسے یہاں نہ لے کر آتی۔“ عکس نے کہا۔

”وہ یہاں اس لیے آئی ہے تاکہ اگر میرے ساتھ patch up ہو سکتا ہے تو کر لے..... اسے پتا نہیں تھا کہ میں نے تم سے شادی کر لی ہے اگر اسے امریکا میں پتا چل جاتا تو وہ کبھی مثال کو یہاں لے کر نہیں آتی..... میں نے صرف ایسی کسی صورت حال سے بچنے کے لیے تم سے ایئر بیسی میں نکاح اور رخصتی کی۔“ عکس حیرانی سے اس کا چہرہ دیکھتی رہی اسے شہر دل کی بات کی سمجھ نہیں آتی تھی۔

”patch up کیا مطلب.....؟ تم دونوں کی divorce ہو چکی ہے پھر patch up کیسے ہو سکتا ہے۔“ اس نے کہا۔

”طلاق کا حق تقویض کیا تھا میں نے اسے اور وہ ایک طلاق کے ساتھ علیحدگی کی شرط کے ساتھ تھا۔ ہم دونوں چاہیں تو دوبارہ نکاح کر کے رہ سکتے ہیں۔“ اس نے عکس سے بات کی تھی اس بارے میں اور میری نے مجھے پریشا نگر کیا تھا، تمہارے تانا سے بھی بات کی تھی، عکس کا دام غصے گھوم کر رہ گیا تھا۔

”انہوں نے مجھے ایسا کچھ نہیں بتایا۔“ عکس نے کہا۔

”ہاں لیکن انہوں نے مجھے ہلو کر بات کی تھی۔“ وہ خاموش اسے دیکھتی رہی وہ اس شادی کے حوالے سے جو خدشات لے کر بیٹھی وہ غلط نہیں تھے..... اور وہ سارے مسائل اب آہستہ آہستہ اس کے سامنے آنے لگے تھے۔

شہر بانو کو اندازہ بھی نہیں تھا کہ پاکستان میں اس کے ایک ہفتے کے قیام کے دوران وہ عکس کی وجہ سے مصیبتوں کے کس پہاڑ سے بچتی تھی۔ وہ ایک بلا بھی جو عکس نے اس دن شیر دل کو مجبور کر کے شہر بانو کے سر پر آنے سے ٹالی تھی۔

شیر دل مثال کے پاکستان سے چلے جانے کے کئی دن بعد تک بہت اب سیٹ رہا تھا لیکن پھر آہستہ آہستہ وہ نائل ہونے لگا تھا۔ مثال امریکا جانے کے بعد بھی اس سے رابطے میں تھی اور اس کے ذہنی سکون کی ایک وجہ یہ بھی تھی۔ اس کی پوسٹنگ انہی دنوں NWFP ہوئی تھی اور وہ جو پہلے عکس کے ساتھ لاہور یا کراچی میں ایک ہی شہر میں پوسٹنگ کروانے کا خواہش مند تھا اسے اب رخصتی میں وہاں جانا پڑا تھا۔ عکس نے بھی اس کی پوسٹنگ والی جگہ پر اپنی پوسٹنگ گردانے کے لیے کوششیں ترک کر دی تھیں کیونکہ شیر دل NWFP میں جہاں پوسٹنگ تھا وہ علی کے لیے کچھ زیادہ محفوظ علاقہ نہیں تھا اور نہ ہی وہاں اچھی میڈیکل سہولیات تھیں عکس ان دنوں امید سے بھی اور وہ کوئی رسک لینا نہیں چاہتا تھا۔

”آپ نے مجھے یہ سب کیوں نہیں بتایا؟“ شہر بانو اور شیر دل کی مصالحت کے حوالے سے ہونے والے انکشاف کے بعد عکس نے خیر دین سے بات کی تھی اور اس سے شکایت کیا تھا۔

”اگر تمہیں بتا دیتا تو تم شیر دل کو چھوڑ دیتیں۔“ خیر دین نے کہا اور ٹھیک کہا تھا اگر اسے یہ پتا چلتا کہ شہر بانو نے شیر دل کے درمیان اب بھی مصالحت کی کوئی محاش تھی تو وہ ان دنوں کے درمیان سے بہت جانے میں ایک لمحے کا بھی تاثر نہ کرتی بلکہ شاید وہ خود شیر دل کو اس مصالحت پر مجبور بھی کرتی۔

”اور اگر ایسا ہو جاتا تو ہم سب کے لیے ٹھیک ہوتا..... میرے لیے..... شیر دل کے لیے..... شہر بانو اور مثال کے لیے.....“ اس نے خیر دین سے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

”آپ نے بہت خود غرضی دکھائی تانا..... اور زندگی میں پہلی بار خود غرضی دکھائی۔“ اس نے مدھم آواز میں خیر دین کو جتایا تھا۔

”تم ایسا نہیں کرو گے شیر دل۔“ عکس نے دو ٹوک انداز میں اسے جیسے خبردار کیا تھا۔ ان کی شادی کو ابھی کچھ دن گزرے تھے اور شہر بانو، مثال کو لے کر پاکستان آئی تھی اور اس کے آنے کے فوراً بعد شیر دل نے مثال کی کھڑی کے حوالے سے کورٹ میں میس کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ کسی بھی صورت میں اسے دوبارہ شہر بانو کے ساتھ واپس بھیجنا نہیں چاہتا تھا اس نے بہتیار اور مزہ سے بھی یہ معاملہ ڈسکر کر لیا تھا اور ان دونوں کی بھی رائے یہی تھی کہ انہیں مثال کو شہر بانو سے لے لینا چاہیے یہ کام اس لیے بھی ضروری تھا کہ شہر بانو واپس جا کر وہاں سے شادی کرنے والی تھی اور مثال جس طرح شیر دل سے اچھڑ گئی، شیر دل کو بالکل نہیں لگتا تھا کہ اسے اس کی پرورش کرنے میں کوئی مسئلہ ہو سکتا تھا۔ لیکن عکس کے ساتھ یہ مسئلہ ڈسکر کرتے ہی وہ بچھے سے اگڑ گئی تھی۔ ”تم اب ایک ماں سے اس کی بیٹی چھینو گے..... وہ تم پر اعتبار کرتے ہوئے اسے یہاں لے کر آئی ہے۔“ اس نے شیر دل کو سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

”اس نے بھی تو مجھ سے میری بیٹی کو چھینا تھا۔ میں نے بھی تو اس پر اعتبار کرتے ہوئے اسے marriage nuptials (ازدواجی بندھن کے ناتے) میں چائلڈ کھڑی دی تھی لیکن اس نے اسی ایک اجازت کو میرے خلاف استعمال کرتے ہوئے مجھے اپنی بی بی کی شکل دیکھنے کے لیے ترسا دیا تھا۔“ شیر دل کے انداز میں بے حد سرد مہر کی تھی۔

”اس نے غلط کیا اور اب تم اس کی غلطی کو اپنی ایک بڑی غلطی سے بدلنا چاہتے ہو۔“ عکس نے کہا۔

”I dont care“
”You have to“..... یہ ایک چھ سالہ بیٹی کی زندگی کا سوال ہے، تم دونوں اپنی جنگیں اس پر لڑنا بند کر دو۔ تمہیں کیا لگتا ہے تم اسے شہر بانو سے لے لو گے تو وہ آرام سے چلی جائے گی؟ وہ ایک کے بعد دوسری اپیل کرے گی اور وہ بھی امریکن ایڈمسی کی سپورٹ کے ساتھ..... تم چاہتے ہو جیسا سین پبلے ہوا ہے ویسا ہی دوبارہ ہو..... مزید شرمندگی اور ذلت اٹھاؤ تم۔“ وہ اس کے فیصلے کے مضمرات بتا رہی تھی۔

”تب میں دھوکے میں مارا گیا تھا۔ ضرورت سے زیادہ اعتماد کرنے کی وجہ سے..... لیکن اب وہ لے آئے جس کو بھی اپنی سپورٹ کے لیے لانا چاہتی ہے، میں دیکھوں گا وہ میری بیٹی کو پاکستان سے باہر کیسے لے کر جاتی ہے۔“ عکس اس کی شکل دیکھ کر گھبرائی تھی۔ شیر دل کو اس نے بھی اس طرح کی scheming کرتے نہیں دیکھا تھا نہ وہ اسے کبھی بے وقوفانہ حد تک اتار پست لگا تھا لیکن اس وقت وہ اسے صرف ایک مرد لگ رہا تھا جس کے لیے سب سے اہم بات صرف اس pride کو بحال کرنا تھا جو اس نے اس کی بیوی چھین کر لے لی تھی۔

”تم نے سوچا ہے مثال کیسی زندگی گزارے گی۔ اس طرح کی قانونی جنگ کا اس پر کیا اثر ہوگا؟“ شیر دل نے اس کی بات کاٹ دی۔

”وہ میرے اور تمہارے ساتھ ایڈجسٹ کر لے گی..... وہ بہت خوش رہے گی یہاں۔“
”تم اس equation میں سے مجھے اور میرے گھر کو نکال دو..... میں اسے اپنے ساتھ نہیں رکھوں گی۔“ عکس نے

دو ٹوک انداز میں کہا۔ شیر دل کو جیسے یقین نہیں آیا۔
”تم میری اولاد کو کیسے پالو گی؟“ اس نے جیسے عکس کو جتانے والے انداز میں کہا۔

”میں تمہاری صرف وہ اولاد پالوں گی جو میں پیدا کروں گی میں کسی دوسری عورت کی اولاد چھین کر اس کی ماں بننے کی خواہش مند نہیں ہوں اور تمہیں اگر یہ کام کروانا ہے تو پھر تمہیں ایک تیسری شادی کرنی پڑے گی۔ I would not support you

“عکس نے بہت صاف لفظوں میں اسے اپنا فیصلہ سنایا تھا۔
”میں تم سے ایسی بات کی تو توقع نہیں کر سکتا۔“ شیر دل کو یقیناً شاک لگا تھا۔

”میں بھی تم سے اس طرح کے غلط کام کی توقع نہیں کر سکتی جو تم کرنے جا رہے ہو۔ تم نے شادی کر لی ہے لیکن تم شہر بانو کو punish کرنا چاہ رہے ہو کہ وہ شادی کر کے اپنی زندگی میں سیٹل ہونے کے بجائے یہاں کورس میں خوار ہوئی پھر، تم ایسا کیسے کر سکتے ہو شیر دل..... تم مرد ہو، تعلیم یافتہ ہو..... ایک باشعور انسان سے ایک جاہل اجنبی جانور کیوں بننا چاہتے ہو۔ اس عورت کے ساتھ تم نے اتنے اچھے معاملے گزارے ہیں اور کچھ نہیں تو تمہیں انہی سالوں کی پروا کرنی چاہیے۔ لحاظ ہونا چاہیے اس ایک رشتے کا جو کبھی تمہارے اور اس کے درمیان تھا۔“ وہ اس کی باتوں سے سمندر کے جھاگ کی طرح بیٹھتا جا رہا

”تم ٹھیک کہتی ہو لیکن بڑھا یا اور اولاد انسان کو مجبور کر دیتے ہیں..... میں کتنی بار تمہیں تکلیف میں پڑنے دیکھتا..... سجاد سے رشتہ ختم نہ ہو چکا ہوتا تو ربات بھی لیکن رشتہ ختم ہونے کے بعد..... اور وہ بھی میری جلد بازی کی وجہ سے..... میں نے یہی ٹھیک سمجھا کہ تمہاری شادی شیر دل کے ساتھ ہو جانی چاہیے۔“ خیر دین کی آواز میں ندامت تھی۔ وہ کسی چھوٹے بچے کی طرح کسی بڑے کے سامنے خود سے ہونے والی کسی غلطی کا اعتراف کر رہا تھا۔ وہ اسے دیکھتی رہی۔

”جو بھی تھا یہ ٹھیک نہیں تھا نا..... میں آپ کو اتنا کمزور نہیں سمجھتی تھی۔“ اس نے کچھ ناپسندیدگی سے کہا۔

”جب تمہاری اپنی اولاد ہو جائے گی تو تمہیں اندازہ ہوگا کہ اولاد انسان کو کس طرح کمزور کرتی ہے۔ اس کے اصول اور اخلاقیات کو کس طرح بدل کر رکھ دیتی ہے۔“ خیر دین نے سر اٹھا کر اسے دیکھا پھر مدغم مگر مہم کاہٹ کے ساتھ کہا وہ کچھ سرخ ہوتے چہرے کے ساتھ بے اختیار ہنس پڑی۔ اسے خیر دین سے ایسی مثال کی توقع نہیں تھی۔

☆☆☆

شیر دل کے ساتھ ازدواجی زندگی کا آغاز ایک آسان آغاز نہیں تھا..... یہ وہ شیر دل نہیں تھا جسے عکس اتنے سالوں سے جانتی تھی۔ وہ خوش مزاج، گل مزاج شخص اب بہت چھوٹی سی بات پر غصے میں آ جاتا تھا..... فطرتاً تھا ہونے کے باوجود شہر بانو اور مثال سے علیحدگی نے اس کے مزاج کو بہت بری طرح بدلا تھا۔ وہ پہلے کی نسبت سنجیدہ ہو گیا تھا۔ اگر بات نہ کرتا تو کوئی نئی دن بات نہیں کرتا تھا..... فون نہیں کرتا تھا..... اور اگر فون کرنے پر آتا تو دن میں کئی کئی بار اسے فون کرتا..... وہ مملوک مزاج ہو گیا تھا اور وہ پہلے ایسا نہیں تھا کس کو اس کے mood swing بری طرح پریشان کرتے تھے لیکن اس کے باوجود شیر دل کے ساتھ شروع کے چھ ماہ اس نے بڑے گل کے ساتھ گزارے تھے پھر آہستہ آہستہ بچے کی آمد کا وقت نزدیک آ گیا تھا اور شیر دل کا مزاج بدلا گیا۔ وہ پرانے شیر دل ہونے لگا تھا اس کی توجہ، محبت اور خیال بڑھ گیا تھا، اس کی مملوک مزاجی میں کچھ کمی آنے لگی تھی۔ شاید اسے محسوس ہونے لگا تھا کہ وہ عکس کے ساتھ اتنا اچھا شوہر بن کر نہیں رہا تھا جتنا وہ شہر بانو کے ساتھ ہمیشہ رہا تھا۔

☆☆☆

شہر بانو کو فطری کی پیدائش کا پتا مثال سے چلا تھا۔ وہ اپنی چھٹیوں میں پاکستان شیر دل سے ملنے لگی تھی اور اس بار شہر بانو نے اسے اکیلے بھجوا دیا تھا۔ وہ اپنی جاب کی وجہ سے چھٹی نہیں لے سکتی تھی اور نہ ہی اب وہ ایک بار پھر شیر دل کا سامنا کرنا چاہتی تھی۔ جب زندگی بدل نہیں سکتی تھی تو پھر حقیقت سے کھوتی طرح آنکھیں بند کر کے فرار بہتر تھا وہ بھی اب یہی کرنا چاہتی تھی، نو سے پانچ بجے کی ایک تھکا دینے والی نوکری، ایک شوہر جو اسے بیوی سے زیادہ ایک ہاؤس کیپر سمجھتا تھا اور ایک بیٹی جو اس کے کسی فیور، کسی خدمت سے خوش نہیں ہوتی تھی..... شہر بانو کے پاس اس ”baggage“ کے ساتھ زندگی ویسے ہی ایک ہی دائرے میں گھومنے لگی تھی جس میں وہ کلوہو کے تیل کی طرح کچھ سوچے بغیر پھر کھاتی جا رہی تھی۔ شیر دل کے ساتھ گزارا ہوئی زندگی، اس کی محبت، وہ ناز برداریاں وہ آرام و آسائش خواب ہو چکے تھے۔ جواب باقی تھا وہ ایک مشکل زندگی تھی جس میں obligations تمہیں options نہیں تھے اور اس بھبرے ہوئے پانی میں مثال نے جیسے ایک غلام پیدا کر دیا تھا۔

وہ پاکستان جانے کے پانچویں دن اس سے فون پر بات کر رہی تھی جب مثال نے اسے بے حد ایکساٹنڈ انداز میں ایک چھوٹا اور پارسا بھائی آنے کی اطلاع دی تھی۔ شہر بانو تل بھی نہیں لے سکتی تھی، یہ غیر متوقع نہیں ہوتا چاہیے تھا اس کے لیے..... پھر بھی غیر متوقع تھا..... تکلیف نہیں ہونی چاہیے تھی اسے پھر بھی ہوئی تھی، سمجھ میں ہی نہیں آیا تھا کہ وہ مثال سے کیا کہتی یا کسی سے بھی کیا کہتی..... مثال دوسری طرف سے بڑے بُرے جوش انداز میں اسے بھائی کے چلے کی تفصیلات دے رہی تھی۔ اس نے عجیب کم ہمتی کے عالم میں فون رکھ دیا تھا۔ سمجھن آتی تھی کہ اسے لگا وہ اب کبھی اٹھ نہیں سکتی۔ ایک بیٹا اس کی اور شیر دل کی خواہش تھی۔ وہ پلان کر رہے تھے اگر یہ سب ان کی زندگی میں نہ ہوتا تو شاید اس سال وہ بیٹا اس کا بیٹا ہوتا۔ وقت اس سے سب کچھ چھین کر لے گیا تھا اور جو چھین کر لے گیا تھا وہ دوسروں کو دے رہا تھا۔ داؤد کے ساتھ اس کی شادی کبھی ایک سال ہونے والا تھا لیکن وہ اولاد نہیں چاہتا تھا اور کم از کم چند سال تو اس کے لاکھ سر جتنے کے باوجود وہ اس ایک بات پر اپنے موقف سے ہٹنے کو تیار نہیں تھا۔

”ممی، عکس آگئی ہے کہا ہے جب میں next ٹائم ان کے پاس جاؤں گی تو وہ فطریل کے ساتھ ساتھ میرا بھی ایک بہت اچھا ساروم بنا دیں گی پھر میں اپنے روم میں رہوں گی۔“ وہ اس دن صبح اسکول جانے کے لیے تیار کر رہی تھی جب مثال کو یک دم پتا نہیں کیا یا د تھا۔ اس نے بڑے ایکساٹنڈ انداز میں ماں سے کہا۔

”وہ بھی تمہارے لیے کچھ نہیں بتائیں گے، اب ان کے پاس اپنا baby ہے تمہارے پاپا اور فطریل کی ممی کو تم میں دلچسپی نہیں ہے، ان کے لیے اپنا baby کافی ہے۔ وہ تم سے جھوٹ بول رہے ہیں۔“ اس نے مثال کا سفید پڑتا چہرہ بھی نہیں دیکھا تھا وہ بس غصے کے عالم میں اس کے اس گل کو اپنے پیروں تلے روندتی چلی گئی تھی جو اس بچی نے بنایا تھا۔ وہ اُن پڑھ، جاہل عورتوں کی طرح یہ باتیں نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اپنی اکھوتی بیٹی کو کھوت مند اندہ سوچ اور رویت ہی دینا چاہتی تھی مگر حد اور غصے نے کچھ دیر کے لیے جیسے اس کا ذہن ماؤف کر دیا تھا۔ اس کے پاس صرف مثال رہ گئی اور وہ کم از کم اس کی محبت عکس کے ساتھ نہیں بانٹ سکتی تھی۔ وہ پورا دن مثال کم صدمہ رہی تھی۔ رات کو اس نے شیر دل سے Skype پر بات کرنے کی ضد کی۔

بڑھ گئی جب داؤد کو اچانک اسی کمپنی سے Lay off (نوکری سے نکالنا) کر دیا گیا جہاں وہ کئی سالوں سے کام کر رہا تھا۔ شہر بانو پہلے جاب سے اپنے اخراجات پورے کرتی تھی اور گھر میں تھوڑا بہت کنٹریبیوشن کرتی تھی اب ایک دم گھر کے سارے اخراجات اس کے سر آگئے تھے۔ گھر mortgage ہونے کی وجہ سے ان دونوں پر شدید فنانشل پریشر تھا۔ ایک اور بچہ ان حالات میں پیدا کرنا اس گلے میں پھندا ڈالنے کے برابر تھا جس میں پہلے ہی بہت سے پچھندے پڑے ہوئے تھے۔ ان حالات میں مثال کے لیے ہر ماہ شیر دل کی طرف سے بھیجی جانے والی رقم ایک نعمت غیر ترقی سے کم نہیں تھی۔ وہ رقم جو پہلے کچھ مہینے نہیں رکھتی تھی۔ اب ایک دم بہت جگہوں پر کام آنے لگی تھی۔

سال ختم ہونے پر ایک بار پھر چھٹیوں میں مثال پاکستان گئی تھی، وہ اس بار بھی اکیلی تھی شہر بانو کو اس سال بھائی کی ایسی جنگ لڑنی پڑی تھی کہ اس کے دل سے مثال اور عکس کے حوالے سے سارے خدشات اور سو سے نکل گئے تھے اور وہ ہموں اور وسوسوں کو پالنے کے لیے وقت کا ہونا ضروری تھا اور اس کے پاس ... آفس، گھر اور باہر کے کاموں کے بعد صرف اتنا وقت بچتا تھا کہ وہ چند گھنٹے سو کر گلے دن دوبارہ اسی جنگ کے لیے تیار ہوتی اور ایسے حالات میں جب اس کے پاس مثال سے بات تک کرنے کے لیے وقت نہیں تھا وہ اس کے بارے میں واسے پالنے کیسے بیٹھ جاتی۔

مثال اس بار شیر دل اور عکس دونوں کو پچھلے دو سالوں کی نسبت کم صدم اور بدلی ہوئی لگی تھی۔ وہ اب بھی طغزل کے آگے پیچھے بھرتی رہی تھی مگر انہوں نے ویسے اسے بہت خاموش اور فکر مند پایا۔ شیر دل اور عکس کے بہت زیادہ کریدنے کے باوجود بھی وہ کچھ جانے اور سمجھنے میں کامیاب نہیں ہو سکے تھے۔

عکس کو مثال بہت اچھی لگتی تھی، وہ ہمیشہ اسے بار بی ڈول کی یاد دلاتی تھی وہ مشکل صورت میں اسی کا بچپن تھی۔ اسے لڑکیاں ہمیشہ اچھی لگتی تھیں اور اس کی وجہ سے بھی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ وہ طغزل کو accept کرتے ہوئے بھی کہیں نہ کہیں ایک بیٹی کی خواہش اپنے دل میں پالے ہوئے تھی اور وہ پوری نہیں ہوئی تھی لیکن مثال کے اپنے پاس قیام کے دوران مزید بڑھ ضرور لگتی تھی۔ مثال ڈسٹر ڈسٹی اس کا اندازہ اسے پہلی دفعہ بھی ہو چکا تھا لیکن اس کو ہنڈل کرنا اتنا مشکل ثابت نہیں ہوا تھا، وہ اس کی بات سنتی بھی تھی اور مانتی بھی تھی اس کی اور کی بات سنتی سنتی اور وہ اس کی توجہ کی بھی خواہش مند رہتی تھی۔ عکس کی سنانا جیسے اس کے لیے ایک certification تھی وہ پاکستان سے جانے کے بعد بھی عکس سے رابطے میں رہی تھی۔ ہر دفعہ شیر دل کے اس کے گھر پر ہوتے ہوئے وہ عکس کی بھی بات اس سے ضرور کر دیتا تھا۔

”آہنی کیا آپ کی کوپن گھر میں نہیں رکھ سکتیں؟“ اس نے ایک دن لان میں طغزل کے ساتھ کھیلے کھیلے اچانک عکس سے کہا تھا، وہ حیران ہوئی تھی اس غیر متوقع اور عجیب و غریب فرمائش کو سن کر سوال کا جواب کمال مشکل تھا۔

”تمہاری مٹی آکر رہنا چاہیے most welcome لیکن مجھے نہیں لگتا وہ یہاں آکر رہنا چاہیں گی وہ امریکا میں جاب کرتی ہیں، وہاں ان کا اپنا گھر ہے، ان کے husband ہیں..... وہ کیوں یہ سب کچھ چھوڑ کر یہاں آنا چاہیں گی؟“ اس نے بڑی نرمی سے مثال کو آسان لفظوں میں جواب دینے کی کوشش کی تھی۔

”وہ آ بھی سکتی ہیں۔“ مثال نے جیسے کسی گہری سوچ میں الجھتے ہوئے اس سے کہا، عکس کو اب بھی اس کی بات کی سمجھ میں نہیں آئی۔

”ان کے لیے یہاں آنا مشکل ہے، میں نے تمہیں بتایا کہ وہ اپنے گھر اور شہر کو چھوڑ کر کہیں اور تو نہیں جاسکتیں۔ وہ وہاں بہت خوش ہیں۔“

”No she is not“ اس نے مثال کو کہتے سنا کس نے بہت غور سے اس کا چہرہ دیکھا، یہ مناسب نہیں تھا لیکن وہ پوچھنے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔

”وہ خوش نہیں ہیں؟“

”no“ مثال نے یک لفظی جواب دیا، وہ اب ایک بچے کی اس الجھن کا شکار ہو رہی تھی جو اسے راز رکھنے نہ رکھنے کے درمیان فیصلہ نہ کرانے والی صورت حال میں رکھے ہوئے تھی۔ اس ایک لفظی جواب نے عکس کو مزید سوالوں پر مجبور کر دیا تھا۔

”کیوں خوش نہیں ہیں؟“ مثال اس کے سوال کے جواب میں کچھ دیر خاموش رہی پھر اس نے جیسے کچھ پریشان سے انداز میں مدھم آواز میں کہا۔

وہ اسے laptop دے کر خود چلی گئی تھی۔ وہ دو گھنٹے کے بعد کچن کا کام نمٹا کر اس کے کمرے میں آئی تھی۔ مثال بستر پر laptop کے پاس بیٹھ چکی تھی۔ اس نے laptop میں skype کی ویڈیو آف کرنا چاہی اور رک گئی، شیر دل کی ڈپلے میں طغزل کی تصویر تھی۔ وہ بے حس و حرکت بیٹھی رہی۔ اس کے چہرے میں شیر دل کی واضح شباهت تھی۔ سرخ و سفید رنگت بڑی بڑی آنکھوں اور محض سرگراہٹ والا ایک گول منہ چہرہ..... وہ نم آنکھوں کے ساتھ اسے دیکھتی رہی۔ کچھ دیر کے لیے غصہ پٹائیں کہاں چلا گیا تھا۔ وہ بو جھل دل کے ساتھ laptop بند کر کے کمرے سے چلی گئی۔

”عکس آہنی نے کہا ہے طوٹی کے آنے سے میری importance میں کوئی کمی نہیں آئی، پاپانے بھی یہی کہا ہے۔ اگلی صبح وہ اسے اسکول چھوڑنے جا رہی تھی جب مثال نے ایک دم اس سے کہا تھا۔ وہ بری طرح چونکی۔

”عکس سے بات کب ہوئی تمہاری؟“ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا لہجہ کچھ خشک ہو گیا تھا۔

”پاپانے رات کو skype پر بات کروائی ہے میں نے طوٹی کو بھی دیکھا۔“ مثال نے بے حد خوشی سے اسے بتایا۔

شہر بانو کا بارہ ایک دم چڑھ گیا تھا۔

”تم نے اگر دوبارہ طغزل کی می سے بات کی تو میں تمہیں دوبارہ کبھی تمہارے پاپا سے بات نہیں کرنے دوں گی۔“ اس نے بلا جھجک اسے دھمکا دیا تھا۔

”لیکن کیوں عکس آہنی بہت اچھی ہیں..... I really like her۔“

”Stop it..... تمہیں ضرورت نہیں ہے مجھے بتانے کی کہ تمہیں کون پسند ہے اور کون نہیں، میں نے تمہیں کہہ دیا تم عکس سے بات نہیں کرو گی تو تم نہیں کرو گی۔“ اس نے بری طرح اسے جھڑکا تھا۔ مثال کچھ دیر الجھی نظروں سے ماں کو دیکھتی رہی۔ پھر وہ ایک دم کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی تھی۔ شہر بانو کچھ دیر خاموشی سے ڈرائیو کرتی رہی پھر اس نے جیسے کچھ بے چین ہو کر مثال کے بالوں میں ہاتھ بھیرنے کی کوشش کی جسے اس نے جھٹک دیا۔

”وہ تمہیں مجھ سے چھین لینا چاہتی ہے۔ اس لیے وہ تمہیں پیار کر رہی ہے۔ وہ تمہیں genuinely (خلوص سے) میری طرح پیار نہیں کرتی۔“ شہر بانو نے عجیب بے چینی سے اس سے کہا۔ مثال نے اس پر ایک اور الجھی نگاہ ڈالی اور کہا۔

”مٹی میں پاپا اور عکس آہنی کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں، میں طوٹی کو miss کرتی ہوں۔“ اس نے اتنے گلے ڈلے الفاظ میں اس سے کہا تھا کہ چند لمحوں کے لیے شہر بانو کچھ بولنے کے قابل نہیں رہی تھی۔

”میں تمہیں بھی وہاں نہیں بھیج سکتی، تم میری انکوٹی بیٹی ہو تم مجھے چھوڑ کر اس کے پاس کیسے رہ سکتی ہو۔ you loved them more than me؟ (تم انہیں مجھ سے زیادہ پیار کرتی ہو؟)۔ بات کرتے ہوئے اس کی آواز بھرا گئی تھی۔

”yes۔“ ایک لفظی جواب نے اس کی ہمت ختم کر دی تھی۔

وہ باقی کا سارا راستہ بہتے آنسوؤں کے ساتھ خاموشی سے ڈرائیو کرتی رہی تھی۔ مثال بے حد سرد مہری اور بے نیازی کے عالم میں پورا راستہ گاڑی کی کھڑکی سے باہر دیکھتی رہی۔

بعض دفعہ اولاد انسان کے لیے نعمت سے زیادہ ایک نارچہ بن جاتی ہے۔ ٹو دے مار چر..... وہ آپ کو کچھ کہیں تو آپ کو تکلیف ہوتی ہے، آپ ان کو کچھ کہیں تو بھی آپ ہی کو تکلیف ہوتی ہے..... اور وہ صرف یہ ہے کہ آپ نے انہیں پیدا کیا ہوتا ہے انہوں نے آپ کو نہیں..... وہ آپ کو چھوڑ سکتے ہیں آپ ان کو نہیں۔

مثال کے ساتھ ہونے والے یہ بار بار کے arguments (دکا لپے جیسے شہر بانو کے دل میں ایک اور اولاد کی خواہش شدت سے پیدا کر رہے تھے وہ ایک سینڈ چائس لینا چاہتی تھی شاید ایک اور بچہ۔ جو اس کے اور داؤد کے کھوکھلے رشتے کی بنیاد بدل دے اور اگر نہیں بھی ہوتا تو وہ بچہ مثال اور اس کے درمیان communication (تعلق) کے گرے ہوئے پل کو تو مہار اوے سکتا تھا۔ اس نے مثال کی طغزل کے لیے دیوانہ وار محبت دیکھی تھی اور اسے یوں لگتا تھا کہ وہ یہ محبت اس کے اور داؤد کے بچے کے ساتھ بھی کر سکتی تھی۔

اگلا سال اس کی زندگی کا ایک اور مشکل سال تھا۔ داؤد، شہرین اور فاروق کے مجبور کرنے پر اس فیملی کا آغاز کرنے پر تو تیار ہو گیا تھا لیکن ان دونوں کے باہمی تعلقات پہلے سے بھی زیادہ خراب ہو گئے تھے اور تعلقات کی یہ خرابی اس وقت اور بھی

نیز ہو سکتا ہے..... وہ کتابوں میں محبت کے بارے میں لکھی باتوں پر یقین نہیں کرتی تھی لیکن محبت پر کرتی تھی اور اس کا یہ یقین اس شام بری طرح ڈگمگا رہا تھا۔

☆☆☆

رات کے پچھلے پہر کا کوئی وقت تھا جب اس کی آنکھ کھلی تھی چند لمحوں کے لیے اسے لگا جیسے فطرت جاگا ہوا تھا اور اس کی آنکھ فطرت کے بلنے سے کھلی ہوئی۔ کدوٹ لینے پر اسے فطرت تو اسی طرح گہری نیند میں نظر آیا لیکن شیردل اپنے بستر پر نظر نہیں آیا تھا۔ ہاتھ روم کی لائٹ بھی آف تھی۔ عکس کچھ تشویش اور حیرانی سے اٹھ کر بیڈ روم سے باہر آئی تھی وہ باہر کارڈ روم کی نیم تاریکی میں قیود کارڈ کیوں کے پاس پڑی ایک کرسی پر بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ دروازہ کھلنے کی آواز پر اس نے نیم تاریکی میں عکس کو دیکھنے کی کوشش کی..... عکس نے کارڈ روم کی ایک فیشی لائٹ آن کر دی۔ وہ اسی طرح سگریٹ پیتا رہا، وہ آکر اس کے برابر میں پڑی کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔

”نیند نہیں آ رہی تھی۔“ شیردل نے سگریٹ کو منہ سے نکالتے ہوئے اس کی طرف دیکھ کر بغیر کہا۔

”میں جانتی تھی آئے گی بھی نہیں۔“ اس نے مدھم آواز میں کہا۔ شیردل نے اس کا چہرہ دیکھا پھر نظر چرائی۔

”اس سے بات کرو..... آخر وہ مصیبت میں ہے تو ہمیں اس کی مدد کرنی چاہیے، ہم اس کے کزن بھی ہو..... خون کا رشتہ ہے تمہارا اس سے..... محبت کا رشتہ نہیں بھی بھائی تو.....“ عکس نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تھا۔

☆☆☆

”سب کچھ بالکل ٹھیک ہے۔“ شہر بانو نے کچھ دیر کے لیے ماں کو دیکھتے رہنے کے بعد نظر میں ہٹائی تھیں۔ شرمین کا وہ سوال اس کے لیے غیر متوقع نہیں تھا لیکن شرمین کا اس طرح ایک دوسرے شہر سے اچانک اس کے پاس آنا غیر متوقع تھا۔ داؤد اور اس کے درمیان شروع سے ہی اختلافات ابھرنا شروع ہو گئے تھے اور شرمین ان اختلافات سے واقف تھی اس لیے شہر بانو نے اس کے اس سوال کو ہمیشہ کی طرح ایک روٹین کا سوال سمجھا تھا وہ دونوں ابھی رات کے کھانے کے بعد کافی کے گگ لے کر بیٹھی تھیں جب شرمین نے یہ سوال کیا تھا۔

”داؤد تیرے ہاتھ اٹھاتا ہے کیا؟“ شرمین کے اگلے سوال نے کافی کاسپ لیتی شہر بانو کو بخند کر دیا تھا۔ اس کا رنگ اڑا تھا اور شرمین نے بے حد تکلیف سے اپنی اولاد کے تاثرات نوٹس کیے تھے۔ ان کا دل اس کے تاثرات دیکھ کر جیسے ڈبا تھا۔

”آپ سے کس نے کہا؟“ شہر بانو نے ہاں یا نہ کہنے کے بجائے کافی کا کپ نیچے رکھ کر کچھ اضطراب کے عالم میں شرمین سے پوچھا۔

”شیردل نے“ شہر بانو کا دماغ جیسے بھک سے اڑ گیا۔ ”اس نے پرسوں فون کیا تھا مجھے..... مثال نے اسے تمہارے اور داؤد کے حوالے سے کچھ بتایا ہے، وہ بہت اپ سیٹ تھا۔ میں بھی بہت اپ سیٹ ہوئی، جھگڑوں کا تو میں جانتی تھی لیکن تم نے بھی یہ نہیں بتایا کہ معاملات اس حد تک بگڑ چکے ہیں۔“ شرمین نے بے حد اضطراب کے عالم میں کہتی رہیں اور شہر بانو آڑی ہوئی رنگت کے ساتھ عجیب صدمے کی کیفیت میں بیٹھی رہیں۔ وہ بھی شیردل کو بتانا چاہتی تھی کہ وہ بھی داؤد کے ساتھ اچھی زندگی گزار رہی تھی وہ کسی ہی اچھی زندگی جیسی وہ عکس کے ساتھ گزار رہا تھا لیکن اس کا بھانڈا اچھ چورا ہے پر چھوٹا تھا اور مثال وہ کیسے جانتی تھی..... وہ چلے بھر میں بہت سے لوگوں کے سامنے نظریں اٹھانے اور نظریں ملانے کے قابل نہیں رہی تھی۔

”اس نے مثال کو واپس لینے کے حوالے سے کچھ کہا ہے کیا؟“ شہر بانو نے بے حد اضطراب کے عالم میں کہا۔

”نہیں اس نے مثال کے حوالے سے کچھ نہیں کہا۔ صرف تمہارے حوالے سے بات کی۔“ شرمین نے کہا۔

”لیکن پھر کس لیے اسے آپ سے بات کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔“ شہر بانو نے جینن کی وہ یہ مانتے پر تیار ہی نہیں تھی کہ شیردل اس کے اور صرف اس کے حوالے سے شکوک ہو رہا تھا۔ وہ یہ سوچ کر بوکھلائی پڑی تھی کہ وہ مثال کی کسڈی کے حوالے سے اب ضرور اس سے بات کرے گا۔

”اس نے مجھ سے صرف یہ کہا کہ مجھے تمہارے بارے میں پتا ہونا چاہیے۔“ شرمین نے کہا۔ ”اگر داؤد اور تمہارا درمیان کوئی اختلافات ہیں تو مجھے ان کو ختم کرنے کی کوشش کرنی چاہیے، شرمین اسے بتا رہی تھی۔“ لیکن میں اسے کیا کہتی.....“ آپ نے اسے میرے اور داؤد کے جھگڑوں کے بارے میں بتایا؟“ شہر بانو کچھ اور اپ سیٹ ہوئی تھی۔

”because he hit him“ (کیونکہ وہ انہیں مارتے ہیں) مدھم آواز میں کہے ہوئے اس جملے نے

عکس کو کچھ دیر کے لیے فریئر کر دیا تھا۔ ”only sometimes..... I mean not always“ مثال نے ایک دم خود ہی جیسے پچھچھ کی یوں جیسے اپنی ندامت میں وہ معاملے کی عینگی کو کم کرنا چاہتی ہو۔

بعض انکشاف انسان کی سمجھ میں نہیں آتے عکس کو بھی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ وہ اس راز کو جاننے کے بعد کیا کرے..... مثال کو مزید کریدے یا اس کی طرح خاموش ہو جائے یا داؤد کو کلامت کرے یا شہر بانو سے ہمدردی..... مثال سر جھکائے اسکرینیل کے پسر جوڑنے میں مصروف تھی یوں جیسے وہ اس راز کو اس کے ساتھ شیئر کر لینے کے بعد اب نادم تھی۔ عکس شاک کے عالم میں اس کے پاس بیٹھی رہی..... اتنے عرصے میں اسے یہ اندازہ تھا کہ مثال اور شہر بانو کے درمیان بہت مسئلے ہیں مگر شہر بانو اور داؤد کے درمیان بھی سب کچھ ٹھیک نہیں تھا یہ اسے اندازہ نہیں ہوا تھا۔ ہو بھی کیسے سکتا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا وہ یہ بات شیردل سے شیئر کرے یا نہ کرے..... اور وہ مثال کے پورے قیام کے دوران اس ایک آنکھن کا شکار رہی تھی۔

”شرمین آئی کوئی سب پتا ہے؟“ اس نے اس دن مثال کے انکشافات کے بعد مثال سے پوچھا تھا۔

”I dont know“ جواب پھر مختصر تھا۔ عکس نے جیسے کوئی راستہ ڈھونڈنے کی کوشش کی تھی جو نام ہوئی تھی۔

مثال کے واپس جانے کے بعد عکس اس انکشاف کو اپنے ذہن سے نہیں نکال سکی اور اس نے بالآخر شیردل سے جب

ڈیک اینڈ پری بات شیئر کی تو وہ بھی کچھ دیر کے لیے اسی کی طرح ہکا بکا رہ گیا تھا۔

”میں سمجھتی تھی اسی وقت بتانا چاہیے تھا اس نے کہا تھا اور وہ اب بے حد مشکور نظر آنے لگا تھا۔

”میں بتانا چاہتی تھی لیکن ڈیل مائنڈ ہو گئی تھی۔“

”داؤد ایسا آدمی تو نہیں ہے کہ مار پیٹ کرے۔“ شیردل بہت الجھ گیا تھا، وہ داؤد کو بہت اچھی طرح جانتا تھا اور اس سے بہت باہل بھی جکا تھا۔

”لیکن کچھ نہ کچھ تو ہو رہا ہے ان کے گھر میں جو مثال کو ڈسٹرب کر رہا ہے۔“ عکس نے کہا تھا۔

”اگر وہاں یہ سب ہو رہا ہے تو پھر مثال کو وہاں نہیں ہونا چاہیے، میں اپنی بیٹی کو وہاں سے لے آؤں گا۔“ شیردل کو بات کرنے کے بعد احساس ہوا، وہ اسے بہت عجیب نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ ”کیا ہوا؟“

”تم صرف مثال کے بارے میں فکر مند ہو، شہر بانو کے بارے میں نہیں.....؟“ وہ دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے پکڑ دیر کے لیے بے حد خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے پھر شیردل نے اس سے نظریں ہٹائیں۔

”نہیں۔“ اس کے لہجے میں عجیب سی سرد مہری تھی۔

”مجھے یقین نہیں آ رہا شیردل۔“ عکس نے جیسے اسے سلامت کرنے والے انداز میں کہا۔

”مجھے کیوں پروا ہونی چاہیے؟ میرا اور اس کا کوئی رشتہ نہیں ہے۔“ شیردل نے کچھ اکھڑے ہوئے لہجے میں اس سے

کہا۔

”وہ تمہاری بیوی رہ چکی ہے۔ تمہاری بیٹی کی ماں ہے، کبھی تم اس سے بہت محبت کرتے تھے۔“ عکس نے جیسے اسے یاد

دلا یا۔

”تو.....؟“ اس نے بات کاٹتے ہوئے اسی انداز میں اس سے پوچھا۔

”تو تمہیں اس کی پروا ہونی چاہیے۔ بہت زیادہ نہیں تو تھوڑی بہت..... کم از کم اتنی جتنی ایک انسان کو کسی دوسرے

انسان کے لیے ہوتی ہے۔“ شیردل کچھ دیر خاموش رہا پھر اس نے کہا۔

”میرے پروا کرنے سے کیا ہوگا، میں کچھ نہیں کر سکتا اس کے لیے..... داؤد اس کا اپنا انتخاب تھا، اب اگر وہ انتخاب اس کے لیے ٹھیک نہیں نکلا تو کیا کر سکتا ہوں..... افسوس کرنے کے علاوہ.....“ وہ کہتا ہوا اٹھ کر وہاں سے چلا گیا تھا..... عکس وہیں بیٹھی رہیں۔ شیردل نے جو بھی کہا تھا بالکل ٹھیک کہا تھا کوئی بھی سمجھدار آدمی یہی کہتا۔ اس کے باوجود اسے جیسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ شہر بانو سے اس حد تک لائق ہو سکتا تھا اور کیسے ہو سکتا تھا اس نے اس کا اور شہر بانو کا تعلق ان کی شادی دیکھی تھی..... وہ شہر بانو کے بارے میں شیردل کی فیکٹو سے بھی واقف تھی۔ وہ بھی اس کی فیکٹو کے ہر دوسرے جملے میں آئی تھی اور وہ اب اس بات سے بھی جسے اسے کہہ دیا تھا کہ وہ تکلیف میں تھی۔ انسان کسی کو اتنی آسانی سے بھلا سکتا ہے؟ اتنی آسانی سے اس سے بے

☆☆☆

”تم اپنے پاپا سے میرے بارے میں بھی کبھی کوئی بات نہیں کرو گی۔“ شرمین دوسرے دن داؤد سے بات کے بغیر چلی گئی تھیں اور ان کے جانے کے بعد شہر بانو نے مثال کو پاس بٹھا لیا تھا۔

”میں نے پاپا سے آپ کے بارے میں کوئی بات نہیں کی۔“ مثال نے جواب دیا۔

”stop lying“ (جھوٹ بولنا) شہر بانو نے چاہتے ہوئے بھی rude ہوئی تھی۔

”I am not lying“ مثال بھی ماں کے اس طرح بات کرنے پر irritate ہوئی تھی۔

”تم نے پاپا سے کیوں کہا کہ۔۔۔“ شہر بانو کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اس جملے کو کس طرح مکمل کرے۔ مثال اس پر نظر پڑ جائے ہوئے تھی۔ ”میرے اور داؤد کے درمیان جو کچھ بھی ہوا وہ تمہارے پاپا کا مسئلہ نہیں ہے۔ تمہیں ان کو کچھ بھی بتانے کی ضرورت نہیں ہے، تم نے شیردل سے کیوں کہا کہ داؤد مجھے مارتا ہے۔“

”میں نے پاپا کو نہیں بتایا تھا۔“ مثال نے جواب دیا۔ ”اس کے جواب نے شہر بانو کی رہی سہی عزت نفس بھی اتار کر رکھ دی تھی۔ وہ بے بسی سے ہونٹ کاٹنے لگی تھی۔ وہ جیسے تمنا بن گئی تھی۔ ایک کے بعد ایک شکست عکس و شیردل کے سامنے اس کی زندگی کی بساط پر موجود مہروں میں سے کوئی چل نہیں پارتا تھا۔“

”آئندہ بھی ان لوگوں سے میرے بارے میں کچھ مت کہنا۔۔۔ I am warning you۔۔۔“ اس نے حلق کے بل چلا کر مثال سے کہا اور پھر روتے ہوئے کمرے نکل گئی۔ مثال سہم گئی تھی۔ مٹی اب ویسے کیوں نہیں رہتی تھیں جیسے پہلے رہتی تھیں۔ خوش۔۔۔ مسکراتے ہوئے۔۔۔ مجھ سے ڈھیروں باتیں کرنے والی۔۔۔ مٹی، عکس آنٹی جیسی کیوں نہیں ہوسکتی۔۔۔ وہ غصہ نہیں کرتیں۔۔۔ وہ shout نہیں کرتیں۔۔۔ وہ تو طوطی کے ساتھ اس طرح بات نہیں کرتیں جیسے میرے ساتھ۔۔۔ آنسوؤں سے بھری آنکھوں کے ساتھ مثال نہیں جانتی تھی وہ ایک ایسا موازنہ کر رہی تھی جو اگر شہر بانو جان جاتی تو اس کی اذیت میں اور اضافہ ہو جاتا۔

☆☆☆

خیر دین کی موت نے کچھ مہینوں کے لیے عکس اور شیردل کی توجہ شہر بانو سے ہٹا دی تھی۔ وہ عکس مراد علی کی زندگی کا ایک اور تکلیف دہ دور تھا۔ شیردل جیسا سادھی اگر اس کی زندگی میں نہ ہوتا تو اس تکلیف سے گزرنے اور سنبھلنے میں اسے بہت وقت لگ جاتا لیکن شیردل نے اسے سنبھال لیا تھا، وہ جانتی تھی خیر دین دنیا سے بہت مطمئن اور پرسکون ہو کر گیا تھا اور اس کی ایک وجہ شیردل اور طفل بھی تھے اور اس دوسرے بچے کی خبر بھی جو اسے خیر دین کی اس آخری علالت سے کچھ دن پہلے ملی تھی۔ خیر دین کے انتقال کے تین ماہ بعد عکس کو ایک دن مثال سے بات کرتے ہوئے اس مسئلے کا خیال آیا تھا۔ جو مثال نے اس سے شیئر کیا تھا۔

”وہ expect کر رہی ہے اور وہ داؤد کے ساتھ رہنا چاہتی ہے۔“ skype پر بات ختم کرنے کے بعد اس نے شہر بانو کے متعلق شیردل سے پوچھا تھا اور اس نے مدہم آواز میں اسے بتایا۔ وہ مزید سوال نہیں کر سکی۔ فیصلہ صحیح تھا غلط شہر بانو کا فیصلہ تھا اور ان حالات میں کیا کیا تھا جب اس کے پاس آپشن نہ ہونے کے برابر تھے۔ بات وہیں ختم ہو گئی تھی اور شاید یہ موضوع دوبارہ زیر بحث نہ آتا اگر چند ماہ کے بعد انہیں شہر بانو کے miscarriage کا پتا نہ چلتا، وہ جواب دیا کہ نہیں، شرمین یا مثال شیردل کو یہ نہیں بتا سکتے تھے۔ مگر وہ اور عکس دونوں ہی اس خبر کو کن کراپ سیٹ ہوئے تھے۔ عکس شہر بانو کی تکلیف اور ذہنی کیفیت کا اندازہ شیردل سے زیادہ اچھی طرح لگا سکتی تھی، خاص طور پر جب وہ خود ایسی حالت میں تھی۔ وہ پہلا موقع تھا جب وہ شہر بانو کو فون کیے بغیر نہیں رہ سکی تھی، جب شہر بانو کے miscarriage کو دو مہینے گزر چکے تھے۔ عکس مراد علی کے تعارف سے پہلے ہی صرف اس کی آواز سننے پر بھی وہ اسے پہچان گئی تھی۔ کچھ دیر کے لیے اس کے حواس نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ وہ کال آتی ہی unexpected تھی۔

”مجھے آپ کے miscarriage کا پتا چلا۔ بہت افسوس ہوا ہے۔ صرف اس لیے بات کرنا چاہتی تھی میں۔“ اس نے شہر بانو سے علیک سلیک کے بعد کہا تھا پھر اس کے جواب کا انتظار کیا۔ شہر بانو ایسی طرح چپ رہی۔۔۔ عکس نے چندا اور جملے بولے تھے۔ شہر بانو نے اس کا بھی جواب نہیں دیا۔ وہ ہمیشہ سوچتی تھی کہ وہ اگر کبھی عکس مراد علی سے بات کرے گی تو اسے

”تم نے مجھے یہ کیوں نہیں بتایا کہ داؤد تم پر ہاتھ اٹھاتا ہے؟“ شرمین نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے اس سے پوچھا۔

”پہلے ہاتھ نہیں اٹھاتا تھا۔۔۔ جب سے (بے روزگار) ہوا تھا بات بات پر بہت انگریسو ہو جاتا ہے۔۔۔“ اس نے چند لمحوں کے بعد عجیب سی ندامت کے ساتھ شرمین کو بتایا۔

”تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا میں اور فاروق تو دماغ درست کر دیتے اس کا۔۔۔ ایک بار پولیس کو کال کر دیتیں چار دن پولیس اسٹیشن رہ کر آتا تو دوبارہ تم پر ہاتھ اٹھانے سے پہلے سو بار سوچتا۔“ شرمین بہت غصیناک ہو کر اس سے کہہ رہی تھیں وہ ٹوکے بغیر ان کی بات سنتی رہی۔

”پھر اس کے بعد کیا ہوتا ایک بار پھر بریک اپ۔۔۔ مٹی میں بار بار گھر توڑا اور بنائیں سکتی۔“ وہ بات کرتے کرتے آبدیدہ ہو گئی تھی۔

”but you don't deserve this life“ شرمین بھی رنجیدہ ہوئی تھیں۔

”پتا نہیں میں کیا deserve کرتی ہوں کیا نہیں۔۔۔ لیکن بس ایک گھر بنائے رکھنا چاہتی ہوں میں اب۔۔۔ کچھ عرصے میں جا بھوجانے کی تو اس کا یہ پڑیشن وغیرہ بھی ختم ہونا شروع ہو جائیں گے۔“ وہ پتا نہیں کیا تو جیہہ دے رہی تھی اور کس کو دے رہی تھی۔

”اور اگر نہ ہوئے تو؟“ شرمین نے اس سے پوچھا۔

”آپ صرف میرے لیے دعا کریں۔“ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں ماں سے کہا۔

”میں داؤد کا دماغ درست کر دوں گی۔“

”مٹی آپ اس سے اس ایٹو پر کوئی بات نہیں کریں گی۔۔۔ میں گھر میں کوئی ہنگامہ نہیں چاہتی۔۔۔ آپ چلی جائیں گی لیکن مجھے تو یہیں رہنا ہے۔“ اس نے ماں کو دیکھا تھا۔

”تم ایک abusive relationship میں رہنا چاہتی ہو۔۔۔ کیوں؟“ اس نے بہت دیر تک خاموش رہنے کے بعد بھی ہوئی آواز میں کہا۔

”مٹی میں expect کر رہی ہوں۔“ چند لمحوں تک شرمین کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہے۔

”لیکن تم نے تو فیسی اشارت کرنے کا ارادہ ابھی ترک کر دیا تھا۔“ وہ ابھی تھیں۔

”ہاں۔۔۔ لیکن بعض چیزیں unexpected ہوتی ہیں۔“ اس نے مدہم آواز میں کہا۔

”اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تم abort کروا سکتی ہو اس بچے کو۔۔۔ اس mess میں پڑے رہنے کے لیے یہ بچہ زنجیر نہیں ہونا چاہیے تمہارے پیروں میں۔“ شرمین نے چند لمحوں کے بعد کہا۔

”جیسے آپ نے abort کروا دیا تھا۔“ اس کے سوال نے شرمین کو چند لمحوں کے لیے گونگا کر دیا تھا۔ ”میں یہ نہیں کر سکتی۔۔۔ میں اس بچے کو کسی چیز کی سزا نہیں دے سکتی۔“ وہ رنجیدگی سے کہہ رہی تھی۔ ”آپ اس بچے کو abort نہ کروا تیں تو میرا کوئی بہن بھائی ہوتا، کسی سے اپنی تکلیف شیئر کر سکتی میں۔“

جماد اور اسد۔۔۔

”وہ دونوں میرے بھائی نہیں ہیں۔ وہ آپ کے اور اکل فاروق کے بیٹے ہیں لیکن میرے بھائی نہیں ہیں۔“ شہر بانو نے اسے بات کرنے سے روک دیا۔

”تم نے ہمیشہ اپنے آپ کو دوسروں سے الگ تھلگ رکھا، گھٹنے ملنے کی کوشش کرتیں تو ان کے ساتھ بھی تمہارا کوئی ریلیشن شپ بن ہی جاتا۔“ شرمین نے اس کو blame کیا تھا اس بات کا احساس کیے بغیر کہ وہ ذہنی طور پر کس اذیت اور خود ترسی کا شکار تھی۔

”آپ ٹھیک کہتی ہیں۔۔۔ سارے flaws (خامیاں) مجھ میں ہی ہیں۔۔۔ ساری غلطیاں صرف میری ہیں۔۔۔ ساری قیمت بھی تو میں ہی ادا کر رہی ہوں اور میں ہی ادا کر دوں گی۔“ وہ رنجیدگی سے کہتے ہوئے کافی کا کپ وہیں چھوڑ کر چلی گئی تھی۔

ان کے ساتھ کچھ بھی شیئر کرنے کو تیار نہیں تھی۔
وہ اس سے اگلے سال پاکستان نہیں آسکی تھی۔ شہر بانو اس کے اور شرین کے ساتھ چٹینوں میں آسٹریلیا چلی گئی تھی۔
شیردل اپنی پروفیشنل مصروفیات میں اتنا مصروف ہو گیا تھا کہ اس کی امریکا کی جانے والی کالز میں بھی وقفہ آنے لگا تھا صرف
عکس بھی جواب بھی Skype کے ذریعے ہر دوسرے تیسرے دن فونل اور باڈل کے ساتھ مثال کی بات کروانے کی کوشش
کرتی رہتی۔

☆☆☆

جواب بہتر ہو گئی تھی لیکن جواب اور جواب سے متعلقہ مصروفیات بھی بہت زیادہ ہو گئی تھیں اور شہر بانو بالآخر اس زندگی اور اس
مصروفیت کی عادی ہونے لگی تھی، مصروفیت اچھی تھی کم از کم یہ اسے بار بار بچپتاؤں کے لیے وقت اور موقع نہیں دیتی تھی۔
میکائیلی زندگی تھی لیکن پھر بھی بہتر تھی۔

وہ مثال کی گیارہویں سالگرہ کے چند دن بعد کی بات تھی جب وہ آفس میں تھی اور اسے لنگ ٹائم کے قریب مثال کے
اسکول سے فون آیا تھا۔ انہوں نے اسے تفصیلات نہیں بتائی تھیں لیکن اسے فوری طور پر اسکول پہنچنے کا کہا تھا۔ شہر بانو بے حد
گھبراہٹ اور بدحواسی میں اسکول پہنچی تھی اور جو کچھ اسے وہاں جا کر پتا چلا تھا اسے لگا جیسے آسمان اس کے سر پر گر پڑا تھا۔
مثال کا ایرویک انسر کٹر اس سے زیادتی کی کوشش میں کسی دوسرے بچہ کی نظر میں آیا تھا اور پکڑا گیا تھا۔ خوش قسمتی صرف یہ
ہوئی تھی کہ مثال بروقت پہنچی تھی۔

اسکول ہیڈ ماسٹر میں اس واقعے کی تفصیلات بتاتے ہوئے اس سے معذرت کر رہی تھی اور شہر بانو منگ کچھ نہ سمجھتے ہوئے
اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی، یہ کیسے ہو سکتا تھا اور پھر اس کی بیٹی کے ساتھ۔ زندگی میں ابھی مبینہ کم تھیں، اس نے اپنے ہنڈے
ہوتے ہوئے وجود کے ساتھ سوچا، پھر جیسے وہ شدید غم و غصے کا شکار ہو کر رپیل پر برستی رہی تھی جو اس کی باتیں سن رہی تھی اسے
وضاحت دینے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کا اکریس چلا تو وہ اس کے انسر کٹر کو جا کر ابھی شوٹ کر دیتی۔ یہ کیسے ہوا کہ اس نے
اس کی مثال کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھا۔ رپیل نے اسے مثال کے رویے کے بارے میں کچھ بتانے کی کوشش کی تھی مگر وہ
تشویش کے عالم میں اس آفس سے نکل کر مثال کے پاس آگئی تھی وہ ایک دوسرے آفس میں بیٹھی تھی، اس نے ماں کو ایک نظر
دیکھا تھا لیکن پھر اسی طرح سر جھکا لیا جیسے اس نے پہلے جھکا یا ہوا تھا۔ وہ اس کے قریب آئی اور اس نے اسے لگے لگایا تھا مثال
نے کسی رد عمل کا اظہار نہیں کیا۔ وہ گم سم تھی، شہر بانو کو لگا وہ شاک میں تھی وہ اسے لے کر کھر آئی۔

ایرک چند مہینے پہلے ہی اس کے اسکول میں آیا تھا اور مثال مسلسل اس سے اس کا ذکر کر رہی تھی اور یہ بے حد
Unusual تھا کیونکہ مثال بہت کم اس طرح اسکول کے کسی بچہ کی تعریف یا باتیں کرتی تھی اور اب وہی ایرک اس کی
زندگی تباہ کرنے کا سبب بنتے بنتے رہ گیا تھا۔

وہ رات شہر بانو کی زندگی کی ایک اور مشکل راتوں میں سے ایک تھی۔ وہ ایک چیز جس کو اس نے کبھی تسلیم نہیں کیا تھا وہ
اس رات جا کر اس نے بالآخر تسلیم کر لی تھی۔ وہ بھی تب جب وہ ماں کے طور پر اس anguish سے گزر رہی تھی، پہلی بار
زندگی میں اس نے مان لیا تھا کہ اس کے پاپا نے عکس مراد علی کے ساتھ زیادتی کی ہوئی تھی۔ وہ اس کی زندگی کے ہر دور پر فرشتے
تھے۔ عکس مراد علی کی زندگی کے ولن تھے۔ اور عکس مراد علی نے ان پر جو الزام لگایا تھا وہ ناقابل یقین سہی لیکن ناممکنات میں
سے نہیں تھا۔ اس رات پہلی بار اس نے آئینے میں حقیقت اور سچ کا وہ چہرہ دیکھنے کی کوشش کی تھی جو وہ ہمیشہ جھٹلاتی رہی تھی۔
شرمین کے انکشافات کے باوجود بھی۔ پہلی بار اس نے اپنے باپ کی بیٹی بن کر نہیں صرف غیر جانبداری سے سوچا تھا اور وہ
اپنے آپ سے نظریں نہیں ملا سکی تھی اور شاید یہی وہ احساس تھا جس سے بچنے کے لیے وہ اتنے سالوں سے اپنے باپ کو مجرم
ماننے سے انکار کر رہی تھی۔ وہ اسے مجرم مان لیتی تھی تو وہ ایک شخص بھی اس کی زندگی کی اس فہرست سے غائب نہ ہو جاتا جسے
اس نے آئیڈیل کا درجہ دیا ہوا تھا۔ اور زندگی میں ایک آئیڈیل کو انسانیت سے کر کے دیکھا انسان کی ساری قد ریں بھلا دیتا
ہے خاص طور پر جب وہ آئیڈیل ایک خونی رشتہ بھی ہو۔

☆☆☆

”شہر بانو نے فون کیا تھا مجھے۔۔۔۔۔۔ وہ پاکستان آ رہی ہے۔“ شیردل ڈنر پر اس رات عکس کی بات سن کر حیران رہ گیا تھا۔

اس پر شدید غصہ آئے گا وہ اسے بہت برا بھلا کہے گی لیکن کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ وہ بھر پھر کر وقفے وقفے سے اس کے جواب کے
انتظار میں پولتی رہی تھی اور شہر بانو فون روٹی رہی تھی۔ اسے زندگی میں کم از کم اس عورت کی ہمدردی نہیں چاہیے تھی لیکن اسی عورت
کی ہمدردی سے اس کے اندر کا غصہ اور خفگی آنسو بن کر بہنے لگے تھے۔

”میں نے فونل کی تصویریں دیکھی ہیں وہ بہت خوب صورت ہے۔ شہر بانو کو کبھی میں نہیں آیا اس وقت فونل کیسے یاد
آ گیا تھا اور اس کا ذکر وہ بھی تب۔۔۔۔۔۔ جب عکس اس سے کچھ اور بات کر رہی تھی۔

عکس نے اس کی آواز کی بھراہٹ محسوس کی تھی پھر اس کے لفظوں کی بے ربطی بھی۔۔۔۔۔۔ وہ آنسو جو فونل لائن کے ایک
طرف تھے اب دوسری طرف بھی بہنے لگے تھے۔ اس نے شہر بانو سے مزید کچھ کہنے کی کوشش کی مگر شہر بانو نے فون بند کر دیا۔
وہ عکس مراد علی کے سامنے ریت کی دیواری طرح ڈھے نہیں جانا چاہتی تھی۔ اپنا کچھ مجرم رکھنا چاہتی تھی۔ عکس نے اس کے بعد
کئی بار اسے فون کرنے کی کوشش کی تھی وہ یا تو کال ہی نہیں لیتی تھی اور اگر لیتی تو اس کی آواز سننے ہی فون بند کر دیتی۔

پانچویں مہینے میں ہونے والے اس miscarriage نے شہر بانو کی صرف ذہنی اور جذباتی کیفیت کو متاثر نہیں کیا
تھا بلکہ اس کی شادی کو بھی بری طرح ہلا دیا تھا۔ شہر بانو اس ایک حادثے سے اتنا بے سیٹ نہیں ہوئی تھی جتنی اس پر کینسر کے
دوران مس کیرج کے بعد داؤد کی سرد مہری اور بے نیازی سے۔۔۔۔۔۔ اسے نہ اس کی پریکٹس کی ایکسٹنٹ بھی نہ ہی بچے کے
ضائع ہونے پر کسی طرح کی کوئی پریشانی یا فوس۔ وہ اس کے مس کیرج کے دن اسے اسپتال میں اکٹلا چھوڑ کر کسی جاگ
انٹرویو کے لیے چلا گیا تھا۔ فائنل گرامر اور روپے پیسے کی بچی انسان کو صرف توڑتی ہے لیکن اپنے خونی رشتوں اور لائف
پارٹنر کی خود غرضی اور بے حسی انسان کو مزید مزید کر کے رکھ دیتی ہے۔ شہر بانو کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔

تقریباً چھ ماہ گزرنے کے بعد وہ بالآخر اس شادی کا بوجھ اٹھاتے اٹھاتے تھک گئی تھی۔ اسے تب تک یوں لگنے لگا تھا کہ
وہ اگر چند ماہ اور اس شادی میں رہی تو پھر شاید وہ اس کے بعد ذہنی امراض کے کسی اپتال میں پائی جائے گی۔

مثال ان دنوں ایک بار پھر چٹینوں میں پاکستان تھی۔ جب شہر بانو اور داؤد کے درمیان طلاق ہوئی تھی۔ وہ اس طلاق
کے بعد شرین اور فاروق کی ہزار کوششوں کے باوجود ان کے پاس جا کر رہنے پر تیار نہیں ہوئی۔ وہ اب مثال کے ساتھ کوئی
اپارٹمنٹ کرائے پر لے کر اکیلے رہنا چاہتی تھی۔ جواب اس کی اچھی تھی اور وہ مثال کے ساتھ آرام سے رہ سکتی تھی۔ اسے اب
شیردل کی اس ماہانہ بھیجی جانے والی رقم کی بھی ضرورت نہیں تھی۔

☆☆☆

”آئی میں ممی کے پاس نہیں جانا چاہتی آپ مجھے نہیں رہنے دیں میں طوطی اور باڈل کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔“
چٹیناں ختم ہونے کے قریب پہنچنے پر مثال نے ایک دن بہت اکٹھا ہٹ آمیز انداز میں عکس سے کہا۔

”بیٹا تمہاری ممی کو اس وقت تمہاری بہت ضرورت ہے وہ وہاں اکیلی ہیں، عکس نے اسے سمجھایا تھا وہ شہر بانو اور داؤد کی
طلاق کے بارے میں جان چکی تھی۔

”ممی کو میری ضرورت نہیں ہے۔ وہ میرے بغیر بھی بہت خوش ہیں۔ She can live without me“ وہ عکس کے سمجھانے پر جیسے بہت مایوس ہوئی تھی اور بہت دیر تک عکس سے امریکا نہ جانے کے لیے
مضد کرتی رہی تھی۔ وہ پہلا موقع تھا جب اس نے عکس سے کسی بات پر ضد کی تھی، عکس حیران تھی وہ کیوں شہر بانو کے ساتھ رہنے
پر تیار نہیں تھی۔

”وہاں کچھ بھی نہیں ہے۔ ممی کے پاس میرے لیے ٹائم ہی نہیں۔ میں سارا دن اکیلے رہتی ہوں، اکیلے کمپیوٹر پر گیمز
کھیل کھیل کر تھک جاتی ہوں۔“ اس آٹھ سالہ بچی نے عجیب بے بسی اور بے چارگی سے عکس کے ساتھ اپنی تکلیف شیئر کی تھی وہ
بہت دیر اسے بیٹھ کر سمجھاتی رہی تھی۔ مثال نے بالآخر خدشہ ختم کر دی تھی لیکن وہ بے حد مایوس اور دل گرفتہ تھی۔

وہ پہلا موقع تھا جب اس کے پاکستان سے چلے جانے کے بعد بھی عکس نئی دن اس کے بارے میں سوچتی اور پریشان
ہوتی رہی۔ ہمیشہ کی اس طرح امریکا جاتے ہی اس نے Skype پر ان سے رابطہ نہیں کیا تھا۔ وہ کئی ہفتوں کے بعد
Skype پر آئی تھی اور اس پر ایک نظر ڈالتے ہی عکس اور شیردل کو اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کسی وجہ سے بہت اپ سیٹ ہے لیکن وہ

he did to you۔“ (جو کچھ انہوں نے کیا میں اس پر معافی چاہتی ہوں) زندگی عجیب شے ہے بعض دفعہ وہ باتیں ان سے کہلاتی ہے جن سے آپ کو کبھی وہ سننے کی توقع تک نہیں ہوتی۔ عکس اس کا چہرہ دیکھ کر رہ گئی جس کی آنکھیں اس وقت آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ ایک ایک کر زبان سے کی گئی معذرت سے زیادہ موثر اس کی آنکھوں اور چہرے پر تحریر شرمندگی اور ندامت کا احساس تھا۔

عکس نے خود پر قابو پایا تھا وہ یہاں لان میں بیٹھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونا نہیں چاہتی تھی بہت نرمی سے اس نے شہر بانو کے کمرے کے بچے پر دھرے ہاتھ کو کھینچا۔

”وہ سب گزر گیا۔“ بہت عرصہ ہو گیا۔ میں نے اب اس کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیا ہے۔ تمہیں شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے نہ ہی کسی معذرت کی۔ اس سب میں تمہارا کوئی قصور نہیں تھا۔“

”ہاں لیکن میں اس فیملی کا حصہ ہوں اور اس حوالے سے اپنے رول پر شرمندہ ہوں۔ صرف پاپا نے تمہیں تکلیف نہیں پہنچائی میں نے بھی۔“ شہر بانو بات کرتے کرتے رک گئی تھی۔

”تمہاری فیملی نے مجھے بہت تکلیف پہنچائی لیکن تمہاری می نے میرے نانا کی مالی مدد بھی کی تھی اس وقت جب ہم مالی طور پر بالکل جاہ ہو چکے تھے۔“ اس نے جیسے شہر بانو کا احساس جرم کم کرنے کی کوشش کی تھی۔

”ایک لاکھ کی رقم وہ جو انہوں نے میرے نانا کو دی تھی۔ انہوں نے اسی رقم سے اپنی اور میری زندگی دوبارہ بنائی تھی۔“ شہر بانو نے کچھ الجھتے ہوئے اسے بات جاری رکھنے سے ٹوک دیا۔

”میں نے تمہارے نانا کو کوئی رقم نہیں دی تھی۔ وہ چپکے لے کر گئی تھیں اور انہوں نے تمہارے نانا کو وہ رقم لینے پر مجبور کیا تھا لیکن انہوں نے وہ رقم نہیں لی تھی۔ میں نے مجھے خود بتایا تھا۔“ عکس چند لمبے پلٹیں جھپکائے بغیر اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔ وہ خیر دین کی زندگی کا پہلا جھوٹ تھا اس سے اور وہ جھوٹ بھی کس جگہ آکر ٹھکاتا تھا۔ وہ اسے شہر بانو کی ماں کا احسان مندر کے شہر بانو کا گھر توڑنے سے بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے اپنی چڑیا کے گرد احسان کی کشمن رکھا چینی کی کیونکہ اسے یقین تھا وہ احسان فراموشی نہیں کر سکتی تھی۔ وہ اس شخص کی بیٹی کا گھر اور زندگی بچانے کی کوشش کر رہا تھا جس نے خود اس کی اور اس کی چڑیا کی زندگی تباہ کر دی تھی۔ وہ کیسا انسان تھا۔ عکس بہت دیر تک چپ رہی، کبھی سلجھانے میں اسے چند سیکنڈز لگے تھے لیکن اس کیفیت سے نکلنے کے لیے بہت دیر۔ وہ جو ایک بوجھ اس کے نانا نے اس کے کندھوں پر رکھ کر اسے جھکا یا تھا وہ اس انکشاف نے اٹھایا تھا۔ کیسا سکون اور اطمینان تھا جو عکس مراد علی نے محسوس کیا تھا۔

”Thank you۔“ اس نے شہر بانو سے کہا۔

”کس چیز کے لیے؟“ وہ الجھی۔

”ایک بوجھ ہٹانے کے لیے۔“

☆☆☆

شیر دل کو لگا عکس کا دماغ خراب تھا۔

”اب تم بہت کہنا کہ میرا دماغ خراب ہو گیا ہے۔“ اس نے شیر دل کو جیسے کسی کتاب کی طرح پڑھا تھا۔ مثال کو پاکستان میں دو ہفتے ہو چکے تھے۔ شیر دل اتنے سالوں بعد اپنی بیٹی کے اپنے پاس آ جانے پر بے حد خوش اور پُر سکون تھا۔ اسے لگا تھا زندگی ایک بار پھر سے مکمل ہو گئی تھی اور اب اچانک اس رات عکس نے اس سے یہ بات کہہ دی تھی۔

”اگر یہ مذاق ہے تو بہت بد مذاق ہے۔“ شیر دل نے کچھ خفا ہو کر اس سے کہا تھا۔

”میرا اینس آف ہیومر برا ہے لیکن اتنا برا بھی نہیں کہ میں اس طرح کی باتیں مذاق میں کرنے لگوں۔“ عکس نے جواباً بہت بخجندی سے کہا۔

”میں شہر بانو سے شادی کر لوں؟“ شیر دل نے بے یقینی سے اس کے جملے کو دہرایا۔

”ہاں۔“ اس کے انداز میں اطمینان تھا جس نے شیر دل کو ہلا دیا۔

”میں ساری زندگی بس یہی کرتا رہوں کہ چار چار سال بعد شادی۔۔۔۔۔ تم سمجھتی ہو شادی کے علاوہ میرے پاس کرنے کے لیے اور کوئی کام نہیں ہے۔ مجھے نہیں پتا تمہیں بیٹھے بٹھائے شہر بانو سے ہمدردی کا دورہ پڑا ہے یا کوئی اور وجہ ہے

”تمہیں فون کیا تھا۔۔۔۔۔؟ اکیلی آ رہی ہے؟“

”ہاں۔۔۔۔۔ مثال کو لے کر آ رہی ہے، مجھے سے ملنا چاہتی ہے۔“

”کس لیے؟“

”پتا نہیں۔۔۔۔۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آئی۔۔۔۔۔“ وہ دونوں ہی کچھ حیران اور الجھے ہوئے تھے۔ عکس نے شیر دل سے یہ بات

شیر نہیں کی لیکن پتا نہیں کیوں اسے یہ لگا تھا جیسے شہر بانو، مثال کو اس کے پاس چھوڑنے کے لیے آ رہی تھی۔ شاید وہ دوبارہ شادی کرنا چاہتی تھی اور مثال کی وجہ سے اسے کسی پریشانی کا سامنا تھا اس لیے اس نے اسے شیر دل کو دے دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ عکس سوچ رہی تھی اور وہ تب تک یہ سارے اندازے لگا رہی تھیں جب تک شہر بانو ان کے گھر آئیں گی۔

پہلی نظر شہر بانو پڑا۔ لےنے ہی اس کو شک لگا تھا۔ دس بیس سال نہیں گزرے تھے بس پانچ سال ہی تو گزرے تھے مگر وہ اپنی عمر سے کئی سال بڑی لگنے لگی تھی۔ چھکن اور خشکی جیسے اس کے چہرے پر لکھی ہوئی تھی۔ عکس کو اسے دیکھ کر تکلیف ہوئی تھی۔

”تم نہیں ملو گے اس سے؟“ اس نے پچھلی رات شیر دل سے پوچھا تھا۔

”نہیں۔“ اس نے جواباً کہا۔

”ملنا چاہیے۔“

”کیا کروں گا؟“ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا اور ٹھیک کر رہا تھا کہ اس سے ملنے کے لیے وہاں نہیں تھا۔ عکس نے سوچا تھا شہر بانو کے لیے اس گھر میں اسے اور شیر دل کو ایک جوڑے کے طور پر دیکھنا بہت تکلیف دہ ہوتا۔ کسی کے لیے بھی ہوتا۔۔۔۔۔ اور شیر دل کے لیے ان دونوں عورتوں کے ساتھ ایک ہی میز پر بیٹھنا بہت آکڑ ہو جاتا۔

عکس کا اندازہ ٹھیک تھا وہ مثال کو مستقل طور پر وہاں چھوڑنے آئی تھی اور وہاں آنے کے چند منٹوں بعد ہی اس نے عکس کو یہ بتا دیا تھا۔

”کل واپسی کی فلائٹ ہے میری۔۔۔۔۔ بس رک نہیں سکتی، میں چاہتی تھی کہ مثال کو خود یہاں چھوڑ جاؤں۔“ عکس نے اسے رکنے کے لیے کہا تھا اور اس نے جواباً کہا تھا۔ وہ دونوں اس وقت لان میں بیٹھی ہوئی تھیں اور ان سے کچھ فاصلے پر مثال، طغزل اور یازل کے ساتھ بڑے جوش و خروش کے عالم میں کھیل رہی تھی۔ وہ ایک happy family تھی جس کا شہر بانو جھڑپ نہیں تھی۔ شہر بانو نے ایک لمحے کے لیے ان سب کو دیکھتے ہوئے سوچا اور کم از کم اب اس کی زندگی اس تنہائی میں نہیں گزرے گی جس میں اس کا اپنا بچہ گنرا تھا۔

”کل رات کی فلائٹ ہے۔۔۔۔۔ تم اگر کل دوپہر کو کبھی نکلو تو بہت آرام سے پہنچ سکتی ہو۔۔۔۔۔ لاہور زیادہ دور تو نہیں ہے یہاں سے۔“ عکس نے اس کے آج ہی واپس جانے کے ارادے کو جان کر کہا۔ ایک عجیب سے آکڑ کیفیت کا شکار تھیں وہ

دونوں اس وقت۔۔۔۔۔ بات کرنے میں جھجک ہو رہی تھی۔ خاموش بیٹھے رہنے میں شرمندگی۔

”مثال یہاں رہے گی تو تم اکیلے امریکا میں کیسے رہو گی؟“ عکس نے اس سے پوچھا۔ یہ اندازہ کر لینے کا باوجود وہ مثال کو اس کے پاس چھوڑ دینے کے ارادے سے آ رہی تھی۔ حیران تھی کہ شہر بانو نے اتنا بڑا فیصلہ کیسے کر لیا تھا۔

”میں اور مثال ایک ساتھ رہتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے بہت دور ہیں۔ ہم دونوں ساتھ رہتے ہوئے بھی اکیلے ہیں۔ مجھے اس زندگی کی عادت ہو گئی ہے لیکن میں نہیں چاہتی مثال کو اس زندگی کی عادت ہو۔ میں چاہتی ہوں وہ شیر دل کے پاس رہے۔ اس کے پاس پلے ہوئے۔“ شہر بانو نے مدہم آواز میں کہا۔ وہ اب بھی اسے وہ وجہ بتانے کی ہمت نہیں کر سکتی تھی جس نے اسے اتنا بڑا فیصلہ کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ جس نے اسے یہ احساس دلایا تھا کہ وہ ایک غیر ذمے دار ماں ہے جو ایک بچی کی بھی حفاظت نہیں کر سکتی۔۔۔۔۔ اور مثال کے ساتھ آئندہ کچھ برائے ہو اس خوف نے اسے مثال کو شیر دل کے پاس لانے پر مجبور کر دیا تھا۔

”میں تم سے معافی بھی مانگنا چاہتی تھی۔“ عکس اس کی بات سنتے سنتے اس کے جملے پر چونک پڑی۔

”مجھ سے معافی۔۔۔۔۔ کس چیز کی؟“ وہ واقعی نہیں سمجھتی تھی۔

بہت دیر خاموش رہنے اور کچھ کہنے کی ہمت جمع کرنے کے بعد اس نے بالآخر عکس سے کہا۔

”پاپا نے جو کچھ کیا تھا بہت غلط تھا۔۔۔۔۔ بہت غلط۔۔۔۔۔ I am sorry for what

اسے باپ جیسی محبت دیں گے اور اس کی کمی کے ساتھ ٹی کررہے تھے ہیں لیکن اس کے بدلے وہ اس سے یہ چاہتے تھے کہ وہ..... عکس بہت ساری ای میلوں کو مکمل پڑھ بھی نہیں سکتی تھی، اسے لگا وہ غلامت اور گندگی کے ڈھیر پر بیٹھی تھی۔ باہر کی کوئی غلامت اور تعفن انسان کے ذہن کے اندر موجو غلامت اور تعفن کا مقابلہ نہیں کر سکتا، عکس کو کبھی کبھی اچھا تھا وہ بھی غلامت کے ایسے ہی تعفن زدہ ڈھیروں کو دیکھ رہی تھی جو معاشرے کے اچھے اور فعال شہریوں کے طور پر یہ ظاہر اپنی اپنی زندگیاں دوسروں کی زندگیوں کے پرچنے اڑا کر گزار رہے تھے۔ digital کیمرے سے بنائی ہوئی وہ تصویریں اس نے پتے کی طرح لرزے وجود کے ساتھ ان ای میلوں سے delete کر دی تھیں جو ان میں سے چند لوگوں کے مطالبے پر گیارہ سال کی اس بچی نے ان کو بھیجی تھیں۔ وہ نہیں جانتی تھی شہر دل ان تصویروں کو دیکھے، ایک باپ کے طور پر وہ ان تصویروں کو دیکھ کر شاید دوبارہ کبھی یہ بھی نہیں اٹھاسکتا تھا۔ انہی ای میلوں میں سے ایک ای میل میں ایک کے ساتھ ہونے والے اس واقعے کی تفصیلات بھی تھیں جو مثال نے انہی میں سے کسی دوسرے مرد سے شیئر کی تھیں۔ وہ ایڈر گماتی اس دوسرے شخص کی جوابی ای میل پوری نہیں پڑھ سکتی تھی۔ وہ بچی اور اس کی تکلیف ان سب مردوں کے لیے فٹ بال کا کام کر رہی تھی..... باپ شاید ایک رولنگ اسٹون.....

مثال کی زندگی میں چنیا کی طرح سات دوست بوئے نہیں تھے جن کے لیے وہ اسنووائے تھی۔ اس کی زندگی میں چند گلدہ تھے جن کے سامنے وہ ایک مردار سے زیادہ کچھ نہیں تھی۔

عکس نے ای میل پر دھنی بند کر دیں۔ وہ اس جنم سے گزری تھی، اس دور سے واقف تھی جس جنم کی لپیٹ میں اس نے مثال کو دیکھا تھا..... اور اسے لگا اس کا جو دایک بار پھر جلے گا تھا۔ وہ بھی تو شہباز حسین کی طرف اسی لیے جاتی تھی کیونکہ وہ اسی کی پشتر میں اور شہر بانو کی زندگی کا حصہ بننا چاہتی تھی۔ اس پرفیکٹ لائف کا حصہ جسے وہ ہر روز لان میں اور اس گھر میں دیکھتی تھی..... وہ بھی کہیں نہیں شہباز حسین میں وہ باپ دیکھتی تھی جو اگر اس کے اور علیہ کے ساتھ ہوتا تو وہ

[illegible]

لیکن مجھے اس طرح کی مصیبت اپنے گلے میں ڈالنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ تمہیں شہر بانو نے ایسا کچھ کہا ہے؟“ شہر بانو اس کی بات پر بری طرح ہنستے سے اٹھ رہا تھا۔ وہ یہ جانتا تھا کہ پاکستان سے جانے کے بعد بھی شہر بانو اور عکس آپس میں رابطے میں نہیں رہیں اور یہ روز روز کا رابطہ اس کے لیے غیر متوقع یا حیران کن تھا۔ لیکن اس کا خیال تھا اس کی وجہ صرف مثال تھی اور کچھ نہیں۔

”مجھے شہر بانو نے کچھ نہیں کہا۔“ عکس نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔
 ”پھر؟“

”میں صرف تمہاری بیٹی کی زندگی بچانا چاہتی ہوں۔“ وہ اس کی بات پر بری طرح ٹھٹھا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟ مثال کو کیا ہوا ہے؟ وہ میرے پاس ہے..... بہت خوش اور مطمئن ہے۔“ وہ عکس کی بات سمجھ نہیں سکتا تھا۔

عکس کچھ کہنے کے بجائے کمرے میں پڑا ہوا اپنا لیپ ٹاپ اٹھا لاتی تھی۔ اس نے فیس بک کھولی، وہ مثال کی آئی ڈی تھی وہ عکس کا لیپ ٹاپ استعمال کرنے کے بعد سائن آؤٹ کرنا بھول گئی تھی۔ عکس نے اس کی سینٹ ای میل کھولی۔ وہ بہت ساری میلز پر بھرا ہوا تھا۔ جن میں سے زیادہ بڑی تعداد ایرک ٹیوٹی کے نام تھیں اور کچھ دوسرے مردوں کے نام جو بڑی عمر کے مرد تھے، انہیں پڑھتے ہوئے اس نے لیپ ٹاپ شیردل کی گود میں رکھ دیا، وہ اچھے ہوئے انداز میں ان ای میلز کو دیکھنے لگا۔

وہ ایک گیارہ سالہ لڑکی کی زندگی کے demons تھے۔ سوشل نیٹ ورک اور اپنے آس پاس کے لوگوں میں اپنے لیے ایک باپ جیسے شخص کی تلاش کی کوشش..... اس بے لوث پدری محبت کی تلاش کی کوشش جس کے لیے وہ کچھ بھی کرنے پر تیار تھی۔ کسی بھی حد تک جانے پر تیار تھی۔ وہ محبت، باپ کی محبت اور exploitation میں فرق نہیں کر پا رہی تھی۔ ان مردوں کو کبھی ہوئی ہر ای میل کے ٹوٹے پھوٹے جملوں میں صرف ایک ہی پکار تھی۔ ”مے ڈے..... مجھے بچائیں۔“ وہ ان تمام بڑی عمر کے مردوں کو بتا رہی تھی کہ وہ اپنے باپ سے بہت پیار کرتی تھی اور وہ ان کی سوئٹ ہاؤس، مٹی، ڈائریکٹ کے القابات میں پھنسی ہوئی ہوس کو بھی شیر دل کی اپنے لیے محبت کے برابر لاکھڑا کر رہی تھی۔ وہ انہیں بتا رہی تھی کہ اس سے کوئی محبت نہیں کرتا..... وہ اپنی مٹی کے پاس رہتی ہے جس کے پاس اس کے لیے وقت نہیں اور وہ اس سے نفرت کرتی تھی..... اور اس طرح اس کی پاپا کی زندگی میں آنے والی ایک witch (چڑیل) نے ان کا خوب صورت گھر توڑ دیا تھا۔ وہ اب شیر دل سے بھی نفرت کرتی تھی کیونکہ وہ طفل دل اور باڈل سے اس سے زیادہ محبت کرتا تھا اور اس نے اس کی مٹی کو چھوڑ دیا تھا۔ ان ای میل میں یہ بھی لکھا تھا کہ وہ بکلی باشرہ با نوکوراتوں کو روٹے دیتا تھی اور وہ اس گھر سے بھاگ جانا چاہتی تھی کیونکہ وہ مٹی کے لیے کچھ نہیں کر سکتی لیکن وہ مٹی کے لیے کچھ کرنا چاہتی تھی اور وہ سوچتی تھی probably اگر مٹی کو ایک اچھا آدمی مل جائے جو مٹی اور اس سے دونوں سے پیار کرے تو وہ بھی ایک اچھا گھر بنا سکتے ہیں..... جیسے شیر دل اور عکس اور طفل دل اور باڈل کا تھا۔

عکس نے اس دن مثال کے laptop استعمال کرنے کے بعد اتفاقاً ای میل کرنے کے لیے laptop اٹھایا
 تھا اور وہ facebook id سامنے آ جانے پر غیر ارادی طور پر اس کی ای میل پڑھنے لگی تھیں۔ وہ ای میل نہیں تھیں،
 مثال کی زندگی کا جہنم تھا جسے اسے دیکھنے کا موقع مل گیا تھا۔ ایک گیارہ سالہ بچی جو اپنے ماں باپ کی طلاق کے بعد ان
 دونوں سے love-hate ریلیشن شپ میں تھی اور جو ان لوگوں سے اپنی تکلیف شیئر کر رہی تھی جو اسے
 fatherly, loving and kind لگ رہے تھے اور وہ ان کی توجہ اور محبت پانے کے لیے ان کے
 ساتھ رہنے کے لیے وہ سب کچھ کرنے کو تیار تھی جو وہ چاہتے تھے۔ عکس کسی بت کی طرح ماؤف ذہن کے ساتھ ان
 مردوں کی ای میل پڑھ رہی تھی..... گویا کدو کی ای میل جو ایک گیارہ سالہ بچی کے ذہن، شخصیت اور زندگی کو اپنی
 شہوت اور ہوس بھرے الفاظ اور ذہنی گندگی کے نوکے پتوں سے نوح نوح کر کھا رہے تھے جو اس بچی کو تارے تھے کہ وہ

کے باوجود چھوڑنے پر تیار نہیں تھا۔

برآمدے کی قد آدم کھڑکی کے سامنے کھڑے شیردل نے لان میں ایک پتنگ کو بلند سے بلند کرنے کی سرکوتہ جدوجہد میں مصروف اپنے متبوں بچوں کو مدھم سکر اہٹ کے ساتھ دیکھا تھا۔ وہ گرمیوں کی چھٹیوں میں شیردل کی پوسٹنگ کے دوران وہاں آئے تھے۔ عکس اسلام آباد میں کسی کانفرنس میں مصروف تھی اور اسے ایک ہفتے کے بعد وہاں سے فارغ ہونا تھا ابھی کچھ دیر پہلے وہ فون پر اس سے بات کر رہا تھا اور وہ چند منٹ پہلے ہی فون رکھ کر باہر آیا تھا جب شام کو مٹین کھیلنے کے لیے جاتے جاتے وہ ان لوگوں کو دیکھ کر کھڑک گیا تھا۔

”تم نے جانا نہیں؟“ شہر بانو کی آواز نے اسے چونکا دیا تھا، وہ شیدلان میں بچوں کے پاس جانے کے لیے نکلی تھی۔

”جارہا تھا بچوں کو دیکھ کر کھڑک گیا۔“ اس نے پلٹ کر شہر بانو کو مسکرا کر دیکھا۔ وہ بھی اس کے قریب آگئی اور باہر دیکھنے لگی۔

”طفعل کاٹ فلائنگ میں ایکپرٹ ہوتا جا رہا ہے۔“ اس نے فضا میں بلند اس پتنگ کو مہارت سے اڑاتے ہوئے طفعل کو دیکھ کر ستائشی انداز میں شیردل سے کہا۔

”ہاں بیٹا کس کا ہے۔“ شہر بانو اس کی بات پر مسکرا دی۔

”دعس کا۔“ وہ اس کی بات پر بے اختیار ہنس پڑا تھا۔

”میں ذرا باہر جا رہی ہوں، باڈل کو کیوں نہیں پکڑا رہے یہ دونوں پتنگ۔۔۔۔۔ وہ بے چارہ کس طرح بار بار کہہ رہا ہے۔۔۔۔۔ یہ ہمیشہ اس کے ساتھ اسی طرح کرتے ہیں۔“ وہ کھڑکی کے باہر پتنگ پکڑنے کے لیے ان دونوں کے پیچھے بھاگتے باڈل کو دیکھ کر پھر بے چین ہوئی تھی۔ شیردل کے کچھ کہنے سے پہلے وہ تیز قدموں سے باہر نکل گئی تھی۔ وہ تب بھی وہیں کھڑا رہا۔

کئی سالوں کے بعد بالآخر ان سب کی زندگی میں وہ مدوجز اور تلاطم ختم ہو گیا تھا جو انہیں گرداب کی گردش بنائے ہوئے تھا۔ باڈل، شہر بانو کو باہر آتے دیکھ کر اس کی طرف شکایت کرنے کے لیے بھاگ پڑا تھا۔ وہ اب ان کے درمیان صلح صفائی کروانے میں مصروف تھی۔ پتا نہیں کس بے دھیانی میں پتنگ طفعل کے ہاتھ سے چھوٹی تھی یا ڈور کہیں سے ٹوٹ گئی تھی شیردل نے ان سب کو پتنگ کو دوبارہ پکڑنے کی کوشش میں بھاگتے دیکھا صرف شہر بانو بھی جو باڈل کو اس باڈل سے کودنے سے بچا رہی تھی جس پر سے اکروہ کودتا تو بری طرح گرتا۔

پتنگ کو بالآخر انہوں نے لان میں سے باہر جانے سے پہلے ہی دوبارہ پکڑ لیا تھا۔ کیونکہ وہ ابھی بہت بلند نہیں تھی۔ زندگی اور پتنگ بعض دفعہ انسان کو ایک ہی طرح خوار کرتے ہیں۔ ایک ہی طرح fantacise کرتے ہیں۔۔۔۔۔ ایک ہی طرح اپنے پیچھے دوڑاتے ہیں۔۔۔۔۔ ایک ہی طرح خوشی سے ہانپل کرتے ہیں اور ایک ہی طرح مایوس کرتے ہیں۔۔۔۔۔ لیکن نہ پتنگ کو کوئی آسمان میں اڑنے سے روک سکتا ہے نہ زندگی کو چلنے سے۔

شیردل نے اپنے سیل فون پر لان میں ہونے والی اس اچھل کود کو capture کیا اور اسے عکس مراد علی کو MMS کر دیا۔۔۔۔۔

ایک smiley کے ساتھ جواب فوراً آیا تھا۔ "My clan"

شیردل نیکٹ پڑھتے ہوئے مسکرایا اور باہر نکل گیا۔

(ختم شد)

معزز قارئین! عمیرہ احمد کے اس ناول کے بارے میں اگر آپ کے ذہن میں کوئی سوال ہو یا آپ کوئی بات جانا چاہیں تو بذریعہ خطوط پوچھ سکتے ہیں۔ ہمیں آپ کی آرا کا انتظار ہے گا۔

(مدیرہ)

اسے بھی بہت پیار کرتا۔ ویسے ہی ہوا میں اچھالتا جیسے شہباز باری ڈول کو اچھالتا تھا ویسے ہی اٹھائے پھرتا جیسے وہ اس کو اٹھائے پھرتا تھا اس کی امی کے لیے ویسی ہی چیزیں لاتا جیسی وہ شربین کے لیے لاتا تھا۔ خیر دین نے بہت ساری کیاں پوری کی تھیں لیکن وہ بہت ساری خواہشوں کو حسرت میں بدلنے سے نہیں روک سکا تھا۔

ہر بار جب شہباز حسین اسے ذرا سی بھی توجہ دیتا تو چڑیا خوشی سے بھولے نہیں سمائی تھی اور خیر دین کو اس کا احساس تھا لیکن وہ یہ سمجھ نہیں پایا تھا کہ شہباز حسین، چڑیا کے لیے کیا ہوتا جا رہا تھا۔

اس رات بھی یہی ہوا تھا شہباز کے لہجے کی نرمی اور اس کی توجہ کو وہ ویسی ہی محبت سمجھتی تھی جیسی وہ شہر بانو سے کرتا تھا۔ وہ وہاں سے وقت پر بھاگ سکتی تھی اگر وہ اس کو باپ جیسا نہ سمجھ رہی ہوتی۔ اگر اسے یہ یقین نہ ہوتا کہ وہ اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا تھا۔۔۔۔۔ عکس بلک بلک کر روئی تھی۔ یہ کام اس نے پہلی بار کیا تھا۔ وہ دام جس میں وہ آئی تھی، اس میں کسی اور کو آتے دیکھ کر وہ برداشت نہیں کر پا رہی تھی۔ اس کی زندگی میں خیر دین آگیا تھا، وہ بچہ کنجی تھی۔۔۔۔۔ لیکن مثال کی زندگی میں کوئی خیر دین نہیں تھا، وہ اس کے لیے شہباز کی نواسی نہیں تھی، شیردل کی بیٹی تھی۔ جیس کی بساط پر موجود بادشاہ جس کی طاقت محدود تھی اور وہ کمزور تھا لیکن کوئین کمزور نہیں تھی اور وہ بہت طاقتور تھی۔۔۔۔۔ وہ بادشاہ کو چیک میٹ ہونے سے بچانے کے لیے ہر چال چل سکتی تھی۔

”شہر بانو سے کچھ مت کہنا اس سب کے بارے میں۔۔۔۔۔ میں اور تم پہلے بھی الگ الگ جگہوں پر پوسٹڈ ہیں اب بھی الگ رہ سکتے ہیں تم شہر بانو کو اپنے پاس رکھ لو تب تک جب تک مثال بڑی نہیں ہو جاتی اس عمر سے گزر جائے پھر دیکھیں گے کیا کرتا ہے۔“

وہ اب بت بنے شیردل کے باڈل پر ہاتھ رکھے اس سے کہہ رہی تھی۔ وہ شیردل کی تکلیف کو سمجھ پا رہی تھی۔ اس کے چہرے پر آج اسے خیر دین کا چہرہ نظر آیا تھا۔ بس فرق یہ تھا کہ خیر دین کے چہرے پر اسے بھی شکست نظر نہیں آئی تھی جو شیردل کے چہرے پر نظر آئی تھی۔

”ابھی سب کچھ چھ گیا ہے شیری۔۔۔۔۔ ابھی کچھ بھی نہیں گیا۔“ اس نے شیردل کا بازو دبا دیا تھا، شیردل نے اس ملک کو دیکھا جو بادشاہ کو بچانے کے لیے اپنی جگہ چھوڑ رہی تھی۔

”کوئین ہر جگہ جاسکتی ہے، ہر چال چل سکتی ہے، اس لیے کوئین میرا فیورٹ جیس ہیں ہے۔“ اسے یاد آیا تھا اس نے گرمیوں کی ان چھٹیوں میں پہلی بار چڑیا کے ساتھ جیس کھیلنے کے لیے جیس بورڈ سیٹ کرتے ہوئے کہا تھا۔

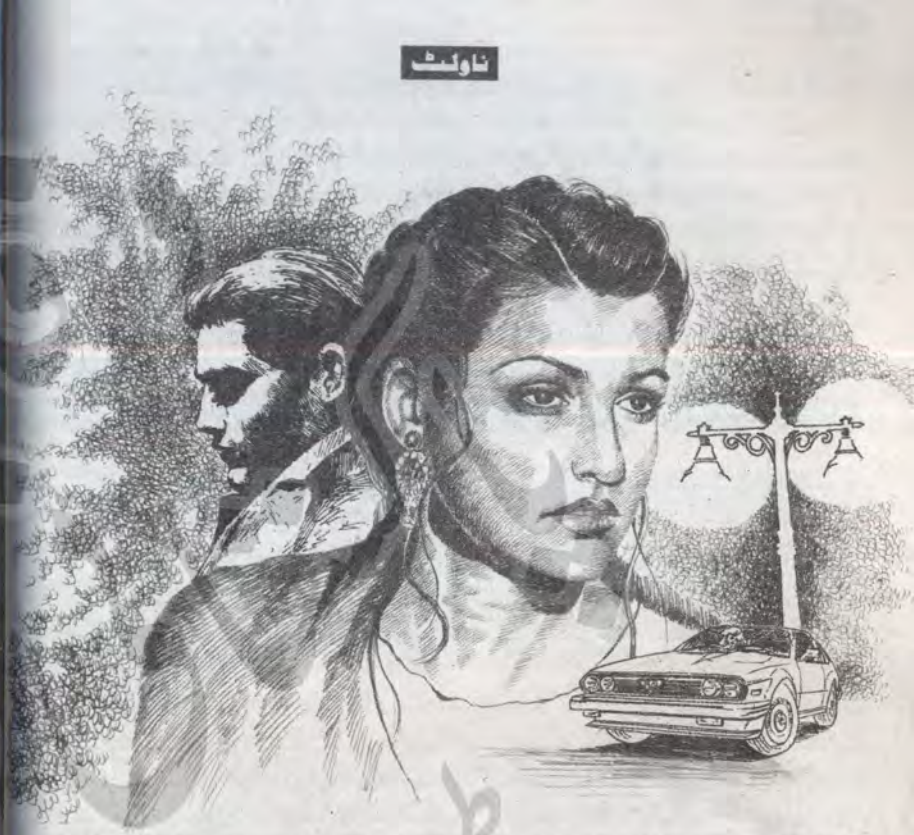
”کوئین کی طرح کوئی نہیں، کوئین ہوئی ہے اور اس کو knight کی طرح کا کوئی کام نہیں کرنا پڑتا۔۔۔۔۔ but she is still powerful کیونکہ وہ کنگ کی وائف ہوتی ہے اور بادشاہ اس سے محبت کرتا ہے۔“

”لیکن میں ایک ایسی گیم بناؤں گی بڑی ہو کر جس میں کوئین ہی کنگ ہوگی جب وہ زیادہ powerful ہے تو بورڈ بھی کوئین کا ہونا چاہیے کنگ کا نہیں۔“ چڑیا نے جواباً اس سے کہا تھا اور اس نے اپنا وعدہ پورا کر دیا تھا۔ وہ زندگی کے اس کھیل میں کوئین ہوتے ہوئے بھی بادشاہ بن گئی تھی۔۔۔۔۔ بورڈ بھی اس کا تھا، مہرے بھی، پاور بھی۔۔۔۔۔ نام بھی۔۔۔۔۔ وہ خیر دین کی نسل میں سے تھی اور اس کے جینز میں خیر کے علاوہ کچھ اور نہیں تھا۔

ایک شیردل نے زندگی میں بھی اس عورت کی برتری کو تسلیم نہیں کیا تھا۔۔۔۔۔ وہ آج کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

☆☆☆

طفعل نے ہاتھ میں پکڑی ڈور کو جھکا دیا۔ مثال نے دونوں ہاتھوں میں پکڑی اس پتنگ کو اچھل کر ہوا میں چھوڑا۔ باڈل نے بے حد خوشی سے ایک چیخ مارتے ہوئے جیسے اپنے بڑے بہن، بھائی کی مہارت کو داد حسین دیتے ہوئے فضا میں بلند ہوتی ہوئی پتنگ کو فخریہ انداز میں دیکھا، اس کے ہاتھ میں ڈور والی چرخی تھی جو وہ ان دونوں کے لاکھ منع کرنے



کہیں ویپ کجے کہیں دل

قصہ رحمت

تیسرا حصہ

گو بچنے لگے۔ وہ جلدی سے چیئر سے اٹھا اور کھڑکی کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ باہر چھوٹے ہوئے درختوں کے پتوں کی سرسراہٹ میں اسے روا کے الفاظ کی سرگوشیاں محسوس ہونے لگیں۔

تو قیر اپنے ویل فرینڈ آفس میں اپنی ریو لوگت چیئر پر بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر انتہائی پریشانی اور اداسی کے تاثرات تھے۔ وہ کمپیوٹر پر کچھ کام کرنے لگا تو روا کے الفاظ echo کی صورت اس کے کانوں میں

ہوا لاؤنج میں آیا تو خدیجہ اسے دیکھ کر پریشان ہو گئیں۔
”کیا..... پھر؟“ خدیجہ نے پریشانی سے پوچھا۔

”ہاں.....“ حاتم گہری سانس لے کر بولا جی ردا تیزی سے اپنا بیگ پکڑے کمرے سے باہر نکلے۔ وہ پیپر دینے جا رہی تھی۔

”مما..... ڈرائیور کو جلدی سے بلائیں۔ مجھے پیپر دینے جانا ہے۔“ ردا نے خدیجہ کی طرف دیکھ کر کہا۔
”ردا..... چلو میں خود گھومیں ڈراپ کر آتا ہوں۔“

حاتم نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔
”حاتم بھائی آپ؟“ وہ چونک کر بولی۔
”ہاں..... میں کیوں نہیں؟“ حاتم نے چونک کر پوچھا۔

”ایکھو بھئی..... یہ آپ کے سونے کا ٹائم ہے ناں۔“ ردا جلدی سے بولی۔
”نہیں تم چلو۔“ حاتم نے آہستہ آواز میں کہا۔

”مما..... بہت دعا کیجیے گا کہ پیپر اچھا ہو جائے۔“ ردا نے ماں سے گلے ملتے ہوئے کہا۔
”ہاں، اللہ سب ٹھیک کرے گا۔“ وہ فکر مندی سے بولیں اور حاتم، ردا کے ہمراہ باہر نکل گیا۔

”حاتم بیٹا..... تجھ سے۔“ خدیجہ نے پیچھے سے آواز دیتے ہوئے کہا۔ حاتم نے گہری سانس لے کر ماں کی طرف دیکھا اور وہ منہ ہی منہ میں دعا پڑھنے لگیں۔

☆☆☆

ردا، حاتم کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھی تھی۔ وہ اپنے بیگ میں سے نوٹس نکال کر انہیں پڑھنے میں مصروف تھی۔ حاتم ہر گاڑی کو مشکوک نظروں سے دیکھ کر ڈرائیونگ کر رہا تھا اس کے چہرے پر غصے کے آثار تھے اور وہ بار بار اپنا منہ ہونٹ کاٹ رہا تھا۔ کافی دیر سے پیچھے آنے والی ایک گاڑی کو اپنے بیک فوگور میں سے واضح کر رہا تھا۔ وہ گاڑی اسے اور ٹیک کرتے ہوئے آگے چلی گئی تو حاتم نے تیزی سے گاڑی چلاتے

ہے..... میں ایک فرینڈ کے ساتھ جیولر کے پاس گیا تو مجھے سیٹ پسند آ گیا تو اس کے لیے لے آیا ہوں۔“
فہام مسکرا کر بولا۔

”بیٹا! پہلے ہی اتنی جیولری اس کے پاس ہے، اس کی کیا ضرورت تھی؟“ وہ منہ بنا کر بولیں۔
”بات ضرورت کی نہیں پسند کی ہے، بتائیں سیٹ اچھا ہے ناں؟“ فہام مسکرا کر بولا۔

”ہاں..... بہت اچھا ہے۔ حاتم تم بھی دیکھو۔“
خدیجہ نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
”ہاں..... اچھا ہے۔“ حاتم زبردستی مسکرا کر بولا۔

”حاتم کیا بات ہے، تم کچھ پریشان لگ رہے ہو؟“ فہام نے حیرت سے حاتم کو دیکھ کر پوچھا۔
”میرے سر میں درد ہے، میں اپنے کمرے میں جا رہا ہوں۔“ اس نے گہری سانس لے کر کہا اور وہاں سے چلا گیا۔

”مما! حاتم ٹھیک تو ہے ناں؟“ فہام نے ماں سے پوچھا۔
”ہاں ہاں، سب ٹھیک ہے۔ سیٹ بہت اچھا ہے۔“ خدیجہ نے ہڑ بڑا کر کہا تو فہام مسکراتے لگا مگر خدیجہ بہت پریشان ہو گئیں۔

”ردا کہاں ہے۔ اسے بھی دکھائیں ناں۔“
فہام نے اسے آواز دینا چاہی۔

”وہ ابھی سو رہی ہے۔ بعد میں دکھا دینا۔“
خدیجہ نے جلدی سے کہا۔
”اوکے.....“ اور وہ سیٹ اٹھا کر مسکراتا ہوا وہاں سے چلا گیا مگر خدیجہ کچھ پریشان سی وہیں بیٹھی رہیں۔

☆☆☆

حاتم سلپنگ سوٹ میں لمبوس موبائل پکڑے اپنے کمرے سے باہر نکلا تو اس کے چہرے پر پریشانی کے تاثرات تھے۔ وہ ہونٹ سکود کر موبائل پر میسج پڑھتا

لگ رہے ہو۔“ خدیجہ اس کی طرف بغور دیکھ کر بولیں۔
”کچھ نہیں.....“ حاتم نے ہڑ بڑا کر ماں کی طرف دیکھ کر کہا۔

”مگر تمہارا چہرہ بتا رہا ہے کہ تم کچھ پریشان ہو۔“
خدیجہ سنجیدگی سے بولیں۔
”مما! کوئی لڑکا مجھے ردا کے بارے میں عجیب عجیب میسج کر رہا ہے۔“ حاتم گہری سانس لے کر بولا۔
”کون ہے وہ؟“ خدیجہ نے یک دم گھبرا کر پوچھا۔

”اگر مجھے اس کا پتا چلے تو میں اسے گولی سے نہ اڑا دوں۔“ حاتم نے غصے سے بھڑک کر کہا۔
”بیٹا! یوں غصے میں مت آؤ اور اپنی بہن پر یقین رکھو۔ وہ ایسی نہیں ہے۔“ خدیجہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر نرمی سے کہا۔

”اس بات کا تو یقین ہے۔ اسی لیے تو میں خاموش ہوں۔“ حاتم نے گہری سانس لے کر کہا۔ اُس کا موبائل بجنا تو وہ میسج پڑھنے لگا۔
”اب پھر اسی کا میسج ہے۔“ حاتم غصے سے تنہنے پھلا کر بولا۔

”کیا تم نے فہام کو اس کے بارے میں بتایا ہے؟“ خدیجہ نے پریشانی سے پوچھا۔
”نہیں..... وہ بزنس پر ایلمر دیکھیں یا پھر یہ والی۔“ حاتم نے اپنے ہینڈل کرنے کی کوشش کرتا ہوا۔

”حاتم گہری سانس لے کر بولا تو فہام اندر داخل ہوا..... اس کے ہاتھ میں ایک شاپنگ بیگ تھا۔
”مما! اسے کھول کر دیکھیں.....“ فہام نے مسکرا کر بیگ کی طرف بڑھا کر کہا۔

”یہ..... گولڈ کا سیٹ..... کس کے لیے ہے؟“
خدیجہ نے شاپر کھول کر اس کے اندر موجود زیور کا ڈبا دیکھ کر حیرت سے کہا۔
”ردا کے لیے..... دیکھیں تو کتنا خوب صورت

”کیا محبت..... محبت کی رٹ لگا رکھی ہے۔ نہیں ہے مجھے آپ سے کوئی محبت.....“ ردا کے الفاظ تو قیصر کے کانوں میں گونجنے لگے۔

”ردا نے میری محبت کو یوں ریمیکس کر دیا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا، اس نے تو میرے چہرے پر ایسا طمانچہ مارا ہے جس کی جلن میں ساری زندگی محسوس کرتا رہوں گا۔“ تو قیصر نے آہ بھر کر سوچا اور اپنا ہاتھ اپنے گال پر رکھ کر رگڑنے لگا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھرنے لگیں۔ وہ واپس چیمز پر جا کر بیٹھ گیا اور اس کی پشت کے ساتھ سر کو ٹکا کر نمناک آنکھوں سے چھت کو گھورنے لگا۔

”محبت میں اتنی ذلت اور شکست..... میں کیسے یہ سہم پاؤں گا۔“ اس نے آہ بھر کر سوچا اور ہونٹ میسج کر سکی روکنے کی کوشش کرنے لگا مگر آنسو اس کی آنکھوں سے بہہ نکلے۔ کتنا مشکل ہوتا ہے یہ سب برداشت کرنا..... کسی کو اتنی شدت اور محبت سے چاہا جائے اور وہ اس محبت کو قدموں تلے روند کر چلا جائے..... محبت بھرے احساسات اور جذبات کو ایسی ٹھیس لگتی ہے کہ سب کچھ چکنا چور ہو جاتا ہے۔ دل سینکھنے میں نہیں آتا۔ کسی پل سکون آتا ہے نہ قرار..... دکھ کا شدید احساس رگ و پے میں سرایت کر جاتا ہے اور انسان چاہنے کے باوجود کچھ نہیں کر پاتا۔ تو قیصر بھی اسی کیفیت سے گزر رہا تھا اور مانی بے آب کی طرح تڑپ رہا تھا۔

☆☆☆

حاتم کا موڈ سخت آف تھا۔ اس کے چہرے پر انتہائی غصے کے تاثرات تھے۔ حاتم لاؤنج میں صوفے پر بیٹھا وی دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ریموٹ تھا۔ جس سے وہ چینلوں پر بار بار چینج کر رہا تھا۔ خدیجہ اس کے ساتھ صوفے پر بیٹھی تھی۔ اس کا موبائل بھی اس کے پاس صوفے پر پڑا تھا۔

”حاتم بیٹا! کیا بات ہے، تم مجھے کچھ اپ سیٹ

آگیا؟“ ردا نے چونک کر پوچھا۔
”ہونے کو تو کچھ بھی ہو سکتا ہے..... کیوں حاتم؟“

”ہاں..... یہ تو ہے۔“ حاتم کے ساتھ فہام نے بھی ہنستے ہوئے ہاں میں ہاں ملائی۔
”یہ آپ میرا احسان مانتے ہیں کہ آپ کی رخصتی کر رہا ہوں۔“ حاتم نے شہیلہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”اس لیے کہ تمہاری باری جلدی آئے۔“ شہیلہ تیزی سے بولی۔

”خاصی سمجھدار ہو گئی ہیں۔ وہ بھی چند منٹوں میں۔“ حاتم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”اچھا بھئی، اب جلدی کھانا ختم کرو..... رات کا فی ہو چکی ہے، اب گھر چلنا چاہیے۔“ خدیجہ بولیں۔
کھانا کھا کر سب لوگ ریسٹورنٹ سے باہر نکلے تو خدیجہ بولیں۔

”فہام بیٹا! تم شہیلہ کو ڈراپ کر آؤ، میں اور ردا، حاتم اور عاصم کے ساتھ چلے جاتے ہیں۔“
”ٹھیک ہے ماما۔“ فہام نے کہا۔

”جاؤ بیٹا، فی امان اللہ.....“ خدیجہ کو محبت سے چوم کر بولیں تو شہیلہ بھی ردا کے گالوں کو چوم کر مسکراتے ہوئے گاڑی میں فرنٹ سیٹ پر فہام کے ساتھ بیٹھ گئی اور فہام گاڑی ڈرائیو کرنے لگا۔

”تم نے آج ڈرا بجوائے کیا ناں؟“ فہام نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”ہاں، بہت زیادہ..... میں تو ہمیشہ سے آپ اور آپ کی فیملی کے ساتھ بہت انجوائے کرتی ہوں۔“ شہیلہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”شہیلہ..... میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ ہمارا فیملی یونٹ کبھی نہ ٹوٹے۔ سب ایک دوسرے کے دکھ، درد اور خوشیوں کو محسوس کریں اور پیار محبت سے رہیں۔“ فہام مسکراتے ہوئے بڑے مان سے بولا۔

شہیلہ نے چونک کر عاصم سے پوچھا۔
”کیا آپ واقعی اتنی سمجھدار ہیں یا پھر.....“ عاصم نے مسکراتے ہوئے شہیلہ کو مخاطب کیا اور جان بوجھ کر جلد ادھر اچھوڑا۔

”مجھے پہیلیاں اچھی نہیں لگتیں.....“ شہیلہ منہ بنا کر تیزی سے کہنے لگی۔

”جبکہ مجھے پہیلیاں بھی اچھی لگتی ہیں اور سہیلیاں بھی۔“ عاصم نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

”لگتا ہے تم یہ Meaningful باتیں ان سہیلیوں سے ہی سیکھتے ہو۔“ شہیلہ نے مسکراتے ہوئے معنی خیز انداز میں کہا۔

”ییس آف کورس..... کسی دن آپ کو بھی سناؤں گا۔ تفصیل سے.....“ عاصم نے مسکراتے ہوئے ڈھٹائی سے جواب دیا۔

”لیکن ماما بھی تو آپ ان دونوں کی شادی کا فائل کریں گھر میں کچھ بلاؤ گے..... ہم بھی کچھ انجوائے کریں۔“ عاصم، ماں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”ہاں، میں تو بس ردا کے پیپر ز ختم ہونے کا انتظار کر رہی تھی۔ کل ہی ریحانہ کی طرف جا کر شادی کی تاریخ طے کرتی ہوں۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولیں۔

”ماما! اتنی جلدی، آئی مین، حاتم کا بھی کہیں.....“ فہام نے چونک کر چھوٹے بھائی حاتم کی طرف دیکھ کر کہا۔

”اس کی بعد میں دیکھوں گی..... پہلے تمہاری اور شہیلہ کی شادی ہو جائے۔“ خدیجہ مسکراتے ہوئے بولیں تو شہیلہ شرما کر مسکرانے لگی۔

”لڈو پھوٹ رہے ہیں کہ نہیں۔“ ردا نے آہستگی سے شہیلہ کے قریب ہو کر سرگوشی کی۔

”لڈو تو تب پھوٹیں گے جب تمہاری شادی بھی میرے ساتھ ہوگی۔“ شہیلہ منہ بنا کر ردا کی طرف دیکھ کر بولی۔

”ہیں..... ہیں یہ میری شادی کا ذکر کہاں سے

اس ایئرنگ پھر کیسے..... کسی کو پتا چل جاتا ہے؟“ ردا نے چونک کر پوچھا۔
”یہی تو پتا نہیں چل رہا۔ بہت کوشش کر رہا ہوں۔ ہر بار نئے نمبر سے میچ آتے ہیں۔“ حاتم بولا۔

”وہ لڑکا ہے یا لڑکی؟“ ردا نے چونک کر پوچھا۔
”لڑکا.....“ حاتم نے گہری سانس لے کر کہا۔

”لڑکا بھلا آپ کو کیوں تنگ کر رہا ہے؟“ ردا نے آنکھیں پھیلاتے ہوئے کہا تو حاتم نے اس کی طرف دیکھا اور گہری سانس لے کر خاموش ہو گیا۔ ردا بھی اسے دیکھ کر خاموش ہو گئی اور وہ تیزی سے ڈرائیونگ کرنے لگا مگر اس کا ذہن بری طرح ماؤف ہو رہا تھا۔

☆☆☆

ردا کے پیپر ز کیا ختم ہوئے گھر میں زندگی لوٹ آئی۔ اس کے پیپر ز کی وجہ سے باہر گھومنا پھرتا، لان میں بھائیوں کا بیڈ مشن کھیلنا، ڈنر کے لیے باہر جانا، فرینڈز کا آنا جانا، سب ایکٹیوٹیز مینڈ گئی تھیں کیونکہ ردا ان میں شامل نہیں ہوتی تھی اور جس روز وہ فارغ ہوئی تو فہام نے سب سے پہلے ڈنر کا پروگرام بنالیا اور اس نے شہیلہ کو بھی انوائٹ کیا۔

رات کو ساری فیملی ایک چائینیز ریسٹورنٹ میں ڈنر کرنے گئی تو وہ بہت خوش تھی۔ شہیلہ بہت ماڈرن گیٹ اپ میں خدیجہ اور ردا کے پاس بیٹھی تھی جبکہ فہام کے دوسری جانب فہام، حاتم اور عاصم بیٹھے تھے۔ فہام بہت خوش تھا اور مسکرا مسکرا کر شہیلہ کی طرف دیکھتا، عاصم اس بات کو نوٹ کر رہا تھا اور شرارتی انداز میں مسکرا رہا تھا۔

”بھئی، یہ آپ لوگ کب تک آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہیں گے۔ ایک بار ہی نظریں چار کر کے زمانے کو بھی دیکھیں اور سامنے والوں کو بھی۔“ عاصم نے مسکرا کر کہا۔

”تمہاری اتنی لمبی چوڑی بات کا مطلب؟“

ہوئے اس گاڑی کو اور ٹیک کیا اور آگے جا کر گاڑی کو زور سے جھٹکا دیا تو ردا سیٹ سے اچھل کر ڈرائیو بورڈ سے جا ٹکرائی۔

”حاتم بھائی..... سب ٹھیک تو ہے ناں؟“ ردا نے گھبرا کر بھائی سے پوچھا۔

”کیا مطلب؟“ حاتم نے چونک کر کہا۔
”آپ نے تو ایسی ریش ڈرائیونگ کبھی نہیں کی۔“ ردا نے پریشانی سے کہا تو حاتم نے ایک گہری سانس لی۔

”آپ مجھے کچھ اپ سیٹ لگ رہے ہیں۔“ ردا نے اس کی طرف بغور دیکھ کر کہا۔

”نہیں بس پو پو..... تمہارے پیپر ز کب ختم ہوں گے؟“ حاتم نے جلدی سے بات بدلنے ہوئے کہا۔

”اس کے بعد لاسٹ پیپر ہے۔“ اس نے بتایا، حاتم کے موبائل پر ایک میچ ٹون آئی وہ جلدی سے موبائل دیکھ کر غصے سے نتھے پھلانے لگا اور غصے سے اسٹیرنگ پر ہاتھ مارنے لگا۔
”ردا..... تمہیں کبھی کوئی راگ کالز یا میسجز تو نہیں آتے۔“

”نہیں..... نہیں..... مگر آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟ وہ کیسے گھبرا کر بولی۔

”پو پو..... وہ میرے موبائل پر اکثر راگ کالز اور میسجز آتے ہیں ناں..... اس لیے پوچھ رہا ہوں۔“ حاتم منہ بنا کر بولا۔

”تو آپ سم بدل لیں۔“ ردا مسکرا کر بولی۔
”دوبارہ چیخ کی ہے مگر پھر بھی اس کو میرے نمبر کا پتا چل جاتا ہے۔“ وہ گہری سانس لے کر بولا۔

”آئی ایم شیور..... وہ پھر آپ کا کوئی کلوز فرینڈ ہی ہوگا جو جان بوجھ کر آپ کو تنگ کر رہا ہے۔“ ردا نے چونک کر کہا۔

”مگر میں نے تو وہ نمبر کسی کو نہیں بتائے۔“ حاتم گہری سانس لے کر بولا۔

”انشاء اللہ..... ایسا ہی ہوگا۔“ شہیلہ نے بھی مسکرا کر کہا۔

”اور میں تم سے بھی یہی چاہتا ہوں کہ تم بھی ان کے ساتھ ہمیشہ ویسی ہی محبت کرو جیسی میں کرتا ہوں۔“

”فہام..... کیا آپ کو مجھ پر یقین نہیں.....؟“

شہیلہ نے حیرت سے پوچھا۔

”ارے..... مجھے تو تم پر اپنے آپ سے بھی زیادہ یقین ہے کہ تم میری ٹھیک کا بہت زیادہ خیال رکھو گی۔ خاص طور پر ردا کا۔“ فہام نے مسکرا کر اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

”ردا..... کا..... ہی کیوں؟“ شہیلہ چونک کر بولی۔

”اس لیے کہ..... میں..... اس سے بہت محبت کرتا ہوں، میں بتا نہیں سکتا..... ردا میرے لیے کیا ہے۔“ فہام قدرے جذباتی انداز میں غم آنکھوں سے بولا تو شہیلہ کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات نمایاں ہونے لگے مگر وہ زبردستی مسکرا کر اسے دیکھتی رہی۔ فہام نے شہیلہ کو گھر کے گیٹ پر اتارا تو وہ قدرے آف موڈ کے ساتھ بیک کنڈھے پر ڈالے لاؤنج میں داخل ہوئی۔ اس کے چہرے پر انتہائی غصے کے تاثرات تھے۔ ریحانہ صوفے پر بیٹھی فی وی دیکھ رہی تھیں۔ شہیلہ غصے سے اپنا بیک صوفے پر پھینک کر منہ پھلا کر بیٹھ گئی۔

”کیا ہوا.....؟ تمہارا موڈ کیوں آف ہے، ڈنر پر جانے سے پہلے تو اچھی بھلی تھیں؟“ ریحانہ نے چونک کر شہیلہ سے پوچھا۔

”میں تنگ آ گئی ہوں، ان لوگوں سے۔“ شہیلہ غصے سے منہ بنا کر بولی۔

”کیوں..... کیا ہوا؟“ ریحانہ حیرت سے بولیں۔

”مما! ان لوگوں کی عجیب سی باتیں ہیں اور سب سے بڑھ کر فہام..... یوں ردا کے ناز، نخرے اور چونچلے اٹھاتا ہے۔ جیسے وہ دودھ جیتی پیتی ہو۔ ردا یہ تو ردا

وہ.....“ شہیلہ خفگی سے بولی۔

”ہاں، وہ اس سے محبت بھی تو بہت کرتا ہے۔ ریحانہ نے مسکرا کر بڑی بے پروائی سے جواب دیا۔

”اور اس کی محبت میں اسے اس وقت کوئی اور دکھائی نہیں دیتا۔ میں بھی نہیں۔“ شہیلہ غصے سے بولی۔

”بیٹا، رشتوں میں یوں مقابلہ مت کرو، فہام نے اسے باپ بن کر پالا ہے۔ جو تمہاری جگہ ہے وہ ردا کی جگہ نہیں ہو سکتی اور ردا کی جگہ تم بھی نہیں لے سکو گی۔ یہ ہمیشہ یاد رکھنا۔“ ریحانہ نرمی سے اسے سمجھانے ہوئے بولیں۔

”مجھے تو مسلمان بھائی نے کبھی ایسے محبت نہیں کی اور نہ ہی آپ نے جیسے خالہ ردا سے کرتی ہیں۔ شہیلہ خفگی سے بولی۔

”ہر ایک کا اپنا، اپنا مزاج ہوتا ہے اگر میں اظہار نہیں کرتی تو اس کا یہ مطلب تو ہرگز نہیں کہ میں تم سے محبت نہیں کرتی۔ آپا کا مزاج مختلف ہے، وہ ہر ایک کے دل میں اتر جاتی ہیں۔“ ریحانہ گہری سانس لے کر بولیں۔

”ردا..... سمیت۔“ شہیلہ طنزیہ لہجے میں بولی۔

”شہیلہ..... مت ایسی باتیں کیا کرو، تم نے بیاہ کر اس گھر میں جانا ہے۔ ابھی سے دل میں نفرتیں لاؤ گی تو گزارہ کیسے ہوگا۔“ ریحانہ سمجھاتے ہوئے کہنے لگیں۔

”ہاں، نفیسہ بھائی کے دل میں بھی میں نے نفرتیں پیدا کی ہیں ناں..... ممما! آپ میرے علاوہ ہر بندے کا فیور کرتی ہیں، سب اچھے ہیں، میں ہی بری ہوں۔“ وہ نہایت غصے سے بولی۔

”میں نے ایسا کب کہا ہے؟ میری بیٹی تو سب سے اچھی ہے۔ تم تو خوش قسمت ہو کہ فہام جیسا اچھا لڑکا تمہیں مل رہا ہے۔ خاندان بھر میں اس کی کتنی تعریف ہوتی ہے، تم جانتی ہو ناں.....“ ریحانہ نے مسکرا کر شہیلہ کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

”مجھے فہام سے تو کوئی شکوہ نہیں۔“ اس نے منہ بنا کر آہستہ آواز میں کہا۔

”باقی سب لوگ بھی بہت اچھے ہیں۔“ ماں نے مسکرا کر کہا۔

”آپ نہیں سمجھیں گی۔“ اس نے سختی سے جواب دیا۔

”تم آخر سمجھانا کیا چاہتی ہو..... خواہ مخواہ کڑھ کڑھ کر اپنا خون جلاتی رہتی ہو..... بیٹا اپنے دل میں دوسروں کے لیے محبت پیدا کرو۔ اس محبت کا رنگ جب چہرے پر نمایاں ہونے لگتا ہے تو ہر دیکھنے والا اس کی طرف کھینچا چلا آتا ہے۔ محبت بہت بڑا ہتھیار ہے۔ اس سے تم دوسروں کے دل جیت سکتی ہو..... اب دیکھو ناں..... ردا ہر ایک سے کتنی محبت اور پیار سے بات کرتی ہے کہ سیدھی دل میں اتر جاتی ہے اور پھر اسے پیار کرنے کو بہت دل چاہتا ہے۔“ ریحانہ نے مسکرا کر کہا۔

”ہاں..... اب آپ بھی اس کی شان میں تعریف پڑھیں۔ آپ لوگ جتنی اس کی تعریفیں کرتے ہیں، اتنی ہی میرے دل میں اس کے لیے نفرت بڑھتی جاتی ہے۔“ وہ غصے سے کہہ کر وہاں سے چلی گئی۔

اور ریحانہ بے حد پریشان ہو کر اسے دیکھنے لگیں۔

☆ ☆ ☆

محسن رضانے بی بی اے اچھے نمبروں سے پاس کرنے کے بعد ایم بی اے میں داخلہ لے لیا تھا۔

میرٹ پر آنے کی وجہ سے اسے یونیورسٹی سے اسکا لرشپ بھی مل گئی۔ وہ بہت خوش تھا مٹھائی لے کر گھر لوٹا تو طیبہ اس کی منتظر تھی۔ اس کے چہرے پر پریشانی اور اضطراب کے تاثرات نمایاں تھے۔ محسن کے ہاتھ میں مٹھائی کا ڈبا دیکھ کر وہ چونکی۔

”میرا یونیورسٹی میں ایڈمیشن ہوا ہے اور مجھے اسکا لرشپ بھی ملی ہے۔“ محسن نے طیبہ کے چہرے پر چھائی حیرانی کو بھانپتے ہوئے بتایا۔

”مبارک ہو، بہت بہت.....“ وہ بیک دم کہہ کر خاموش ہو گئی۔

”بھائی جان بہت مبارک ہو۔“ سیرانے بھائی کے ساتھ لپٹ کر اسے مبارک دیتے ہوئے کہا۔

”تھینک یو، اب پلیٹ میں مٹھائی نکال کر لاؤ۔“ سب کھاتے ہیں۔ حسن اور احسن کو بھی بلاؤ، وہ کہاں ہیں؟“ محسن نے کہا۔

”وہ باہر کھینے گئے ہوئے ہیں۔ میں ابھی انہیں بلاتی ہوں۔“ سیرا کہہ کر دروازے تک چلی گئی اور محسن کمرے میں چلا گیا۔ طیبہ کچھ پیچھے کمرے کے اندر چلی آئی۔

”محسن۔“ وہ اسے آواز دے کر خاموش ہو گئی۔

”ہاں کہو، کیا بات ہے؟“ محسن نے مڑ کر بغور اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

”کیا بتانے سے ہی کسی بات کا پتا چل سکتا ہے۔“ طیبہ نے سختی خیر انداز میں کہا۔

”کیا مطلب؟“ محسن نے حیرت سے پوچھا۔

”میرا خاموشی اور میری ان آنکھوں سے آپ کو میرے دل کی کیفیت معلوم نہیں ہوتی؟ کیا آپ میری زبان سے سب کچھ سننا چاہتے ہیں؟“ طیبہ نے ہمت کر کے کہا۔

”نہیں۔ کیونکہ تم جو کچھ سوچتی ہو وہ ممکن نہیں ہے۔“ محسن نے کہا۔

”کیوں، کیا میں آپ کے قابل نہیں؟“ طیبہ نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

”ایسی بات نہیں مگر دل کو کسی کے لیے مجبور نہیں کیا جاسکتا۔“ محسن نے آہ بھر کر کہا۔

”کیا آپ کے دل میں کوئی اور ہے؟“ طیبہ نے دھڑکتے دل کے ساتھ پوچھا۔

”معلوم نہیں۔“ محسن نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

”مگر میں جانتی ہوں..... آپ جس کی محبت میں گرفتار ہیں۔“ طیبہ نے قدرے اونچی آواز میں کہا۔

”کیا مطلب؟“ محسن نے چونک کر پوچھا۔

”وہ یحییٰ ہے ناں!“ طیبہ نے کہا۔ محسن نے بغور

ماہنامہ پاکیزہ۔ دسمبر 2012ء

75

سانس لے کر حاتم سے پوچھا۔
 ”کچھ روز سے..... میں نے تم بھی بدلی ہے اور
 نمبر ٹریس آؤٹ کرانے کی کوشش بھی کی ہے مگر ہر بار میٹج
 نے نمبر سے آتا ہے اور جب میں ٹریس آؤٹ کرانے
 کی کوشش کرتا ہوں تو سمر عورتوں کے نام کی نکلتی ہیں مگر
 میٹج کوئی لڑکا ہی کرتا ہے۔“ حاتم منہ بنا کر بولا۔
 ”کیا تم ردا کے بارے میں مشکوک ہو؟“ فہام
 نے چونک کر اس سے پوچھا۔
 ”معلوم نہیں..... مگر میں بہت ڈسٹرب ہوں۔“
 حاتم گہری سانس لے کر بولا۔
 ”ردا پر یوں یقین رکھو جیسے اپنے آپ پر رکھتے
 ہو۔ زمانہ کچھ بھی کہے تمہارے اس یقین میں کمی نہیں
 آتی چاہے۔ وہ ہماری بہن ہے اور اس کی پارسائی کے
 گواہ ہم ہیں اور حافظ بھی۔“ فہام نے حاتم کے کندھے
 پر ہاتھ رکھ کر نرمی سے سمجھاتے ہوئے کہا۔
 ”اگر کوئی اتنا سچا ہے تو وہ ہمارے سامنے آ کر
 بات کرے۔ ایسے اچھے بھٹکنڈے جھوٹے لوگ ہی
 اپنا تے ہیں۔ تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔
 جب تک میں زندہ ہوں، ردا کی عزت پر کوئی حرف
 نہیں آنے دوں گا جاؤ جا کر آرام کرو۔“ فہام نے
 موبائل اس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا تو وہ وہاں
 سے چلا گیا۔
 ”خدا میری ردا کے سر پر تم بھائیوں کا سایہ ہمیشہ
 قائم رکھے۔“ خدیجہ نے مسکرا کر فہام کی طرف دیکھ کر
 دعائیہ لہجے میں کہا ان کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔
 ”مما! آپ کیوں اتنی پریشان ہو رہی ہیں اور وہ
 بھی میرے ہوتے ہوئے۔“ فہام نے مسکرا کر ماں کو
 اپنے ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔
 ”ہاں، جن ماؤں کے تم جیسے بیٹے ہوں، انہیں
 کبھی نہیں گھبرانانا چاہیے۔ مگر کیا کروں ایک جوان
 بیٹی کی ماں بھی تو ہوں۔“ خدیجہ نے مسکرا کر فہام کا ہاتھ
 چومتے ہوئے کہا تو وہ مسکرا دیا۔

انہیں دبا تے ہوئے آہستہ آہستہ ان سے باتیں بھی کر رہا
 تھا اور وہ ہوں، ہاں میں اسے جواب دے رہی تھیں۔
 ”مما! میں کل ہی کسی آرٹھو پیڈک سے آپ کے
 لیے اپنا کٹنٹ لے لیتا ہوں۔ آپ کی ٹانگوں کا درد
 بدستاب ہی چلا جا رہا ہے۔“ فہام نے ان کی ٹانگیں
 دبا تے ہوئے فکر مند ہی کہا۔
 ”ٹھیک ہو جائے گا، تم فکر نہیں کرو، اور اب جاؤ
 اپنے کمرے میں آرام کرو، میں ٹھیک ہوں۔“ خدیجہ
 درو کی شدت کو برداشت کرتے ہوئے آہستہ سے
 پولیس اسٹے میں حاتم انتہائی غصے میں موبائل پکڑے
 کمرے میں داخل ہوا مگر فہام کو خدیجہ کے پاس بیٹھا
 دیکھ کر چونکا اور کچھ کہتے ہوئے ایک دم رک گیا اور وہ
 حاتم کا چہرہ دیکھ کر گھبرا گئیں۔
 ”حاتم تم گھبرائے ہوئے لگ رہے ہو..... خبر تو
 ہے؟“ فہام نے حیرت سے پوچھا۔
 ”کچھ نہیں۔“ اس نے واپس مڑتے ہوئے کہا
 اور ماں کو آنکھوں ہی آنکھوں میں گویا کچھ سمجھا یا۔
 ”رکو حاتم۔“ خدیجہ نے گہری سانس لیتے
 ہوئے حاتم کو بلایا تو وہ رک گیا اور چونک کر ماں کی
 طرف دیکھنے لگا۔
 ”کیا پھر کوئی ایسا میٹج آیا ہے؟“ انہوں نے
 بڑی فکر مند ہی سے پوچھا۔
 ”حاتم کیا پرانے اور یہ مہماتم سے کس میٹج کے
 بارے میں پوچھ رہی ہیں؟“ فہام نے چونک کر بھائی
 سے پوچھا تو وہ بوکھلا گیا۔
 ”حاتم کے موبائل پر کوئی لڑکا ردا کے بارے میں
 فضول میٹج کرتا ہے۔“ خدیجہ نے گہری سانس لے کر
 اسے بتایا۔
 ”کیا..... ردا کے بارے میں؟“ فہام کی حیرانی
 قابل دیدگی وہ تیزی سے حاتم کے نزدیک آیا اور
 موبائل اس کے ہاتھ سے لے کر میٹج پڑھنے لگا۔
 ”کب سے یہ میٹج آرہے ہیں؟“ اس نے گہری

نے مسکراتے ہوئے کہا۔
 ”محبت خود ہی ایسا میٹج پھونکتی ہے کہ نہ چاہتے
 ہوئے بھی دل بڑا اور ظفر اونچا ہو جاتا ہے۔ شاید مجھے
 کرنے والے کسی کو دکھ میں نہیں دیکھ سکتے۔ معلوم نہیں
 ایسا کیوں ہو جاتا ہے۔ پہلے مجھے اس لڑکی سے حسد
 تھا مگر اب اس پر رشک آنے لگا ہے جسے بن بتائے کوئی
 اتنا چاہے..... جس کی محبت میں گرفتار ہو کر اسے کوئی اور
 دکھائی نہ دے۔“ طیبہ نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔
 ”سوری..... تم میری وجہ سے ہرٹ ہوئی ہو
 میں بے بس ہوں۔ میں تمہیں دھوکا دے سکتا ہوں اور
 نہ ہی اپنے آپ کو۔ بس تم مجھے معاف کر دینا اور جو اچھا
 پروپوزل آئے اسے قبول کر کے اپنی زندگی اپنے
 طریقے سے گزارنا۔“ محسن نے بڑے غلوں سے کہا۔
 ”کتنا آسان ہوتا ہے دوسروں کو نصیحت کرنا اور
 کتنا مشکل ہوتا خود اس پر عمل کرنا..... اپنی دے تھیک
 یو۔“ وہ کہہ کر باہر نکل گئی اور محسن مضطرب سا اسے
 جاتے ہوئے دیکھتا رہ گیا۔
 ”میں نے جو کچھ کیا وہ سب ٹھیک ہے کیا؟ میں نے
 کوئی غلطی تو نہیں کی۔“ انجانے میں کسی کا دل توڑ کر کوئی
 گناہ تو نہیں کیا؟ طیبہ کی مہربانیوں کا بدلہ میں نے اس
 کے جذبات کی نفی کر کے دیا اور اس سے وہ کتنی ہرٹ
 ہوئی یہ سب کچھ کر کے میں گناہ گار تو نہیں ٹھہرا.....
 اس نے آہ بھر کر سوچا۔
 ”کیا کروں کچھ مجھ میں نہیں آتا۔ دل اس کی یاد
 سے کسی بل غافل ہی نہیں ہوتا۔ وہ جو معلوم نہیں کبھی
 ملے گی بھی یا نہیں۔ دنیا کی اس بیخیز میں نہ جانے کہاں
 کھو گئی ہے وہ اور شاید میں ایک خیال، ایک ہیولے
 کے پیچھے بھاگ رہا ہوں۔ میں کیا کر رہا ہوں؟“ وہ خود
 اپنا محاسبہ کر رہا تھا۔

☆☆☆

فہام ماں کے پاس بیڈ پر بیٹھا ان کی ٹانگیں دبا رہا
 تھا۔ ان کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔ وہ بہت محبت سے

اس کی طرف دیکھا مگر کچھ نہ بولا۔
 ”محسن وہ ایک ہیولا بن کر آپ کے اندر مگر
 کر چکی ہے اور آپ اس کے سحر میں مبتلا ہو گئے ہیں مگر
 یہ بھول بیٹھے ہیں کہ اب وہ کبھی نہیں آئے گی۔“ طیبہ
 نے درشت لہجے میں کہا۔
 ”زندگی ناممکنات کا سفر نہیں..... جب مجھ سے
 کائنات میں رونما ہو سکتے ہیں تو معمولی سی ناممکن بات
 ممکن کیوں نہیں ہو سکتی؟“ محسن نے ٹھوس لہجے میں کہا۔
 ”آپ حقیقت سے نظریں پھا کر خیالی دنیا میں
 جی رہے ہیں اور حقیقت کبھی نہیں بدلتی۔“ طیبہ نے کہا۔
 ”تم ٹھیک کہہ رہی ہو، میں مانتا ہوں مگر میرا دل
 نہیں مانتا اسے کیسے مناؤں۔“ محسن نے صاف گوئی
 سے کہا۔ طیبہ نے اس کی طرف گہری نگاہوں سے دیکھا
 اور ایک سر آہ بھر کر رہ گئی۔
 ”طیبہ میرے پاس کچھ نہیں ہے سوائے یقین
 کامل کے اور میری یہی سچی لگن اگر میرے خدا کو منظور
 ہوگا تو وہ کبھی نہ بھی زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر
 ضرور ٹنگ لائے گی۔“ وہ پرامید لہجے میں بولا۔
 ”اور میں..... اور میری محبت آپ کے لیے کوئی
 معنی نہیں رکھتی؟“ طیبہ نے تقریباً روتے ہوئے پوچھا۔
 ”تم میرے لیے بہت محترم ہو اسی لیے تو تمہیں
 کسی دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتا۔ اگر چاہتا تو تم سے
 محبت کا ڈھونگ رچا کر تمہارے احساسات مجروح
 کر سکتا تھا لیکن میں ایسا ہرگز نہیں کروں گا۔ اس لیے کہ
 تم بہت اچھی لڑکی ہو..... مگر میرا نصیب نہیں ہو۔“ محسن
 نے کہا تو طیبہ چھوٹ چھوٹ کر رو دی۔
 ”پلیز چپ ہو جاؤ..... سچے آگے تو وہ کیا
 سوچیں گے۔“ محسن نے کہا تو اس نے دوپٹے کے پلو
 سے آنکھیں مگرزیں۔
 ”اب میں چلتی ہوں، دعا کرتی ہوں وہ آپ کو
 ضرور ملے۔“ طیبہ نے دکھ کے دل سے کہا۔
 ”شکریہ، تمہارا دل واقعی بہت بڑا ہے۔“ محسن

”میں سب سمجھتی ہوں اور وہ بھی بہت اچھے طرح..... مجھے کیا کرنا ہے اور کس کے ساتھ رشتہ بنانا ہے، سب جانتی ہوں۔“ شمیمہ نے مسکرا کر ماں کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر کہا تو وہ غصے سے منہ بناتے ہوئے وہاں سے چلی گئیں اور شمیمہ معنی خیز انداز میں مسکراتے لگی۔

☆☆☆

خدیجہ بیگم نے لاؤنج میں فروٹ اور مٹھائیاں کے ٹوکے رکھے تھے۔ زاہدہ انہیں خاص اہتمام سے سجا رہی تھی اور شوکت ڈرائیور انہیں گاڑیوں میں رکھ رہا تھا۔ خدیجہ بیگم بھی خصوصی طور پر تیار ہوئی تھیں کیونکہ وہ آج فہام کی شادی کی تاریخ رکھنے جا رہی تھیں اور بے حد خوش تھیں۔ خوشی سے ان کے پاؤں زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔ ردا لاؤنج میں آئی تو اتنا زیادہ اہتمام دیکھ کر چونک گئی۔

”مما آپ اتنا سب کچھ شمیمہ آپنی کے گھر لے جا رہی ہیں؟“ ردا نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں بیٹا، یہ بھی رسم ہوتی ہے۔ بہو کے گھر جب بھی جائیں تو اس شان سے جائیں کہ اسے اپنی عزت اور قدر محسوس ہو۔“ خدیجہ بیگم نے مسکرا کر کہا۔

”ردا بی بی کو کیا پتا..... جب ان کی سسرال والے یہ سب کچھ لائیں گے پھر ان کو پتا چلے گا۔“ زاہدہ نے سرخ گوٹے والے رومال سے مٹھائی کی ٹوکری کو لپیٹتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

”ہٹو..... کیا فضول باتیں کر رہی ہو..... میرا شادی کا کوئی ارادہ نہیں، مجھے تو ابھی یونیورسٹی جانا ہے۔ بہت پڑھنا ہے۔“ ردا نے مصنوعی خشکی سے کہا۔

”پڑھ کر بھی تو شادی کرنی ہے ناں! زاہدہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

”تب کی تب دیکھی جائے گی۔“ ردا نے منہ بنا کر جواب دیا۔

”اچھا زاہدہ..... جلدی سے سارا سامان

☆☆☆

شمیلہ اپنے کمرے میں بیڈ پر نیم دراز ایک فیشن میگزین دیکھنے میں مصروف تھی کمرے میں آہستہ آواز میں میوزک آن تھا۔ ریحانہ تیار ہو کر بیک ہاتھ میں پکڑے شمیمہ کے کمرے میں آئیں۔

”بیٹا! میں ٹیلر کے پاس جا رہی ہوں اگر تمہیں بھی جانا ہے تو چلو۔“ وہ اس کی طرف دیکھ کر بولیں۔

”نہیں، مجھے نہیں جانا۔“ شمیمہ منہ بنا کر بولی۔

”کیوں تم نے آپا والا سوٹ نہیں سلوانا؟“

ریحانہ نے حیرت سے پوچھا۔

”نہیں، وہ مجھے پسند نہیں آیا؟“ شمیمہ صفہ پلٹتے ہوئے منہ بنا کر بولی۔

”کیوں، وہ تو بہت اچھا ہے اور اس وقت تو تم کہہ رہی تھیں کہ تمہیں بہت پسند آیا؟“ ریحانہ نے انتہائی حیرت سے چونک کر پوچھا۔

”اس لیے کہ میں فہام کو ناراض نہیں کرنا چاہتی۔“ شمیمہ ماں کے قریب کھڑے ہو کر معنی خیز انداز میں بولی۔

”مگر فہام کا اس سے کیا تعلق؟“ ریحانہ نے چونک کر پوچھا۔

”فہام کی فیملی دنیا کی سب سے اچھی فیملی ہے، وہ لوگ کبھی کوئی غلطی کر رہی نہیں سکتے، ان پر کسی قسم کا اعتراض یا تنقید فہام برداشت نہیں کرتا۔“ شمیمہ طنزیہ انداز میں مسکراتے ہوئے بولی۔ ”اس لیے میں فہام کو کبھی ناراض نہیں کر سکتی۔“ اس نے آنکھیں گھما کر معنی خیز انداز میں کہا۔

”ورنہ تم آپا اور ان کی فیملی کی کبھی عزت نہ کرو۔“ ریحانہ خشکی سے بولیں۔

”ہاں، تو..... کیوں کرو؟“ شمیمہ ٹھوس لہجے

میں بولی۔

”شمیلہ، شمیمہ تمہیں کیسے سمجھاؤں۔“ وہ غصے سے جھنجھلا کر بولیں۔

اچھا نہیں سمجھتی۔ گھر بہو کی چیزوں سے نہیں اس کے اخلاق سے خوب صورت لگتا ہے..... اور شہیلہ مجھے مل رہی ہے تو اور کیا چاہیے۔“ خدیجہ نے مسکرا کر کہا تو نفیسہ نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ ریحانہ اور سلمان کی طرف دیکھا۔

”بس پھر ٹھیک ہے اس ماہ کی 25 تاریخ رکھ لیتے ہیں۔“ خدیجہ نے کہا۔

”ٹھیک ہے جیسا آپ کہہ رہی ہیں۔ ہمیں اس پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔“ سلمان نے مسکرا کر کہا تو سب مسکرانے لگے۔

☆☆☆

شہیلہ کو جب خبر ملی کہ خالہ نے جہیز لینے سے انکار کر دیا ہے تو وہ بری طرح سخ پا ہوئی۔ اس نے تو پلان کر رکھا تھا کہ وہ بہت ٹھیک ٹھاک جہیز لے کر جائے گی مگر اس کی ساری پلاننگ پر پانی پھر گیا تھا۔ رات کو فہام اپنے کمرے میں بیڈ پر نیم دراز شہیلہ سے موبائل پر باتیں کر رہا تھا۔ کمرے میں ہلکی سی موسیقی بھی سنائی دے رہی تھی۔

”آج تو تم بہت خوش ہوگی۔ ہماری شادی کی ڈیٹ جو فکس ہوگئی ہے، فہام نے سرگوشی کے انداز میں شہیلہ سے پوچھا۔

”میرا موڈ سخت آف ہے۔“ شہیلہ نے منہ بنا کر خفگی سے جواب دیا۔

”کیوں؟“ فہام نے چونک کر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

”خالہ جان نے جہیز لینے سے انکار کر کے میری ساری خواہشات کو ختم کر دیا ہے۔“ شہیلہ خفگی سے بولی۔

”کیا مطلب..... میں سمجھا نہیں؟“ فہام نے اس کی بات کا مطلب نہ سمجھتے ہوئے کہا۔

”میری اتنی خواہش تھی کہ میں اپنی شادی پر اپنی مرضی سے کرا کر، بیڈ شیٹس اور گھر کی دوسری چیزیں خریدوں مگر خالہ جان نے تو.....“ شہیلہ غصے

کاڑیوں میں رکھواؤ..... ریحانہ انتظار کر رہی ہوگی۔“ خدیجہ بیگم نے اپنا برس اٹھاتے ہوئے کہا اور مسکراتے ہوئے وہاں سے چلی گئیں۔ زاہدہ، شوکت کے ہمراہ ٹوکریاں گاڑی میں رکھوانے لگی۔

☆☆☆

شہیلہ اتنا سب کچھ دیکھ کر خوشی سے پھولے نہ سارہی تھی۔ نفیسہ بھی قدرے حیرت سے ان کی طرف دیکھتی رہی اور دل ہی دل میں اس سے حسد کرتی رہی۔ ریحانہ اپنی بیٹی کی اتنی قدر اور خوش نصیبی پر فخر محسوس کر رہی تھیں اور بے حد خوش تھیں۔

خدیجہ اکیلے ہی گئی تھیں اب وہ ریحانہ کے بہو، بیٹے کے ہمراہ فیضی شادی کی تاریخوں پر بات کر رہی تھیں۔ ریحانہ کی مالی حیثیت کبھی مستحکم نہیں رہی تھی۔ نہ ہی گھر زیادہ پر آسائش اور بڑا تھا۔ خدیجہ کے مقابلے میں ان کی مالی حیثیت بہت کم تھی مگر خدیجہ ہمیشہ انہیں سپورٹ کرتیں اور کبھی کسی کمی کا احساس نہ ہونے دیتیں۔ شوہر کی وفات کے بعد جو فنڈ ملار ریحانہ نے اسے بینک میں جمع کروادیا اور یہی سوچا کہ شہیلہ کی شادی پر نکلوائیں گی۔ سلمان کی تنخواہ سے گھر کا خرچ مشکل سے پورا ہوتا تھا۔

”ریحانہ، میں تو اس غرض سے آئی ہوں کہ جلد سے جلد فہام اور شہیلہ کی شادی کر دی جائے۔“ خدیجہ نے کہا۔

”خالہ جان اتنی جلدی..... تیاری کے لیے کوئی وقت تو دیں۔“ سلمان جلدی سے بولا۔

”بیٹا کیسی تیاری..... ریحانہ کان کھول کر سن لو میں ایک پائی کا جہیز نہیں لوں گی۔ شہیلہ کے لیے زیورات اور کپڑے میں خود ہنواؤں گی اور بارات میں بھی بہت کم لوگ لاؤں گی۔“ خدیجہ نے کہا۔

”نہیں آپا..... اب ہم نے بیٹی کو ایسے ہی تو رخصت نہیں کرنا۔“ ریحانہ نے کہا۔

”ریحانہ میں نمود و نمائش اور پیسے کے زیاں کو

غزل

ہم بھی سوچیں اگر خساروں کو
منہ دکھائیں گے کیا بہاروں کو
لطف دے گی شکستہ کشتی بھی
بھول جاؤ اگر کناروں کو
چین ملتا ہے تیری محفل میں
چاند کو جگنوؤں کو تاروں کو
مرسلہ: دورِ شرمِ کراچی

”آمین..... آمین۔ ماما، شہیلہ آپ کے لیے
شاہنگ کرتے ہوئے مجھے اتنی خوش محسوس ہوتی ہے کہ
آپ کو کیا بتاؤں۔“ ردا نے مسکرا کر جلدی سے کہا۔
”بیٹا یہ بھتیجیوں کے رشتے ہوتے ہیں اور خوشی بھی
جب ہی محسوس ہوتی ہے جب انسان دل سے کسی کو چاہتا
ہے۔“ خدیجہ مسکرا کر بولیں۔

”مجھے تو اس دن کا شدت سے انتظار ہے جس
دن شہیلہ آپ کی ہمیشہ کے لیے ہمارے گھر میں آجائیں
گی۔“ ردا نے مسکرا کر دوپٹا نہ کرتے ہوئے کہا۔
”اللہ خیر سے وہ دن لائے لیکن سوٹ واقعی بہت
اچھا ہے۔“ خدیجہ مسکرا کر بولیں۔

”ہے ناں ماما..... میں شہیلہ آپ کو فون کر کے
بتاتی ہوں۔“ ردا نے خوش ہو کر کہا۔

”ردا تم بھی ناں..... کیا کچھ بتاؤ گی۔ سب کچھ
ہی بہت اچھا ہے۔“ خدیجہ ہنستے ہوئے بولیں اور وہ
اپنے موبائل پر شہیلہ کا نمبر ملانے لگی۔

”ہیلو شہیلہ آپ کی، آج میں نے آپ کے لیے
بہت زبردست شاہنگ کی ہے ایک ڈریس مجھے اتنا پسند
آیا کہ میں نے فوراً ہی خرید لیا۔“ ردا نے خوش ہو کر
شہیلہ سے کہا۔

”اچھا اس میں کیا خاص بات ہے؟“ اس نے
زبردستی مسکرا کر پوچھا۔

”ملٹی کلر کے کومی نیشن پر بہت خوب صورت
کام ہوا ہے۔“ ردا مسکرا کر بولی۔

”ملٹی کلر.....؟“ شہیلہ نے چونک کر پوچھا۔
”کیوں، آپ کو ملٹی کلر پسند نہیں ہے؟“ ردا نے

ایک دم گہرا کر پوچھا۔
”ارے نہیں..... نہیں تم جو بھی لاؤ گی وہ مجھے پسند
ہوگا۔“ شہیلہ نے جلدی سے موڈ بدلتے ہوئے کہا۔

”جھینک یو۔“ ردا مسکرا کر بولی۔
”خالہ جان کے گھٹنوں میں بہت درد تھا تو کیا تم
ایک شاہنگ کرنے لگی تھیں؟“ شہیلہ نے یک دم منہ بنا

سے کہا تو فہام پریشانی سے ہونٹ کاٹنے لگا۔

”اوکے..... تم اپنا موڈ آف نہ کرو۔ میں ماما سے
کہوں گا۔ وہ آئندہ تم لوگوں کے معاملات میں انٹرفیر
نہیں کریں گی۔“ فہام نے اس کا موڈ ٹھیک کرنے کے
لیے کہا تو شہیلہ کے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ پھیل
گئی۔ جو وہ چاہتی تھی فہام اسی طرف آ رہا تھا۔ اس کا
موڈ یک دم ٹھیک ہو گیا اور وہ اس سے مسکرا مسکرا کر
باتیں کرنے لگی۔

”اچھا یہ بتاؤ تم اپنے اور میرے اس ملن پر کتنی
خوش ہو؟“ فہام نے مسکرا کر معنی خیز انداز میں پوچھا۔

”آنکھوں نے جس کے سننے دیکھے ہوں اور دل
نے جس کے بارے میں کیا کچھ محسوس کیا ہو۔ وہ شخص
ملنے جا رہا ہو تو کیا احساسات ہوتے ہیں۔ یہ تو آپ
کو معلوم ہونا چاہیے۔“ شہیلہ نے مسکرا کر کہا تو فہام
نے بھر پور تہہ لگایا۔

”بالکل..... میری بھی یہی کنڈیشن ہے شہیلہ۔
آئی لو یو سوچ۔“ فہام نے مسکرا کر کہا۔

”آئی لو یو ٹو۔“ شہیلہ نے قدرے شرمناک
جواب دیا تو دونوں مسکرانے لگے۔

☆☆☆

خدیجہ لاؤنج میں صوفے پر بیٹھی تھیں اور ردا ان
کے پاس بیٹھی انتہائی خوشی سے شاہنگ بیگز میں سے
کپڑے نکال نکال کر دکھا رہی تھی۔

”ماما یہ دیکھیں، کتنا خوب صورت دوپٹا ہے اور
کلر کومی نیشن بھی بہت خوب صورت ہے۔ شہیلہ آپ کی کو
بہت سوٹ کرے گا۔ مجھے پہلی نظر میں ہی اتنا پسند آیا
کہ میں نے اسے فوراً ہی خرید لیا۔“ ردا نے ایک خوب
صورت کا مہر دوپٹا انہیں دکھاتے ہوئے کہا۔

”ہاں ماشاء اللہ کام بھی بہت خوب صورت ہے
اور رنگ بھی۔ خدا شہیلہ کو پہننا اوڑھنا نصیب
کرے۔“ خدیجہ نے اپنی عینک لگا کر دوپٹے کو ہاتھ لگا
کر دیکھتے ہوئے کہا۔

سے بولی۔

”ماما نے تو تم لوگوں کا ہی بھلا سوچا ہے۔“ فہام
نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”کیا ضرورت تھی اتنا ہمدرد بننے کی۔ میرے
بھائی، بھابی کون سا مجھ پر پہلے ہی بہت کچھ خرچ کرتے
ہیں۔ ایک شادی پر ہی کرنا تھا، وہ بھی انہیں روک دیا
گیا ہے۔“ شہیلہ غصے سے بولی۔

”کیا مطلب؟“ فہام نے اسے حیرت سے
پوچھا۔

”مسلمان بھائی کو تو اپنی بیوی کے ناز و غرے
اٹھانے سے ہی فرصت نہیں ملتی۔ میں اور ماما، ڈیڈی کی
پنشن سے گزارہ کرتی ہیں۔ ماما نے میری شادی کے
لیے کچھ سیونگ کر رکھی ہے۔ اب انہیں موقع مل جائے
گا۔ دونوں اب اسے بھی ہتھیالیں گے۔“ شہیلہ فہام کو
بتاتے ہوئے بولی۔

”آئی ایم سوری..... میں تو کچھ بھی نہیں جانتا۔
ایڈ آئی ایم شیور ماما بھی نہیں جانتی ہوں گی لیکن شہیلہ
ہمارے گھر میں تمہیں کسی بھی چیز کی کمی نہیں ہوگی۔“
فہام اس نے اچھی طرح سمجھایا۔

”فہام بات کی کی نہیں ہے بات میرے کنبوں
بھائی اور گھٹیا فطرت والی بھابی کی ہے۔ خود غرض اور
لاچکی ہیں۔“ وہ انتہائی حقارت سے بولی۔

”شہیلہ تم ان لوگوں کے بارے میں ایسی باتیں
کیوں کر رہی ہو؟“ فہام کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔

”اس لیے کہ میں ان دونوں کو اچھی طرح جانتی
ہوں، ہر کوئی ردا کے بھائیوں جیسا نہیں ہوتا۔“ شہیلہ
نے غصے سے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

”یہ تم لوگوں کا پرسنل میٹر ہے، اب میں کیا کہہ
سکتا ہوں۔“ فہام ڈرا بھٹکا کر بولا۔

”یہی تو میں سمجھا رہی ہوں کہ آپ لوگوں کو کسی بھی
معاملے میں بولنے کی ضرورت نہیں۔ ہر گھر کے اپنے
مسائل اور ضروریات ہوتی ہیں۔“ شہیلہ نے قدرے غصے

”ارے نہیں، رشنا میرے ساتھ تھی اور ہم نے
بہت انجوائے کیا۔“ ردا مسکرا کر بولی۔

”آئی سی پھر تو تم بہت تھکی ہوئی ہوگی۔ اب تھوڑا
ساریسٹ کرلو۔“ شہیلہ نے بچھے ہوئے لہجے میں آہستہ
آواز میں کہا۔

”ہاں، اوکے بائے۔“ وہ مسکرا کر بولی۔
”ماما شہیلہ آپ کی کبھی ڈریس کا سن کر اچھا لگا ہے۔“
ردا نے ماں کو خوشی سے بتایا تو دونوں مسکرانے لگیں۔

☆☆☆

ریحانہ اپنے کمرے میں وارڈروب کھولے
کھڑی تھیں اور اس میں سے کچھ نئے کپڑے نکال کر
دیکھ رہی تھیں۔ شہیلہ قدرے غصے میں ان کے کمرے
میں داخل ہوئی۔

”شہیلہ بیٹے میں نے یہ کچھ کپڑے نکالے ہیں،
تمہارے لیے اور ردا کے لیے جو تمہیں پسند ہوں وہ
دیکھ لو۔“ انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”مجھ سے پسند کروانے کی کیا ضرورت ہے۔
جو دل چاہتا ہے دے دیں۔“ شہیلہ غصے سے منہ

بنا کر بولی۔

”کیوں ایسی کیا بات ہوگی؟“ ریحانہ نے چونک کر پوچھا۔

”اوسر ردا اپنی فرینڈ کے ساتھ میری شاپنگ کر رہی ہے۔ اس نے اتنا گوارا نہیں کیا کہ مجھے ساتھ لے جا کر میری چوئس کے ڈریس خریدتی۔“ شمیلہ نے منہ بنا کر شکایتی لہجے میں کہا۔

”بیٹا شادی بیاہ کی شاپنگ مائیں، بہنیں بڑے ارا مانوں اور چاہتوں سے کرتی ہیں اور میرا خیال ہے آپا نے اس لیے کہیں نہیں بلایا ہوگا۔ ورنہ وہ تو تمہیں ہر بات میں آگے کرتی ہیں۔ تم اس بات سے دل میلانہ کرو۔ ساری زندگی تم نے اپنی ہی پسند سے کپڑے پہنے ہیں۔ انہیں اپنے ارا مان پورے کرنے دو۔“ ریحانہ نے گہری سانس لے کر اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”لیکن ماما..... پھر بھی۔“ وہ خفگی سے ماں کو دیکھنے لگی۔

”تم جس گھر میں جا رہی ہو وہ بہت نصیب والیوں کو ملتا ہے۔ جتنی محبت اور چاہت وہ لوگ دکھا رہے ہیں ان کی قدر کرو۔“ ریحانہ نے اس کی بات کاٹ کر کہا تو وہ کچھ شرمندہ ہی ہو گئی۔

”پلیز بیٹا، اس گھر میں جانے سے پہلے اپنے ذہن سے تمام خبی باتیں نکال دو اور اب یہ سوٹ پسند کرو جو تمہیں اچھا لگے۔“ ریحانہ نے مسکرا کر اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھاتے ہوئے کہا تو وہ زبردستی مسکرا کر پکڑے دیکھنے لگی۔

☆☆☆

توقیر کمرے میں اندھیرا کیے بیڈ پر آنکھیں موند لیتا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں بار بار غم بوری تھیں۔ کبھی وہ آہیں بھرتا ہوا اٹھ کر بیٹھ جاتا اور کبھی لیٹ جاتا تھا۔

”مجھے سمجھ نہیں آ رہا۔ ردا نے میری محبت کو کیوں ویلو نہیں کیا، میں تو اس سے بہت پُر خلوص اور شدید محبت کرنے لگا تھا۔ اس نے ایک لمحے کے لیے بھی نہیں

سوچا کہ یوں انکار کرنے سے میں کتنا ہرٹ ہو گا۔“ توقیر نے پریشان ہو کر سوچا اور اپنی غم آنکھوں کو اپنے ہاتھوں سے صاف کرنے لگا۔

”کمرے میں اتنا اندھیرا کیوں کر رکھا ہے؟“ نجمہ نے اس کے کمرے میں داخل ہو کر حیرت سے بڑبڑاتے ہوئے کہا اور آگے بڑھ کر لائٹ آن کی توقیر نے جلدی سے اپنی آنکھوں پر بازو رکھ لیا۔

”توقیر کیا تم سو رہے ہو بیٹا کھانا بھی نہیں کھایا؟“ نجمہ نے اس کے قریب بیٹھ کر اس کا بازو ہلاتے ہوئے کہا تو توقیر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ نجمہ اسے آوازیں دینے لگیں مگر وہ خاموش رہا۔

”توقیر تو اتنی جلدی سونے کا عادی نہیں پھر آج کیسے سو گیا۔“ نجمہ حیرت سے بڑبڑائیں۔

”توقیر بیٹا تم ٹھیک تو ہونا آج جلدی کیوں سو گئے؟“ انہوں نے اس کا بازو پھر ہلاتے ہوئے پوچھا۔

”میرے سر میں بہت درد ہے، مجھے سونے دیں۔“ توقیر نے منہ بنا کر آہستہ آواز میں کہا اور کروٹ بدل لی۔ انہوں نے پریشانی سے اس کی طرف دیکھا اور کمرے سے باہر چلی گئیں۔

ان کے جاتے ہی وہ آہ بھر کر اٹھ بیٹھا اور واش روم میں جا کر شیشے کے پاس کھڑا ہو گیا اس کی آنکھیں متورم تھیں، وہ پانی کے چھینٹے زور زور سے اپنے چہرے پر مارنے لگا۔ جس میں اس کے آنسوؤں کی آمیزش بھی شامل تھی۔

☆☆☆

نجمہ اور رشنا دونوں..... بیٹھی ناشتا کرنے میں مصروف تھیں۔ توقیر اپنے کمرے سے باہر نکلا۔ اس کی آنکھیں انتہائی سرخ اور چہرہ بہت اداس اور پریشان دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے شیو بھی نہیں کی تھی اور نہ ہی ٹھیک سے تیار ہوا تھا۔ وہ اپنا بیگ پکڑے لاؤنچ سے باہر جانے لگا۔

”توقیر..... کیا تم ناشتا کیے بغیر آفس جا رہے

ہو؟“ نجمہ نے چونک کر اسے آواز دیتے ہوئے پوچھا۔ ”مجھے بھوک نہیں ہے۔“ اس نے ان کی طرف دیکھے بغیر آہستہ آواز میں جواب دیا۔

”توقیر یہاں آؤ۔“ نجمہ نے خفگی سے تھکمانہ انداز میں کہا تو توقیر خاموشی سے ڈائمنگ ٹیبل کے قریب آ گیا۔

”اوسر بیٹھو اور ناشتا کر کے آفس جاؤ اور تم تیار بھی ٹھیک سے نہیں ہوئے۔“ نجمہ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں نے کہا نا کہ مجھے بھوک نہیں ہے اور میں ٹھیک ہوں۔“ توقیر نے قدر سے جھنجھلا کر کہا۔

”رشنا بھائی کو چائے بنا کر دو۔“ نجمہ نے رشنا کی طرف دیکھ کر کہا۔ توقیر خاموشی سے بیٹھ گیا۔ رشنا نے کپ میں چائے ڈالتے ہوئے بار بار اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔

”توقیر کیا بات ہے، چہرے سے بہت پریشان لگ رہے ہوں۔ یوں لگ رہا ہے جیسے رات بھر سو نہیں سکے۔“ انہوں نے اس کی طرف بغور دیکھ کر کہا۔

”کچھ نہیں۔“ توقیر نے چائے پیتے ہوئے آہستہ آواز میں کہا۔

”کیا آفس میں کوئی ٹینشن چل رہی ہے؟“ نجمہ نے گہری سانس لے کر پوچھا۔

”نہیں۔“ اس نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

”پھر کیا بات ہے، کچھ تو بتاؤ۔ تمہارا چہرہ صاف بتا رہا ہے کہ تم بہت پریشان ہو؟“ انہوں نے خفگی سے جھنجھلا کر پوچھا۔

”کچھ بھی نہیں۔“ وہ گہری سانس لے کر بولا۔

”مگر توقیر بھائی آج آپ چہرے سے بالکل مجبوں لگ رہے ہیں اور وہ بھی نا کام مجبوں۔“ رشنا نے اس کی طرف دیکھ کر ہنسنے ہوئے کہا۔

”کہیں محبت میں نا کامی تو نہیں ہوئی؟“ رشنا نے مسکرا کر راز و دانہ انداز میں پوچھا تو توقیر نے یک

کھیں دیپ جلے کھیں دل دم چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پھر اس کی آنکھیں غم ہونے لگیں اور وہ چائے کا کپ وہیں چھوڑ کر اٹھ کر چلا گیا تو رشنا یک دم پریشان ہو گئی۔

”یہ توقیر بھائی کو کیا ہوا ہے..... جب تک بات کا جواب نہیں دے لیتے تھے وہ خاموش نہیں بیٹھتے تھے اور آج تو بولے نہیں کچھ گڑبڑ ہی لگ رہی ہے۔“ وہ فکر مند ہی بولی۔

”ہاں، میں بھی یہی محسوس کر رہی ہوں۔ اچھا بھلا تھا اچانک ہی اسے کچھ ہو گیا ہے۔“ نجمہ نے پریشانی سے کہا تو رشنا بھی پریشان ہو گئی۔

☆☆☆

ردا گاڑی ڈرائیو کر رہی تھی۔ رشنا اس کے ساتھ ہی تھی۔ وہ بہت خاموش تھی، زیادہ باتیں نہیں کر رہی تھی۔

”کیا بات ہے رشنا، آج تم خاموش کیوں ہو، کیا فراز بھائی سے جھگڑا ہو گیا ہے؟“ ردا نے چونک کر اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

”نہیں یار، میں توقیر بھائی کی وجہ سے بہت آپ سیٹ ہوں۔“ رشنا نے فکر مند ہی کہا۔

”کیوں، انہیں کیا ہوا ہے؟“ ردا نے ایک دم چونک کر پوچھا۔

”میری تو پتا نہیں چل رہا۔ ہر وقت ہنسنے ہنسانے والے اور خاموش نہ بیٹھنے والے توقیر بھائی ایک دم اتنے چپ ہو گئے ہیں کہ کسی سے بات ہی نہیں کرتے اور چہرے سے بھی بہت پریشان اور اداس دکھائی دیتے ہیں۔“ رشنا نے اک آہ بھر کر کہا تو ردا نے ایک زبردست بریک لگائی اور بوکھلا کر ریش ڈرائیو نگ کرنے لگی۔

☆☆☆

فہام، خدیجہ کے ہمراہ صوفے پر بیٹھا تھا اور خدیجہ خوشی خوشی شاپنگ بیگز کھول کر اسے دکھا رہی تھیں۔ کپڑوں کو دیکھ کر فہام کے چہرے پر مسکراہٹ پھیلنے لگی۔

گا۔“ عاصم نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا۔

”کیا الدین کا جن ہے آپ کے پاس؟“ روا نے چونک کر پوچھا۔

”نہیں، جن کی خالہ یعنی کہ تم۔“ عاصم نے بہن کو مسکراتے ہوئے دیکھ کر کہا۔

”جائیں، میں کارڈ نہیں لکھتی اب دو منٹ میں خود ہی لکھیں۔“ روا نے مصنوعی خشکی سے کارڈ اور پین چھوڑ کر جاتے ہوئے کہا۔

”اگر میری گڑیا ناراض ہو کر کارڈ نہیں لکھے گی تو پھر کوئی بھی نہیں لکھے گا۔“ فہام نے مسکرا کر پیار سے اسے صوفے پر بٹھاتے ہوئے کہا تو روا مسکرا کر صوفے پر بیٹھ گئی۔

”بیٹا..... اب جلدی کام کرو، ردا سب سے پہلے رشنا کا کارڈ لکھو اور کل تم خود ان کے گھر کارڈ دینے جانا۔ اس بچی نے شادی میں بہت کام کیا ہے۔“

خدیجہ بخیدگی سے بولیں۔

”جی..... ما!“ اس نے مسکرا کر کارڈ لکھتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

توقیر، نجمہ کے ساتھ لان میں چیئر پر بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ اس کی شیو بڑھی ہوئی تھی اور وہ چہرے سے بہت افسردہ دکھائی دے رہا تھا۔ رشنا ضروری چیزوں کی لسٹ پکڑے لان میں آئی وہ قریب کی ہی مارکیٹ جا رہی تھی۔

”مما! ایک بار یہ چیزوں کی لسٹ دیکھ لیں اور بتا دیں کوئی چیز رہ تو نہیں گئی۔“ اس نے ہاتھ میں پکڑی لسٹ ماں کو دکھاتے ہوئے کہا۔

”میرا خیال ہے سب چیزیں تو میں نے لکھ دی ہیں کوئی نہیں رہ گئی۔“ نجمہ نے لسٹ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”لائیں..... میں ابھی لے کر آئی ہوں۔“ رشنا لسٹ پکڑتے ہوئے بولی اور وہ ڈرائیور کے ساتھ گاڑی میں چلی گئی۔ توقیر ہر چیز سے بے نیاز آہستہ

سب لاؤنج میں جمع تھے۔ ان کے سامنے.....

بہت خوب صورت شادی کے کارڈز کا ڈھیر میز پر بڑا ہوا تھا۔ عاصم اور ردا کارڈز لکھنے میں مصروف تھے جبکہ حاتم کے ہاتھ میں مہمانوں کی لسٹ تھی۔ فہام بہت خوش تھا اور مسکرا کر انہیں دیکھ رہا تھا۔ خدیجہ کچھ خاموش تو ضرور تھیں لیکن ان کی کوشش تھی کہ کسی کو کچھ محسوس نہ ہو۔

”فہام بھائی..... آپ نے اپنی شادی کا کارڈ اتنا خوب صورت بنوایا ہے تو میری شادی پر کیسا بنوائیں گے؟“ عاصم ایک کارڈ پکڑ کر شرارتی لہجے میں بولا۔

”بے فکر رہو..... تمہارا کارڈ تو میں سونے کے پانی سے لکھواؤں گا۔“ فہام مسکراتے ہوئے بولا۔

”اوہ..... رینی.....“ عاصم خوش ہو کر بولا۔

”اور ردا کا کارڈ؟“ عاصم مسکرا کر ردا کی طرف دیکھ کر بولا۔

”جیسا ردا کہے گی۔“ فہام مسکراتے ہوئے بولا تو ردا منہ نیچے کر کے شرمائی گئی۔

”کچھ شرم کریں، کیسی باتیں کر رہے ہیں۔“ روا نے عاصم کو کھورتے ہوئے کہا۔

”اور حاتم بھائی کی شادی پر ہم کارڈ پرنٹ نہیں کروائیں گے صرف ایک پلین کاغذ پر انویشن لکھ کر بھیج دیں گے۔“ عاصم نے حاتم کی طرف دیکھ کر قہقہہ لگاتے ہوئے کہا تو اس نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”وہ کیوں بھئی؟“ فہام نے حیرت سے پوچھا۔

”حاتم بھائی ظہرے سوہرے..... بخیدہ مزاج، انہیں زندگی کی خوشیوں اور رنگینیوں سے کیا کام.....

مجھے تو لگتا ہے ان کی دلہن کے ڈریس پر بھی کام نہیں کڑھائی ہوگی اور وہ بھی سمپل سی۔“ عاصم مسکرا کر شرارتی لہجے میں بولا تو سب ہنسنے لگے۔

”بس کرو عاصم کیا فضول باتیں کر رہے ہو اور جلدی سے کارڈز لکھو اتنا زیادہ کام ہے۔“ خدیجہ مصنوعی خشکی سے بولیں۔

”مما..... آپ حکم کریں، دو منٹ میں لکھ دوں

لے کر بولیں۔

”وہ تو سب ٹھیک ہے مگر.....“ فہام پریشانی سے بولا۔

”میں سب سمجھ گئی ہوں تمہیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔“ خدیجہ شکستہ لہجے میں بولیں اور خاموش ہو کر بے دلی سے کپڑے شاپنگ بیگ میں ڈالنے لگیں۔ فہام شرمندہ سا وہاں سے اٹھ کر چلا گیا۔

☆☆☆

ردا ایک اسٹاکش ڈریس پہنے تیار ہو کر بیگ کندھے پر ڈالے خدیجہ کے کمرے میں آئی تو دیکھا ماں بیڈ پر آنکھیں بند کیے لیٹی ہوئی تھیں، ردا مسکراتے ہوئے ان کے پاس آ بیٹھی۔

”مما..... ہاں تو بتائیں آج ہمیلہ آپ کی لیے کیا شاپنگ کرنی ہے؟“ وہ مسکراتے ہوئے پوچھنے لگی۔

”جو کچھ بھی لانا ہے بس آج لا کر شاپنگ ختم کرو۔“ خدیجہ گہری سانس لے کر بڑی بیزاری سے بولیں۔

”کیوں..... ممما، ابھی تو بہت شاپنگ رہتی ہے۔“ اس نے چونک کر پوچھا۔ ”کیا بات ہے آج آپ مجھے شاپنگ کے لیے بھیجتے ہوئے خوش نہیں لگ رہیں ورنہ آپ تو بہت خوش ہوتی ہیں۔“ روا نے ان کی طرف بغور دیکھ کر پوچھا۔

”کچھ نہیں، بس میری طبیعت ٹھیک نہیں۔“ خدیجہ گہری سانس لے کر بولیں اور اسے اپنے پرک میں سے پیسے نکال کر دے لگیں۔

”بس آج شاپنگ مکمل کرو، جو کچھ رہ جائے گا وہ ہمیلہ خود آ کر دیکھ لے گی۔“ خدیجہ نے آہ بھر کر کہا۔

”کیوں..... کیا کوئی بات ہوئی ہے؟“ روا نے چونک کر پوچھا۔

”نہیں کوئی بات نہیں ہوئی، اب تم جاؤ۔“ خدیجہ نے اس کی بات ٹالتے ہوئے کہا اور ردا حیرت سے ماں کو دیکھ کر وہاں سے چلی گئی۔

☆☆☆

”بیٹا کیا تمہیں ہمیلہ کے یہ کپڑے پسند آتے ہیں۔ تمہاری تو اپنی چوائس بہت اچھی ہے اگر کوئی کلرز پیچ کرنے ہوں تو بتا دینا۔“ خدیجہ نے مسکرا کر فہام سے پوچھا۔

”سب بہت اچھے ہیں۔“ فہام نے مسکرا کر کپڑوں کو ہاتھ لگا کر دیکھتے ہوئے کہا۔

”بے چاری ردا ہی اپنی سبیلی کے ساتھ ساری شاپنگ کر رہی ہے۔ میں تو گھٹنوں کے درد کی وجہ سے کہیں جا ہی نہیں پارہی۔“ خدیجہ نے مسکرا کر کہا۔

”ویسے تم ہمیلہ سے اس کی پسند بھی پوچھ لینا اور جو جو چیزیں پسند ہوں وہ بھی۔“ خدیجہ مسکراتے ہوئے بولیں۔

”میں نے تو ریحانہ کو صاف کہہ دیا ہے کہ وہ کوئی جینز نہ بنائے۔ سب میں ہی بناؤں گی۔ زور بھی کپڑے بھی۔“ خدیجہ اپنی ہی لے میں بولیں۔

”مما آپ کو ایسا کچھ نہیں کہنا چاہیے تھا۔“ فہام نے نظریں چراتے ہوئے آہستہ آواز میں کہا۔

”بیٹا..... کیا تم چاہتے ہو کہ ہمیلہ جینز لے کر اس گھر میں آئے؟“ خدیجہ ایک دم چونک کر بولیں۔

”نہیں..... مگر میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ ہم ان کے گھر یلو معاملات میں بولیں۔“ فہام نے ہنسنے لگا۔

”بیٹا..... تم کیا کہہ رہے ہو، مجھے تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔“ انہوں نے حیرت سے پوچھا۔

”مما..... بس آپ ہمیلہ کی فلیٹز کا خیال رکھیں۔“ وہ کسی بات سے ہرٹ نہ ہو۔“ فہام نے ایک دم بوکھلا کر بات کو گول مول کرتے ہوئے کہا اور خدیجہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔

”کیا یہ سب ہمیلہ نے تم سے کہا ہے؟“ انہوں نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”نہیں..... وہ؟“ فہام ایک دم بوکھلا گیا۔

”بیٹا..... میں تو اسے بھر پور محبت اور خوشیاں دینے کی کوشش کر رہی ہوں۔ صرف اس لیے کہ یہ گھر اس کو سہارا نہیں مکیا ہی لگے۔“ خدیجہ گہری سانس

لے کر پوچھا۔

”نہیں..... وہ؟“ فہام ایک دم بوکھلا گیا۔

”بیٹا..... میں تو اسے بھر پور محبت اور خوشیاں دینے کی کوشش کر رہی ہوں۔ صرف اس لیے کہ یہ گھر اس کو سہارا نہیں مکیا ہی لگے۔“ خدیجہ گہری سانس

آہستہ جاتے کے سبب لے رہا تھا۔

”تو قیر خدا کے لیے کچھ تو بولو..... کچھ تو بتاؤ، تمہاری اس خاموشی کو میں کیا سمجھوں؟“ نجمہ نے اس کی طرف بغور دیکھ کر کہا مگر تو قیر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ابھی رشنا کو نکلے پندرہ منٹ بھی نہیں ہوئے تھے کہ ردا گیٹ سے داخل ہوئی اور اُن کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔

”آؤ..... ردا کیسی ہو، بیٹا؟“ نجمہ نے مسکرا کر پوچھا۔

”آئی، رشنا کہاں ہے؟“ ردا نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”ذرا مارکیٹ تک گئی ہے ابھی آجائے گی، تم بیٹھو۔“ نجمہ نے کہا۔

”آئی..... میں فہام بھائی کی شادی کا کارڈ دینے آئی ہوں۔“ ردا نے مسکرا کر بیک میں سے کارڈ نکالتے ہوئے کہا۔

”آپ سب نے ضرور آنا ہے۔“ ردا نے مسکرا کر کہا اور ایک دم تو قیر کی طرف دیکھا مگر تو قیر خاموشی سے دوسری جانب دیکھ رہا تھا۔

”ہاں، ہاں بیٹا ہم سب آئیں گے، تم بیٹھو تو سہی۔“ نجمہ مسکراتے ہوئے بولیں۔ وہ گہری سانس لے کر بیٹھ گئی۔ تو قیر خاموشی سے چائے پی رہا تھا۔ اس نے ایک دفعہ بھی ردا کی طرف نہیں دیکھا۔

”آئی رشنا کب تک آئے گی؟“ ردا نے آہستہ سے نجمہ سے پوچھا۔

”بس تھوڑی دیر تک آجائے گی۔“ نجمہ نے مسکراتے ہوئے کہا تو ردا خاموش ہو گئی۔ اتنے میں ٹیبل پر رکھا نجمہ کا موبائل بجنے لگا۔

”تمہارے ڈیڈی کا فون ہے۔ مجھے اُن سے ایک ضروری بات کرنی ہے میں ابھی آتی ہوں۔“ نجمہ نے تو قیر کی طرف دیکھ کر کہا۔

”ردا بیٹے میں بس ابھی آئی، تم یہیں بیٹھو۔“ نجمہ نے ردا سے کہا اور خود فون پر بات کرتے ہوئے وہاں سے

چلی گئیں تو ردا نے نظریں چراتے ہوئے تو قیر کی جانب دیکھا۔ وہ اداس چہرہ لیے دوسری جانب دیکھ رہا تھا۔

”آپ بہت اب سیٹ لگ رہے ہیں۔“ ردا نے بہ مشکل اپنے آپ کو کپڑوں سے ہٹاتے ہوئے کہا تو قیر نے کوئی جواب نہ دیا اور نہ ہی اس کی طرف دیکھا تو قیر نے ایک گہری سانس لی۔

”کیا آپ، میری وجہ سے..... آئی ایم سوری میں آپ کو ہرٹ نہیں کرنا چاہتی تھی۔“ ردا رک رک بولی تو تو قیر نے غم آنکھوں سے اسے دیکھا اور ایک آنکھ بھری مگر بولا کچھ نہیں۔

”آپ کی یہ خاموشی مجھے گلٹی کر رہی ہے، پلیز کچھ تو کہیے۔“ ردا نے پریشانی سے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

”میں نے آج تک کسی سے محبت نہیں کی صرف اور صرف آپ سے کی ہے مگر آپ نے میری محبت کو یوں ٹھکرا دیا جیسے ہم کچرے میں کوئی چیز پھینکتے ہیں، کیا میری محبت اتنی بے وقعت ہے؟“ تو قیر نے آہ بھر کر اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

”آئی، ایم سوری..... اگر آپ میری وجہ سے ہرٹ ہوئے ہیں لیکن میں نے آپ کو حقیقت بتانے کی کوشش کی ہے کہ میرے دل میں آپ کے لیے وہ فیملی نہیں جو آپ اپنے دل میں میرے لیے محسوس کرتے ہیں۔“ ردا نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

”کیوں؟“ اس نے چونک کر پوچھا۔

”میں نہیں جانتی..... مگر میرے دل پر میرا اختیار بھی نہیں کہ میں اسے آپ کی طرف مائل کر سکوں۔“ ردا خشک لہجے میں بولی تو تو قیر نے چونک کر اسے دیکھا۔

”اور اپنی بد نصیبی مجھے دکھ دے رہی ہے کہ جس سے میں نے محبت کی اس کے لیے میری محبت کوئی معنی نہیں رکھتی۔“ وہ بڑی بے پارگی سے بولا۔

”میں کیسے اپنے دل کو آپ کی چاہت کے لیے مجبور کر دوں۔ میں جب بھی آپ کے بارے میں

سوچتی ہوں تو میرا دل اس سوچ کو ہی قبول نہیں کرتا۔“
روانے آہستہ سے کہا اور سر جھکا لیا۔
”مجھے خوشی ہے کہ آپ نے پوری سچائی سے مجھے اپنے دل کی حالت بتادی ہے، ردا میں کوئی آوارہ اور فلرٹ انسان نہیں جو دوبارہ کبھی آپ کا پیچھا کروں گا۔ میں آئندہ کبھی آپ کے راستے میں نہیں آؤں گا لیکن یہ یاد رکھیے کہ میری پہلی اور آخری محبت آپ ہی ہیں اور آپ ہی رہیں گی۔ میری زندگی میں آپ کے سوا کوئی اور نہیں آئے گا۔“ تو قیر نے آہ بھرتے ہوئے اس کی طرف دیکھ کر کہا تو روانے ایک دم چونک کر اسے دیکھا، اس کی آنکھیں نم ہونے لگی تھیں۔ رشنا کی گاڑی گیٹ سے اندر داخل ہوئی اور وہ گاڑی سے نکل کر اس کی جانب آئی۔

”اوہ، ردا..... تم کب آئیں چلو اندر چلتے ہیں۔“
رشنا جلدی سے بولی اور وہ خاموشی سے اٹھ کر وہاں سے چلی گئی، تو قیر نے آنکھوں سے اسے دیکھا رہ گیا۔

☆☆☆

فہام اپنے کمرے میں صوفے پر نیم دراز بہت روٹینک موڈ میں شہیلہ سے باتیں کر رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک مسکراہٹ تھی۔

”شہیلہ، ہماری شادی میں تین دن رہ گئے ہیں۔ تمہیں کیا محسوس ہو رہا ہے، آئی مین..... کیا تم ایکسٹنڈ ہو؟“ فہام نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”آف کورس..... یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ فہام میری زندگی میں آپ سب سے اہم ہیں اور آپ کو پانے کا خواب ہمیشہ سے دیکھتی آئی ہوں۔“

شہیلہ مسکرا کر قدرے شرماتے ہوئے بولی۔
”اور اب خواب پورا ہونے جا رہا ہے۔“ فہام مسکراتے ہوئے بولا۔

”پھر بھی آپ مجھ سے پوچھ رہے ہیں..... کیا میں خوش ہوں، میری زندگی اور خوشی سب کچھ آپ ہی ہیں۔“ شہیلہ مسکراتے ہوئے بولی۔

”تمہارا یہی انداز محبت تو مجھے امپریس کرتا ہے۔“ فہام مسکرا کر بولا۔
”صرف..... امپریس؟“ شہیلہ نے مسکرا کر معنی خیز انداز میں پوچھا۔

”یار امپریس ہونا ہی سب سے بڑی بات ہوتی ہے۔“ فہام ہنستے ہوئے بولا۔
”دیکھیے گا..... میرے علاوہ زندگی میں اور کسی سے امپریس نہیں ہونا۔“ شہیلہ مسکراتے ہوئے بولی۔

”بے فکر ہو..... میری زندگی میں جو کچھ تمہاری اور ردا کی ہے کسی کی کبھی نہیں ہو سکے گی۔“ فہام مسکراتے ہوئے بولا تو شہیلہ کے چہرے کے تاثرات بدلنے لگے۔
”ہاں، ہاں..... وہ تو میں اچھی طرح جانتی ہوں۔“ شہیلہ خود کو تامل کرتے ہوئے جلدی سے بولی۔
”شہیلہ جانتی جو جب ممانے مجھ سے شادی کے بارے میں پوچھا تو میں نے تمہیں ترجیح کیوں دی؟“ فہام مسکراتے ہوئے بولا۔

”ہاں..... میری محبت کی وجہ سے ا“ شہیلہ مسکراتے ہوئے بولی۔
”ہاں، یہ بھی بہت بڑا فیکٹر ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہ ہم آپس میں کزنز ہیں اور تم ردا کے ساتھ بھی کافی اٹیچڈ ہو۔ کوئی اور لڑکی ہوتی تو شاید وہ میرے اور ردا کے ریلیشن شپ کو کبھی سمجھ نہیں پاتی لیکن تمہیں تو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔“ فہام مسکراتے ہوئے بولا۔

”تو ہمارے ریلیشن شپ کی ریزن ردا ہے کچھ اون نہیں؟“ شہیلہ ایک دم چونک کر بولی۔
”ہاں..... یونہی سمجھو۔“ فہام مسکراتے ہوئے بولا تو اس نے گہری سانس بھری اور خاموش ہو گئی۔

”میں بس یہی چاہتا ہوں کہ تم ردا سے ویسی ہی محبت کرو جیسی میں کرتا ہوں۔“ فہام مسکراتے ہوئے بولا۔
”ہاں، ہاں..... کیوں نہیں، میں نے تو اسے

ہمیشہ اپنی چھوٹی بہن سمجھا ہے اور سمجھتی رہوں گی۔“ شہیلہ ایک دم منہ بنا کر مگر لہجے میں نرمی لاتے ہوئے بولی۔
”تھینک یو شہیلہ..... تم ہمیشہ میری بات مانتی آئی ہو اور تمہاری یہ خوبی مجھے سب سے اچھی لگتی ہے۔“ فہام مسکراتے ہوئے بولا۔

”شکر ہے میں آپ کو کہیں دکھائی تو دی۔“ وہ طنز یہ انداز میں قہقہہ لگاتے ہوئے بولی۔
”یار تم میرے دل میں رہتی ہو اور جو دل میں ہوں وہ کہیں اور دکھائی کیوں دے۔“ فہام نے ہنستے ہوئے کہا تو شہیلہ معنی خیز انداز میں مسکراتے لگی۔ فہام باتیں کرتا رہا اور شہیلہ ہونٹ سکڑ کر اور منہ بنا کر انہیں سختی رہی۔ ظاہری طور پر اس کی ہاں میں ہاں ملائی رہی مگر اس کا دل بری طرح کھٹا ہوا چپکا تھا۔ فہام کی محبت کی خاطر وہ سب کچھ برداشت کر رہی تھی۔

☆☆☆

شہیلہ اور فہام کی شادی کی دونوں گھروں میں زبردست تیاریاں ہوں رہی تھیں۔ خاندان اور سٹلنے چلنے والے بھی بہت خوش تھے اور فہام کی شادی کا خاص چاؤ کر رہے تھے شاید اس کی وجہ فہام کی ہر ایک سے دوستی اور اپنائیت تھی..... سب ہی اسے بہت چاہتے تھے۔

☆☆☆

فہام احمد کی شادی میں جانے کے لیے رشنا انتہائی خوب صورت اسٹائلش ڈریس پہنے، بالوں کا اسٹائل بناتے تیار تھی۔ نجمہ بھی خوب صورت لباس میں ہلبوس صوفے پر بیٹھی اپنے نیک میں اپنا موبائل اور پیسے گن کر رکھ رہی تھی۔ ٹیبل پر خوب صورت پیکنگ میں نفٹس رکھے تھے۔

”بہت اچھی لگ رہی ہو۔“ نجمہ نے مسکرا کر رشنا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
”تھینک یو ماما..... میں تو تیار ہوں اور آپ؟“ شہیلہ مسکراتے ہوئے پوچھنے لگی۔
”میں بھی بس تیار ہوں۔ تو قیر نہ جانے کہاں رہ

گیا ہے۔ اسے میں نے صبح ہی کہا تھا کہ شادی میں ضرور چلتا ہے۔“ نجمہ نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔
”اور انہیں یقیناً اپنی سوچوں میں سب کچھ بھول گیا ہوگا۔ آج کل تو وہ اتنے خاصے absent minded ہو رہے ہیں۔ ابھی تک آفس سے ہی نہیں آئے۔“ رشنا منہ بنا کر بولی۔

”بیٹا اسے فون کر دو کہ وہ جلدی گھر آئے۔“ نجمہ نے کہا تو رشنا اپنے موبائل پر تو قیر کا نمبر ملانے لگی کہ اس کی گاڑی کا ہارن سنائی دیا۔ کچھ لمحوں بعد وہ بوجھل قدموں سے اندر آیا۔ چہرے سے بہت اداس لگ رہا تھا۔

”کیا..... آپ لوگ کہیں جا رہے ہیں؟“ تو قیر نے دونوں کو تیار دیکھ کر حیرت سے پوچھا۔
”دیکھا میں کیا کہہ رہی تھی؟“ رشنا نے منہ بنا کر خفگی سے کہا۔
”آج ردا کے بھائی کی شادی ہے اور ہم سب کو وہاں جانا ہے۔ جلدی سے تیار ہو کر آؤ۔“ نجمہ نے تو قیر کے قریب آ کر کہا۔

”مجھے کہیں نہیں جانا..... میری طبیعت ٹھیک نہیں۔“ تو قیر نے ٹائی کی ٹائٹ ڈسٹریکشن کرتے ہوئے بیزار سی کہا۔
”کیا ہوا..... بخار تو نہیں ہے؟“ نجمہ نے گھبرا کر اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”انہیں جو بخار ہے، دکھائی دینے والا نہیں۔“ رشنا نے منہ بنا کر جواب دیا۔
”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ تو قیر نے خفگی سے پوچھا۔

”بیماری ہے ہی نہیں تو دکھائی کہاں سے دے۔ آپ بس ایکسکوزز ڈھونڈ رہے ہیں..... نہ جانے کے۔“ رشنا نے منہ بنا کر کہا۔
”ہاں..... یونہی سمجھو۔“ تو قیر اسے غصے سے دیکھتے ہوئے اپنے کمرے میں چلا گیا۔

”یہ تو قیر کو کیا ہوا..... اس نے تو کبھی اس لہجے

میں بات نہیں کی۔“ نجمہ حیرت سے بولیں۔
 ”نہیں جاتے تو نہ جائیں۔ آپ تو چلیں ہم لوگ پہلے ہی لیٹ ہو رہے ہیں۔“ رشنا نے ہنسی سے منہ بنا کر کہا تو نجمہ آہ بھر کر رہ گئیں۔

☆☆☆

”یعنی بیٹا اپنی تیاری کرلو۔ سامان باندھ لو یگم صاب کا حکم ہے کل شام تمہیں شہر جانا ہے۔“ اماں بشیراں نے رات کو سونے سے پہلے اس سے کہا۔
 ”اماں میری پیکنگ تو مکمل ہے مگر یہاں میرا دل لگ گیا ہے۔ بالکل جانے کو دل نہیں چاہ رہا اور خاص طور پر آپ سے تو بہت محبت ہو گئی ہے۔ اماں آپ بہت اچھی ہیں۔ آپ میرے ساتھ شہر کیوں نہیں چلتیں۔“ یعنی نے محبت سے بشیراں کے گلے میں بائیں ڈالتے ہوئے کہا۔

”نہیں بیٹا..... میرا جینا مرنا تو جلی میں ہے۔ یہی میرا میکا اور سسرال ہے۔ اب مگر کہی یہاں سے نکلوں گی مگر اب تم آتی رہنا۔“ بشیراں نے محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔
 ”معلوم نہیں اب کب آؤں گی۔“ وہ افسردگی سے بولی۔

”کیوں؟“ بشیراں نے حیرت سے پوچھا۔
 ”پڑھائی بھی تو کرنی ہے۔“ وہ اکتاہٹ سے بولی۔

”تم کیا پڑھتی ہو؟“
 ”بہت سی کتابیں۔ انگریزی اور اردو میں۔“ وہ منہ بنا کر بولی۔

”کتابیں بندے کو عقل سکھاتی ہیں۔ ہم جیسے ان پڑھ لوگوں کو جو بائیں زندگی کی ٹھوکریں کھا کر پتا چلتی ہیں تم لوگ وہ پہلے ہی کتابوں میں پڑھ لیتے ہو۔ تمہارے دادا جی کی ڈھیروں کتابیں الماریوں میں پڑی ہیں وہ بہشتی بھی رات کو کتاب پڑھے بغیر نہیں سوتے تھے۔ میں اکثر ان سے پوچھتی تھی۔ صاب جی

آپ سارا دن زمینداری کر کے تھکے ہوئے ہوتے ہیں اور پھر رات گئے تک کتابیں پڑھتے ہیں، آپ کو نیند نہیں آتی؟ تو جانتی ہو وہ کیا جواب دیتے تھے..... کہتے تھے۔ بشیراں اچھی کتاب سے پیارا اور کوئی دوست نہیں اور جب تک میں اپنے دوست کا حال چال نہ پوچھ لوں نیند نہیں آتی۔“ بشیراں نے ہنستے ہوئے کہا تو یعنی بھی ہلکھلا کر ہنس دی۔

”اس کا مطلب ہے دادا جی بہت خوش مزاج انسان تھے؟“ یعنی نے کہا۔

”ہاں۔ بچوں، بڑوں اور ملازموں سب سے بہت محبت اور نرمی سے پیش آتے تھے مگر دشمنوں اور دغا بازوں کے بارے میں بہت سخت تھے۔ کھڑے کھڑے بندے کو پتھر کا دیتے تھے۔“ بشیراں نے کہا۔
 ”کیا مطلب؟“ یعنی نے حیرت سے پوچھا۔

”ایسی سزا دیتے تھے کہ وہ یاد رکھتا تھا۔“ بشیراں مسکرا کر بولی۔

”اور ماں جی تب بھی اتنی سخت تھیں جتنی اب ہیں؟ مجھے پہلے پہلے ماں جی سے بہت ڈر لگتا تھا۔ اونچی آواز میں بات کرتیں تو میں اکثر ڈر کر چھپ جاتی تھی لیکن اب یہاں آکر محسوس ہوتا ہے کہ وہ اتنی سخت نہیں ہیں جتنی نظر آتی ہیں۔“ یعنی نے سرگوشی کے سے انداز میں کہا۔

”ہاں سچ کہتی ہو، وہ دل کی بڑی نرم ہیں اور اگر وہ اتنی سخت نہ کریں تو ملازم سارا کچھ ہڑپ کر جائیں۔ یہ تو بیکر صاب کی دانش مندی ہے کہ وہ سب پر کڑی نظر رکھتی ہیں۔ صاب جی کے ساتھ ان کی بہت اچھی بنتی تھی۔ سمجھدار عورت ہیں اس لیے صاب جی بھی ہر کام ان کے مشورے سے کرتے، ان کی ہر بات مانتے تھے دونوں نے بڑی پیاری زندگی گزار لی ہے مگر ایک بات ہے صاب جی ان سے ڈرتے بھی بہت تھے۔“ بشیراں نے آہستہ آواز میں قہقہہ لگا کر کہا تو یعنی بھی ہنسنے لگی۔
 ”بیٹا اب تم سو جاؤ۔ صبح تمہیں جلدی اٹھنا ہے۔“

بشیراں نے اس کے اوپر چادر پھیلاتے ہوئے کہا۔
 ”لیکن اماں جانے سے پہلے مجھے آموں کے باغ میں ضرور جانا ہے۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔
 ”ہاں، ہاں چلی جانا۔ میں تمہیں اور عذرا کو کبھی دوں گی۔ تجھے ساتھ لے جائیں گی۔“ بشیراں نے محبت سے کہا۔

”نہیں، اماں کل آپ بھی میرے ساتھ چلنا۔“ یعنی نے کہا۔

”اچھا، ٹھیک ہے۔ یگم صاب سے پوچھ لوں گی۔ اگر کوئی کام نہ ہوا تو ضرور چلوں گی۔“ بشیراں نے مسکراتے ہوئے کہا اور لائٹ بند کر دی۔

اگلے روز وہ ناشتا کرنے کے بعد ماں جی سے اجازت لے کر آموں کے باغ میں چلی گئی۔ وہ ایک منٹ میں درخت پر چڑھ جاتی تھی اور نیچے کھڑے سب دیکھتے رہ جاتے تھے۔

”واہ بیٹا، تو تو بڑی کاری گر ہے۔ کیسے بندریا کی طرح درخت پر چڑھ گئی۔“ بشیراں نے ہنستے ہوئے کہا۔
 ”مگر میں بندریا نہیں ہوں۔“ یعنی نے بھی ہنستے ہوئے جواب دیا۔

”ارے تو، تو میری شہزادی ہے۔“ بشیراں محبت سے بولی۔

”اماں..... آگے آکر جھولی پھیلاؤ۔ میں اوپر سے آم چھینتی ہوں۔“ یعنی نے کچے کچے آم توڑتے ہوئے کہا۔

”بیٹا کاہے کو توڑ رہی ہے۔ حویلی میں آموں کی بیٹیاں بھری رکھی ہیں۔“ بشیراں نے کہا۔
 ”اماں یہ آم میں اپنے ساتھ شہر لے جاؤں گی اور ڈیڈی کو بتاؤں گی کہ یہ میں خود توڑ کر لائی ہوں۔“ وہ خوش ہوتے ہوئے بولی۔

”بیٹا تو بھی بڑی نرمالی ہے۔ بھلا جمال بیٹے کے لیے کیا ہے انوکھی بات ہوگی جو خود سارا دن درختوں پر چڑھ کر کھاتا تھا خیر..... توڑ لے تو آم۔“ بشیراں درخت

کے نیچے اپنا دوپٹا پھیلا کر بولی۔ چھیمو اور عذرا زمین سے کچے آم چھنتی رہیں۔ یعنی کافی دیر آم توڑتی رہی اور خوب انجوائے کرنی رہی۔

”بیٹا اب بس کرو۔ میرا دوپٹا پھنسنے کو ہے اب نیچے آ جاؤ۔“ بشیراں نے اسے کہا۔

”یہ دیکھو میں آنے لگی ہوں۔ اوپر سے چمپ لگاتی ہوں۔“ یعنی نے پرجوش انداز میں کہا۔

”نہ..... نہ بیٹا کہیں چوٹ نہ آ جائے۔“ بشیراں نے گہرا کر کہا مگر یعنی اس کے کہنے سے پہلے ہی وہاں سے کود چکی تھی اور دھڑام سے زمین پر آگری اور گرتے ہی اس کی ٹانگ بری طرح مڑ گئی۔ وہ بیٹھی چلا رہی تھی بشیراں، چھیمو اور عذرا گہرا گئیں۔ یعنی کے رونے، چلانے کی آواز سن کر رکھوالے اور ڈرائیور بھی دوڑے چلے آئے اور جلدی سے یعنی کو گاڑی میں ڈال کر حویلی لے گئے۔

ماں جی، بشیراں پر بگڑنے لگیں کہ اس نے یعنی کو درخت پر چڑھنے ہی کیوں دیا۔ گاؤں کے ڈاکٹر کو جلدی سے بلایا گیا۔ اس نے وہی طور پر تو ٹانگ کو باندھ دیا مگر اسے شہر لے جانے کو کہا کیونکہ اس کی دائیں ٹانگ فریکچر ہو چکی تھی۔ ماں جی نے بیٹے کو فون پر ساری بات بتائی اور ڈرائیور کے ساتھ اسے لے کر شہر آ گئیں۔ وہ اسے سیدھا اسپتال لے کر گئیں۔ جمال اور ایمین بھی اسپتال پہنچ گئے تھے۔

☆☆☆

یعنی کافی روز اسپتال میں ایڈمٹ رہنے کے بعد اب گھر آ گئی تھی۔ اس کی ٹانگ پر بلاسٹر چڑھا تھا جس کی وجہ سے وہ زیادہ حرکت نہیں کر سکتی تھی۔ بس بستر پر لیٹی رہتی تھی اور مسلسل بستر پر لیٹنے سے اسے ڈپریشن ہونے لگا تھا۔ ایمین ہر وقت اس کی دیکھ بھال میں مصروف رہتیں اور جمال اس کا دل بہلاتے رہتے۔ یعنی کے دل میں ماں کی محبت روز بروز بڑھ رہی تھی۔ ایمین کھانے پینے کے علاوہ اس کی صفائی ستھرائی کا ہر وقت خیال

گے تو میں کیوں ان کے ساتھ برا کروں گی۔ میں کوئی پاگل ٹھوڑی ہوں۔“ شمیمہ گہری سانس لے کر بولی۔
 ”ہاں، ہاں..... میں جانتی ہوں تالی دونوں ہاتھوں سے جتی ہے لیکن کہیں یہ کوئی کمی یا کوتاہی دکھائی دے تو نظر انداز کرنے کی کوشش کرنا۔ کبھی کبھی معمولی سی باتیں بھی دلوں میں ہمیشہ کے لیے ایسی گرہیں ڈال دیتی ہیں کہ پھر ساری زندگی نہیں کھلتیں۔“ ریحانہ جلدی سے بولیں۔

”کوشش کروں گی ممما.....“ شمیمہ نے مڑ کر آئینے میں اپنے آپ کو دیکھا۔
 ”خدا تمہیں ہمیشہ سبھی رکھے..... اور تمہیں اتنی خوشیاں دے کہ سنبھالنا مشکل ہو جائیں، ہمیشہ خوش رہو، آباد رہو.....“ ریحانہ بیٹی کی طرف نم آنکھوں سے دیکھتے ہوئے اسے اپنے ساتھ لگا کر محبت سے چومنے لگیں۔

پورے گھر کو بہت خوب صورت انداز سے سجایا گیا تھا۔ سب لوگ بہت زیادہ خوش تھے۔ ساری کہیں ادا کی گئی تھیں، رخصتی کے بعد فہام دہن کو لے کر گھر آ گیا۔ گاڑی میں اس نے ردا کو اپنے ساتھ بٹھایا تھا۔ خدیجہ بیگم ملازمہ کے ساتھ جلدی گھر آئی تھیں۔ دونوں دولہا دہن لاؤنج میں داخل ہوئے تو خدیجہ دروازے پر کھڑی ہو کر دونوں کا استقبال کرنے لگیں۔ فہام کے ہمراہ ردا، عاصم اور حاتم تھے۔ شمیمہ اور فہام دونوں بہت خوب صورت لگ رہے تھے۔ خدیجہ محبت سے دروازے میں اپنے ہاں کی رسم کے مطابق تیل گرا کر شمیمہ کو اندر لائیں اور محبت سے اس کی پیشانی چوم کر اسے گلے لگایا۔ اس کے سر سے پیسے وار کر انہوں نے ملازمہ کو پکڑائے۔ ردا بھی بہت خوش تھی۔ اس نے بہت اسٹاکش لہنگا سوٹ پہن رکھا تھا جبکہ شمیمہ کا چہرہ بہت سپاٹ تھا۔ خدیجہ بہ مشکل چلتے ہوئے شمیمہ اور فہام کو اپنے ساتھ لگا کر لاؤنج میں لائیں اور صوفے پر بٹھا کر مٹھائی کھلانے لگیں۔ حاتم اور عاصم بھی کافی خوشگوار موڈ میں تھے۔ خدیجہ، شمیمہ کے منہ میں رس گلا

زیادہ فکر ہے۔ پڑھائی تو تم ساری عمر کر سکتی ہو مگر صحت ایک دفعہ چلی جائے تو انسان بہت مشکل سے سنبھلتا ہے پلیر ریلیکس پور ماسنڈ۔ جمال نے بیڈ پر بیٹھ کر یمنی کو محبت سے اپنے ساتھ لگالیا۔

ڈیڈی کی محبت رفتہ رفتہ شدید تر ہوتی جا رہی تھی اور اہمکن کی محبت کا انداز بھی بدل رہا تھا۔ ماں جی کی محبت کا اپنا اسٹاک تھا اور اماں بشیراں اسے اپنے طریقے سے چاہتی تھی۔ واقعی ایک محبت دوسری سے کتنی مختلف ہے مگر ہر ایک کا احساس اور لمس کتنا دلغریب ہے وہ کتنی افسردہ تھی مگر ڈیڈی کی تسلی اور محبت سے وہ ایک لمحے میں بدل گئی۔ وہ دل جو پہلے افسردہ ہو کر آہیں بھر رہا تھا اب ڈیڈی کی محبت سے محفوظ ہو کر مسرور ہو رہا تھا۔ وہ ڈیڈی کی باتوں کو یاد کر کے مسکرانے لگی۔

☆☆☆

شمیمہ دہن بنی بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ وہ برائڈل روم میں کھڑی قد آور آئینے میں اپنے آپ کو دیکھ کر متعجب خیر انداز میں مسکرائی۔ دروازہ کھلا ریحانہ مسکراتے ہوئے اندر آئیں اور خوش ہو کر شمیمہ کو اپنے ساتھ لگالیا۔

”خدا تمہیں ہمیشہ خوش رکھے۔ آج تو میری بیٹی پری لگ رہی ہے اور فہام بھی ماشاء اللہ کسی شہزادے سے کم نہیں لگ رہا۔“ ریحانہ نے بھرپور لگا ہوں سے شمیمہ کو دیکھتے ہوئے کہا تو اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

”اللہ تم دونوں کو نظر بد سے بچائے بیٹا..... اب، دو خاندانوں کے درمیان تم محبت کی سفیر بن کر جا رہی ہو۔ تمہاری وجہ سے یہ رشتے داری مزید مضبوط بھی ہو سکتی ہے اور کمزور بھی..... اپنی محبت اور خدمت سے ان سب کے دلوں میں گھر کرنا..... سب رشتے خود بخود مضبوط ہوتے جائیں گے۔“ ریحانہ نے مسکرا کر اسے دیکھتے ہوئے کہا تو اس نے موڈ بدل کر ماں کی طرف دیکھا۔
 ”اگر وہ لوگ میرے ساتھ اچھا سلوک کریں

اس کی صحت کی فکر ہے۔“ اہمکن کے شکایت کرنے پر انہوں نے کہا۔
 ”مگر اب وہ بہت شدید ڈپریشن کا شکار ہے۔ اسے خود سمجھائیں۔“ اہمکن نے جمال سے کہا۔
 ”ہاں“ میں ابھی اس کے کمرے میں جاتا ہوں۔“ جمال نے اٹھتے ہوئے کہا۔
 ”جمال اس نے کل سے کھانا بھی نہیں کھایا۔“ اہمکن نے بتایا۔

”واٹ..... اور تم مجھے اب بتا رہی ہو۔ اس کا کھانا اندر منگواؤ میں خود اسے کھاتا ہوں۔“ جمال نے پریشانی سے کہا اور یمنی کے کمرے میں چلے گئے۔
 ”میری جان، میری گڑیا کیوں اب سیٹ ہے۔ میری گڑیا کو معلوم بھی ہے کہ ڈیڈی کتنے ڈسٹرب ہو جاتے ہیں جب ان کی گڑیا روٹھ جاتی ہے۔“ جمال نے یمنی کا ماتھا چومتے ہوئے کہا اور اسے سہارا دے کر بٹھایا۔ یمنی جمال کی بات سن کر رونے لگی۔

”کم آن ڈیر، کس بات پر رو رہی ہو؟“ جمال نے اس کے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔
 ”ڈیڈی، آپ نے مجھے ایگز امز دینے کی پریشانی کیوں نہیں دی۔ میرا سال ضائع ہو گیا۔“ یمنی نے شکایت کی۔

”اوہ، مائی سویٹ یمنی اتنی سی بات پر ناراض ہے۔ ڈیر میں چاہتا ہوں کہ تم ایم بی اے کرو اور بزنس میں میری ہیپ کر دو۔ یہاں ایک نیا پرائیوٹ کالج کھل رہا ہے، میں چاہتا ہوں بی بی اے میں تمہارا ایڈمیشن وہاں کرواؤں۔“ جمال نے کہا تو یمنی حیرت سے باپ کی طرف دیکھنے لگی۔

”ڈیڈی آپ نے سب کچھ خود ہی طے کر لیا ہے اور مجھے کچھ بتایا ہی نہیں۔“ یمنی نے شکایت لہجے میں کہا۔
 ”نہیں بیٹا، تمہاری رائے کے بغیر تو میں کچھ نہیں کر سکتا۔ یہ سب کچھ تب ہو گا جب تم خود کالج میں جا کر ایڈمیشن کرواؤ گی لیکن اس وقت مجھے تمہاری صحت کی

رکھیں اور یمنی کے دل میں ماں کے لیے محبت کے علاوہ تشکر کا احساس پیدا ہونے لگا۔ وہ بستر پر لیٹی ہر وقت سوچوں میں گم رہتی تھی اسے حسن رضا اور اس کے بہن بھائی بہت یاد آتے، کبھی ماں جی اور بشیراں، کبھی اپنے اسکول اور کالج کے دوست اور اساتذہ مگر سب سے زیادہ اماں بشیراں کی محبت بھری باتیں.....

ماں جی ہر روز فون کر کے اس کا حال پوچھتیں۔ کبھی بکھار اس کی اماں بشیراں سے بھی بات چیت ہو جاتی۔ وہ اُن سے یوں کھل کر باتیں کرتی جیسے کوئی اپنی پرانی چھتری دوست سے باتیں کرتا ہے۔ اہمکن حیرانی سے اسے فون پر باتیں کرتے دیکھتیں مگر خاموش رہتیں۔ یمنی میں نمایاں تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ پہلے وہ اہمکن کی ذرا سی بات پر مشتعل ہو کر رگڑ عمل کرتی تھی۔ اب ان کی ہر بات کا جواب نرمی سے دیتی تھی۔ پہلے وہ ان کی ہر بات کا الٹا مطلب لیتی اور بات بے بات ان سے بحث و تکرار کر کے انہیں جان بوجھ کر زچ کرتی۔ اہمکن اس کے رویے پر مشتعل ہوتیں تو وہ اس صورت حال سے لطف اندوز ہوتی مگر اب وہ کافی حد تک بدل چکی تھی۔ وہ ہر وقت اہمکن کی محبت کو آہرزو کرتی۔ ان کی انتہائی توجہ اور خدمت کو دیکھ کر سوچ میں پڑ جاتی کہ اگر وہ یوں بیمار نہ ہوتی تو کبھی اہمکن کے قریب نہیں آ سکتی تھی۔ زندگی بھر دونوں ایک دوسرے سے دور رہتیں۔ اسے یوں محسوس ہوتا جیسے اس کی بیماری کے پیچھے قدرت کا خاص مقصد تھا۔ شاید وہ دونوں کو ایک دوسرے کے قریب لانا چاہتا تھا۔

یمنی کے اے لیول کے ایگز امز مرس ہو گئے تھے اور اس وجہ سے وہ شدید ڈپریشن کا شکار رہی۔ جمال احمد نے اسے سپر نہیں دینے دیے تھے ورنہ وہ تو وہیل چیئر پر جا کر پیپر دینے کو تیار تھی۔ وہ بستر پر لیٹی چھت کو گھورتی رہتی اور رونی رہتی تھی۔ اسے سال مرس ہونے کا بہت افسوس تھا مگر جمال احمد مطمئن تھے۔
 ”ایگز امز مرس ہونا کوئی بڑی بات نہیں۔ مجھے

ڈالنے لگیں تو عاصم نے جلدی سے ماں کے ہاتھ سے چھین کر خود کھالیا..... شہیلہ قدرے غصی سے اس کی طرف دیکھنے لگی اور منہ بنا کر رہ گئی۔

”شہیلہ بھائی اگر اس وقت دلہن نہ بنی ہوتیں تو میری خوب شامت آتی تھی۔“ عاصم ہتھکڑیاں لگا کر بولا۔

”تم بے فکر رہو..... شامت تمہاری پھر بھی آئے گی..... شہیلہ اسے چھوڑنا مت۔“ حاتم مسکرا کر بولا تو شہیلہ زبردستی مسکرائے گی۔ ردا آگے بڑھ کر شہیلہ کو مٹھائی کھلانے لگی تو عاصم نے پھر وہی حرکت کرنا چاہی تو شہیلہ کو غصہ آگیا اور اس نے مٹھائی کی پلیٹ اس طرح پیچھے کی کہ وہ ردا کے ہاتھ سے گر کر ٹوٹ گئی۔

سب چونک کر ہکا بکا رہ گئے۔
”یہ تو شگون کی مٹھائی تھی۔“ خدیجہ پریشانی سے بڑبڑائیں۔

”میں کوئی شو پیس نہیں، جس کا تماشا لگا کر تم انجوائے کر رہے ہو۔“ شہیلہ نے غصے سے عاصم کو کہا۔

”بھائی میں تو.....“ عاصم گھبرا کر بولا۔

”شہیلہ کیا ہو گیا ہے..... وہ تو مذاق کر رہا ہے۔“

فہام نے انتہائی حیرت سے کہا اور فہام نے عاصم کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔

”ردا بھائی کو اس کے کمرے میں لے جاؤ۔ تھک گئی ہوگی۔“ خدیجہ نے کہا تو وہ شہیلہ کو اپنے ساتھ لگا کر وہاں سے چلی گئی اور.....

سب ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئے۔ خدیجہ سب کو سمجھانے لگیں۔ ردا باہر آئی تو خدیجہ نے فہام کو شہیلہ کے کمرے میں بھیجا مگر وہ بہت جھینپا ہوا اور پریشان لگ رہا تھا۔ اس نے کلاہ اور ہار اتار کر

کارڈ درجسٹریٹبل بر رکھ دیے تھے۔ اس کے چہرے پر افسردگی اور پریشانی کے تاثرات تھے۔ وہ اپنے کمرے میں جانے لگا۔ دروازہ کھولا اور پھر رک گیا۔ خدیجہ دور سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ وہ اس کے قریب آ کر محبت سے بولیں۔

”بیٹا..... شہیلہ ایسی نہیں ہے، وہ ہم سب سے

محبت کرتی ہے، تم پریشان مت ہو، شادی کے فٹنگز کی وجہ سے کسی نے ریٹ نہیں کیا۔ سب لوگ ہی تھکے ہوئے ہیں۔ شہیلہ بھی تو تھکی ہوگی اس لیے ذرا غصے میں آگئی۔ تم اس بات سے دل میلانہ کرو۔ اسے محبت سے سمجھانا اور اپنی زندگی کا سفر خوشی خوشی شروع کرو۔“

انہوں نے محبت سے اسے سمجھایا اور ٹیبل سے ہار اٹھا کر اسے پہنایا اور کلاہ اس کے سر پر رکھا اور محبت سے اس کی پیشانی کو چوما۔

”اللہ تمہیں بہت خوش رکھے اب جاؤ۔“ خدیجہ محبت سے بولیں تو فہام نے نم آنکھوں سے ماں کا ہاتھ چوما اور وہاں سے چلا گیا اور خدیجہ آہ بھر کر رہ گئیں۔

☆☆☆
کمرے کو بہت خوب صورت انداز میں فریش فلور ز سے سجایا گیا تھا۔ کمرے میں انتہائی خوب صورت اور قیمتی فرنیچر رکھا تھا۔ شہیلہ دلہن بنی بیڈ پر بیٹھی تھی۔ اس کا موڈ قدرے آف تھا اور چہرے پر سنجیدگی چھائی تھی۔ فہام کمرے میں آیا اور شہیلہ کی طرف دیکھ کر گہری سانس لی۔ کلاہ اتار کر ٹیبل پر رکھا اور بیڈ پر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

”زندگی کا نیا سفر مبارک ہو۔“ فہام بچھے ہوئے لہجے میں بولا تو شہیلہ نے آنکھیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا پر خاموش رہی۔

”شہیلہ میں نے تم سے بہت محبت کی ہے اور میں اپنی فیملی سے بھی بہت محبت کرتا ہوں۔“ فہام گہری سانس لے کر بولا تو شہیلہ نے پھر چونک کر اسے دیکھا۔

”اچھی طرح جانتی ہوں..... کیا آپ کو میری محبت پر اعتبار نہیں؟“ شہیلہ نے شکایتی لہجے میں کہا۔

”اعتبار نہ ہوتا تو تم سے شادی کیوں کرتا..... دیکھو شہیلہ محبت کا سفر بہت ٹھنک ہوتا ہے۔ اس میں ہمیں اپنا بہت کچھ sacrifice کرنا پڑتا ہے ان کے لیے کہ جن سے ہم محبت کرتے ہیں۔ تمہیں بھی اپنے سلوک سے میرے لیے اپنی محبت کو ثابت کرنا

ہوگا۔“ فہام نے اس کا ہاتھ پکڑ کر نرمی سے کہا۔

”کیا مطلب؟“ شہیلہ نے چونک کر پوچھا۔

”ہر رشتے کے تقاضے الگ ہوتے ہیں مگر محبت ان سب میں مشترکہ عنصر ہے۔ ممانے مجھ سے بہت محبت کی ہے اور انہوں نے ڈیڈی کی ڈیڈی کے بعد سے مجھے اس گھر کا بڑا بنادیا۔ میں ان سب کے لیے صرف بڑا بھائی ہی نہیں..... باپ بھی ہوں، اگر چھوٹے کہیں غلطیاں کر بھی جائیں تو بڑوں کو درگزر کرنا پڑتا ہے۔“

فہام گہری سانس لے کر سنجیدگی سے بولا۔

”آج اس گھر میں تمہارا پہلا دن تھا اور اگر تم تھوڑا سا برداشت کر لیتیں تو اس میں کیا برائی تھی۔ شادی بیاہ پر تو ایسے مذاق چلتے ہی رہتے ہیں مگر یوں ماسٹڈ کرنے سے دلوں میں جو نفرتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ وہ ساری زندگی ختم نہیں ہوتیں۔“ فہام نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

”آئی ایم سوری..... اس وقت مجھے ایک دم غصہ آگیا..... کچھ سمجھ ہی نہیں آیا..... سوری.....“ شہیلہ اس کے قریب آ کر نظریں جھکاتے ہوئے شرمندگی سے بولی۔

”زندگی میں سب سے مشکل کام رشتوں کو نبھانا ہوتا ہے اور انہیں نبھانے کے لیے اپنے دل کو قبرستان بنانا پڑتا ہے۔ جس میں دوسروں کی غلطیاں اور خطائیں دفن ہو سکیں۔“ فہام نے اس کا ہاتھ پکڑ کر بڑے انداز میں کہا۔

”اچھوٹائی..... ہمارے گھر میں۔“ شہیلہ شرمندگی سے بولی۔

”تمہارے گھر کی باتیں وہاں تک ختم..... یہ ہمارا گھر ہے اور اس میں سب محبت سے رہتے ہیں۔ کوشش کرنا کہ آئندہ کسی کی فیلنگز ہرٹ نہ کرو۔“ فہام نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

”اوکے..... میں کوشش کروں گی۔“ شہیلہ نے آہستہ آواز میں کہا اور دونوں مسکرائے لگے۔

☆☆☆
خدیجہ کافی پریشان اپنے کمرے میں بیڈ پر بیٹھی تھیں۔ حاتم، عاصم اور ردا ان کے گرد کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ عاصم بہت زیادہ افسردہ تھا اور اس کی آنکھوں میں بار بار آنسو آ رہے تھے۔

”مما..... لیکن کریں میری کوئی بری نیت نہیں تھی۔ میں تو بس مذاق کر رہا تھا۔“ عاصم نے نم آنکھوں سے ماں کی طرف دیکھ کر کہا۔

”بیٹا! دیکھو پورا اعتبار ہے۔“ ردا کرسکتی ہے۔“ خدیجہ آہ بھر کر بولیں۔

”لیکن فہام بھائی پر ہمیں پورا اعتبار ہے۔“ ردا ایک دم چونک کر بولی۔

”رشتے بدلنے دیر نہیں لگتی۔“ خدیجہ نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

”کیا..... آپ فہام بھائی کے بارے میں ایسا کہہ رہی ہیں؟“ ردا نے حیرت سے پوچھا۔

”نہیں..... میں تو رشتوں کی اونچ نیچ سمجھا رہی ہوں، خدا کرے تم لوگوں کا ایک دوسرے کے ساتھ ہمیشہ سلامت رہے۔ لیکن بیٹا اب تم سیکھ لو، ہر قدم بہت پھونک پھونک کر رکھنا ہے۔ شہیلہ کے ساتھ اب بہت سوچ سمجھ کر بات کرنا..... زیادہ فرینک ہونے کی ضرورت ہے اور نہ ہی زیادہ ہمدرد بننے کی..... اس کا مزاج ذرا مختلف لگ رہا ہے جو اب دکھائی دے رہا ہے۔“ انہوں نے عاصم کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

”میری تو سمجھ میں نہیں آ رہا کہ شہیلہ آپنی ایسی نہیں تھیں۔ انہیں کیا ہو گیا ہے ہم لوگ اکٹھے گھومتے پھرتے، انجوائے کرتے تھے اور اب؟“ ردا آہ بھر کر بولی۔

”پہلے اس کا رشتہ اس گھر اور اس کے کینوں کے ساتھ اتنا مضبوط نہیں تھا، جتنا کہ اب ہے۔ فہام اس گھر کا سربراہ ہے۔ اب وہ فہام کی ہم سفر ہے۔ اب اس کے قدم مضبوط ہو چکے ہیں۔“ خدیجہ نے سنجیدگی سے کہا۔

ماہنامہ پاکیزہ۔ دسمبر 2012ء 99

کی طبیعت بہت خراب ہوگئی۔ میں نے ہی آپا کونوں کیا تو انہوں نے منع کر دیا کہ خدا نخواستہ راستے میں اسے کچھ ہو گیا تو..... سنو شہیلہ تمہاری رسموں سے زیادہ اور خوشیوں سے زیادہ میرے لیے سلمان کی جان اہم ہے۔ ابھی باہر جاؤ اور خاموشی سے ناشتا کرو۔ عاصم سے بھی معافی مانگو، خیر دار تم نے آپا سے کوئی بد تمیزی کی..... سنا تم نے۔“ انہوں نے غصے سے بٹی کو ڈانٹا تو وہ کچھ شرمندہ ہوئی۔

”اچھا وہ تو ٹھیک ہے مگر معافی میں کیوں مانگو؟“ شہیلہ نے آہستہ سے کہا۔

”میں کہتی ہوں..... باہر جاؤ اور سب کے ساتھ مل بیٹھ کر ناشتا کرو۔“ ریحانہ نے غصے سے ڈانٹتے ہوئے کہا تو شہیلہ نے منہ بنا کر موبائل آف کر دیا۔

خدیدہ ڈانٹنگ ٹیبل پر بیٹھی بہو، بیٹے کا انتظار کر رہی تھیں۔ روانے فی پاٹ لاکر ٹیبل پر رکھا تو فہام کمرے سے باہر نکل کر آیا۔ اس کے چہرے پر سنجیدگی چھائی تھی۔

”بیٹا..... ناشتا تیار ہے۔ شہیلہ کہاں ہے؟“ خدیجہ نے مسکرا کر اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”فہام بھائی..... دیکھیں، ممانے آپ لوگوں کے لیے کتنے زبردست ناشتے کا اہتمام کیا ہے۔“ روا نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

”کیا ضرورت تھی..... وہی کچھ رہنے دیتیں۔ جو سلمان بھائی لے کر آتے۔“ فہام نے نظریں چراتے ہوئے بات کو گول کرتے ہوئے کہا۔

”بیٹا میں نے ہی سلمان کو منع کیا ہے۔“ خدیجہ بولیں۔ ”مما اس موقع پر بہنوں کو بھائیوں کا انتظار ہوتا ہے۔ میں نے آپ سے کہا تھا کہ ان لوگوں کے معاملات میں نہ بولیں۔ آپ نے پھر وہی بات کی۔“ فہام سنجیدگی سے بولا۔

”ریحانہ نے بتایا کہ سلمان کی رات سے بہت طبیعت خراب ہے تو کیسے میں اسے آنے کا کہتی۔ ناشتے سے زیادہ اس کی صحت اہم تھی۔“ خدیجہ گہری سانس

”شہیلہ..... تمہیں..... ک کیا ہوا؟“ انہوں نے گہرا کر پوچھا۔

”بس آپ جلدی یہاں آئیں.....“ شہیلہ نے روتے ہوئے ماں سے کہا۔

”کیوں..... سب خیر تو ہے نا؟“ ریحانہ نے گہراہٹ کے عالم میں چیخ کر پوچھا مگر شہیلہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

”بیٹا رونا بند کرو اور مجھے بتاؤ۔ آخر بات کیا ہے؟“ ریحانہ نے فکر مندی سے پوچھا۔

”مما! آپ ہر بات میں مجھے تصور وار ٹھہرائی ہیں لیکن رات کو عاصم نے میرے ساتھ اتنی بد تمیزی کی کہ آپ کو کیا بتاؤں۔“ شہیلہ نے ریحانہ کو سب بتایا تو وہ کہنے لگیں۔

”یہ کوئی اتنی بڑی بات نہیں تھی۔ جس کا تم نے اتنا برا منایا..... دیور تو بھابیوں کے ساتھ بہت مذاق کرتے ہیں، کیا تم عاصم کے مزاج سے واقف نہیں؟“ ریحانہ.. گہری سانس لے کر بولیں۔

”آپ ہمیشہ ان لوگوں کی ہی سائنڈ لیتی ہیں۔ کبھی میرا ساتھ نہیں دیا۔“ شہیلہ نے غصے سے کہا۔

”کیونکہ یہ ایسی بات نہیں تھی جسے تم ایٹو بناتیں..... اور اب بتاؤ میں کیوں آؤں؟ اور فہام کہاں ہے؟“ ریحانہ نے خشکی سے پوچھا۔

”فہام باہر ہیں اور آپ آکر خالہ جان کو خود ہی سمجھائیں کہ میری بھی کچھ خوشیاں اور ارمان ہیں۔ میں بھی چاہتی ہوں کہ میری رسمیں بھی پوری ہوں۔ زندگی میں ایک بار ہی تو شادی ہوتی ہے انہوں نے نہ جھجھک لینے دیا اور اب سلمان بھائی کو ناشتالانے سے بھی منع کر دیا۔ آخر وہ کیوں میری خوشیوں کی دشمن ہو رہی ہیں؟“ شہیلہ غصے سے شکا بنی لہجے میں بولی۔

”شہیلہ..... تمہارا دماغ ٹھیک تو ہے۔ سارے الزام آپا پر لگائے جا رہی ہو۔ سلمان رات بھر اللٹیاں کرتا رہا۔ سچ ناشتالانے کے لیے تیار ہونے لگا مگر اس

”جی بیگم صاحبہ.....“ زاہدہ نے کہا اور وہاں سے چلی گئی۔

شہیلہ تیار ہو رہی تھی اور فہام محبت پاش نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ دروازے پر دستک ہوئی تو فہام نے دروازہ کھولا۔ زاہدہ مسکراتے ہوئے دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”ناشتا تیار ہے۔ بیگم صاحبہ آپ دونوں کو بلا رہی ہیں۔“

”کیا سلمان بھائی میرا ناشتا لے کر آگئے ہیں؟“ شہیلہ نے جلدی سے پوچھا۔

”نہیں، انہیں تو بیگم صاحبہ نے آنے سے منع کر دیا تھا۔“ زاہدہ نے بتایا۔

”کیا.....؟“ اس نے حیرت سے چلا کر فہام کی طرف دیکھا۔

”زاہدہ..... تم جاؤ، ہم آ رہے ہیں۔“ فہام نے جلدی سے زاہدہ کو کہا اور دروازہ بند کر لیا۔

”دیکھا فہام..... پہلے خالہ جان نے سلمان بھائی کو جھجھک سے منع کر دیا اور اب ناشتالانے سے.....

یہ ایک رسم ہوتی ہے جس میں بھائی بہنوں کے لیے ناشتا لے کر آتے ہیں اور خالہ جان نے جان بوجھ کر انہیں منع کر کے میرے ارمانوں اور خوشیوں کا خون کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ میری کوئی خوشی پوری نہیں

ہونے دے رہیں۔“ وہ ایک دم سسکی بھر کر بولی۔

”میں نے ماما کو منع بھی کیا تھا کہ آپ ان لوگوں کے معاملات میں انٹرفیر نہ کریں۔ پھر بھی.....“ وہ ہونٹ

سکوڑتے ہوئے بڑبڑایا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔

شہیلہ کو غصہ آنے لگا اور اس نے اسی وقت فون پر ماں کا نمبر ملایا۔ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اور وہ بیڈ پر آٹھیں بند کیے لیٹی تھیں۔ موبائل پر مسلسل گھنٹی بج رہی تھی کافی دیر بعد انہوں نے موبائل کان سے لگایا تو

دوسری جانب شہیلہ روتے ہوئے بولی۔

”مما.....“ شہیلہ نے سسکی بھری۔

”آپ کا مطلب ہے وہ ہمیں ایکسپلائٹ کریں گی؟“ حاتم نے چونک کر پوچھا۔

”میں ایسا کچھ نہیں کہتی مگر سب سے صرف یہ کہوں گی کہ اب رشتوں کی آزمائش کا وقت شروع ہو گیا ہے اور آزمائش میں ہمیشہ ایک دوسرے کا ساتھ دیتے ہیں۔ ایک دوسرے کو تنہا نہیں چھوڑتے۔“ خدیجہ کافی سنجیدگی سے انہیں سمجھانے لگیں تو وہ لوگ انہیں دیکھنے لگے۔

☆☆☆

خدیدہ ڈانٹنگ چیئر پر بیٹھی روا اور ملازمہ زاہدہ کو ہدایات دے رہی تھیں۔ دونوں بھاگ بھاگ کر کھانے کی ڈشز لالا کر ٹیبل پر رکھ رہی تھیں۔ ٹیبل کھانوں سے بھر گئی تھی۔

”مما! کوئی چیز رہ گئی ہے تو وہ بھی بتادیں۔ فانیو اسٹار ہوٹلز میں اتنا زبردست ناشتا نہیں ملتا۔ جو آپ نے آج گھر میں بنوایا ہے۔“ روا نے ٹیبل کی طرف دیکھ کر کہا۔

”آج میری بہو کا اس گھر میں پہلا ناشتا ہے اور وہ بہت پر تکلف ہونا چاہیے۔“ خدیجہ نے مسکرا کر خوشی سے کہا۔

”بیگم صاحبہ! لیجیے..... یہ نہاری ہوگئی۔ حلوا پوری بھی ہے، نان اور یہ بھی۔“ زاہدہ نے نہاری کا ڈونگا رکھتے ہوئے کہا۔

”اگر شہیلہ بی بی کے گھر والے بھی ناشتا لے کر آگئے تو ہم کہاں رہیں گے، ٹیبل تو بھر گئی ہے۔“ زاہدہ مسکرا کر بولی۔

”میں نے انہیں منع کر دیا ہے..... سلمان بے چارہ کہاں صبح اتنی دور سے آئے گا۔“ خدیجہ مسکرا کر بولیں۔

”زاہدہ..... ایسا کرو، جاؤ فہام اور شہیلہ کو بلاؤ۔ ناشتا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔“ خدیجہ نے زاہدہ سے کہا۔

مجھے منظور ہے عقیل حق



”کیا بدعائیں ساری زندگی پیچھا کرتی ہیں۔
یا اللہ تیرے دربار میں مجھ بد نصیب کی توبہ قبول نہ
ہوئی، میں بد نصیب..... کرموں جلی، ماں باپ کی
نافرمانی... یا اللہ، یا رحمن، یا رحیم تیرے دربار میں پچھلے
کتنے برسوں سے شرمندہ ہاتھ باندھے کھڑی
ہوں..... میں سجدوں میں گڑ گڑا کرتی تھی اور اپنے
ماں باپ سے معافی مانگتی ہوں، عزت کی بھیک مانگتی
ہوں، زندگی میں سر اٹھانا چاہتی ہوں، میرے مالک

لے کر بولیں۔ فہام کچھ کہنے لگا کہ دروازہ کھلا اور شہیلہ
ایک سادے سے سوٹ میں بیویوں کمرے سے باہر نکل
آئی اور آکر آہستہ آواز میں سلام کر کے خاموشی سے
کرسی پر بیٹھ گئی۔ روانے بھی پریشان ہو کر کبھی خدیجہ کی
طرف دیکھا اور کبھی فہام کی طرف۔ فہام بھی شرمندہ سا
کرسی پر بیٹھا تھا اور صرف چائے کا کپ پیا۔ خدیجہ بھی
بہت خاموش تھیں اور ان کی آنکھوں میں می تیرنے لگی۔
”بیٹا! یہ بھی کھاؤ۔“ خدیجہ نے پیار سے شہیلہ
سے کہا اور چیزیں آگے کیں مگر شہیلہ نے ان کے ہاتھ
سے پکڑ کر رکھ دیں۔

”نہیں، مجھے بھوک نہیں۔“ وہ سنجیدگی۔ بی۔
”میری طبیعت ٹھیک نہیں۔ میں اپنے کمرے میں
جا رہی ہوں۔“ خدیجہ نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا
اور وہاں سے چلی گئیں تو فہام پریشانی سے ہونٹ
کاٹنے لگا۔ وہ بہت شرمندہ ہو رہا تھا۔ ماں سے نظریں
نہیں ملا سکا تو جلدی سے چائے پی کر وہاں سے چلا
گیا۔ رد پریشان ہکا بکا سب کو دیکھتی رہ گئی۔

☆☆☆☆

خدیجہ اپنے کمرے میں آکر بیڈ پر بیٹھی تھیں۔ ان
کی آنکھیں نم ہو رہی تھیں۔ وہ آہ بھر کر دیواروں کی
طرف دیکھ رہی تھیں۔

”فہام کالج آج سے ہی بدلنے لگا ہے۔ میں
سوچتی تھی ساری دنیا بدل جائے گی مگر میرا فہام کبھی نہیں
بدلے گا۔“ خدیجہ نے آہ بھر کر سوچا۔ دروازہ کھلا اور
فہام شرمندہ سا نظریں جھکائے کمرے میں داخل ہوا۔
انہوں نے ایک ٹک اسے دیکھا اور سر جھکا لیا۔ فہام
نے ان کے قریب آکر ان کا ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگایا
اور سسکیاں بھرنے لگا۔

”مما! آئی ایم سوری۔“ فہام نے روتے ہوئے کہا۔
”کس بات کی سوری؟“ خدیجہ آہ بھر کر بولیں۔
”میں نے آپ سے.....“ فہام شرمندہ ہو کر بولا۔
”ہاں..... مجھے بھی دکھ ہوا ہے۔ جس فہام نے

بقیہ اگلے ماہ پڑھیں

زنجیریں مجھے پہنادی تھیں اور میں نے خوش خوشی یہ زنجیریں اپنے پاؤں میں پہن لیں۔ مجھے اب بھی اکثر وہ لمحہ یاد آتا ہے جب چند ثانیوں میں دل کی سلطنت لٹی تھی، جب میں نے بلا جوں و چرا خاموشی سے اپنا دل کسی کے قدموں میں ڈال دیا تھا۔ جب میں بالکل بھول گئی تھی کہ میں اپنے ماں باپ کو دھوکا دینے کے جرم میں بھی گرفتار بھی ہو سکتی ہوں۔

☆☆☆

وہ عید کی سہ پہر تھی..... ابا اور اماں ہماری اکلوتی پھوپھی کے گھر سوئیاں لے کر گئے ہوئے تھے۔ بھیا نہار ہے تھے اور میں صحن میں بچے تخت پر بیٹھی اپنی شاعری پڑھ رہی تھی کہ میں ایک بہت اچھی شاعرہ بھی تھی۔ احسن نہ جانے کہاں سے چلے آئے اور چپکے سے پیچھے سے آکر میری ڈائری اچک لی۔

”پلیز احسن بھائی، میری ڈائری واپس کر دیں۔ یہ میری پرسنل ڈائری ہے۔“ میں بچوں کے بل اچک اچک کر ان کے ہاتھ سے ڈائری لینے کی کوشش کرنے لگی اور نہ جانے کیسے بالکل اچانک انہوں نے میرا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں پکڑ لیا۔

”پلیز احسن بھائی۔“ میری آواز جیسے حلق میں پھنس گئی۔ میں پوری جان سے لرز گئی۔ میرا ہاتھ ان کی گرفت میں تھا اور میں دیوار سے لگ گئی کہ اپنے پیروں پر کھڑا رہنے کے لیے مجھے ایک سہارے کی ضرورت تھی چاہے وہ اینٹوں اور پتھروں سے بنی دیوار ہی ہو۔

”می..... میر..... میرا ہاتھ چھوڑ دیں پلیز۔“ ڈائری میرے ذہن سے نکل گئی لیکن ہاتھ پیروں میں عجیب سی سنسنیٹ سی ہونے لگی کہ زندگی میں پہلی مرتبہ میں ایک نئے احساس اور تجربے سے گزر رہی تھی اور جب میں نے ان کی طرف دیکھا تو مجھے ایک عجیب سا احساس ہوا۔ وہ احسن بھائی نہ تھے وہ ایک مرد تھے اور میں ایک عورت..... بس وہیں سے عورت اور مرد کی کہانی شروع ہو گئی۔ احسن بھائی نے آہستگی سے

رہا کہ میں پانچ دن سے گھر نہیں آیا اور تم میرا انتظار کرتی رہیں؟ احسن بھائی کا ہاتھ نہ جانے کب میرے کاندھے پر آکر ٹھہر سا گیا، وہ مجھ پر جھکے، لو دیتی آنکھوں کو میرے چہرے پر جھکا کر پوچھنے لگے۔ مجھے بہت عجیب سا لگا۔ کچھ مختلف تھا ان کے انداز میں۔ خود بخود میرا ہاتھ میرے دوپٹے پر چلا گیا اور میں اپنے آپ میں سمٹ گئی۔ نہ جانے کیوں میں دل ہی دل میں دعا مانگنے لگی کہ اماں کی طرح کمرے میں آجائیں یا مجھے آواز دے کر باہر بلا لیں لیکن اماں تو حسب عادت مجھے بھول کر کچن میں مصروف تھیں۔

☆☆☆

وقت کی رفتار نہ کبھی تھمی ہے نہ تھمتی گی۔ وقت کا کام گزرتا ہے اور وہ گزر جاتا ہے لیکن میری زندگی جیسے ایک نقطے پر ٹھہر سی گئی اور وہ نقطہ تھا احسن بھائی کی محبت..... میں لاشعوری طور پر نہ جانے کیسے احسن بھائی کی محبت میں گرفتار ہو گئی بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ انہوں نے مجھے اپنی محبت میں گرفتار کر لیا۔ انہیں محبت کرنا آتی تھی..... وہ محبت کروانا بھی جانتے تھے۔ میں بے وقوف چھوٹی چھوٹی باتوں سے خوش ہونے والی اماں ابا..... کی لاڈلی، بھیا کی چپیتی سب بھول گئی یا درہا تو صرف احسن۔

بعض اوقات انسان کے ساتھ بہت عجیب سے معاملات ہو جاتے ہیں۔ ایک انسان کی محبت ساری محبتوں پر حاوی ہو جاتی ہے۔ اچھائی اور برائی کی تمیز منادیتی ہے۔ باپ کی شفقت پر..... ماں کی ممتا اور بھائی کی چاہت پر ہم خیالوں میں رہنے والی لڑکیوں کا نفس چھا جاتا ہے۔ ہم سب اقدار بھلا دیتے ہیں۔ مجھے بھی ان دنوں کچھ یادیں رہتا تھا۔

میں جو ہمیشہ اسے گریڈ لے کر پاس ہوتی آئی تھی۔ اب مجھے پڑھائی میں کوئی دلچسپی نہیں رہی کہ میں مکتبہ عشق میں جو داخل ہو گئی تھی۔ احسن نے بہت آہستہ آہستہ اور غیر محسوس انداز میں اپنی محبت کی

واقف تھا۔ وہ واقعی فنکار تھا۔

احسن جمال اکثر بھیا کی غیر موجودگی میں آتا اور میں گھنٹوں اس سے باتیں کرتی۔ اپنی ہر بات، اپنی سہیلیوں کے قصے، اپنے اسکول کی باتیں اور اس وقت اماں کچن میں مصروف ہوتیں کہ وہ وقت ہمیشہ اماں کے کھانا پکانے کا ہوتا تھا۔ آخر احسن جمال ٹھیک اسی وقت ہمارے گھر کیوں آتا تھا جب بھیا اور ابا دکان پر اور اماں باورچی خانے میں مصروف ہوتیں۔ کیا صرف سولہ سال کی عمر میں آپ یہ بات سوچ سکتی ہیں..... نہیں نا تو میں نے بھی نہیں سوچی لیکن اماں تو سوچ سکتی تھیں۔

☆☆☆

وہ اوائل اپریل کے دن تھے۔ میں فرسٹ ایئر پری میڈیکل کی طالبہ تھی جب آل کراچی انٹر کالجز مقابلہ تقاریر میں میری پہلی پوزیشن آئی تو مانو زین پر چہرہ ہی نہ نکلتے تھے۔ ہر ایرے غیرے کو میں اپنی ٹرائی دکھائی پھرتی اور جب احسن بھائی آئے تو ان کے سامنے بھی ٹرائی لے کر بیٹھ گئی۔

”دیکھیں، دیکھیں احسن بھائی سینٹ جوزف کالج میں مقابلہ تقاریر میں چوتھیں کالجوں کے طلبہ و طالبات کے درمیان مقابلہ تھا۔ مجھے اس سال کی بہترین مقررہ کی ٹرائی ملی ہے۔“ میں پھولی سانوں کے درمیان احسن بھائی کو راستے ہی میں روک کر اپنی ٹرائی دکھانے لگی۔

”ارے بے وقوف، بچہ ابھی تو آیا ہے، سانس تو لینے دے۔“ اماں نے مجھے ٹھہکا۔

”تو کیوں آئے ہیں پانچ دن کے بعد۔ پانچ دن سے انتظار کر رہی تھی۔“ میں نے اپنی ازلی بے پروائی سے جواب دیا اور اماں سر جھٹک کر مجھے میرے حال پر چھوڑ کر ابا کے لیے کھانے نکالنے چلی گئیں۔ ”ویری گڈ، ویری گڈ گریا۔ تم ہو ہی زبردست۔“ چلو ٹرائی کو تو ایک طرف کرو اور یہ بتاؤ کیا واقعی تم کو یاد

صرف ایک بار..... ایک بار تو مجھے معاف کر دے۔ میرے ماں باپ مجھے معاف کر دیں.....“ میں اس رات آسمان کے نیچے رات کی تاریکی میں کھڑی ہوئی خدا سے گھنٹوں دعا مانگتی رہی۔ میرے مالک برحق مجھ پر رحم کر، میرے ماں باپ کی قبروں پر سکون بھیج۔ میری توبہ قبول فرما۔ مجھے دنیا کے طعنوں سے بچالے، میری روح کو گھن لگ گیا ہے۔ میری ریاضتوں کو قبول فرمالے۔ میرے مالک میری توبہ قبول فرما۔ میری بیٹی کو بھٹکنے سے بچالے۔“ میں بچپنوں سے رو رہی تھی۔ میرا چہرہ، گردن اور سینہ آنسوؤں سے تر ہو رہا تھا اور نالکہ لمبھی کھڑی ماں کا یہ روپ دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

میری نظر نالکہ پر تھی وہ کہیں جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی۔ ہلکے گلابی کاشن کے سوٹ پر گلابی سانچ دیتا ہوا میک اپ اس کے چہرے کو ایک تازگی دے رہا تھا۔ بڑی بڑی غلابی آنکھیں کا جل سے جی سنوری سحر انگیز لگ رہی تھیں۔ اس کی نرم و نازک گلابی انگلیاں بہت تیزی سے اس کی لمبی سی چوٹی میں بل ڈال رہی تھیں۔ وہ مسکرائی ہوئی بہت حسین لگ رہی تھی۔

جب اس عمر میں کوئی لڑکی بلاوجہ مسکرانے لگے..... آنکھیں بولنے لگیں اور جب وہ بیٹھے بیٹھے چوکنے لگے تو ماں کو ہوشیار ہو جانا چاہیے اور اگر اس لمحے کو ماں نظر انداز کر جائے، اس لمحے میں غافل ہو جائے اور بے پروائی سے جھٹک دے تو.....!

☆☆☆

وہ میرے بھائی کا دوست تھا۔ اس کا ہمارے گھر بڑی بے لکھی سے آتا جاتا تھا۔ وہ بہت بذل سچ تھا ویسے تو اس سے ابا کی بھی دور پرے کی رشتہ داری تھی لیکن رشتہ داری پر بھیا کی دوستی زیادہ حاوی تھی۔ وہ جب بھی ہمارے گھر آتا لگتا زندگی آگئی ہے۔ اس کے برجستہ جملوں پر میرے بہت سنجیدہ سے ابا جی بھی ہنس پڑتے کہ وہ بات کرنے کے فن سے بہ خوبی

کرتے..... اس کے لاکھ اصرار کے باوجود میں بھی اپنے باپ کی دہلیز پر نہ گئی کہ مجھے اب احساس ہوا کہ میرا تو منہ ہی نہیں ہے کہ میں کسی عزت دار آدمی کا سامنا کر سکوں اور وہ تو میرے ماں باپ ہیں جنہوں نے مجھے شیشے کی گڑیا کی طرح پالا تھا۔

وہ اک نادانی..... پتا نہیں صرف میری نادانی تھی یا میری ماں کی غفلت، میرے باپ کا اندھا اعتماد تھا یا میرے بھائی کی بے لوث محبت..... مجھے کیسے کیسے نہ کر لایا۔ میرے ابا، میرے پیارے ابا کا آخری دیدار میں نے مسجد میں کیا کہ گھر کی دہلیز پر سے اماں نے مجھے دھکے دے کر نکال دیا تھا اور جب میری ماں نے اس دار فانی سے کوچ کیا تو بھائی نے ان کا چہرہ بھی دیکھنے نہ دیا کہ یہ میری ماں کی وصیت تھی۔

ہم جیسی بیٹیوں کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے جو ماں باپ کی عزت کو اپنے نفس پر قربان کر دیں، جو بھائیوں کا اعتماد برباد کر دیں، جو خاندان میں آنے والی نسلوں کو شرمندگی کی دلدل میں دھکیل دیں ان کے ساتھ اس سے بھی برا سلوک ہونا چاہیے۔ انہیں سنگسار کر دینا چاہیے۔

شادی کے صرف سات برس کے بعد جب نانکھ صرف پانچ سال کی تھی احسن نے ایک رقاصہ کے لیے مجھے طلاق دے کر اپنی دوسری دنیا بسائی اور میں صرف اٹھائیس سال کی عمر میں بیوہ کا روپ بھر کر نئے شہر میں کرایہ دار کی حیثیت سے اس تخت پر کپڑوں کے ڈھیر کے ساتھ مشین لے کر بیٹھ گئی اور بیس سال مشین چلاتے چلاتے میں بھول گئی کہ مکافات عمل اور میرے ماں باپ کی بددعا کبھی میرا پیچھا نہیں چھوڑے گی اور یہ کاغذ..... اس کاغذ سے گویا آگ نکل رہی ہے۔

☆☆☆

”پتا نہیں امی کو کیا ہو گیا ہے۔ صبح سے کمر بند کیے لپٹی ہیں۔ دوپہر کا کھانا کھایا اور نہ ہی شام کی چائے پی۔ شاید مجھ سے ناراض ہیں لیکن میں نے تو

کا ہر دروازہ بند ہے۔“

☆☆☆

احسن کے والدین نے مجھے قبول نہیں کیا لہذا میں کچھ دن احسن کے دوست کے گھر رہی اور پھر ہم نے دوسرے لے کا ایک مکان کرایہ پر لے لیا اور زندگی شروع ہو گئی۔ زندگی کیا ہوتی ہے..... دھوپ کیسے بدن کو جلاتی ہے، تپتی زمین پر ننگے پیر کھڑا ہونا کتنا تکلیف دہ ہوتا ہے۔ مجھے چند دن ہی میں اندازہ ہو گیا۔ احسن فطری طور پر ہذا حرام اور نکما انسان تھا۔ اس کی سرشت میں محنت تھی ہی نہیں جیسی وہ گفتوں ہمارے گھر میں اپنا وقت بتاتا تھا۔ بقول اس کے اس نے مجھ سے شادی ہی اس لیے کی تھی کہ میں اکلوتی بیٹی اور میرا باپ مالدار آدمی تھا۔ وہ رات دن میرے باپ اور بھائی کو گالیاں دیتا کہ انہوں نے مجھے خالی ہاتھ رخصت کر دیا جبکہ میرے ماں باپ نے پھر بھی ضرورت کی ہر چیز مجھے دی تھی لیکن احسن نہ جانے کیا کیا امید لگائے بیٹھا تھا اور یوں پہلے زیور بکا اور پھر جہیز کے برتن تک بیک گئے۔ جن گھروں کی بنیادیں بددعاؤں اور آہوں پر رکھی گئی ہوں..... جن کی اینٹ اینٹ کسی کی عزت کو روند کر رکھی ہو..... جہاں صرف نفس کی اجارہ داری ہو، خود غرضی ہو، بے حس ہو وہ چار دیواری والے مکان تو ہوتے ہیں گھر نہیں ہوتے اور میں بھی ایک مکان میں رہتی رہی جہاں احسن نے مجھے کوئی خوشی نہیں دی سوائے نانکھ کے۔ نانکھ کی پیدائش نے میرے لیے ذلتوں اور ندامتوں کے درکھول دیے۔ احسن خود کمزور درکار کا مرد تھا۔ اس لیے ہر لمحہ مجھے پریشانی کرتا تھا اسے نانکھ کی شکل بڑوسی میں ملتی تھی، وہ بھی اسی سے اپنے بھائی کی بیٹی کہنے لگتا اور جو بھی موٹو ہوتا اور میں روٹی اس کی زیادتیوں پر تو وہ جملے دہراتا جو اس کی حمایت میں میں نے اپنے ماں باپ سے کہے تھے اور پھر میرے نیک باپ کو گالیاں دینے لگتا جو اس بے کسی کی حالت میں ہماری کوئی مدد نہیں

گھر آئی۔ میری اکلوتی پھوپھی نے مجھے سینے سے لگا کر اباسے کہا اور میری نظریں میز پر رکھے مٹھائی کے ڈبے پر جم جی گئیں۔

”ہاں آپا، جب دل چاہے لے جاؤ اماں نے مسکراتی نظروں سے ابا کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”ارے کوئی میری بچی ہے تو پوچھ لے۔“ پھوپھی نے میرے دھواں دھواں چہرے پر نظریں جم کر کہا۔

”ارے آپا، یہ میری بیٹی ہے۔ میری جان، میری زندگی۔ اس کی میں نے تربیت ہی ایسی کی ہے میں جانتا ہوں میری مرضی ہی اس کی رضا ہے۔ میری بیٹی نے کبھی مجھ سے اختلاف نہیں کیا تو اب بھی میرا مان رکھے گی۔“ ابا کی آواز اور لہجے میں ایک محبت بھرا مان جھلک رہا تھا اور میں نے ابا کا مان ہی نہیں بلکہ پورے خاندان کا مان توڑ دیا۔ سب کچھ میری ضد اور ہٹ دھرمی کے سامنے ٹکھریا اور پھر ایک روز ابا نے پھوپھی کو بلا کر کہا۔

”اسے یہاں سے لے جاؤ، تم اسے اپنی بیٹی کہتی ہو۔ اس ناخوار کو چاہو تو اپنے گھر سے اس کے عاشق کے ساتھ رخصت کر دو۔“ اور میری پیاری پھوپھی خاموشی سے مجھے لے کر اپنے گھر چل آئیں کہ انہیں ڈرتا کہیں مان اور فخر کے ٹوٹنے سے ان کا بھائی مری نہ جائے اور پھر چند آدمیوں کی موجودگی میں میرا نکاح احسن جمال سے ہو گیا اور وقت رخصت مجھے یہ خیال تک نہ آیا کہ ابا اور اماں آئے تک نہیں ہیں۔ جب میں رخصت ہونے لگی تو میرے بھائی نے میرا راستہ روک لیا۔

”اب تم جس طرح رہو، جس حال میں بھی رہو ہمارا تم سے کوئی تعلق نہیں ہوگا..... ہم مرجھ جائیں تو ہمارے جنازوں میں نہ آنا اور ساری زندگی ہم تمہاری شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتے۔ یقیناً تمہارے لیے یہ رخصتی ہوگی لیکن ہم نے تمہارا جنازہ اٹھایا ہے اور جنازے واپس نہیں آتے اور تمہارے لیے بھی واپسی

میرا ہاتھ اپنے لبوں سے لگا کر چھوڑ دیا اور آہستہ سے میرے کان میں گنگنا کر کہا۔

”اب تم مجھے احسن بھائی نہ کہا کرو کیونکہ میں تمہارا بھائی نہیں ہوں بے وقوف۔“ ان کے ہونٹوں پر ایک دلاویز مسکراہٹ تھی اور اسی لمحے سے وہ میرے لیے احسن ہو گئے۔

وہ جب بھی گھر آتے ان کی خوب صورت آنکھوں میں جذبے بولتے اور میں ان سے چھپتی پھرتی لیکن کیا کبھی کوئی محبت سے چھپ سکا ہے۔

☆☆☆

ماں کی نفرتیں اس قدر کمزور کیوں ہو جاتی ہیں بیٹیوں کی ماں کی تو نظریں عقاب جیسی ہونی چاہیے۔ منافق ہونے کی ایک نشانی یہ بھی تو ہوتی ہے کہ وہ لوگ امین نہیں ہوتے اور بیٹیاں بھی تو امانت ہوتی ہیں تو کیا میری ماں منافق تھیں.....؟

جب گھروں میں بچے پھل کی طرح بیٹیاں موجود ہوں تو ان کی مائیں کیسے خبری کی نیند سو جاتی ہیں۔ ان کے اٹھتے قدموں اور لبوں کی مسکراہٹ کو کیسے نظر انداز کر دیتی ہیں۔ وہ مائیں جو گھروں میں آنے والے پتھروں کو نظر انداز کر دیں، وہ مائیں جن کی نظریں بیٹیوں کے قدموں کے ساتھ نہ اٹھیں، وہ مائیں جو ایک امانت صحیح طور پر نہ سنبھال سکیں کیا وہ مائیں ماں کہلانے کی حق دار ہوتی ہیں؟ خدا نے ایسے ہی تو جنت ماں کے قدموں تلے نہیں رکھ دی۔ ماں کی ذستے داری باپ سے بھی ہوا ہوتی ہے۔ میری ماں بھی شاید بک بے پروا اور اپنے آپ میں مکن رہنے والی عورت تھی۔ میں اور احسن گھنٹوں سخن میں باتیں کرتے تھے۔ لوڈو کھیلتے اور کبھی کبھار کی بازی جیتاتے اور وہ اندر بیٹھی فی وی دیکھتی رہتیں یا پھر کسی کام میں مصروف رہتیں۔ شاید ان کے گمان میں بھی کچھ نہ ہو۔

”بس میں جلد ہی اپنی گڑیا کو اپنے گھر لے جاؤں گی۔“ اس روز میں جیسے ہی کالج سے

اس کی ماں بدگمانیوں کی انتہا تھی۔

☆☆☆

”پیاری ڈاڑی آج امی کی گفتگوں کر حقیقت میں دل بہت پریشان ہوا ہے۔ کاش امی ایک دفعہ مجھ سے پوچھ لیتیں کہ عارف امتیاز کون ہے؟ میرا اس سے کیا رشتہ ہے، میں تو بہت خلوص سے امی کے لیے خوشیوں کے اطمینان کے درکھولنا چاہتی تھی لیکن امی تو ساری دنیا سے ناراض ہیں۔ مجھے عارف امتیاز نے سب کچھ امی کے بارے میں، میرے ابو کے بارے میں بتا دیا ہے۔ میں تو اپنی امی کی بہت عزت کرتی ہوں۔ دل سے ان کی شرافت کی، ان کی پاکیزگی کی قدر دان ہوں۔ مجھ سے زیادہ کون ان کے شب و روز کا گواہ ہوگا۔ کاش امی بھی اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لیتیں۔ اے میرے پروردگار میری ماں کی زندگی کی ہر آزمائش کو ختم کر دے۔ انہیں حقیقی خوشی اور اطمینان دے دے۔ اچھا پیاری ڈاڑی میں سورہی ہوں تم سے کل باتیں کروں گی۔“

نانکھ کی ڈاڑی پڑھ کر مجھے نہ جانے کیا ہوا تھا۔ میں جب بھی نالکھ کو خاموشی سے گھر کے کاموں میں مصروف دیکھتی تو دل میں ایک ہوک سی اٹھتی اور لب پر یہی دعا کہ ”یا اللہ میری نیک، سعادت مند بیٹی کا نصیب کھول دے۔ میرا تو تیرے سوا کوئی نہیں ہے۔ میرے مالک میرے گناہوں کی سزا میری بچی کو نہ دے۔ اس کا نصیب کھول دے۔ اس کے نصیب میں جو بھی تو نے لکھا ہے۔ اسے بھیج دے تاکہ وہ اپنی امانت لے جائے اور میں سکون سے مر سکوں مگر اس نے خود دے۔“

”امی دیکھیں کون آیا ہے۔“ میں اپنے خیالوں میں گم تھی کہ نالکھ کی خوشی سے بھر پور رزنی ہوئی آواز مجھے اس دنیا میں واپس لے آئی اور آنے والے پر نظر پڑتے ہی مجھے ایسا لگا کہ سوکھے دھانوں پر پانی پڑ گیا۔ جیسے آنکھوں میں دیر یا اتر گیا۔ جیسے زندگی کو

گئی تھی۔

”تم نے یہ کیسے سوچ لیا کہ میری بیٹی کو تم اتنی آسانی سے بے وقوف بنا لو گے۔ وہ میری بیٹی ہے ایک امتحان سے گزری ہوئی عورت کی بیٹی۔ اس عورت کی بیٹی جس کی پوری زندگی ایک غلطی کا تاوان ادا کرتے ہوئے گزر گئی۔ میں نے اپنی پوری زندگی ایک ماں کی غفلت کا تاوان ادا کرتے ہوئے گزاری۔ بے پروا ماں تو مرغی جیسے چھوٹے جانور سے بھی بدتر ہوتی ہے۔ وہ چیل کو دیکھ کر کم از کم اپنے بچوں کو پروں میں چھپا تو لیتی ہے لیکن ایک بے پروا عاقبت ناندیش ماں اپنی اولاد کو کونوں اور چیلوں کو آسمان پر منڈلاتے دیکھنے کے باوجود کیوں نہیں لپک کر اپنے پروں میں چھپاتی۔ خود کیوں ڈرے میں جا چھپتی ہے اور پھر جب اس کے بچوں کو وہ جانور نوچ کھاتے ہیں یا اپنے بچوں میں دبا کر لے اڑتے ہیں اور کبھی ان کا گوشت کھا کر اور کبھی ان سے کھیل کر کہیں پر بھی کسی بھی گندگی میں یا کسی جنگل میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیتے ہیں تو پھر وہ ماں ان بچوں کے لیے کیوں سکتی ہے؟

”میں بھی اپنی بیٹی کو پروں میں چھپا کر رکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میرے پروں میں کہاں چھید تھے جہاں سے تم نے میری بیٹی پر نگاہ ڈالی۔ میرے باپ کی بددعا میں کب تک میرا پیچھا کریں گی۔ میرے باپ نے کہا تھا کہ خدا تجھے بیٹی دے اور تیرے جیسی دے پھر تجھے پتا چلے گا تو نے میرے ساتھ کیا کیا ہے۔ کہتے ہیں روز کی توبہ تیرا نافرمان اولاد کو بھی فرما کر دار اولاد کی صف میں کھڑا کر دیتی ہے شاید میرا جرم ناقابل معافی اور میرے باپ کی تکلیف ناقابل تلافی تھی۔“ میں پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ عارف امتیاز ان ہی قدموں پر بغیر کچھ کہے پلٹ گیا اور نالکھ میرے پیچھے بالکل ساکت کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ وہ تو اپنی ماں کے پیچھے چلی آئی تھی کہ صبح سے ماں کمرابند کیے بیٹھی تھی اور اب وہ خاموشی سے کہیں جا رہی تھی۔ اسے کیا پتا تھا کہ

طرف خاموشی اور ایک اداسی تھی۔ ہر طرف پھیلا گہرا سکوت ایک عجیب سا تاثر دے رہا تھا۔ گہرا سرخ رنگ کے سوٹ پر سیاہ چادر اوڑھے میں اندر دیوار کی طرف منہ کیے جانے لیا کچھ سوچ رہی تھی کہ نے سوکھے ہوئے پتوں پر پیر رکھا اور پتوں پر چڑھا ہٹ نے ماحول میں ایک عجیب سا خوف پیدا کر دیا۔ میں اپنی سوچوں میں غرق تھی۔ سردی سے برف ہو رہے تھے اور ٹائیں کسی انجانے خوف سے کپکپا رہی تھیں..... لیکن آنے والا لمحہ فیصلے کا تھا اور لے لے کا سامنا کرنے کے لیے ہمت مجتمع کر رہی تھی کہ آنے والا بالکل قریب آ گیا۔ میرے پورے جسم پر ایک سردی لہر دوڑ گئی اور آنے والے نے کہا۔

”تم آگئیں..... مجھے یقین تھا کہ تم ضرور آؤ گی کہ میں جو بات کرنے جا رہا ہوں وہ تمہاری زندگی میں روشنی بھر دے گی۔“ آنے والے کی آواز میں کی خوشی تھی۔

”ہاں، میں آگئی ہوں عارف امتیاز کہ مجھے آ رہی تھا۔ میں ایک دم پلٹ کر بولی اور عارف امتیاز ایسا لگا کہ آسمان اس کے سر پر گر گیا ہے اور اس کے قدموں کے نیچے زمین نہیں رہی۔

”یہ کیا ہے؟“ میں نے اپنی مٹھی اس کے سامنے کھول دی وہ کاغذ جو صبح سے میری ہتھیلی جلا رہا تھا وہ عارف امتیاز کا خط تھا میری بیٹی کے نام۔

”نالکھ! تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔ ایسی بات جو ہماری زندگیوں کو خوشیوں سے بھر دے گی۔ میں امید کرتا ہوں تم رات کو مجھے گھر کے پیچھے بنے پارک میں مجھ سے ضرور ملو گی۔

عارف امتیاز عارف دھواں دھواں چہرے کے ساتھ میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی آواز طلق میں کہیں کہیں

کچھ نہیں کیا۔“ نالکھ گم صدمہ سی باورچی خانے میں اپنے آپ سے ہی بولے جا رہی تھی۔

”پتا نہیں امی کس بات کے لیے ہر وقت روتی رہتی ہیں۔ آج صبح بھی جائے نماز پر بیٹھی اس قدر رو کر اللہ سے معافی مانگ رہی تھیں۔ اپنے ابو کی تو مجھے ہلکی سی شبیہ یاد ہے اور میں نے اپنی ماں سے زیادہ شریف، باعزت اور نفیس عورت نہیں دیکھی۔ پوری زندگی امی نے انتہائی شرافت سے گزاری۔ پتا نہیں کس گناہ کو یاد کرتی ہیں۔ امی کو ماموں بھی بہت یاد آتے ہیں۔ میرے نانا، نانی تو چلو اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں لیکن ماموں تو زندہ ہیں وہ ہم سے کیوں نہیں ملتے۔ امی بھی میرے اس سوال کا کوئی جواب نہیں دیتیں۔ میں نے ہمیشہ امی کو خوش رکھنے کی کوشش کی ہے۔ جو امی نے کہا وہ مانا لیکن بعض اوقات امی کا رویہ میرے ساتھ بہت تلخ ہو جاتا ہے لیکن مجھے پھر بھی کوئی شکایت نہیں ہے۔ امی جو کچھ کرتی ہیں میرے بھلائی کے لیے کرتی ہیں۔ میرا کتنا دل چاہتا ہے کہ میں اپنی سہیلیوں کے گھر جاؤں یا انہیں اپنے گھر بلاؤں لیکن امی کو پسند ہی نہیں ہے۔ برابر والی خالہ کی صغریٰ کتنی اچھی ہے۔ امی کو اس سے دوستی پر کوئی اعتراض نہیں لیکن ان کے گھر بھی امی مجھے اپنے ساتھ لے کر جاتی ہیں اور اپنے ساتھ لے کر آتی ہیں لیکن میں اپنی امی کے لیے سب کچھ کر سکتی ہوں۔ میرے اللہ میں اپنی امی کو ایک دفعہ ہٹے ہوئے دیکھنا چاہتی ہوں۔ میری سب سہیلیاں کہتی ہیں کہ میری امی بہت خوب صورت ہیں۔ جب یہ بات میں نے امی کو بتائی تو نہ جانے امی کیوں پھوٹ پھوٹ کر رو دیں۔“ نالکھ صبح سے خود سے باتیں کرتے کرتے جیسے تھک سی گئی اس سے قطع نظر کہ میں اس کی بڑبڑاہٹ بھی سن رہی تھی۔

☆☆☆

رات سوانو بجے کا وقت تھا۔ سردیوں کی راتوں میں لگتا ہے چاند بھی سردی سے چھپ جاتا ہے۔ ہر



فصل کی صلیب

اساتوری

”بجلی اور گیس کے بل آئے رکھے ہیں بیٹا، جلدی جمع کروادو تو بہتر ہے ورنہ آخری تاریخ پر بہت رش ہو جاتا ہے۔“ عابدہ بیگم نے چائے کی پیالی اس کے آگے رکھتے ہوئے یاد دہانی کروائی۔

”جی امی، ایسا کریں کہ ابھی مجھے دے دیں، میں لچ ٹائم میں جمع کروادوں گا۔“ اس نے فرمانبرداری سے جواب دیا تو عابدہ بیگم دل ہی دل میں اس کی بلائیں لینے لگیں۔ گھرے پیٹ پر اسکا کیلو

دل پر جیسے مرہم رکھا۔

”تم بہت احتیاط پسند ہو حاجرہ اور اک انہی ماں کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔ عارف نے یا ہم میں کسی نے تمہاری کسی بات کا برا نہیں مانا۔ اب تم ہمیں معاف کر دو اور ہم نے بھی تمہارے لیے اپنے دل کے دروازے کھول دیے ہیں۔ تم میری نند نہیں میری بہن ہو۔ ایک ایسی بہن جس کی شرافت، پاکیزگی اور فیک نامی کی لوگ قسمیں کھاتے ہیں۔“ بھابی بہت عقیدت سے مجھ سے مخاطب تھیں۔

”بھابی آپ لوگوں نے مجھے وہ خوشی دی ہے کہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ میں آپ کے لیے کیا کروں۔“ میں روتے روتے مسکرا کر بولی۔

”کچھ نہیں کرنا بس نالکہ مجھے دے دو۔ عارف کی بات تو طے ہے۔ یہ چھوٹا کاشف اسی سال کنگ ایڈورڈ سے ایم بی بی ایس کر کے فارغ ہوا ہے۔ حاجرہ میں اس کے لیے تمہارے آگے جھولی پھیلاتا ہوں۔ نالکہ جیسا گوہر نایاب میری جھولی میں ڈال دو۔“ بھابی التجائیہ انداز میں کہہ رہے تھے اور میں خوشی سے روتے ہوئے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے سامنے بچن میں کھڑی نالکہ کو دیکھ رہی تھی۔ نالکہ شرماتے ہوئے چائے بنا رہی تھی اور عارف اس کی کسی بات پر بھلا سے اس کے سر پر چپٹ لگا رہا تھا۔ کاشف سر جھکا کر مسکرا رہا تھا۔ میرے دائیں طرف بھیا اور بائیں طرف بھوج میری کمر کے گرد بازو پھیلائے محبت سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ آج میرے چاروں طرف خوشیاں تھیں، اطمینان تھا، دعاؤں تھیں۔ تمام دکھ و تکلیفیں اور بددعاؤں کہیں کھو گئیں۔ شکر الحمد للہ کہے ہوئے میں نے انھیں مونڈ کر بھیا کے کاندھے پر سر ٹکایا اور روتے ہوئے کہا۔

”مجھے منظور ہے۔ بھیا..... مجھے یہ سب منظور ہے۔“

عنوان مل گیا۔ آنے والے بھیتھے۔ کیسے نہ میں اپنے خون کو پہچانتی ان کے ساتھ وہ یقیناً میری بھابی تھیں اور ساتھ کھڑے دو جوان لڑکوں میں عارف امتیاز بھی تھا۔ آف خدا عارف امتیاز میزے بھیا کے ساتھ..... کہیں یہ میرا بھتیجا تو نہیں۔ میں اب بھابی کے سینے سے لگی رہ رہی تھی۔

”غلطی صرف تمہاری نہیں حاجرہ ہماری بھی تھی۔ تم صرف بہن کہاں تم تو میری بیٹی تھیں۔ ہمیں معاف کر دینا چاہیے تھا نہیں۔ جب ہم لوگ کہیں سے سنتے کہ تم پریشان ہو یا تم سلائیوں کر رہی ہو یا احسن تمہیں بہت ستاتا ہے تو ہم بے چین ہو جاتے لیکن جھولی انا ہمارے قدم روک لیتی۔ معاشرے کے۔۔ اور خاندان والوں کے طعنے ہمیں روک لیتے لیکن جب ایک روز مجھے پتا چلا کہ تمہیں طلاق ہوگئی اور احسن اپنی دوسری بیوی کے ساتھ اک روڈ ایکسٹنٹ میں مارا گیا ہے تو میں بے حد بے چین ہو گیا۔ جب تمہارے بارے میں معلومات کیں تو پتا چلا کہ تم تو بہت عرصے پہلے کسی دوسرے شہر چلی گئی ہو۔ بس جب سے تمہیں ڈھونڈ رہا ہوں۔ عارف میرا بڑا بیٹا ہے۔ تمہارے گھر کے برابر میں اس کا دوست رہتا ہے، یہ اپنے دفتر کے کام کے سلسلے میں فیصل آباد سے جب لاہور آیا اور اپنے دوست سے ملنے گیا تو تم باہر دروازے پر کھڑی سبزی خرید رہی تھیں۔ میرے بچے تم سے اور تمہاری صورت سے اچھی طرح واقف تھے کہ میری کوئی بات تمہارے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔ عارف نے اپنے دوست کی فیملی سے تمہارے بارے میں معلومات حاصل کیں پھر دوست کی بہن کے ذریعے نالکہ سے بات کی اور اس دن بھی وہ نالکہ سے صرف اس لیے ملنا چاہتا تھا کہ اسے بتا سکے کہ اب تم اکیلی نہیں ہو اور وہ اسے بتانا چاہتا تھا کہ وہ فیصل آباد جا رہا ہے۔ اس کے پچھڑے ماموں کو لینے بس حاجرہ میرے یہ دونوں بچے تمہیں سر پرانز دینا چاہتے تھے۔“ بھیا نے ساری تفصیل بتا کر میرے ذمے

بازی ہار گیا، اس کی موت نے رقیہ کو اُدھ موار کیا۔ بیٹا جیسا بھی تھا زندہ تھا تو انہیں آس تھی کہ کبھی نہ کبھی سُدرھر کر ان کے بڑھاپے کا سہارا بنے گا۔ بیوی کے سخت شب و روز جو وہ میاں کے ادارے سے ملنے والی پنشن اور اپنی سلائی کی مشین کی دن رات کی محنت کے ساتھ کسی نہ کسی طرح کاٹ رہی تھیں اور بھی دشوار ہو گئے اور دیکھنے والوں کو یوں لگا جیسے بیٹے کے بعد رقیہ کسی طور سنبھل نہیں پائیں گی۔ ان حالات میں بلڈنگ کے تقریباً سارے ہی لوگوں نے ان کی اشک شونی کی کوشش کی خصوصاً عابدہ نے تو اس خاندان کا بہت خیال رکھا اور رقیہ کو یہ سمجھانے میں کامیاب رہیں کہ بے شک جوان بیٹے کی موت کا غم بہت بڑا ہے لیکن تین جوان بیٹیوں کی ماں ہونے کے ناتے وہ اس غم میں جوگ لے لینے کی کوشش نہیں ہو سکتیں۔ انہیں اپنی بیٹیوں کو زمانے کے سردو گرم سے بچانے کے لیے ہمت کرنی ہوگی۔ ان کے مستقل سمجھانے بھانے پر رقیہ نے کسی نہ کسی طور خود کو سنبھال لیا۔ دوسری طرف عابدہ بھی مسلسل ان کی خبر گیری کرتی رہیں۔ اس خبر گیری میں رقیہ کے گھر کے بیرونی کام اپنے بیٹے سے انجام دلوانا بھی شامل تھا۔ نیک طبیعت بیٹا کچھ انسانی ہمدردی کے ناتے اور کچھ دل کے کہنے پر یہ ڈیوٹی بخوشی انجام دے رہا تھا۔ اب بھی اس نے دل ہی دل میں دعائیں مانگتے ہوئے رقیہ کے دروازے پر دستک دی اور دروازہ کھلے ہی وہ سرشار ہو گیا کہ سفید لباس میں پلبوس، سر پر دوپٹا بجائے منیجر اس کے سامنے کھڑی تھی..... بڑی بڑی آنکھوں والی منیجر جو بالوں کو سیدھی مانگ نکال کر سنوارتی تھی، اپنی سادگی کے ساتھ اسے بہت اچھی لگتی۔ اس نے بھی میک اپ کے نام پر اس کی آنکھوں میں کاجل کی لکیر تک نہیں دیکھی تھی۔ اس وقت بھی وہ صاف ستھرے یونیفارم میں ڈھلے چہرے کے ساتھ کالج جانے کے لیے تیار تھی۔ کالج میں

اختیار کی تھی اور اس میں بھی ان کی ذاتی خواہش سے زیادہ بیٹی کی پسند اور مفادات کا دخل تھا۔ ”عادل بیٹا جاتے ہوئے رقیہ سے بھی پوچھ لینا کہ کہیں اسے تو مل وغیرہ جمع نہیں کروانا، تم ان کا بھی مل جمع کروادو تو اچھا ہے ورنہ اس بے چاری کو بعد میں دھکے کھانا پڑیں گے۔“ ماں سے دعائیں لے کر عادل نے بیڑھیوں کی طرف قدم ہی بڑھائے تھے کہ پیچھے سے انہوں نے اس سے کہا۔ ”جی اچھا امی، میں معلوم کر لوں گا۔“ اس نے حسب معمول فرمانبرداری سے جواب دیا لیکن اس بار اس فرمانبرداری میں اس کے دل کی خوں بھی شامل تھی۔ رقیہ آئی ان سے ایک فلور نیچے ہی رہتی تھیں۔ وہ ایک بیوہ خاتون تھیں جنہیں قدرت نے تین بیٹیوں اور ایک بیٹے سے نوازا تھا لیکن قسمت کی ستم ظریفی سے ان کا بیٹا بہت کم عمری میں ہی نشے کا عادی ہو گیا۔ سر پر باپ موجود ہوتا تو کچھ دیکھ بھال اور سختی کرتا۔ رقیہ بے چاری تو بس آٹھ آٹھ آنسو رو کر اور بیٹے کی ہمت تر لے کر کے ہی رہ جاتیں یا اس امید پر دعائیں کرتی رہتیں کہ کبھی تو وہ سُدرھرے گا لیکن ایک روز یہ امید بھی ٹوٹ گئی۔ ان کا اکلوتا بیٹا شاہ زیب ایک رات گھر سے گیا تو زندہ واپس نہ آیا۔ پتانے والوں نے بتایا کہ شاہ زیب اور اس کے دو ساتھی بلڈنگ کی چھت پر بیٹھ کر کوئی نئے قسم کا نشہ ٹرائی کر رہے تھے۔ جانے وہ کس قسم کا نشہ تھا کہ نشیات کے عادی وہ لڑکے بھی اسے برداشت نہیں کر سکے اور ان کی حالت غیر ہو گئی یہاں تک کہ وہ اس قابل بھی نہ رہے کہ کسی کو اپنی مدد کے لیے ہی پکار سکتے۔ صبح جب بلڈنگ کا چوکیدار پانی کا وال کھولنے اوپر چڑھا تو اس نے تینوں لڑکوں کی ایتر حالت دیکھ کر شور مچا دیا۔ فوراً ہی ایبولینس منگوائی گئی اور تینوں کو اسپتال لے جایا گیا۔ باقی دونوں لڑکے تو طبی امداد ملنے پر بچ گئے لیکن شاہ زیب جو لڑکے میں سب سے کم عمر اور کمزور تھا اپنی جان کی

چھیننے کی عادت کی وجہ سے اکثر و بیشتر ایسی چھوٹی موٹی جھڑپیں ہوتی رہتی تھیں۔ ”اچھا بھئی..... اللہ حافظ میں چلتا ہوں، آ دوںوں کا تو کسی نتیجے پر پہنچنا مشکل ہے۔“ اس نے جاتے جاتے ختم ہو گئی تھی اس لیے وہ میز پر سے بل بایک کی چابی اٹھاتے ہوئے بولا۔ ”جاؤ بیٹا یا مان اللہ۔“ عابدہ بیگم جھگڑا بھرا بھال بیٹے کی طرف متوجہ ہوئیں اور اسے رخصت کرنے اس کے پیچھے ہوئیں۔ ان کا معمول تھا کہ بچے گھر سے باہر جاتے انہیں دروازے تک ضرور رخصت کر کے آتیں۔ یہ بھی صرف دو ہی تھے ایک عادل، دوسری چھوٹی بیٹی..... عادل پڑھائی سے فارغ ہو کر ایک کورسز کلاس میں ملازمت کر رہا تھا جبکہ انیلا بی اے کے فاضل ان میں تھی۔ وہ اپنے چھوٹے سے خاندان کے ساتھ اطمینان سے اپنے معمولات انجام دیتی خاصی آسودہ زندگی گزار رہی تھیں۔ خلیل صاحب کا ایک چھوٹا سا جزل اسٹور تھا جس کی آمدن سے اس مختصر کتبے کا کافی خونی گزارہ ہو جاتا تھا۔ طرز زندگی میں بہت زیادہ نمائش کا دخل نہ ہونے کے باعث بھی کافی آسودہ تھی۔ البتہ جب سے انیلا بڑی ہوئی تھی گھر کے مال میں تھوڑی بہت تبدیلی آئی تھی۔ کچھ فی وی کی بدولت اور کچھ اپنی باحیثیت سہیلیوں کو دیکھ کر انیلا نے گھر میں کئی ایسی اشیا کا اضافہ ضروری قرار دیا تھا جن کے پہلے پنا کسی پریشانی کے گزارہ ہو رہا تھا۔ حیرت انگیز طور پر عابدہ بیگم اس موقع پر بیٹی کی ہموار بن گئی تھیں اس کے لیے ان کی یہ دلیل تھی کہ جوان بچی گھر میں رہنے کے لیے آنے والے لڑکی کے ساتھ ساتھ گھر بھی دیکھتے ہیں۔ اس لیے گھر میں کچھ تبدیلیاں کرنے بہتر ہے۔ ان کچھ تبدیلیوں پر اچھی خاصی رقم خرچ ہوئی تھی لیکن خلیل صاحب نے یوں اعتراض نہیں کیا کہ کفایت شعار بیگم نے پہلی بار فضول خرچی کی

لائنگ والی شرٹ پہنے، قرینے سے بال سنوارے وہ آفس جانے کے لیے بالکل تیار تھا کچھ شکل و صورت بھی اچھی تھی اس لیے اس تیاری کے ساتھ بہت ہی ہینڈسم لگ رہا تھا پھر جب دیکھنے والی نظر ماں کی ہو اور وہ بھی اپنے فرمانبرداری کو زبان سے ماشاء اللہ نکلتا تو لازم تھا۔ ان کے زیر لب کہے ماشاء اللہ کو عادل نے تو نہیں سنا لیکن اس کے ساتھ ہی ناشتے میں مصروف خلیل صاحب کے کانوں تک ضرور ان کی آواز پہنچ گئی وہ بہت خوشی سے مسکراتے ہوئے بولے۔ ”میرا بیٹا بالکل مجھ پر گیا ہے، جوانی میں میری والدہ بھی مجھے تیار دیکھ کر ایسے ہی ماشاء اللہ کہا کرتی تھیں۔“ ”اللہ جانے آپ کن وقتوں کا ذکر کر رہے ہیں، میری نظروں نے تو آپ کی ایسی خوب صورتی کا بھی نظارہ نہیں کیا کہ زبان سے ماشاء اللہ نکل سکے۔“ حسب توقع عابدہ بیگم نے منہ بنا کر ان کی مخالفت کی اور مزید بولیں۔ ”عادل تو بتانا ہی اپنے چھوٹے ماموں کی کاپی ہے۔ اس کی عمر میں وہ تھا ایسا نا کا جیلا کہ ہم بہنیں اور اماں قدم قدم پر اس کی بلائیں لیتی تھیں۔“ ”چھوڑیں بھی بیگم، آپ کا بھائی کہاں سے میرے بیٹے جیسا خوب صورت ہو گیا۔ اتنا گھر اساتو لا تو رنگ ہے اس کا۔“ خلیل صاحب نے مزے سے توس پر کھن لگاتے ہوئے انہیں چھیڑا۔ ”ارے وہ تو بعد میں مانیفا نڈ سے اس کا رنگ جل گیا تھا ورنہ ایسا جیلا تھا میرا بھائی کہ لڑکیاں پٹا پٹ گرتی تھیں اس پر۔“ عابدہ بیگم نے جلدبلا جواب دیا۔ ”خوف سے گر جاتی ہوں گی بے چاریاں۔“ خلیل صاحب باز نہ آئے۔ ”آپ اپنے حجرے نہ بیان کریں۔“ انہوں نے بھی حرت جواب دیا۔ عادل مسکرا ہٹ دبا ئے چائے پیتے ہوئے ماں، باپ کی جھڑپ سنتا رہا۔ دونوں میں محبت بہت تھی لیکن خلیل صاحب کے

پڑھنے والی اپنی ہم عمر لڑکیوں کی طرح اس کے چہرے پر شوشی کے بجائے ہر وقت ایک گہری سنجیدگی طاری رہتی۔ عادل اس کے اس روپ کو پسند کرنے کے باوجود کبھی کبھی اس کے لیے اداس ہو جاتا تھا کہ وہ بے چاری حالات کے ہاتھوں اس بری طرح گھٹ گئی تھی کہ مسکراتا ہی بھول گئی۔ ورنہ وہ روز صبح آفس جاتے ہوئے دیکھتا ہی تھا کہ لڑکیاں کس طرح بن سنور کر شوخ تیلیوں کی طرح تعلیمی اداروں کا رخ کرتی تھیں۔ خود اس کی اپنی بہن انیلا بھی عابدہ بیگم کی کڑی نظر کے باعث شوخ میک اپ نہ سہی آئی لائسنز اور فیر اینڈ لولی کا استعمال تو ضرور کرتی تھی یہاں پر اس کا بھی نام و نشان نہیں تھا اس کے باوجود اس کی نظریں منیبہ کے چہرے سے ٹکراتی تو واپس پلٹنا بھول جاتی تھیں۔ اس وقت بھی کچھ ایسا ہی ہوا آخر اس کی نظروں سے خائف منیبہ کو ہی کھٹکھا کر اسے اس بے خودی کی کیفیت سے نکالنا پڑا۔

”وہ..... میں آئی سے پوچھنے آیا تھا کہ اگر بل جمع کروانے ہوں تو دے دیں، میں اپنے بلوں کے ساتھ نجع کروادوں گا۔“ اس نے خود کو سنبھال کر جلدی سے آمد کا مقصد بیان کیا۔

”جی اچھا..... میں امی سے کہتی ہوں۔“ وہ کہتے ہوئے اندر چلی گئی اور رقیہ آئی بلوں کے ساتھ مطلوبہ رقم لے کر دروازے پر آگئیں۔

”باہر کیوں کھڑے رہے بیٹا اندر آ جاتے۔“ اس کے سلام کا جواب دینے کے بعد اسے بل اور پیسے تھماتے ہوئے انہوں نے شفقت سے کہا۔

”بس آئی آفس جاتا ہے، ذرا جلدی میں ہوں بعد میں کسی دن امی کے ساتھ آؤں گا۔“ اس نے مسکراتے ہوئے خوش خلقی سے جواب دیا۔ پرانی محلے داری کے باوجود اس کا ان لوگوں کے گھر بے دھڑک آنا جانا نہیں تھا۔ عام طور پر وہ دروازے پر کھڑے کھڑے ہی کام کی بات کر لیتا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا

کہ خود رقیہ آئی نے ابھی اس سے جوابات کہی تھے محض تکلف ہی کہی ہے ورنہ گھر میں جوان بیٹیوں کی موجودگی کی وجہ سے وہ خود بھی احتیاط کرنا ہی کر تیں لہذا ان کی رواداری کے جواب میں خود رواداری کا مظاہرہ کرتا ہوا وہاں سے رخصت ہو گیا۔ یہ اور بات کہ صبح بھونے والے منیبہ کے دیدار اس کی طبیعت میں سرشاری سی بھردی تھی اور وہ خوش اور مگن سا آفس کے لیے روانہ ہو گیا تھا۔

☆☆☆

”سوچ رہی ہوں تمہارے لیے لڑکی ڈھونڈنا شروع کر دوں۔“ تعلیم سے فارغ ہو گئے ہو اور جا بجا مناسب ہے اس لیے اب تمہاری شادی کرو چاہیے۔“ وہ سب شام کی چائے پی رہے تھے جب عادل بیگم نے روئے سخن اس کی طرف کر کے یہ بات کہی۔ ”زبردست آئیڈیا ہے امی! بھائی کی شادی ہو تو کتنا مزہ آئے گا۔ میں ڈھیر سارے نئے کپڑے بناؤں گی اور اپنی سہیلیوں کو انوائٹ کروں گی۔“ ان نے سب سے پہلے ماں کے خیال کی تائید کرتے ہوئے اپنے ارادوں کا اظہار کرنا ضروری سمجھا۔

”اسے کہتے ہیں ابھی گاؤں بسا نہیں لیئر پہلے آگئے۔ تمہارے ڈھیر سارے کپڑوں اور ڈھیر ساری سہیلیوں کے بھگتانی کے بعد مجھ غریب کے پاس بچے گا ہی کیا کہ میں بیوی کا نٹن پال سکوں۔ میں کہتا ہوں کہ چھوڑو بی بی چوہا لٹو ورا ہی بھلا۔“ انیلا پروگرام سن کر اس نے باقاعدہ کانوں کو ہاتھ لگا لئے ہوئے کہا۔

”دیکھ رہی ہیں امی بھائی کو..... شادی ہونا دور کی بات صرف شادی کا ذکر ہی ہوا ہے تو بھائی اپنی نظریں پھیر رہی ہیں۔“ انیلا نے فوراً ٹھٹک کر ماں سے شکایت کی۔ چھوٹی ہونے کی وجہ سے وہ زیادہ لاڈلی اور غریبی تھی۔

”کیوں دل پر لے رہی ہو بیٹا..... بھائی نہ

بارت لے کر جانے کے لیے دروازے پر کھڑی ہوں۔ شادی ہوتے ہوتے بھی وقت لگے گا۔ ہو سکتا ہے اتنے عرصے میں تمہارا کوئی اچھا سارشتہ آجائے تو میں دونوں بھائی، بہن کو ایک ساتھ ہی نمنا دوں۔۔۔۔۔

نی الحال تو عادل کے لیے اچھی لڑکی ڈھونڈنے کا مسئلہ ہے۔ دسیوں گھر جھانکتے ہی کہیں جا کر اچھی لڑکی مل پاتی ہے۔“ عابدہ بیگم نے ان کی لڑائی میں دخل دیتے ہوئے اپنے ارادے سے آگاہ کیا۔

”تویوں کہیں ناں کہ آپ بہو ڈھونڈنے کے بہانے دوسروں کے گھر جا کر مفتا اڑانے کے چکر میں ہیں۔“ خلیل صاحب تو موقع کی تلاش میں ہی رہتے تھے کہ کب بیگم کو چھیڑ سکیں۔ چنانچہ فوراً ہی ان کی بات پکڑ لی۔

”میری اتنی گھٹیا سوچ نہیں ہے۔ آپ کے خاندان میں ہو گا یہ رواج کہ لڑکی ڈھونڈنے کے بہانے دوسروں کے گھروں میں مفت کی دعوتیں اڑاتے پھریں۔“ حسب معمول عابدہ بیگم سلگ اٹھیں۔

”کہاں ابھی۔۔۔۔۔ اگر ہمارے خاندان میں لڑکیاں تلاش کرنے کے لیے اتنی محنت کی جاتی ہوتی تو آپ کیسے یہاں آتیں۔“ انہوں نے جان بوجھ کر ایک سرد آہ بھرتے ہوئے حسرت سے کہا، اس بار تو عابدہ بیگم سچ ہی سلگ گئیں۔

”اتنی سرد آہیں بھرنے کی کیا ضرورت ہے۔ جائیں اب جا کر کوئی حسینہ ماہ جینے ڈھونڈ لیں، بیٹے کے ساتھ ساتھ میں آپ کے سر پر بھی سہرا سجانے کا انتظام کر دوں گی۔“

”پیشکش تو آپ کی شاندار ہے بیگم لیکن سوچ لیں کہیں ایسا نہ ہو کہ میرے سامنے آپ کے بیٹے کی پرسنالٹی ڈاؤن ہو جائے اور لوگ کہیں بیٹے پر باپ جیسا روپ نہیں چڑھا۔“ وہ بیگم کے غصے سے پوری طرح محظوظ ہو رہے تھے۔ دوسری طرف انیلا اور عادل بھی اپنا جھگڑا بھول کر ان دونوں کے درمیان

کر رہا ہے۔“ عابدہ بیگم نے اسے سمجھایا اور خود دوبارہ بیٹے کی طرف متوجہ ہوئیں۔

”کیا کہتے ہو پھر شروع کروں لڑکی کی تلاش!“

”شادی تو مجھے ایک نہ ایک دن کرنی ہی ہے امی لیکن میں سوچ رہا تھا کہ پہلے انیلا کی ہو جائے تو پھر میں اپنے بارے میں سوچوں۔“ اس بار اس نے سنجیدگی سے ماں کی بات کا جواب دیا۔

”کیوں، پہلے میری کیوں۔۔۔۔۔ آپ بڑے ہیں پہلے آپ کی شادی ہونی چاہیے۔“ اس کی بات سن کر انیلا نے فوراً ہی تنک کر کہا۔

”وہ اس لیے خوشخوار رہی کہ یہ جو تمہیں ہر وقت بچنے نکالنے کی عادت ہے اس سے میری بے چاری بیوی کو خطرہ ہو سکتا ہے۔ تم تو جب دیکھو جب بچے بھاڑ کر اس بے چاری کے پیچھے پڑی رہو گی۔“ اس نے ایک بار پھر اسے چھیڑا تو وہ چیخ پڑی۔

”دیکھ رہی ہیں امی آپ بھائی کی چالاکیاں۔۔۔۔۔ لیکن آپ نے کیا سمجھا ہے کہ میری شادی ہو گئی تو میرا اس گھر سے واسطہ ختم ہو جائے گا۔ ارے میں تو شادی کے بعد بھی آپ کی اور آپ کی بیگم کا ناک میں دم کر سکتی ہوں اور ضرور کروں گی۔“ سرخ پڑتے چہرے کے ساتھ اس نے اپنے عرائم کا اظہار کیا۔

”میں پہلے ہی تمہارے میاں کے کان بھر دوں گا کہ اس بلی کو زیادہ بچھوٹ دینے کی ضرورت نہیں، سختی میں رکھنا اور کم کم میکے آنے کی اجازت دینا۔“ انیلا کے تاثرات کے برعکس اس کے ہونٹوں پر بڑی محظوظ ہونے والی مسکراہٹ تھی۔

”ابو دیکھیں ناں بھائی کو۔“ اس بار انیلا نے خلیل صاحب کو پکارا جو چائے پیتے ہوئے دونوں بہن بھائی کی نوک جھوک سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

”ارے بھئی۔۔۔۔۔ تم بہن، بھائی نے کیوں خواہ مخواہ چونچیں لڑانا شروع کر دی ہیں۔ میں کون سا

فیصلہ کی صلیب

موت پر مضطرب گریہ سے سرخ ہوتی آنکھوں کے ساتھ، ماں، بہنوں کو سنبھالتی منیبہ نے بھی اسے متاثر کیا تھا اور ہر روز سادگی کا پیکر بنی سفید یونیفارم میں نظریں جھکائے کالج جاتی منیبہ بھی اسے اچھی لگتی تھی اگر اس پسندیدگی کو وہ امی تک پہنچاتا تو یقیناً انہیں اعتراض نہ ہوتا۔ وہ خود بھی رقیہ آنٹی کی تینوں بیٹیوں کی تعریف ہی کیا کرتی تھیں پھر پتا نہیں کیوں بہو کے لیے انہیں منیبہ کا خیال نہیں آیا تھا بہر حال اسے امید تھی کہ جب وہ ان کا دھیان اس طرف کروائے گا تو وہ اعتراض نہیں کریں گی۔

”طیبہ کہاں ہے اس کے ہاتھ سے چائے بھجوادیتیں۔“ میز پر چائے رکھتی منیبہ سے رقیہ آنٹی نے کہا۔ ان کی جہاندیدہ نظروں سے عادل کی پسندیدگی چھپی نہیں رہی تھی اس لیے وہ بہت متحاشی تھیں۔ ”وہ سامنے گئی ہے۔ کہہ رہی تھی ارم سے کڑھائی کا نمونہ لینا ہے۔“ منیبہ نے آہستہ سے جواب دیا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

”ایک تو اس لڑکی سے میں بہت پریشان ہوں، نچلا تو بیٹھا ہی نہیں جاتا اس سے..... سیر سپاٹے اور شوخیاں ہی سوچ رہی ہیں۔“ رقیہ بڑبڑاتی ہیں۔

”جانے دیں آنٹی..... اس عمر میں تو سب لڑکیاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ ہماری اینٹلا کوئیں دیکھا آپ نے، کتنی شوخ اور شرارتی ہے۔“ اس نے انہیں ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔

”اینٹلا کی اور بات ہے بیٹا! اس کے سر پر باپ اور بھائی کا ہاتھ ہے کوئی اس کی طرف انگلی بھی نہیں اٹھا سکتا جبکہ میرے دروازے پر سب کی نظریں رہتی ہیں کہ کب موقع ملے اور باتیں بنائیں۔ میں ان بچیوں پر اتنی سختی اسی لیے کرتی ہوں کہ عزت سے اپنے گھر کی ہو جائیں۔ کسی ایک سے بھی ذرا سی لغزش ہوگئی تو باقی بہنوں کے لیے بھی مشکل ہو جائے گی۔ مرد کے سہارے کے بغیر رہنے والی عورتوں کی معمولی سے

کر ڈالی۔ اصل میں یہاں اتنی دیر سے موجود ہونے کے باوجود اسے ابھی تک منیبہ کی شکل دکھائی نہیں دی تھی۔ وہ اندر کمرے میں بچوں کو ٹیوشن پڑھا رہی تھی۔ شام کے اوقات میں اس کے پاس بلڈنگ ہی کے کئی بچے ٹیوشن پڑھنے آتے تھے جس سے اسے اپنے تعلیمی اخراجات کے علاوہ چھوٹی موٹی دیگر ضروریات پوری کرنے میں سہولت ہو جاتی تھی۔

”صاف کہیں کہ آپ کی ہاتھ کی چائے پینی ہے۔ زبردست چائے تو ہمارے گھر میں وہی بناتی ہیں۔“ منہ پھٹتے طیبہ نے ہنستے ہوئے کہا اور ماں کے کھورنے کی پروا نہ کرتے ہوئے منیبہ کو چائے کا کہنے چلی گئی۔

”یہ لڑکی جانے کس پر گئی ہے۔ کتنا ہی روکو ٹوکو اس کا چنچل پن ختم نہیں ہوتا۔“ رقیہ بڑبڑاتی ہیں لیکن مہمان نوازی کے تقاضے تو بھانے ہی تھے۔ چنانچہ نہایت محروم کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس سے بولیں۔ ”آؤ بیٹا وہاں چل کر بیٹھو۔“ وہ اسے ساتھ لیے ہوئے ٹی وی لاونچ میں آگئیں جہاں ایک برانا لیکن صاف ستھرا صوفہ سیٹ رکھا ہوا تھا۔ وہ ایک سنگل صوفے پر بیٹھ گیا اور رقیہ آنٹی سے ان کی دلچسپی کے موضوعات پر گفتگو کرنے لگا۔ تھوڑی دیر میں منیبہ ٹرے میں چائے کی پیالیاں لیے چلی آئی۔ سیدھی ماگنگ نگالے ہمیشہ کی طرح سر پر دوپٹا اوڑھے ہوئے۔ منیبہ کو دیکھ کر اس کی آنکھیں چمک اٹھیں اور ساتھ ہی تھوڑی دیر میں امی سے ہونے والی گفتگو بھی یاد آئی۔

”امی سے کہوں گا کہ لڑکی کی تلاش میں دسیوں گھرنے کی زحمت کرنے کی کیا ضرورت ہے بس ایک میز بھی اتر کر رقیہ آنٹی کے ہاں چلی جائے گا۔“ اپنے دل میں آنے والے خیال پر وہ خود ہی مسکرا اٹھا۔ ساہو سی منیبہ کب سے اس کے دل کو بھانے لگی تھی وہ صحیح طور پر نہیں بتا سکتا تھا البتہ یہ ضرور یاد تھا کہ وہ اسے ہر روپ میں بھاتی تھی۔ اکلوتے بھائی کی

”پلبر کو نہیں لایا آئی..... میں نے سوچا کہ پہلے میں خود دیکھ لوں، چھوٹے موٹے کام تو میں بھی نمٹا لیتا ہوں۔“

”اس سے اچھی بات کیا ہوگی۔ آؤ اندر آجاؤ۔“ وہ خوش ہو گئیں۔ محدود آمدنی میں اس قسم کے خرچوں کے لیے رقم نکالنا ظاہر ہے انہیں مشکل گزرتا تھا ایسے میں اگر عادل ان کا یہ کام کر ڈالتا تو پلبر کے خرچے سے بچ جاتیں۔ عادل نے مشکل سے دس بارہ منٹ میں ان کا یہ مسئلہ حل کر دیا۔

”بہت بہت شکریہ بیٹا..... اگر یہ بل ایسے بہتر رہتا تو بڑی پریشانی ہو جاتی۔“ رقیہ آنٹی نے عادل سے اس کا شکریہ ادا کیا۔ وہ لوگ جس بلڈنگ میں رہتے تھے وہاں مخصوص اوقات میں پانی سپلائی کیا جاتا تھا جسے ہر فلیٹ کے کین فلٹ میں موجود کنگی میں ڈنچ کر لیتے۔ اگر یہ ذخیرہ شدہ پانی ختم ہو جاتا تو پھر پانی لینے کے لیے نیچے اتر کر جانا پڑتا تھا اور ظاہر ہے چار خواتین پر مشتمل اس فلیٹ میں سے تو کوئی نیچے سے پانی کے کین بھر بھر کر اوپر نہیں لاسکتا تھا۔ اس لیے چھوٹا سا یہ مسئلہ ان کے لیے بڑی پریشانی کا باعث تھا۔

”شکریہ کی کیا بات ہے آنٹی..... چھوٹا سا کام تھا، محلے داری میں انسان کو اتنا خیال تو رکھنا ہی پڑتا ہے۔“ اس نے عاجزی سے جواب دیا اس سے قبل کہ رقیہ آنٹی کچھ باتیں طیبہ وہاں نازل ہوگئی۔ ”امی عادل بھائی بالکل صحیح کہہ رہے ہیں۔ ہمارا ان پر اتنا حق تو ہے ہی۔ آپ یہ بتائیں عادل بھائی کہ چائے پینیں گے یا شربت.....؟“ اس نے ایک ہی سانس میں ماں اور عادل دونوں سے بات کہہ ڈالی۔

”چائے پیوں گا مگر ہونی زبردست چاہیے ورنہ کوئی خاص ضرورت نہیں ہے۔“ وہ جانتا تھا کہ منیبہ بہنوں میں منیبہ سب سے اچھی چائے بناتی ہے اس لیے چائے پی کر آنے کے باوجود جان بوجھ کر فرما کر

جاری مکالے سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ دروازے پر ابھرنے والی دستک کی آواز نے سب کی توجہ اپنی طرف مبذول کروالی۔

”میں دیکھتا ہوں۔“ عادل بولتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔ سامنے رقیہ آنٹی کی سب سے چھوٹی بیٹی اریہ کھڑی تھی۔ چودہ پندرہ سال کی اریہ میٹرک کی طالبہ تھی لیکن اپنی عمر کی دیگر بچیوں کی طرح شوخ و چنچل ہونے کے بجائے بہت سنجیدہ مزاج تھی۔ اس وقت بھی اس نے دوپٹے کو بہت سلیقے سے سر پر جما رکھا تھا اور نظریں نیچی کیے اس کے سامنے کھڑی تھی۔ شاید گھر میں کسی مرد کے نہ ہونے کے باعث رقیہ آنٹی بیٹیوں کے معاملے میں حد سے زیادہ احتیاط پسندی سے کام لیتی تھیں، اسی لیے ان کی بیٹیاں اتنی سنجیدہ مزاج تھیں صرف بیچ والی طیبہ کے مزاج میں تھوڑی بہت شوخی پائی جاتی تھی اور وہ ہر وقت ماں سے ڈانٹ بھی کھاتی رہتی تھی۔

”آؤ اریہ اندر آجاؤ۔“ اس نے کہتے ہوئے اسے اندر آنے کا راستہ دیا۔

”نہیں عادل بھائی، میں اپنا فرسک کا چرل بنا رہی تھی مجھے فوراً واپس جانا ہے آپ سے صرف یہ کہنے آئی تھی کہ امی کہہ رہی ہیں ہو سکے تو کسی پلبر کو بلا کر لادیں۔ ہمارے واش بین کمال خراب ہو گیا جس کی وجہ سے سارا پانی ضائع ہو رہا ہے۔“ اس نے سنجیدگی سے آنے کی وجہ بیان کی۔

”اچھا تم چلو میں دیکھتا ہوں۔“ اس نے اریہ سے کہا اور خود اندر جا کر پہلے امی، ابو کو مطلع کیا پھر رقیہ آنٹی کے فلیٹ کی طرف روانہ ہوا۔ اریہ جا چکی تھی..... عادل نے فلیٹ کی کھنٹی بجائی تو آنٹی دروازے پر نمودار ہوئیں۔

”کیا ہوا بیٹا اتنی جلدی پلبر کو لے آئے کیا؟“ حیران سی رقیہ آنٹی نے اس کے پیچھے کسی کو ڈھونڈنے کی کوشش کی۔

جاتے سے اس کی آنکھوں میں تھے۔

☆☆☆

منگنی کی تقریب سے فارغ ہوتے ہی عادل اربہ کو پڑھانے کے سلسلے میں رقیہ آنٹی سے کیا جانے والا وعدہ نبھانے ان کے گھر جا پہنچا۔ دروازہ رقیہ آنٹی نے ہی کھولا۔ ان کی صورت دیکھ کر عادل کو جھکا سا لگا دو دنوں میں ہی وہ برسوں کی بیمار لگنے لگی تھیں۔ چہرے پر ایسی زردی کھنڈی تھی جیسے جسم میں خون ہی نہ ہو۔ عادل کو دروازے پر دیکھ کر انہوں نے قدرے ہچکچاتے ہوئے اسے اندر آنے کی اجازت دے دی۔

”آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے آنٹی..... آپ مجھے بہت کمزور لگ رہی ہیں؟“ ڈرائنگ روم میں ان کے روبرو بیٹھے ہوئے اس نے ان سے دریافت کیا۔

”بی بی بہت ہائی ہو گیا تھا۔ دوا کھا رہی ہوں۔ ڈاکٹر نے کہا ہے آہستہ آہستہ کنٹرول میں آجائے گا تم بتاؤ کیسے آنا ہوا؟“ انہوں نے مختصر اپنی طبیعت کے بارے میں بتا کر اس سے آنے کی وجہ پوچھی تو اسے ان کا اندازہ کچھ عجیب سا لگا۔ وہ اس سے کچھ اس طرح کا برتاؤ کر رہی تھیں جیسے وہ ان کے لیے اجنبی ہو۔

”آپ نے مجھ سے اربہ کو میتھس اور فزکس پڑھانے کے لیے کہا تھا تو میں اسی سلسلے میں آیا ہوں۔ اربہ کہاں ہے؟“ اسے کہیں کہہ سکتی تھیں کہ آجائے۔“ اس نے ان کے رویے کو ان کی طبیعت کی خرابی پر محمول کرتے ہوئے نرمی سے جواب دیا۔

”تمہارا بہت بہت شکریہ بیٹا کہ تم نے میری درخواست کو یاد رکھا لیکن اب اس کی ضرورت نہیں ہے۔ اربہ کو جو کچھ پڑھنا ہوگا منیبہ سے پڑھ لے گی۔“ انہوں نے سپاٹ سے لہجے میں کہا تو وہ حیران رہ گیا۔

”منیبہ کیسے اسے پڑھا سکتی ہے۔ اس نے تو آرٹس کے مضامین میں میٹرک کیا تھا اور اس کا میتھس اور فزکس سے دور دور تک تعلق نہیں ہے۔“

”دونوں بہنیں مل کر کچھ نہ کچھ کر ہی لیں گی“ میں نے اربہ سے کہہ دیا ہے کہ وہ اپنی اسکول ٹیچروں سے ہی اچھی طرح سمجھ لیا کرے۔ اسکول میں اتنا تو پڑھایا ہی جاتا ہے کہ اس کے پرے پرے ہو جائیں۔“

”لیکن آپ اس کے ساتھ ایسا کیوں کر رہیں؟ وہ اچھی خاصی ذہین طالبہ ہے۔ صحیح رہنمائی ملے گی تو بہت اچھے گریڈ سے پاس ہوگی۔ اگر اس کے اچھے نمبر نہیں آئے تو مجھے بہت افسوس ہوگا کہ میرے ہوتے ہوئے بھی ایسا ہوا۔“ وہ اپنے تئیں سمجھانے کی کوشش کرنے لگا۔

”بات کو سمجھا کر عادل بیٹا..... جو کچھ انیلک منگنی والے دن ہوا اس کے بعد میں مزید کوئی رسک نہیں لے سکتی۔ غزالہ نے برسوں کے تعلقات کا لالہ کیے بغیر اس روز اتنا ہنگامہ کیا کہ میں کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہی۔ اس واقعے کے بعد اب سب کی نظریں میری بیٹیوں پر ہی لگی رہیں گی اور لوگ کسی بھی غیر مرد کو میرے گھر آتا جاتا دیکھیں گے تو انگلیاں اٹھانے اور باتیں بنانے سے نہیں چوکیں گے۔ میں نہیں چاہتی کہ طیبہ سے جو غلطی ہوئی اسے کوئی اور بھی دہرائے۔ میں کسی بھی مزید بدنامی کے بغیر ان تینوں کو ان کے گھروں کا کرنا چاہتی ہوں۔ تینوں میں سے جیسے ہی کسی کا بھی مناسب رشتہ آئے گا میں اسے رخصت کر دوں گی۔ نصیب میں ہوا تو اپنے گھروں میں جا کر اعلیٰ تعلیم حاصل کر لیں گی۔“ رقیہ آنٹی ان دنوں میں ہی بہت سے فیصلے کر چکی تھیں اسے محسوس ہوا کہ کہیں غلطی میں وہ اپنی بیٹیوں کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کر جائیں اس لیے نہایت خلوص سے انہیں سمجھانے کی کوشش کرنے لگا۔

”میں مانتا ہوں..... آنٹی کہ طیبہ سے غلطی ہوئی لیکن نادانی میں کبھی کبھار ایسی غلطیاں ہوجاتی ہیں غزالہ آنٹی نے زیادتی کی کہ اس بات کو اتنا زیاد

اچھا! اگر وہ طیبہ کو اپنی بہو کی حیثیت سے قبول نہیں کر سکتی تھیں تو اس معاملے کو کسی اور طریقے سے بھی حل کیا جاسکتا تھا۔ بہر حال انہوں نے جو کرنا تھا کر چکیں لیکن آپ تو ایسا نہ کریں۔ آپ ان کی ماں ہیں۔ آپ کو اپنی بیٹیوں کے لیے فیصلے کرتے وقت دنیا والوں کی پروا کرنے کے بجائے ان کا خیال ہونا چاہیے۔“

”تم میری حالت نہیں سمجھ سکتے بیٹا! میں نے جو سوچا ہے اپنی بچیوں کے بھلے کے لیے ہی سوچا ہے، مجھ غریب بیوہ ماں کے پاس اپنی بچیوں کے لیے مال و متاع تو ہے نہیں جسے دیکھ کر لوگ میرے در پر آئیں۔ بچیوں کی شرافت اور سلیقہ مندی سے ہی امید تھی کہ شاید کوئی ان خوبیوں کا قدردان نکل آئے لیکن شرافت پر بھی ایک داغ لگ گیا۔ ہو سکتا ہے کہ وقت اس داغ کو دھندلا دے لیکن میں یہ رسک نہیں لے سکتی کہ جانے انجانے میں مزید کوئی داغ ان کا نصیب بنے۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ جب تک تینوں کے کسی مناسب جگہ رشتے نہیں ہوجاتے انہیں گھر کی چار دیواری تک ہی محدود رکھوں گی۔ اربہ اور منیبہ اپنے امتحانوں سے فارغ ہو جائیں تو ان کی تعلیم کا سلسلہ یہیں ختم کروادوں گی۔ اب تم سمجھ ہی سکتے ہو کہ جب مجھے اربہ کو مزید آگے پڑھوانا ہی نہیں تو اس کے اچھے یا بُرے نمبروں سے کیا فرق پڑتا ہے۔“ ان کا انداز بڑا بے چلک تھا۔ عادل کو احساس ہوا کہ انہوں نے ہونے والے واقعے کا بہت زیادہ اثر لیا ہے اور ایسی کیفیت میں نہیں ہیں کہ فی الحال سمجھانے سے کچھ سمجھ سکیں لہذا مزید بحث کیے بغیر وہاں سے اٹھ کر باہر نکل آیا۔ اپنے گھر آکر بھی اس کا ذہن وہیں الجھا رہا۔ عابدہ بیگم نے بھی اس کی یہ کیفیت محسوس کر لی اور اس سے اس کی خاموشی کے بارے میں استفسار کیا جواباً اس نے رقیہ آنٹی سے ہونے والی ساری گفتگو ان کے سامنے دہرا دی۔

”میرے خیال میں رقیہ نے بالکل ٹھیک فیصلہ

فیصلے کی صلیب

کیا ہے۔ ایک غریب بیوہ کو جس کی تین تین جوان بیٹیاں ہوں ان حالات میں یہی کچھ کرنا چاہیے تھا ورنہ آگے چل کر اسے مزید پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔“ انہوں نے اس کی زبانی سب کچھ سن کر تبصرہ کیا۔

”یہ کیا بات ہوئی امی! ان کا غریب یا بیوہ ہونا اتنا بڑا جرم تو نہیں ہے کہ ان کی بیٹیوں سے عام انسانوں کی طرح رہنے کا حق ہی چھین لیا جائے۔ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ طیبہ کی ایک معمولی سی غلطی کی سزا اس کی دوسری بہنیں بھی بھگتیں۔“ وہ ان کی بات سن کر خفا سا ہو گیا۔

”پہلی بات تو یہ کہ طیبہ نے کوئی معمولی غلطی نہیں کی تھی۔ لڑکیوں کی ایسی غلطیاں بعض اوقات نسلوں تک یاد رکھی جاتی ہیں۔ دوسرے یہ کہ تمہیں اس معاملے میں بددبہ..... زیادہ انوالو ہونے کی ضرورت نہیں۔ تم اربہ کو پڑھانے کے لیے گئے تھے، بہت اچھا کیا۔ آگے ان کی مرضی کہ انہوں نے انکار کر دیا۔ تمہارا فرض پورا ہو گیا اس لیے تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے..... باقی میں دیکھوں گی کہ رقیہ کو کھوڑا بہت سمجھا سکوں۔“ عابدہ بیگم نے اس کی غلطی کی پروا کیے بغیر نہایت سختی سے اسے ٹوک دیا۔

”یہ کوئی بات نہیں ہوئی امی! رقیہ آنٹی سے ہمارے اتنے پرانے تعلقات ہیں، ہمارا فرض بنتا ہے کہ وہ کچھ غلط کر رہی ہیں تو انہیں اس کا احساس دلائیں۔ طیبہ سے اگر کوئی غلطی ہوگئی ہے تو اس کی سزائی دونوں بہنوں کو نہیں ملنی چاہیے یا آپ بھتی ہیں کہ وہ دونوں بھی اپنی بہن کی شریک جرم ہیں؟“ ماں کے سخت لہجے کے باوجود وہ کلمہ حق بلند کرنے سے باز نہیں آیا۔

”خدا نخواستہ میں کیوں کسی کی بیٹیوں پر بہتان باندھ گئی۔ اربہ اور منیبہ دونوں ہی بڑی اچھی اور سمجھدار بچیاں ہیں۔ خصوصاً منیبہ کا مزاج تو بہت ہی سنجیدہ ہے۔ وہ تو طیبہ کو بھی اس کی شوخی اور بے باکی پر

اکثر روکتی ٹوکتی رہتی تھی۔ اگر اس کے علم میں یہ بات ہوتی تو توبت بھی یہاں تک نہ آتی، وہ بہت پہلے ہی ماں کو بتا کر مسئلہ حل کر چکی ہوتی لیکن خیر جو ہونا تھا ہو گیا۔ آگے رقیہ کی مرضی ہے کہ وہ اپنے مسائل کو کس طرح حل کرتی ہیں۔ ہم کون ہوتے ہیں ان کے معاملات میں دخل دینے والے؟ اس طرح کی دخل اندازی کرتے ہوئے وہی لوگ اچھے لگتے ہیں جن کے پاس مسئلہ کا کوئی حل ہو۔“ اسے باز نہ آتا دیکھ کر انہوں نے ایک اور زاویے سے سمجھایا لیکن اس کے ہاتھ ایک اچھا پوائنٹ آگیا سو اہستہ سے بولا۔

”ہم رقیہ آئی کی کام از کم ایک مسئلہ تو حل کر ہی سکتے ہیں۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ عابدہ بیگم نے اسے گھورا۔

”میرے خیال میں آپ میرا مطلب سمجھ رہی ہیں۔ آپ اس دن کہہ رہی تھیں کہ ایلا کی رخصتی کے بعد آپ کو اکیلے گھر سنبھالنے میں دشواری ہوگی اس لیے اسے رخصت کرنے کے ساتھ ساتھ آپ بہو بھی گھر لے آئیں گی تو اس کے لیے منیبہ بہت مناسب رہے گی۔ وہ میز دار اور سلیقہ شاعر لڑکی ہے۔ ابھی آپ بھی اس کی تعریف کر رہی تھیں۔“ آخر کار وہ بہت دنوں سے دل میں دہی بات زبان پر لے ہی آیا۔

”ہرگز نہیں..... میرا دماغ خراب نہیں ہے کہ منیبہ کو اپنی بہو بنالوں۔“ انہوں نے فوراً ہی بہت سختی سے انکار کر دیا۔

”لیکن کیوں امی..... منیبہ آپ کی دیکھی بھالی لڑکی ہے اور آپ اچھی طرح جانتی ہیں کہ وہ گھر سنبھالنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔“ اسے ان سے اتنے صاف انکار کی امید نہیں تھی اس لیے کچھ حیران ہو کر انہیں سمجھانے لگا۔

”دیکھو عادل مجھ سے بحث مت کرو، تم میرے اکلوتے بیٹے ہو اور میں تمہاری شادی دیکھ بھال کر گئی

ایسے خاندان میں کرنا چاہتی ہوں۔“

”ایسے خاندان سے آپ کی مراد کہیں والے لوگ تو نہیں ہیں؟“ اسے گمان ہوا کہ دیگر سی ماؤں کی طرح کہیں اس کی ماں بھی اپنے اکلوتے ہونہار بیٹے کو کیش کروانے کا ارادہ نہ رکھتی ہو اس کچھ تنکھے لہجے میں پوچھا۔

”لاحول ولا قوۃ..... تم نے مجھے ایسا لالچ رکھا ہے کیا! جو کچھ ہمارے پاس ہے اسے بہت سمجھتی ہوں۔ مجھے روپے پیسے سے کوئی غرض نہیں لیکن لوگ عزت دار تو ہونے چاہئیں۔ رقیہ خاندان میں رشتہ جوڑ کر میں لوگوں کو کیا بتاؤں گی لڑکی کا اکلوتا بھائی نشے کی زیادتی کی وجہ سے کتوں کی طرح جان سے گیا اور بہن پڑوسی سے مڑکا کرنے کے جرم میں بھری محفل میں بے عزت ہوئی۔ نہ بابا نہ مجھے نہیں جوڑنی ایسی رشتہ داری۔ انہوں نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

”کتنے افسوس کی بات ہے امی..... تو آپ کے رقیہ آئی سے بہنوں جیسے تعلقات ہیں بے چاری تو آپ کی تعریفیں کرتے نہیں تھکتیں آپ پیٹھ پیچھے ان کے بارے میں ایسے خیالات ہیں۔“ اس نے ماں کو ملامت کی۔

”وہ تو اس کی بیوی اور تنہائی کا خیال کر رہی اس سے ہمدردی کرنی تھی لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ میرے بیٹے کو اپنی بیٹی کے لیے گھیر لے۔“ انہوں نے شرمندہ ہونے کے بجائے چمک کر جواب دیا۔

”اب آپ بہتان لگا رہی ہیں۔ رقیہ آئی نے کچھ نہیں کہا۔ ان لوگوں کو تو کچھ معلوم ہی نہیں ہے تو میں نے آپ کو اپنے دل کی بات بتادی کہ ماں بڑھ کر کون ہوگا جو اولاد کی خوشی کو سمجھ سکے۔“ بلند آواز سے ان کے الزام کی ترویج کرتے کرتے آخر میں کالجیہ خود بخود بے حد دھیمیا اور افسردہ ہو گیا۔

”تم صحیح کہہ رہے ہو کہ ماں سے بڑھ کر اولاد

خوشی کسی کو پیاری نہیں ہوتی لیکن اگر اولاد غلط سمت میں قدم بڑھائے تو ماں کا فرض ہے کہ اسے روکے اور صحیح راستے کی طرف رہنمائی کرے۔ منیبہ کتنی ہی اچھی صحیح لیکن اس کا ساتھ تمہارے لیے خوشیوں سے زیادہ مسائل لے کر آئے گا۔ اس کے میکے میں اتنے مسئلے ہیں کہ وہ کبھی تمہیں اور تمہارے گھر کو بھر پور توجہ نہیں دے پائے گی۔ آج تمہیں ان لوگوں سے ہمدردی ہو رہی ہے لیکن کل جب سکون کے لیے ترسو گے تو خود ہی پریشان ہو جاؤ گے۔ اس رشتے سے انکار کا دوسرا سبب یہ بھی ہے کہ میں تمہاری خوشی کے لیے ایلا کی آئندہ زندگی میں کوئی مسئلہ پیدا نہیں کرنا چاہتی..... اس کی منگنی والے دن غزالہ نے وہاں جو ہنگامہ کیا تھا وہ اس کے سرسالیوں نے بھی دیکھا تھا۔

اگر میں تمہارا رشتہ منیبہ سے کر دیتی ہوں تو کل کو اس کی سرسال والے اسے طعنہ دے سکتے ہیں کہ اس کی بھانجی کا تعلق کیسے گھٹیا خاندان سے ہے۔ ویسے بھی میں نے محسوس کیا ہے کہ وہ تھوڑے نازک مزاج لوگ ہیں جو اس قسم کی باتوں کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ کل کو وہ ایلا کو یہ کہہ کر میکے آنے سے روک سکتے ہیں کہ تمہاری بھانجی جس قسم کے بیک گراؤنڈ سے تعلق رکھتی ہے ہم تمہارا اس سے میل جول مناسب نہیں سمجھتے پھر سوچو کہ ہم کیا کریں گے؟ کیا تم اپنی خواہش کی خاطر اپنی اکلوتی بہن کی خوشیوں کو برباد کر سکتے ہو؟“ وہ ایسے ایسے نکات نکال کر اسے سمجھا رہی تھیں کہ جن کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

”آپ بہت عجیب باتیں کر رہی ہیں امی.....! میں تو آپ کی باتوں سے صرف اتنا سمجھ سکا ہوں کہ آپ کو منیبہ میں کوئی برائی نظر نہیں آرہی لیکن آپ دنیا والوں کے ڈر سے اس رشتے سے انکار کر رہی ہیں۔“

”تم یہی سمجھ لو بیٹا..... دنیا میں رہنا ہے تو دنیا والوں کا خیال بھی کرنا پڑے گا۔ تم بس مجھ پر اتنا غم نہ کرنا کہ میں تمہاری ماں ہوں اور میرا ہر فیصلہ

فیصلے کی صلیب

تمہاری بھلائی کے لیے ہی ہے۔“ انہوں نے گویا بحث کی گنجائش ہی ختم کر دی اور اتنا تو عادل بھی جانتا تھا کہ اگر اس کی ماں ایک بار کی بحث کے بعد قائل نہیں ہو سکی تھیں تو اس کا مطلب تھا کہ ان سے کتنی ہی بار اس موضوع پر گفتگو کی جائے نتیجہ یہی نکلے گا اس لیے اب خاموشی ہی مناسب تھی۔

☆☆☆

”رقیہ آئی نے منیبہ کا رشتہ طے کر دیا ہے۔ انہوں نے مجھے تصویر دکھائی تھی، مجھے تو وہ آدمی منیبہ کے حساب سے بالکل اچھا نہیں لگا۔ چالیس سال سے تو زیادہ ہی عمر ہوگی اس کی۔“ عابدہ بیگم سے اس کی گفتگو کے کوئی ڈیڑھ ماہ بعد اس کے کانوں نے منیبہ سے متعلق کوئی خبر سنی تھی اور وہ بھی ایسی کہ دل افسردہ ہو گیا۔ اس ڈیڑھ ماہ میں اس نے منیبہ سمیت اس کی کسی بہن کی جھلک تک نہیں دیکھی تھی۔ جس کا مطلب تھا کہ رقیہ آئی اب بوی تختی سے اپنے فیصلے پر قائم تھیں اور حقیقتاً انہوں نے اپنی تینوں بیٹیوں کو گھر کی چار دیواری میں محدود کر دیا تھا اور اب ایلا جو خبر سنار ہی تھی اس کے بعد یہ بھی تصدیق ہو گئی تھی کہ وہ اپنے کہے کے مطابق بیٹیوں کو کسی بھی طرح ٹھکانے لگانے کے ارادے پر نہ صرف قائم تھیں بلکہ عملی طور پر بھی ایسا ہی کر رہی تھیں۔

”کوئی اتنی زیادہ عمر نہیں ہے۔ میں نے بھی لڑکے کی تصویر دیکھی ہے۔ اچھا بھلا ہے پھر یہ کیا کم ہے کہ رقیہ کے رشتے داروں میں ہی سے ہے اور بغیر کسی قسم کے جہیز کے تین کپڑوں میں نکاح پڑھوا کر لڑکی لے جانے کو تیار ہے۔ رقیہ تو بہت مطمئن تھی کہ اس کا اتنا بڑا مسئلہ اتنی آسانی سے حل ہو گیا۔ ہو سکتا ہے ایک آدھ مہینے میں وہ منیبہ کو رخصت بھی کر دے۔ تمہیں کوئی ضرورت نہیں ہے امی سیدھی باتیں کر کے منیبہ کا دل خراب کرنے کی۔“ ایلا کی دی گئی اطلاع پر عابدہ بیگم نے فوراً ہی اپنا رد عمل ظاہر کیا کہ مبادا کہیں

منیبہ کے ساتھ زیادتی کا سن کر عادل کی رگ ہمدردی ایک بار پھر پھڑک جائے۔ ویسے بھی اس کے خاموشی اختیار کر لینے کے باوجود وہ اس کی طرف سے تشویش کا بی شکار نہیں۔ اس عرصے میں اس نے اپنی مصروفیت بہت بڑھائی تھی اور صبح کا نکلا رات گئے ہی واپس آتا تھا۔ انہوں نے سب کچھ سمجھتے ہوئے اسے زیادہ جھپٹنا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ تو اتنی محتاط تھیں کہ اپنے اور عادل کے درمیان ہونے والی گفتگو کی غلیل صاحب اور انیلا تک کو ہوا نہ لگنے دی کہ کہیں گھر میں اس کا کوئی اور طرف دار پیدا نہ ہو جائے بلکہ انہوں نے اس بات پر شکر بھی کیا تھا جس روز عادل سے ان کی وہ گفتگو ہوئی غلیل صاحب اور انیلا گھر پر موجود نہیں تھے۔

”میرے خیال میں امی آپ نے چشمہ لگائے بغیر ہی وہ تصویر دیکھی ہوگی جیسی اتنے بڑے آدمی کے لیے لڑکے کا لفظ استعمال کر رہی ہیں لیکن منیبہ کی نظریں بالکل ٹھیک ہیں اور میرے کچھ کہے بغیر بھی وہ جانتی ہے کہ آئی اس کی شادی کسی ”بابے“ سے کر رہی ہیں۔“ انیلا کو کون باز رکھ سکتا تھا۔ جودل میں تھا اس نے کہہ ڈالا۔

”تمہیں ضرورت نہیں ہے اس معاملے میں دخل دینے کی۔ رقیہ، منیبہ کی ماں ہے۔ اس نے کچھ سوچ سمجھ کر یہ رشتہ طے کیا ہوگا۔ منیبہ ماں کی فرمانبرداری ہے بھی کوئی اعتراض نہیں کرنے کی لیکن تم.....“ انہوں نے دانت کچکچاتے ہوئے اسے گھورا۔ ”تم کبھی میری بات مت ماننا، میں نے تمہیں منع کیا تھا کہ تمہیں وہاں جانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ تمہاری اپنی شادی قریب ہے۔ تیرے میرے گھر جھانکنے کے بجائے اپنی تیاری کی طرف توجہ دو۔ ویسے بھی معلوم نہیں کہ تمہاری سسرال والے کن لوگوں سے تمہارا ملنا پسند کریں اور کن سے نہیں۔ تمہیں خود ہی پہلے سے محتاط ہو جانا چاہیے۔“ انہوں نے انیلا کو جھڑک کر رکھ دیا تو وہ منہ بسورتے ہوئے خاموشی سے کھانا کھانے لگی لیکن عادل کے لیے یہ سننے کے بعد

حلق سے نوالہ نیچے اتارنا ممکن نہیں رہا تھا چنانچہ وہ چپکے سے اٹھ گیا۔ منیبہ سے کسی قسم کا عہد و پیمان نہ کرنے کے باوجود اس وقت وہ خود کو اس کا مجرم سمجھ رہا تھا۔ اسے احساس تھا کہ وہ پیاری لڑکی ایسے جیون ساٹھی کی حق دار نہیں تھی جس کا انتخاب غلط میں، مصلحتوں کے تحت کیا گیا تھا لیکن وہ سوائے اس کے لیے دیکھی ہوئے کے کبھی کیا سکتا تھا۔ اس کی تربیت ہی اس طرح سے کی گئی تھی کہ وہ ایک حد سے آگے جا کر کسی بھی شے کے لیے ضد کرنے کا عادی نہیں تھا اور یہاں تو یہ حقیقت بھی اس کے سامنے تھی کہ اگر اس نے ضد کر کے کسی طرح منیبہ سے شادی کی خواہش منوا لی تو منیبہ کو اس گھر میں کوئی خوشی نہیں مل سکے گی۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی بے شمار خوبیاں رکھنے والی ماں میں یہ بہت بڑی برائی موجود تھی کہ وہ اپنی مرضی کے خلاف ہونے والی کسی بات کو کبھی قبول نہیں کر پاتی تھیں۔ منیبہ ان کی مرضی کے خلاف بہو بن کر اس گھر میں آجاتی تو وہ اس کا ناطقہ بند کر دیتیں اس لیے بہتر یہی تھا کہ وہ اپنی خواہش سے ہی دستبردار ہو جاتا لیکن دل کے ملال کا کیا کرتا، دل کو اداس ہونے سے روکنا اس کے بس میں نہیں تھا..... ہاں اگر منیبہ کی شادی کسی بہت اچھی جگہ ہو رہی ہوتی تو دوسری بات تھی وہ اتنا دکھ محسوس نہ کرتا۔ اب تو وہ ہری تکلیف تھی ایک طرف منیبہ کو نہ پاسکے کا غم تھا تو دوسری طرف اس کی بربادی کا رنج..... دل ہی دل میں یہ درد سہناؤ کچھ اور اپنے خول میں سمٹ گیا۔ عابدہ بیگم اس کی کیفیت کو خوب سمجھ رہی تھیں اس لیے ضرورت سے زیادہ مستعدی دکھائی اور انیلا کے سسرالی عزیزوں میں سے کسی کی لڑکی پسند کر کے منیبہ کے نکاح سے ایک ہفتہ قبل اس کی گفتگو کر ڈالی اور ساتھ ہی ضرورت سے زیادہ روشن خیالی کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہ انتظام بھی کر ڈالا کہ عادل کی اپنی مگیت سے گفت و شنید اور ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ ان کے خیال میں اس طرح عادل کو منیبہ کا غم بھول کر جلد بھلنے میں مدد ملتی۔ تین چار ماہ بعد ویسے بھی

شادی ہوئی ہی تھی اس لیے اتنی آزادی دینے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ ان کی یہ تدبیر خاصی کارگر رہی۔ عادل واقعی بھلنے لگا اور اس نے خود پر جو قنوطیت کی طاری کر لی تھی وہ بھی دور ہوتی محسوس ہونے لگی۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ منیبہ اپنے شوہر کے گھر رخصت ہو چکی تھی اور اب ایسی کوئی آس نہیں رہی تھی کہ وہ اسے پاس کے گاؤں لے کر وہ حالات کے ساتھ خود کو ایڈجسٹ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ عابدہ بیگم خاموشی سے ان تبدیلیوں کو دیکھتی کافی مطمئن ہو چکی تھیں اور پوری تدبیر سے بیٹھے اور بیٹی کی شادی کی تیاریاں کرنے میں مصروف تھیں لیکن انہیں کیا معلوم تھا کہ ایک بہت بڑا حادثہ ان کا منتظر ہے جس کے بعد ان کا سارا اطمینان رخصت ہو جائے گا۔

☆☆☆

وہ ایک معمول کا دن تھا۔ غلیل صاحب اپنی دکان اور عادل آفس میں تھا۔ انیلا گھر کی صفائی سسرالی میں مصروف تھی جبکہ عابدہ بیگم جلدی جلدی رات کا کھانا تیار کرنے کی کوشش میں تھیں۔ انہیں کپڑوں اور زیورات کی خریداری کے سلسلے میں بازار جانا تھا اس لیے چاہتی تھیں کہ گھر کا کام جلد از جلد منٹ جائے تاکہ بعد میں وہ بے فکری سے خریداری کر سکیں۔ انیلا کو اپنے رنگ روپ کی بہت فکر رہتی تھی اس لیے وہ لوگ دوپہر کے بجائے شام کے وقت خریداری کے لیے نکلتے تھے اور واپس گھر آتے آتے رات ہو جاتی تھی اس لیے ضروری تھا کہ جانے سے پہلے رات کا کھانا تیار کر کے جائیں کیونکہ واپس آنے کے بعد تو اتنی محنت ہو جاتی تھی کہ کچھ کرنے کی ہمت ہی نہیں رہتی۔ دوسرے کھانا تیار ہونے کا ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ اگر انہیں زیادہ دیر ہو جاتی تو غلیل صاحب اور عادل ان کے انتظار کی زحمت کیے بغیر خود ہی کھانا کھا لیتے تھے۔

”انیلا تمہیں آواز نہیں آرہی کب سے فون کی گھنٹی بجے جا رہی ہے۔“ کانوں پر ہیڈ فون چڑھائے اپنے کام میں مگن انیلا کے سر پر آکر عابدہ بیگم چلائیں..... جو

فون کی آواز سن کر آٹا گوندھتے گوندھتے بچن سے آئی تھیں تو اسے ہوش آیا۔ اسے گھر کو صاف سٹرا رکھنے کا خط تھا اور اس پکر میں وقت بے وقت ہیڈ فون لگا کر گانے سنتے ہوئے صفائی میں مصروف رہتی تھی۔ عابدہ بیگم نے غنکی کا اٹھارہ گیارہ ہیڈ فون ایک طرف ڈال کر فون کی طرف لپکی۔ ریسپور اٹھانے پر دوسری طرف سے جانے کیا خبر سنائی گئی کہ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔

”کیا ہوا..... کس کا فون ہے؟“ اس کے تاثرات دیکھ کر عابدہ بیگم کا ماتھا ٹھنکا۔

”امی..... چھوٹے ماموں کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔“ اس نے لرزتی آواز میں ماں کو خبر سنائی۔

”یا اللہ خیر..... کہاں جو بیٹن آئی ہیں۔ وہ ہے کس اسپتال میں؟ اپنے ابو کو فون کرو ہم ابھی اسے دیکھنے چلتے ہیں۔“ وہ انیلا سے کہہ کر جیسے تیسے ہاتھ دھو کر دوبارہ فون کے پاس آئیں۔ انہیں اپنا چھوٹا بھائی دل و جان سے عزیز تھا اور وہ اس کے ایکسیڈنٹ کی خبر

خبر

طلسمانی انگوٹھی ایک عظیم تحفہ ہے۔ ہم نے سورہ یاسین کے نقش پر فیروزہ بینی، عقیق، بکھراج، لاجورد، نیل، زمرد، یاقوت پتھروں سے تیار کی ہے۔ انشاء اللہ جو بھی یہ طلسمانی انگوٹھی پہنے گا اس کے تمام بکڑے کام بن جائیں گے۔ مالی حالات خوب سے خوب تر اور ترسے سے نجات مل جائے گی۔ پسندیدہ رشتے میں کامیابی، میاں بیوی میں محبت، ہر قسم کی بندش ختم، رات کو نیکے کے نیچے رکھنے سے لاشری کا نگر، جادو کس نے کیا، کاروبار میں فائدہ ہوگا یا نقصان معلوم ہو جائے گا۔ آخیری طرف مائل، تاخر مان اولاد نیک، میاں کی عدم توجہ، حج یا حاکم کے غلط فیصلے سے بچاؤ، مکان، فلیٹ یا دکان کی قابض سے چھڑانا، معدے میں زخم، دل کے امراض، شوگر، برقان، جسم میں درد و غم کی اندرونی بیماری، مردانہ کمزوری، ناراض کوراضی کرنے سے سب کچھ اس انگوٹھی کی بدولت ہوگا۔ یاد رکھو سورہ یاسین قرآن پاک کا دل ہے۔

واپس، صوفی علی ہودا

0333-3092826, 021-32446647

IM-20A الرحمان ٹریڈ سینٹر بالقابل سندھ مدرسہ کراچی

سن کر بھی کوئی انتہائی بات سوچنے کی ہمت نہیں کر سکی تھیں اس لیے دل کی منتشر ہوئی دھڑکنوں کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے انیلا کو ہدایات دیئے لگیں۔

”ماموں اسپتال میں نہیں ہیں امی، وہ چلے گئے..... ہمیں چھوڑ کر چلے گئے۔“ وہ دہائیں مار کر روتے ہوئے ان سے لپٹ گئی پھر تو جیسے ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے ان کی دل دوز چیں اور رونے کی آوازیں سن کر پاس پڑوس والے دوڑے آئے۔ صورت حال جانے پر سب نے اپنے طور پر انہیں دلاسا دینے کی کوشش کی لیکن دکھ ایسا تھا کہ انہیں اپنے ہوش و حواس قائم رکھنا مشکل لگ رہا تھا۔ محلے والوں میں سے ہی کسی نے خلیل صاحب کو ان کی دکان سے بلوایا اور وہ لوگ عجلت میں گھر سے روانہ ہو گئے۔ جوان بھائی جس کی شادی کو ابھی چھ سات سال ہی گزرے تھے جو دو چھوٹے چھوٹے بچوں کا باپ تھا سفید کفن میں لپٹا چارپائی پر لیٹا تھا۔ ایسی جوان موت پر غیروں کی آنکھیں بھی اشک بار تھیں۔ وہ کیسے گودوں بھلائے ماں جائے کو اس حال میں دیکھ کر اپنی سُدھ بُدھ نہ کھوتیں۔ کس کس نے غم بانٹا، کس نے تسلی دی، کب جنازہ اٹھا انہیں تو کچھ ہوش ہی نہیں رہا۔ انیلا بھی پیارے ماموں کی ناگہانی موت پر غم سے نڈھال تھی اس پر سے ماں کی حالت نے اسے بوکھلا دیا تھا۔ وہ دوسرے عزیزوں کے ساتھ حواس باختہ سی انہیں سنبھالنے کی سعی کر رہی تھی۔ عادل جسے دفتر میں ہی فون پر اس حادثے کی اطلاع دے دی گئی تھی۔ وہیں چلا آیا تھا ماں کو تسلی بخشی دیتا رہا۔ بعد نماز عشا ماموں کی نماز جنازہ پڑھائی گئی اور پھر انہیں ان کی آخری آرام گاہ تک پہنچا دیا گیا۔ ابھی تدفین کا مرحلہ طے ہی ہوا تھا کہ عادل کے موبائل فون پر اس کے ایک پڑوسی لڑکے کی کال آگئی۔

”عادل بھائی! آپ جلدی سے یہاں پہنچیں، آپ کے فلیٹ میں پتا نہیں کیا مسئلہ ہے، ایسا لگ رہا

ہے کہ آگ لگ گئی ہے۔ بری طرح جلنے کی بو آرہی ہے اور دھواں باہر آرہا ہے۔ شاید آگنی لوگ جلدی میں یہاں سے جاتے ہوئے چوہا بند کرنا بھول گئی تھیں۔“ لڑکے نے اطلاع دی تو عادل عجلت میں گھر کے لیے روانہ ہو گیا۔ اسے پڑوسی لڑکے کا اندازہ درست لگ رہا تھا کہ جس وقت ماموں کے انتقال کی خبر آئی ہوگی چوہے پر کچھ پک رہا ہوگا۔ خبر سننے کے بعد گھبراہٹ اور پریشانی میں کسی کو یہ یاد نہیں رہا ہوگا کہ چوہا جل رہا ہے اور اس جلتے چوہے نے اپنا کام دکھانا شروع کر دیا تھا۔ اس سے پہلے کہ بہت زیادہ نقصان ہو جاتا وہ جلد سے جلد گھر پہنچ جانے کی کوشش میں تھا اور عادت کے برخلاف بہت تیز رفتاری سے بائیک دوڑا رہا تھا۔ ماموں کے کفن دفن کی مصروفیت میں اسے یہ بھی نہیں معلوم ہو سکا تھا کہ گھر جانے کے لیے اسے جس راستے سے گزرنا ہے وہاں دہشت گردی کی فائرنگ کی وجہ سے حالات کشیدہ ہیں۔ پبلک ٹرانسپورٹ غائب دیکھ کر بھی اسے دھیان نہیں آیا۔ اصل میں وہ خود بھی اپنے چھوٹے ماموں سے بہت زیادہ اٹیچڈ تھا۔ عمروں میں بہت زیادہ تقاوت نہ ہونے کی وجہ سے ان کی آپس میں خاصی دوستی تھی اس لیے ان کی اچانک موت نے اسے بھی گہرے صدمے سے دوچار کیا تھا اور دیکھا جائے تو اس کے اپنے حواس بھی پوری طرح کام نہیں کر رہے تھے اس لیے وہ راستے میں کہیں کھڑے پولیس والوں کا تاراج سے کیا گیا اشارہ بھی نہیں دیکھ سکا اور بائیک کو اسی رفتار سے دوڑاتا رہا لیکن اس کے نصیب میں مزید آگے جانے کے بجائے دوسری دنیا میں جانا لکھا تھا۔ اس نے بائیک نہیں روکی تو پولیس والوں نے اسے دہشت گرد جان کر فائر کھول دیا۔ کئی گولیاں اس کی پشت پر لگیں اور وہ پوری رفتار سے دوڑتی بائیک سے گرا تو پھر دوبارہ نہ اٹھ سکا۔

☆☆☆

عادل کی موت اس کی ذرا سی غلطی اور پولیس

کہ اس کا بھائی نشے کے باعث مر گیا تھا اور بہن پڑوسی سے معاشقہ کرتے ہوئے پکڑی گئی تھی۔ اگر وہ منیبہ کو کوئی قصور نہ ہوتے ہوئے رد کر سکتی تھیں تو مسز راشدی ایٹلا کو ٹھکرانے میں حق بجانب کیوں نہیں تھیں۔

”پلیز راشدی صاحب! آپ ہی اپنی بیگم کو سمجھائیں، میرا بیٹا بے قصور تھا اور اگر فرض کیا کہ اس کی کوئی غلطی تھی بھی تو اس کے جرم کی سزا میری بے گناہ معصوم بیٹی کو تو نہیں ملنی چاہیے۔“ خلیل صاحب اب راشدی صاحب کے سامنے بڑ بڑا رہے تھے۔ اب تک خاموش بیٹھی عابدہ بیگم کو ان کی آواز کہیں بہت دور یا تال سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔

”مجھے افسوس ہے خلیل صاحب..... لیکن ہم لوگوں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے اور گھر میں باہم سب سے مشورہ کر کے ہی یہاں آئے ہیں۔ اللہ کرے کہ آپ کی بیٹی کو کوئی دوسرا بہت اچھا رشتہ مل جائے ہماری طرف سے البتہ صاف انکار ہے۔“ وہ دونوں میاں، بیوی فیصلے کی تلوار چلا کر چلے گئے۔ خلیل صاحب اس ظلم پر یوں پھوٹ پھوٹ کر روئے کہ شاید جوان بیٹے کی موت پر بھی ایسا نہیں روئے ہوں لیکن عابدہ بیگم کی آنکھوں سے ایک آنسو بھی نہیں پڑا۔ وہ رونے کے لائق تھیں ہی نہیں۔ ان کے ذہن میں تو منیبہ اور ایٹلا کے چہرے گڈمڈ ہو رہے تھے۔ انہیں یاد آرہا تھا کہ کیسے منیبہ لاش کی طرح لٹھے جیسا سفید چہرہ لیے اس ادھیڑ عمر آدمی کے ساتھ ماں کے گھر سے رخصت ہوئی تھی شاید ایسا ہی ایٹلا کے ساتھ ہونے والا تھا لیکن وہ کہاں جا کر دہائی دیتیں کہ یہ متصفانہ فیصلہ تو یقیناً اوپر کہیں آسمانوں میں ہوا تھا۔ قدرت انسان سے بھی اس طرح بھی تو انتقام لیتی ہے کہ اس کے لیے گئے گناہ کی سزا اس کی اولاد کو دے کر اسے ساری زندگی کے لیے عذاب میں مبتلا کر دیا جاتا ہے۔ عابدہ بیگم بھی اس عذاب میں مبتلا کر دی گئی تھیں۔

کی بیٹی سے یہ رشتہ قائم رکھنے میں انٹرسٹڈ نہیں ہیں۔ ہم یہ بات آپ کو پہلے ہی بتا دیتے لیکن یہ سوچ کر چپ رہے کہ آپ لوگ اتنے بڑے صدمے سے گزر رہے ہیں۔ ذرا سنبھل جائیں تو آپ کو بتایا جائے۔“ چائے اور دیگر لوازمات کے لیے ان کے بے پناہ اصرار کو نظر انداز کرتے ہوئے لڑکی کی والدہ مسز راشدی نے یہ بات کہی۔... تو عابدہ بیگم اور خلیل صاحب کی ساعتوں پر ہم آگرا۔

”لیکن کیوں بہن جی! ہم سے ایسی کیا غلطی ہو گئی؟“ آخر کار خلیل صاحب نے ہی ہمت کر کے ان سے پوچھا۔

”بات کسی کی غلطی کی نہیں بلکہ حالات کی ہے۔ جن حالات میں آپ کے بیٹے کی موت ہوئی ہے..... ہمارے لیے ممکن نہیں رہا ہے کہ آپ کی بیٹی کو بیاہ کر اپنے گھر لے جائیں۔ ہم عزت دار لوگ ہیں اور ایسی لڑکی کو بھونپیں بنا سکتے جس کے بھائی پر دہشت گردی کا الزام ہو۔“ انہوں نے گلا کھٹکھاتے ہوئے نہایت صاف گوئی سے وجہ بتائی۔

”لیکن آپ لوگ جانتے ہیں کہ وہ الزام غلط تھا۔ میرے بیٹے پر ظلم ہوا تھا اور وہ صرف غلط فہمی کی وجہ سے مارا گیا۔“ خلیل صاحب نے تڑپ کر صفائی پیش کی۔

”یہ تو آپ کہہ رہے ہیں ناں، شاید آپ کی بات صحیح بھی ہو لیکن ساری دنیا یہی جانتی ہے کہ وہ ایک دہشت گرد تھا اور ظاہر ہے ہمیں دنیا والوں کے ساتھ ہی رہنا ہے، اس لیے ان کا خیال تو کرنا ہی پڑے گا ورنہ آگے ہمیں اپنی بیٹیاں بیاتے ہوئے مشکل کا سامنا کرنا پڑے گا۔“ مسز راشدی کے جملے عابدہ بیگم کے دماغ پر ہتھوڑے سے لگتی ضربوں کی طرح لگے۔ یہی کچھ تو انہوں نے بھی اس وقت کہا تھا جب عادل نے ان سے منیبہ کے لیے خواہش ظاہر کی تھی۔ انہوں نے بھی تو منیبہ جیسی اچھی لڑکی کو صرف اس لیے ٹھکرادیا تھا

واقفے کے بعد خود کو گھر تک محدود کر لینے والی رقیہ نے بھی اس موقع پر ان کا بھرپور ساتھ دیا اور نہ صرف خود مزاج پرسی کے لیے آتی رہیں بلکہ عابدہ بیگم کے گھر کے کام کا جان نمٹانے کے لیے اریہ کو بھی باقاعدگی سے وہاں بھیجتی رہیں۔ ان حالات میں ایٹلا کے سرالیوں کا رویہ البتہ بہت عجیب تھا۔ وہ لوگ صرف عادل کی میت میں شرکت کے لیے آئے تھے اس کے بعد تو نہ انہوں نے اسپتال جا کر عابدہ بیگم کی عیادت کرنا ضروری سمجھا اور نہ ہی فون پر مزاج پرسی کی..... عابدہ بیگم کو تو خیر اتنا ہوش ہی نہیں تھا کہ البتہ خلیل صاحب کو ہی خیال آیا کہ بیٹی کے متوقع سرالیوں کے اس رویے کی جانچ پڑتال کی جائے۔ ان کے احساس دلانے پر عابدہ بیگم کے اسپتال سے گھر واپس آنے کے چندرہ دن بعد ان لوگوں کو کھانے پر گھر آنے کی دعوت دی گئی۔ انہوں نے کھانے کی دعوت قبول کرنے سے انکار کر دیا لیکن عندیہ دیا کہ شام کے وقت ایٹلا کی ساس اور سر ملاقات کے لیے آئیں گے۔ ایٹلا نے ماں کے کہنے پر اریہ کے ساتھ مل کر چائے کے ساتھ کئی لوازمات تیار کر لیے۔ بھائی کی موت نے اس کے مزاج کی ساری شوخی چھین لی تھی اور پہلے کی طرح وہ گھر کے معاملات میں شوق سے دلچسپی نہیں لیتی تھی۔ خلیل صاحب کا خیال تھا کہ اس کی سرال والوں سے بات کر کے اسے مقررہ وقت پر رخصت کر دیں تاکہ کم از کم وہ تو اس جمود سے نکلے۔ وہ اپنے گھر میں ہنسی خوشی رہتی تو شاید ان میاں بیوی کو بھی کچھ سکون ملتا ورنہ عادل کے بعد تو ان کے اندر سے زندہ رہنے کی خواہش ہی مر گئی تھی لیکن ایٹلا کے ساس سر آئے تو ان کی ساری امیدوں پر پانی پھر گیا۔ ان میاں، بیوی کی خوش دلی کے مقابلے میں وہ دونوں بہت سردمہری سے ملے اور ایٹلا کی بہت اہتمام سے سرو کی گئی چائے کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔

”معاف کیجیے گا بھائی صاحب! اب ہم آپ والوں کی غفلت کی وجہ سے ہوئی تھی۔ وہ چاہتے تو اس پر ڈائریکٹ فائر کھولنے کے بجائے اس کا تعاقب کر کے اسے زندہ گرفتار کرنے کی کوشش بھی کر سکتے تھے یا فائر کرنا ہی تھا تو اس کی بانیک کے پسینے کو نشانہ بناتے لیکن انہوں نے جو کرنا تھا کر گزرے اور کمال تو یہ تھا کہ بعد میں حقائق سامنے آنے پر بھی انہوں نے اپنی غلطی تسلیم نہیں کی اور عادل کے پاس سے جانے کہاں سے اسلحہ اور دھماکا خیز مواد برآمد کر کے اسے دہشت گرد ثابت کر دیا یہاں تک کہ اس کا بدنام زمانہ دہشت گرد تنظیم سے تعلق بھی جوڑ ڈالا..... عادل کے اہل خاندان نے میڈیا کے ذریعے اس ساری کہانی کو جھوٹ کا پلندا ثابت کرنے کی اپنی سی کوشش کی لیکن ان کی یہ کوشش نقار خانے میں طوطی کی آواز ثابت ہوئی۔ ویسے بھی حالات اتنے مخدوش تھے کہ ظلم زیادتی کے خلاف آواز اٹھانے والوں کو اپنی گردن بچانا بھی مشکل ہو جاتا تھا۔ اس لیے قریبی جاننے والوں کے علاوہ کسی کو عادل پر لگے جھوٹے الزامات کی حقیقت کا علم نہ ہو سکا۔ اس حادثے نے خلیل صاحب کے شانے جھکا ڈالے۔ ایٹلا کے ہونٹوں پر خاموشی کا قفل لگ گیا جبکہ عابدہ بیگم کا تو وہ حال ہوا کہ وہ نہ زندوں میں رہیں نہ مردوں میں..... عادل کی موت کی خبر ان کے حواس پر بجلی بن کر گر گئی اور انہیں اتنا زبردست ہارٹ اٹیک ہوا کہ وہ مہینے بھر تو اسپتال سے واپس ہی نہ آسکیں۔ واپس آئیں تو بس ایسی حالت میں کہ گویا ان کے نحیف جسم میں سانس ڈال کر انہیں سینے کی سزا دے دی گئی ہو۔

غم کے ان لمحات میں ان کے پڑوسیوں نے ہی بڑھ چڑھ کر دل جوئی کی۔ یہ پڑوسی ہی تھے جنہوں نے فون کرنے کے باوجود عادل کے آنے میں تاخیر ہوتی دیکھی تو گھر کا دروازہ توڑ کر وہاں لگی آگ بجھائی ورنہ شاید وہ بیٹے کے ساتھ ساتھ تنکا تنکا جوڑ کر بنائے گئے آشیانے سے بھی محروم ہو چکی ہوتیں۔ طیبہ والے

زندگی میں جہاں رشتے ناتے اور روابط بہت اہم ہوا کرتے ہیں... وہیں ایک دوسرے کے مثبت رویے بھی کسی خاندان کے لیے مضبوط ستون کا درجہ رکھتے ہیں... مگر ہمیں بہت سے لوگ بہت سے مواقع ایسے ضرور ملتے ہیں... جب

زندگی

ناہید سلطان اختر

نوک شمشیر پہ یوں ہم نے گزارے لمحے
کالج کی آنکھوں سے خوابوں کا گزر ہو چیسے

12

سائے... ازل سے محبت کرنے والوں کے دشمن رہے ہیں اور زندگی بھی یہی ہے کہ کبھی کبھی تیرپکی دگی بھی حکم کے آگے کوکاٹ دیا کرتی ہے...

ہماری مایہ ناز مصنفہ ناہید سلطانہ اختر کے قلم سے ایک شاہکار ناول

جس کی سطر سطر میں زندگی سفر کرتی نظر آئے گی



دولت خان آفریدی تھے اور مہتاب شنواری..... دولت خان کی پہلی منکوحہ بی بی جان تھیں۔ بی بی جان کی پہلی شادی دولت خان کے بڑے بھائی رحمت خان آفریدی سے ہوئی۔ دولت خان کو اس نئے رشتے سے ایسی شرم آئی کہ وہ بغیر بتائے کراچی آگئے اور آٹھ نو سال ایک پلیرنگ کے استاد کے پاس رہے۔ پھر ایک ریکورڈنگ انجنی کے توسط سے کویت جانے کا موقع مل گیا۔ حجاب نے ایم اے بی ایڈ کیا اور وہ ایک محکمہ تعلیم میں سولہ گریڈ کی آفسر بھی پھر پبلک سروس کمیشن کے توسط سے خود کو ہیڈ ماسٹریس کی اسامی کا اہل ثابت کیا۔ ایک ثانوی تعلیمی ادارے میں حجاب کا تقرر کیا گیا۔ رباب انجینئر بننے جارہی تھی۔ تقدیم، تنسیم کے موبائل پر مدثر کے میج پڑھ لیتی ہے اور سب کچھ ابا کو بتا دیتی ہے، تنسیم کو نیورسٹی کے بہانے مدثر کے ساتھ جا کر کورٹ میرج کر لیتی ہے۔ تقدیم ابا کو بتاتی ہے کہ تنسیم نے کورٹ میرج کر لی ہے۔ مدثر کو نیورسٹی جانے سے پہلے تنسیم سے مل کر جاتا ہے تو نیورسٹی میں تقدیم کو اپنا منظر پانا ہے۔ حجاب کے نکاح کی تقریب گھر کے بجائے الطاف کے کہنے پر فائبر اسٹار ہوٹل میں ہوئی ہے۔ تقدیم کے گھر میں مدثر کی کال کا انتظار ہوتا ہے۔ مدثر، تنسیم کو بھیجنے کی حالی بھر لیتا ہے اور بھراپنی والدہ کو اپنی کورٹ میرج کے بارے میں بتاتا ہے۔ زینون نے تقدیم کے لیے عباد کا رشتہ بتایا تو امں رضا مند ہو گئیں کہ وہ لوگ لڑکی کو دیکھنے آ جائیں۔ تنسیم گھر واپس آ کر اپنے کمرے میں رہ رہی ہے لیکن کوئی اس سے بات چیت نہیں کرتا بس اس کو کھانا دے دیتے ہیں، رات میں اسے پیاس لگتی ہے تو وہ دروازہ کھولنا چاہتی ہے لیکن دروازہ باہر سے بند تھا۔ حجاب کا فون بند ہونے پر الطاف امی کے فون پر کال کرتا ہے لیکن حجاب بات نہیں کرتی۔ تنسیم مدثر سے ہتی ہے کہ وہ اپنی امی کو بھیجے۔ حجاب کی امی الطاف کی بہن سے بات کرتی ہیں تو وہ سب لوگ ان کے گھر آ جاتے ہیں اور بسہ کو مور اور امں ٹھہراتے ہیں۔ اکیڈمی میں پانسلک آؤٹ کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ موس کو آؤٹ پاس نہیں ملتا تو صبور احمد پوری فلی کے ساتھ کال کول آگئے۔ زینون ان کو عباد کے لیے جو لڑکی دکھاتی ہے وہ انہیں بہت پسند آتی ہے لیکن عباد کو ان کی غربت پر اعتراض ہوتا ہے۔ امی اسے منع کرنے سے انکار کرتی ہیں تو عباد جینز کی سٹ لکھ کر بھیج دیتا ہے۔ ابا پریشان ہوتے ہیں کہ مدثر نے ابھی تک کوئی پیش رفت کیوں نہیں کی۔ مدثر پریشان تھا کہ ڈیڈی نے وہاں جانے سے منع کر دیا تھا۔ تنسیم، مدثر سے بات کرتی ہے تو مدثر کا رویہ اکھڑا اکھڑا سا ہوتا ہے۔ الطاف، حجاب کے اسکول پہنچ جاتا ہے اور اسے ڈراتا ہے کہ اسٹاف کے لوگوں کو بلا کر وہ سب کو بتا دے گا۔ تقدیم اور ابا موس کی پانسلک آؤٹ کی تقریب میں جاتے ہیں تو صبور احمد اور ان کی فلی کی کابینہ اچھی طرح خیال رکھتے ہیں اور واپسی پر ان کو تحائف کے ساتھ رخصت کرتے ہیں۔ تقدیم سمجھ جاتی ہے کہ وہ لڑکی عازہ ہے جس کی وجہ سے موس نے انکار کر دیا ہے۔ وہ موس سے بات کرتی ہے تو موس کو یہ ڈھارس ہو جاتی ہے کہ اس معاملے کو اب تقدیم سنبھال لے گی۔ تقدیم اماں کو بتا دیتی ہے کہ موس، عازہ میں انٹرسٹڈ ہے اس لیے وہ خوش بخت کا خیال دل سے نکال دیں۔ عباد اچھی جگہ شادی کرنے کے لیے شادی دفتر میں اپنا اندراج کرتا ہے لیکن وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو پاتا۔ مدثر، تنسیم کو طلاق سمجھواتا ہے بذریعہ جبری تو موس کو تمام باتوں کا علم ہوتا ہے، تنسیم، مدثر کو فون کرتی ہے تو وہ فون ریسو نہیں کرتا اور میج کے ذریعے بتاتا ہے کہ ڈیڈی راضی نہیں ہوئے اس لیے طلاق دینی پڑی۔ موس، مدثر کا ایڈریس پوچھتا ہے تاکہ اس سے طلاق کی وجہ پوچھ سکے لیکن تنسیم اس کی رہائش سے لاعلمی کا اظہار کر دیتی ہے۔ الطاف امی کو دھمکی دیتا ہے اب وہ کورٹ میں مقدمہ دائر کر دے گا۔ حجاب کو امی کی سپورٹ ملتی تو اس نے مطلع کا مقدمہ دائر کر دیا۔ عازہ اور اس کے گھر والے خوش تھے کہ انہیں کسی مخالفت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ تنسیم کے پریکٹس ہونے پر ابا نے مدثر کے والد سے بات کی کہ ایک دن کے لیے اسے رخصت کر کے اپنے گھر لے جائیں۔ بہت مشکل سے وہ اس بات کے لیے راضی ہو جاتے ہیں۔ عباد کو ابھی تک وہ گورہنایاب نہیں ملا تھا جس کی اسے تلاش تھی۔ الطاف نے وکیل کو فون کیا اور اس بات پر آمادہ کرنا چاہا کہ وہ یہ کیس منڈرے اور حجاب کو کیس واپس لینے پر آمادہ کر لے تو الطاف اسے منہ مانگا معاوضہ دے گا۔ تقدیم اپنے ان جی او کے وکیل اور ایس انصاری کو تنسیم کا کیس بتاتی ہے تو وہ کہتا ہے کہ شرع کے مطابق تنسیم عدت اپنے سسرال میں گزارے گی اس لیے وہ مدثر کے والدین سے بات کرتا ہے اور تنسیم کو ان کے گھر رہنے اور اس کا خرچ اٹھانے پر مجبور کرتا ہے۔ حجاب کے کیس کی پیشی ہوتی ہے۔ اور اگلی پیشی کی تاریخ دو ماہ بعد کی ہے۔ تنسیم کے مدثر کے گھر آنے پر مدثر باہل میں شفت ہو جاتا ہے۔ تنسیم سمجھتی ہے کہ شاید وہ اس سے کچھ بات کرے گا لیکن جب وہ اس سے نہیں ملتا اور اسے پتا چلتا ہے کہ وہ باہر جا رہا ہے تو تنسیم جذباتی ہو کر ایک غلط قدم اٹھا لیتی ہے۔

بات کھل گئی تھی..... اسے کھولنا پڑی تھی..... جب موت سامنے کھڑی دکھائی دے تو اچھے اچھوں کے حوصلے پست ہو جاتے ہیں۔ زندگی کی چاہ زبان پر پڑے سارے قفل کھول دیتی ہے۔ تنسیم کو بھی اپنا کیا اپنی معالج کے سامنے کھولنا پڑا..... جسے خدار کھے اسے کون چکھے..... بروقت علاج معالجہ بھی خدا کی مشیت ہی سے میسر آیا، نئی زندگی اسقاط سے محفوظ رہی تھی۔

”تم نے ایسی حماقت کیوں کی بی بی؟“ اس کی حالت بہتر ہونے کے بعد اس کی معالج نے پوچھا۔
اس کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔
”بولو.....؟“

وہ چپ رہی۔

”میری معلومات کے مطابق تمہاری یہ پہلی پریلنسی ہے..... تم نے اسے ضائع کرنے کی کوشش کیوں کی.....“ اس کے ہونٹ کپکپائے..... اپنے دونوں ہاتھ چہرے پر اوندھا کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔
”ایزی..... ایزی.....“ ڈاکٹر نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی اور اپنے ہمراہ موجود نرس کو آنکھ کے اشارے سے کمرے سے باہر جانے کی ہدایت کی۔

”کیا مسئلہ ہے؟“ ڈاکٹر نے دلسوز لہجے میں پوچھا۔

”اس کا باپ مجھے طلاق دے چکا ہے.....“ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں بتایا..... ”اور اب ملک سے باہر جا رہا ہے..... میں اکیلے اس کا بوجھ کیسے اٹھاؤں گی۔“ اس کے آنسوؤں، آواز کی ہڑاہٹ اور لہجے کے سوز نے ڈاکٹر کا دل برما دیا۔

”بوجھ! تم اولاد کو بوجھ کہہ رہی ہو..... اولاد تو نعمت ہوتی ہے بی بی..... رحمت خداوندی..... جو کسی کسی کو نہیں بھی ملتی..... شکر کرو اللہ تمہیں یہ نعمت دے رہا ہے..... ہم دن بھر یہاں بیٹھے دیکھتے رہتے ہیں..... نہ جانے کتنی عورتیں، کتنے مرد..... اولاد کے لیے ترپتے پھرتے ہیں..... زیادہ نہیں صرف ایک بچہ چاہیے ہوتا ہے انہیں جوان کا اپنا ہو..... اور تم نقران نعمت کر رہی ہو۔“
”میں..... میں اکیلی..... جو ہوں۔“

”تم اکیلی نہیں ہو..... تم جیسی نہ جانے کتنی عورتیں ہوں گی اس دنیا میں..... ہمارے اپنے معاشرے میں..... ہمارے ارد گرد..... ہمارے آس پاس..... طلاق ہی تو دی ہے نا تمہارے شوہر نے تمہیں..... تمہاری زندگی تو تمہارے اپنے پاس ہے۔“

”ایسی فضول زندگی کا کیا فائدہ ڈاکٹر!“ ڈاکٹر دھیرے سے مسکرائی۔

”زندگی فضول نہیں انمول ہوتی ہے..... چیزوں کو..... حالات کو شبت انداز میں دیکھنا سیکھو۔“

”نہ کچھ سیکھنے کو جی چاہتا ہے، نہ کچھ کرنے کو۔“ اس کی آواز رقت میں ڈوبی ہوئی تھی۔

”تو پھر کیا جی چاہتا ہے؟“

”مرنے کو.....“ ڈاکٹر پھر مسکرا دی۔

”دوسر تو نہیں چھوڑی تھی تم نے..... بچہ ضائع ہوتا تو ہوتا تمہاری اپنی زندگی کو بھی خطرہ تھا مگر دیکھ لو مرنا بھی آسان نہیں.....“ ڈاکٹر نے بل بھر کو توقف کیا پھر انتہائی نرم و سنان لہجے میں بولی۔ ”طلاق واقعی بہت بڑا حادثہ ہوتا ہے، عورت کے لیے مگر حادثہ جتنا بڑا ہو، اتنی ہی جلد اور اسی قدر برداشت کی قوت بھی دیتا ہے رب اپنے

قدر نہ کرو تو پھر وہ نعمت دوبارہ نہیں ملتی.....“
تسلیم پر ڈاکٹر کی اس بات کا مطلق اثر نہ ہوا..... وہ جس کیفیت میں تھی اسے اس نعمت کے دوبارہ ملنے یا نہ ملنے سے چنداں دلچسپی نہیں تھی۔
”اللہ تمہیں جو نعمت دے رہا ہے اس کی قدر کرو..... اوکے.....“ وہ بدستور مذہب رہی۔

☆☆☆

مدر کے والدین کو تو گویا بہانہ ہاتھ آیا..... تسلیم کا اُن کے گھر میں آ پڑنا بلائے ناگہانی سے کم نہیں تھا جسے وہ قہر آبرداشت کیے ہوئے تھے۔ اب جو موقع ملا تو انہوں نے ابا سے کہا۔ ”دیکھ لیں کیا حرکت کی ہے آپ کی بیٹی نے..... شکر ہوا کہ قبول گئی ورنہ اصل قصہ پتا بھی نہیں چلتا..... بہتر یہی ہے کہ آپ لوگ اسے لے جائیں خرچا جب تک ملتا ہے ملتا رہے گا۔“

تقدیم جو اماں کی معذوری کے باعث اپنی موجودگی سے ان کی نمائندگی کر رہی ہوتی تھی ابا کو دیکھنے لگی۔

”میرا خیال ہے ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ ابا بولے۔

”ذکیل صاحب سے پوچھ لیں ابا۔“ تقدیم نے کہا۔

”بی بی وکیل سے کیا پوچھنا۔“

”مشورہ لینا ضروری ہے۔“

”میں تو ضروری نہیں سمجھتا..... مسئلہ خرچے کا ہے، وہ پہنچتا رہے گا..... سکونت کا کرایہ اگر چاہیے تو وہ بھی دینے کو راضی ہیں ہم۔“ مدر کے ڈیڈی کا لہجہ انتہائی مفاہمانہ تھا۔ ”مگر اس طرح کا خطرہ باپ بارمول نہیں لیا جاسکتا..... آج آپ کی بہن نے یہ حرکت کی ہے..... کل کچھ اور کر لے تو۔“ اُن کے لہجے میں اب تک تھی۔

”ٹھیک کہہ رہے ہیں یہ۔“ مدر کی والدہ نے شوہر کی تائید کی۔

”لیکن یہ بھی تو دیکھیں کہ اس نے کن حالات کے تحت ایسا کیا..... وہ ڈپریشن میں ہے..... آپ کے گھر میں اجنبیوں کی طرح رہ رہی ہے..... کوئی بات تک نہیں کرتا اس بے چاری سے..... اسے ہمدردی کی ضرورت ہے..... دکھ بٹانے کی ضرورت ہے۔“

”بی بی! جن حالات میں آپ کی ہمیشہ ہمارے گھر آئی ہے اس میں ایسا ہی ہوتا تھا..... کس تعلق سے بات کرے کوئی..... اور کس رشتے سے دکھ بٹائے.....“ مدر کے ڈیڈی نے کہا۔

”انسانیت سب سے بڑا رشتہ ہے۔“

”یہ جذباتی باتیں ہیں بی بی..... حقیقت بہت تلخ ہوتی ہے..... آپ لوگوں نے اپنے ساتھ ہمیں بھی خوار کر دیا ہے..... ہم تو سر پر بڑی مصیبت کو بھگت رہے ہیں ورنہ آپ کی بہن سے ہم نہ پہلے کوئی تعلق رکھنا چاہتے تھے نہ اب کوئی تعلق ہے ہمارا۔“

”اور مدر کے جانے کے بعد تو یہ بالکل ہی ختم سمجھو۔“ مدر کی ممی نے لقمہ دیا۔

”ہاں..... انسان کو اپنی اولاد سب سے پیاری ہوتی ہے..... میرا بیٹا صرف اس لڑکی کی وجہ سے ہم سے اتنی دور سات سمندر پار جا رہا ہے.....“ ڈیڈی نے کہا۔

”اور جو ایک بار گیا وہ واپس کب لوٹتا ہے۔“ ممی نے ایک ٹھنڈی سانس کھینچی۔

”تسلیم بھی اسی لیے اپ سیٹ ہے۔“ تقدیم نے کہا۔

بندے کو..... مجھے بھی میرے رب ہی نے ہمت دی۔“ تسلیم نے چونک کر ڈاکٹر کو دیکھا۔
”جب میاں بیوی کے رشتے کی بنیاد خلوص پر نہ تو جلد یا بدیر یہ رشتہ ٹوٹ جاتا ہے..... مگر رشتہ ٹوٹنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ آدمی خدا سے مایوس ہو جائے..... ہمت کرنا ہوتی ہے، میرا قصور بس اتنا تھا کہ میں نے کیے بعد وگھرے تین بیٹیاں ہی بیٹیاں پیدا کی تھیں..... شوہر وارث نہیں پیدا کر پاری تھی میں اور میرے شوہر اور اس کی ماں کو اپنی جائیداد کا وارث چاہیے تھا..... اور جائیداد تھی تین مرلہ زمین پر دو منزلہ مکان! طلاق کے بعد میں نے اپنی تین بیٹیوں کو اکیلے ہی پالا..... بڑی بیٹی ڈاکٹر ہے، دوسری انجینئر ہے..... تیسری اسکا لرشپ پرائگنڈ گئی ہوئی ہے، بڑی بیٹی کی شادی کر چکی ہوں باقی دو کی بھی انشاء اللہ ہو ہی جائے گی..... کبھی کبھی انسان کو زندگی سے اکیلے ہی چھٹی لڑنا پڑتی ہے۔“

اپنی مسیحا کی باتوں سے اس کے دل سے احساس نہائی کچھ کم ہو گیا تھا۔

”یہ جو خاتون تمہارے ساتھ ہیں یہ تو خود کو تمہارا مدر لانا لیتی ہیں۔“ ڈاکٹر نے کہا۔

”بشاید ہوتیں مگر اب نہیں ہیں۔“

”کیا مطلب؟“

”طلاق کے بعد تو اس شخص کے گھر سے سارے رشتے ختم ہو گئے میرے۔“

”تو پھر یہ تمہارے ساتھ کیسے؟“

”عدت انہی کے گھر میں گزار رہی ہوں۔“

”آئی سی.....“ ڈاکٹر کو اچنبھا ہوا۔ ”یہ کیسے؟“

”چنانچہ..... میرے گھر والوں نے وکیل کیا جس نے کہا شرعاً مجھے عدت اسی گھر میں گزارنا ہوگی۔“

”شوہر سے ہماری بات چیت ہوتی ہے؟“

”بالکل نہیں..... جب سے میں اس گھر میں آئی ہوں وہ تو گھر چھوڑ کر ہی چلا گیا اور اب تو..... ملک سے ہی

جار ہا ہے۔“

ڈاکٹر کے چہرے پر کچھ تاثر اس طرح کا تھا جیسے بات اس کے لیے دلچسپ بھی ہو تب خیر بھی۔

”پہلی دفعہ ایسا کیس دیکھ رہی ہوں۔“

”میں بہت اذیت میں ہوں ڈاکٹر صاحبہ..... اگھر میں نہیں رہنا چاہتی..... مگر مجبور ہوں۔“

”تمہارے گھر والے تمہیں کیوں نہیں لے جا اپنے ساتھ؟“

وہ چپ رہی..... اس سوال کا جواب دینے، لیے اسے وہ ساری مصلحتیں اپنی معالج کے سامنے کھولنا

پڑتیں جو اس کے گھر والوں کو درپیش تھیں۔

”بہر حال جہاں بھی رہو اس نعمت کی جو خدا تم دے رہا ہے احتیاط سے حفاظت کرو۔“ ڈاکٹر نے کہا۔

”میں اپنی تعلیم مکمل کرنا چاہتی ہوں..... پھر یہ بھی کرتی ہے۔“

”اچھی بات ہے..... آج کے دور میں خواتین کو ترقی دینا چاہیے۔“

”مگر..... اس ذمے داری کے ساتھ میں یہ سب کیسے کر سکوں گی۔“ پلیر آپ کچھ ایسا نہیں کر سکتیں کہ.....“

”انتہائی بے وقوف ہو تم..... اتنا سمجھنا کہ تمہاری سوئی اب تک وہیں لگی ہوئی ہے..... کبھی کبھی ایسا

بھی ہوتا ہے کہ پہلی اولاد ہی آخری بھی ہوتی ہے..... اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ خدا کی دی ہوئی کسی نعمت کی

تقدیم کے میل نمبر پر اولیس انصاری کی کال آگئی۔
 ”مس تقدیم میری بات ہوگئی ہے مدثر سے..... وہ اپنے والدین سے بات کر رہا ہے۔ فی الحال تو تنیم کو انہی کے ساتھ بھیجیں پھر اس مسئلے کا کوئی حل نکالنے کے لیے وہیں بیٹھ کر بات کرنے کے لیے ٹائم طے کرتے ہیں۔“
 ”اوکے!“
 ڈیڈی کے فون پر غالباً مدثر ہی کی کال تھی وہ کان سے فون لگائے بات کر رہے تھے اور می بڑے انہماک سے انہی کو دیکھ رہی تھیں۔

☆☆☆

”عذاب کردی اس لڑکی نے ہماری زندگی.....“ اماں بڑبڑائیں پھر ابا کی طرف دیکھتے ہوئے بولیں۔
 ”کوئی اور بات سوچنے ہی کے نہیں رہے ہم۔“
 ”ٹھیک کہتی ہو۔“ ابا کے لہجے میں دل گرفتگی تھی۔
 ”نہ باقی لڑکیوں کے لیے سوچنے کی مہلت ملتی ہے نہ بے چارے منوس کا دکھ سکھ ٹھول پاتی ہوں..... بس اسی منحوس کے چکر میں پڑے ہو..... بھلا کیا ضرورت تھی اسے یہ حرکت کرنے کی..... قصہ ختم ہی کرنا تھا تو تھوڑا سا زہر کھالیتی تاکہ آنے والے ساتھ اس کا اپنا بھی پاپ کٹ جاتا..... دو چار دن رو کر بیٹھ جاتے اسے..... ہر وقت کی تلوار تو سر پر نہ لگتی رہتی۔“ اماں شدید رنج اور غصے کی کیفیت میں بک بھک رہی تھیں۔
 ”ایسی باتیں نہ کریں اماں۔“ تقدیم دھیرے سے بولی۔

”ایسی نہیں تو پھر کیسی باتیں کروں..... کسی کو منہ دکھانے کا چھوڑا ہے اس نے ہمیں..... ارے ابھی تو لوگوں کو معلوم نہیں ہے..... جس دن ایک کو پتا چلا ساری دنیا کو خبر ہو جائے گی..... تھو تھو کریں گے لوگ..... پکی بیسی کو دیکھو پہلے کھیا میں گڑ پھوڑ بیٹھی اور اب یہ حرکتیں کر رہی ہے..... کیا ضرورت تھی دوا کھانے کی..... لڑکے کے گھر والوں کو جو تھوڑی بہت شرم ہوگی اس کی اس حرکت نے وہ بھی ختم کردی ہوگی..... کہیں نہ کہیں دل میں تو سوچتے ہوں گے کہ گنوں کی پوری ہے..... پہلے بچے کی دفعہ تو لڑکیوں کو کچھ پتا نہیں ہوتا، یہ مردودنی یہ حرکت کر بیٹھی، کیا عزت رہ گئی ہوگی مدثر کے گھر والوں کی نظروں میں۔“
 ”اماں ڈپریشن میں آدی ایسی حرکتیں ہی کرتا ہے۔“ تقدیم نے پھر تنیم کا دفاع کرنے کی کوشش کی۔

”ارے بس رہنے دو۔“ اماں بھڑک کر بولیں۔ ”نہ ڈپریشن نہ کچھ اور..... اس کی فطرت بڑی ہے، مجھ سے زیادہ ڈپریشن ہو سکتا ہے اسے..... کتنے سال ہو گئے اپنے جیروں پر چلے..... بچیوں کی فکر دل کو دیمیک کی طرح چاٹ گئی ہے میرے..... آنکھیں پتھر اگئیں راہ نکلتے نکلتے کہ کوئی تو بھلے ہانس آئیں جو میری بچیوں کو عزت سے اپنے گھر لے جائیں..... رات کو آنکھ کھل جائے تو دوبارہ لگتی مشکل ہو جاتی ہے..... اس کجبت کی طرف بھی بار بار دھیان جاتا ہے..... غیر لوگوں کے بیچ رہ رہی ہے اور وہ بھی ان کی مرضی کے خلاف..... سر ہٹا کٹا، دیور جوان، کوئی منہ نہ دبا دئے اپنا عیب چھپانے کو لوگ گردن دبانے سے بھی گریز نہیں کرتے۔“

”تقدیم کی ماں، میں خود بھی بات کہہ رہا تھا تقدیم سے..... ابھی تک تو خیر یہ تھا کہ مدثر یہاں ہے..... اس کے جانے کے بعد تنیم کا اس گھر میں جہاں غیر محرم رہتے ہوں رہنے کا کیا جواز بنتا ہے۔“
 ”میں تو پہلے بھی اس حق میں نہیں تھی کہ وہ وہاں رہے..... یہ تقدیم ہی کو سوچھی تھی۔“ اماں بولیں۔
 ”اماں! وہ لوگ کچھ تو دباؤ میں آئے..... پتا چلا انہیں کہ لڑکی کوئی دودھ میں پڑی بھی نہیں کہ نکال بیٹھی.....“

”اے کیا ضرورت ہے آپ سیٹ ہونے کی..... مدثر سے اب اس کا کیا تعلق۔“ ڈیڈی نے ناگواری سے کہا۔
 ”بچے سے تو ہوگا۔“ تقدیم بولی۔
 ”اوچھوڑو لی بی! اس کا بچہ! کہاں کا بچہ..... جتنا ٹریپ کرنا تھا آپ لوگ کر چکے..... اس سے زیادہ نہیں۔“
 ”اب آپ پھر ہماری انسلف کر رہے ہیں۔“ تقدیم کو غصہ آ گیا۔
 ”انسلف تو ہماری ہو رہی ہے..... سیدھی سی بات ہے یا تو آپ لوگ اپنی لڑکی کو اپنے گھر لے جائیں ورنہ اگر اس نے آئندہ کوئی ایسی ویسی حرکت کی تو ہم ذمے دار نہیں ہوں گے..... مرے یا جیے ہماری کوئی ذمہ داری نہیں۔“

”کیسے نہیں ہوگی ذمہ داری۔“ تقدیم بھر گئی۔
 ”ایک منٹ..... ایک منٹ بیٹی.....“ ابا نے بات کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ ”تم ادھر آؤ میرے ساتھ۔“ ابا تقدیم کو راہداری کے ایک کونے میں لے گئے اور آہستگی سے بولے۔ ”بہتر یہی ہے کہ اسپتال سے ڈسچارج ہونے کے بعد تنیم ہمارے ساتھ ہی اپنے گھر چلے۔“
 ”کیوں ابا.....؟“

”مدثر کے جانے کے بعد خدا جانے ان لوگوں کا کیا رویہ ہو تنیم کے ساتھ..... غیر لوگ ہیں..... کیا اعتبار..... ابھی تو تنیم نے حماقت دکھائی ہے..... بعد میں اسی کو بنیاد بنا کر یہ لوگ خود ہی کوئی نقصان نہ پہنچا دیں اسے..... الفاظ سن رہی ہو تم ان کے.....“
 ”میں اولیس صاحب سے بات کرتی ہوں۔“
 ”کیا بات کرو گی؟“

”ان کو درمیان میں ڈالا ہے..... مدولی ہے ان سے تو اب بھی مشورہ کرنا ضروری ہے..... بتا دوں گی انہیں کہ تنیم خود بھی خوش نہیں ہے مدثر کے گھر رہنے میں..... اپنے گھر جانا چاہتی ہے..... اور یہ لوگ بھی اسے رکھ کر خوش نہیں..... کیا کیا جائے۔“
 ”پوچھ لو۔“

تقدیم نے وہیں کھڑے کھڑے اولیس انصاری کا نمبر ملایا اور ابا سے ذرا ہٹ کر دھیمی آواز میں اس سے بات کی۔

”میں مدثر سے بات کرتا ہوں۔“ اولیس انصاری نے کہا۔
 ”کب بات کریں گے؟ تنیم کو اسپتال سے ڈسچارج کیا جا رہا ہے۔“
 ”ابھی کرتا ہوں..... آپ میری کال کا انتظار کریں۔“
 ”اوکے..... جھیک پوری بیٹی۔“

وہ اور ابا بے تابانہ اولیس انصاری کی کال کا انتظار کرنے لگے..... مدثر کے ڈیڈی خود ان کی طرف آ گئے۔
 ”اسپتال کا بل ادا کر دیا ہے میں نے۔“ انہوں نے تمہید باندھی پھر کہا۔ ”تو پھر لے جا رہے ہیں آپ اسے اپنے ساتھ۔“

”ہم نے اپنے وکیل سے بات کی ہے..... ان کے مشورے کا انتظار ہے۔“ جڑوں پر دباؤ کی وجہ سے ڈیڈی کی ہڈیاں باہر لنگھتی ہوئی نظر آنے لگیں..... وہ می کی طرف پلٹ گئے۔

”وکیل صاحب! اب جبکہ مقدمہ بقول آپ کے فیصلہ کن مرحلے میں ہے، میں دوسرا وکیل کہاں سے

لاؤں؟“

”بیت مل جائیں گے آپ کو..... کورٹ وکیلوں سے بھری پڑی ہے..... ایک ماگو ہزار ملتے ہیں۔“

”دیکھیں میں نے ہمیلی کیمرز میں آپ کی شہرت سن کر آپ کو اپنا وکیل کیا تھا..... اب نئے ہرے سے ایک نیا

وکیل کرنا میرے لیے مشکل ہوگا..... پلیز وقت نکالیں وکیل صاحب۔“ وہ لجاجت سے بولی۔

”سواری..... میں وقت نہیں دے سکتی..... آپ نے جو فیس ادا کی ہے وہ آپ واپس لے سکتی ہیں۔“

”بات فیس کی نہیں میڈم..... ایک نئے وکیل کا اس مرحلے پر کیس ہاتھ میں لینا فیصلے میں تاخیر کا سبب بھی

ہو سکتا ہے۔“

”ظاہر ہے..... نئے وکیل کو کیس اسٹڈی کرنا پڑے گا۔“

”برانہ مائیں تو ایک بات کہوں۔“

”ہاں۔“

”کہیں دوسری پارٹی نے تو آپ کو اس کیس سے ہاتھ اٹھا لینے کے لیے پریشر ایز نہیں کیا؟“

”کیا مطلب ہے آپ کا؟“ وکیل نے ناگواری سے کہا۔ ”کیا میں دوسری پارٹی کے کہنے پر کیس چھوڑ رہی

ہوں۔“

”ہو سکتا ہے..... کیونکہ وہ شخص کوئی خانہ خالی نہیں رہنے دینا چاہتا..... مجھے ڈرا دم کا کرو تو وہ تھک چکا ہے۔“

”آپ کے خیال میں وہ اب مجھے ڈرا رہا ہوگا۔“

”شاید!۔“

”جی نہیں..... وہم ہے آپ کا..... ہر پرویشن کی کچھ ethics (اخلاقیات) ہوتی ہیں، میں کسی قیمت

پاپے پرویشن کی ethics کے خلاف کام نہیں کروں گی۔“

”انتہائی معذرت وکیل صاحبہ..... کسی کا منہ ہار میں ہاتھ پکڑ کر عین اس وقت چھوڑ دینا جب کنارہ قریب

ہو یہ بھی تو آپ کی پرویشنل ethics کے خلاف ہونا چاہیے۔“

”لیکن جب انسان کی اپنی زندگی سامنے آجاتی ہے میم تو ساری اخلاقیات دھری کی دھری رہ جاتی ہیں.....

میری کچھ پرسنل کمٹ منٹس ہیں۔“

”یعنی اپنی زندگی کی خاطر آپ کسی اور کی زندگی داؤ پر لگا دینا چاہتی ہیں۔“

”ہر انسان خود غرض ہوتا ہے۔“

”معاف کیجیے گا میڈم..... ہر انسان نہیں۔“

”میں کسی بحث میں نہیں الجھنا چاہتی۔“

”مقدمے کی پیروی سے انکار کر کے آپ شخص کو تاخیری حربہ فراہم کرنا چاہتی ہیں۔“

”اگر آپ ایسا سمجھتی ہیں تو یونہی کہیں۔“

”مجھے افسوس ہوا۔“

”مجھے بھی افسوس ہے۔“ وکیل سے تیز لہجے میں گفتگو کے بعد وہ کتنی ہی دیر نہ حال سی بیٹھی رہی..... غالب کا

ایک شعر بار بار اس کے ذہن میں ابھر رہا تھا، ڈوب رہا تھا۔

طلاق دینے والوں کو پتا ہونا چاہیے کہ طلاق کے بعد بھی عورت کے مرد پر حقوق ہوتے ہیں۔“

”کیا حقوق ہوتے ہیں! عدت کے دوران رہنے کی جگہ اور چند ہزار کا نفقہ!“ اماں کے لہجے میں تلخی تھی۔

”گھٹیا لوگ تو یہ بھی نہیں دیتے اماں۔“

”اچھا خیر..... دفع کرو..... اسے اپنے گھر لے آؤ..... کتنے بچے بلایا ہے وکیل نے؟“

”شام چھ بجے۔“

”میں بھی چلوں؟“

”کیا ضرورت ہے!“ ابا بولے۔ ”تھک گئی۔“

”ویسے اماں..... آپ مجھے لاکھ برا بھلا کہیں..... ایک فائدہ ضرور ہوا ہے تنہیم کے اتنے دن اس گھر میں

رہنے سے۔“ تقدیم دینی زبان میں بولی۔ ”لوگوں کو یہ پوچھنے کی ضرورت نہیں پڑی کہ تنہیم سرال جانے کے

بجائے میکے میں کیوں بیٹھی ہے۔“ اماں نے تقدیم کو کینکھی نظروں سے دیکھا۔

”جی بالکل..... اور اب اگر تنہیم گھر آجاتی ہے تو ہمارے پاس یہ جواز ہوگا کہ اس کا شوہر باہر چلا گیا ہے

لہذا وہ ہمارے پاس رہ رہی ہے۔“

”کتننا عرصہ؟“ اماں نے تقدیم کو یوں دیکھا جیسے اسے کوئی بہت مشکل پہیلی پوچھنے کو دے رہی ہوں۔ ”کتنے

عرصے چلے گا یہ بہانہ.....“

”اماں باہر جانے والے کبھی کبھی بدل بھی تو جاتے ہیں..... بے وفائی کر بیٹھتے ہیں..... بیویوں کو بے قصور

چھوڑ دیتے ہیں..... بدلی عورتیں کے چکر میں پڑ جاتے ہیں..... گوریوں کو دل دے بیٹھتے ہیں اور گھر کی عورتوں

سے نظریں پھیر لیتے ہیں..... ہزار بہانے ہوں گے اماں..... ہمیں بس کوئی ایک بہانہ بنانا پڑے گا۔“

”اور جو کسی روز لوگوں کو اصل بات پتا چل گئی۔“

”چل جائے..... پروا نہیں..... دنیا میں بہت بڑی بڑی باتیں ہو جاتی ہیں اماں..... ہم ایک چھوٹے سے

حادثے کو اپنی زندگی کی سب سے بڑی مشکل کیوں بنالیں۔“

”یہ حادثہ چھوٹا حادثہ نہیں ہے تقدیم..... اس نے زندگی تلپ کر کے رکھ دی ہے ہماری۔“ اماں دل گرفتگی

سے بولی۔

”سب ٹھیک ہو جائے گا اماں..... اللہ پر بھروسہ رکھیں۔“

”سچ ہے کوئی تسلی دے تو آدمی کی ڈھارس بندھ ہی جاتی ہے۔“ اماں دھیرے سے بولی۔

☆☆☆

اور یہ بھی سچ ہے کہ پیسے والا انسان اپنے ظرف اور خدا کی دی ہوئی ذہیل کے موافق اپنے مد مقابل کے

لیے اتنی مشکلات پیدا کر سکتا ہے کہ وہ رونے کو آجائے۔“ حجاب کو اس کی وکیل نے فون کیا تھا۔

”مس حجاب! آئی ایم سواری میں اپنی بعض نجی مصروفیات کی وجہ سے آپ کے کیس کو مزید وقت نہیں دے

سکوں گی۔ آپ کو دوسرا وکیل کرنا ہوگا۔“ وکیل کے لہجے سے جھلکتی سرد مہری سے حجاب دم بخود رہ گئی۔ کیا یہ وہی

زبان تھی جو اسے تسلی دیا کرتی تھی..... اسے امید دلاتی تھی کہ زیادہ نہیں چند پیشیوں میں عدالت اس کے حق میں

فیصلہ دے دے گی..... اور یہ کہ اس مقدمے کی پیروی وہ اسے اپنی کلائنٹ ٹیسٹ چھوٹی بہن سمجھ کر کر رہی تھی..... کیا

چھوٹی بہنوں سے اچانک یوں لہجہ بدل لیا جاتا ہے۔

جب توقع ہی اٹھ گئی غالب
اب کے چارہ گر کرے کوئی

”کیا ہوا؟“ امی نے اسے یوں بیٹھے دیکھا تو تشویش سے بولیں۔ اسے نہ چاہتے ہوئے بھی امی کو جملہ رُوداد سنانا پڑی۔

”ان پیسے والے لوگوں کا یہی ہوتا ہے۔ پیسہ پھینکتے ہیں آدمی خریدتے ہیں۔“ امی کرب سے بولیں۔

”ضروری نہیں امی کہ اس نے ہماری وکیل کو خرید ہی لیا ہو۔ عورت بے چاری کے لیے تو اسے بے عزت کر دینے کی دھمکی بھی بہت ہوتی ہے۔“
”اب کیا کر گئی؟“

”یہی سوچ رہی ہوں۔ ظاہر ہے کسی دوسرے وکیل کا بندوبست۔“

”اوہ خدایا! کس مصیبت میں پھنس گئے۔۔۔۔۔ ان مصیبتوں سے تو وہ ایک مصیبت ہی بھلی تھی۔ جس کا نام الطاف ہے۔“ امی نے کہا۔

”ذرا یہ تو سوچیں امی کہ جس ایک مصیبت کی وجہ سے ہمارے لیے اتنی مصیبتیں کھڑی ہوئی ہیں وہ مصیبت کتنی خوفناک ہوگی۔“

”ارے بیٹا عورتیں تو بہت بڑے بڑے مردوں سے بھی گزرا رہ کر لیتی ہیں۔“ امی بولیں۔

اس نے بے ساختہ چونک کر امی کو دیکھا۔۔۔۔۔ کیا وہ بیزار ہو گئی تھیں یا تھک گئی تھیں۔

”سوری امی۔۔۔۔۔ میری وجہ سے آپ کو اتنی پریشانی اٹھانی پڑ رہی ہے۔“ اس نے خفت سے کہا۔

”کوئی نتیجہ نکل آئے۔“ امی نے ساٹ لہجہ میں کہا۔

☆☆☆

مدثر کے گھر والوں کا اس واقعے کو جواز بنا کر تنہا اپنے گھر میں رکھنے کا تردد اور خود تنہا کی بھی وہاں مطلقاً نہ رہنے کی رضا یا کرب بالآخر یہی ٹھہرا کہ تنہا اپنے گھر چلی جائے لیکن اس فیصلے کے بعد مدثر نے ایک مرتبہ تنہا علیحدگی میں بات کرنے کی خواہش ظاہر کر کے سب کو چونکا دیا۔ امی اور ڈیڈی اسے دوسرے کمرے میں لے گئے۔
”کیا بات کرو گے تم اس سے؟“ امی نے تیور بگاڑ کر پوچھا۔

مدثر چپ رہا۔

”اب کیا بات رہ گئی کرنے کو؟“ ڈیڈی نے اسے آنکھیں دکھائیں۔

”میں بچ نہیں ہوں۔۔۔۔۔ مجھے اپنی زندگی خود گزارنے دیں۔“ مدثر نے کہا۔

”ہاں! زندگی تم گزاریو۔۔۔۔۔ ذلت ہم نہیں۔“ ڈیڈی بھڑکے۔

”وہ میری بیوی رہی ہے۔۔۔۔۔ میرے بچے کی ماں بننے والی ہے۔۔۔۔۔ میں اگر حدود و قیود میں رہتے ہوئے کوئی ضروری بات کرنا چاہوں تو اس میں حرج کیا ہے ڈیڈی!“ مدثر بولا۔

”اب تم تاؤ گے ہمیں کہ کس بات میں کیا حرج ہے اور کس میں نہیں۔“ ڈیڈی نے آنکھیں نکالیں۔

”ڈیڈی! آپ بلا وجہ غصہ کر رہے ہیں۔“

”بلا وجہ۔۔۔۔۔“ ڈیڈی نے دانت پیسے۔۔۔۔۔ ”باہر بھجوانے پر اتنی رقم تم پر خرچ کر رہا ہوں۔“ ڈیڈی نے دونوں ہاتھوں کو تھیلیوں کے رخ پر اتھا ایک دوسرے کے سامنے کرتے ہوئے ان کے درمیانی فاصلے سے خرچ کی

زندگی

جانے والی رقم کا اندازہ ظاہر کیا۔“ اور۔۔۔۔۔ اسے نان نفقہ بھی میری جیب سے جارہا ہے۔۔۔۔۔ اسپتال کا بل کس کی جیب سے گیا ہے، میری۔۔۔۔۔ میری برخوردار۔“ ڈیڈی نے اپنے سینے پر ہاتھ مارا اور بھبک کر بولے۔ ”میں ادا کر رہا ہوں اس کے ہر ماہ ڈاکٹر کے پاس جانے کی فیس اور دواؤں کا خرچ۔“
”اتار دوں گا آپ کا سارا قرض۔۔۔۔۔“ مدثر کو بھی غصہ آ گیا۔

”ہونہہ۔۔۔۔۔ اتارے گا۔“ ڈیڈی نے امی کی طرف دیکھا۔ ”سن رہی ہو اپنے لاڈلے کی بات۔“

”کیوں بدتمیزی کر رہے ہو مدثر۔“ امی نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

”میں بدتمیزی نہیں کر رہا ہوں۔۔۔۔۔ ڈیڈی کی بات کا جواب دے رہا ہوں انہیں۔۔۔۔۔ منعم کی بیوی اور بچے پر

جو اتنا پیسہ بھایا جاتا ہے اس کا حساب بھی تو رکھا کریں۔“

”تمہیں اصل تکلیف اسی کی ہے۔“ امی بولیں۔

”ہاں ہے۔۔۔۔۔ تو کوئی غلط ہے کیا۔۔۔۔۔“ مدثر نے اپنا پاؤں زور سے فرش پر مارا۔

”ہیں۔۔۔۔۔ ہیں! ایک اتنی سی بات کیا پوچھ کر تم سے کہ اب کیا بات کرو گے اس سے، تم تو آپے ہی سے باہر

ہو گئے۔“

”میں نے اسے طلاق صرف آپ لوگوں کے کہنے میں آ کر دی۔۔۔۔۔ پچھتا رہا ہوں۔“

”پچھتا رہے ہو تو جاؤ دوبارہ بیوی بنا لو اسے۔“ ڈیڈی نے ناگواری سے کہا۔

”کاش! ممکن ہوتا۔“

”جس لڑکی نے ہمارے گھر کا سکون درہم برہم کر دیا تم اس کی حمایت میں اپنے ماں، باپ سے بدتمیزی

کر رہے ہو۔۔۔۔۔“ امی نے ناگواری سے کہا۔

”آپ لوگ میری اتنی سی بات پر کہ میں اس سے بات کرنا چاہتا ہوں اتنے مشتعل ہو گئے ہیں۔۔۔۔۔ وہ اگر

بیشک کے لیے اس گھر میں آجاتی تو خدا جانے آپ لوگ کیا سلوک کرتے اس کے ساتھ۔“

”گلا گھونٹ دیتے۔۔۔۔۔ قتل کر دیتے۔“ امی نے اپنے سینے پر ہاتھ مارا۔ ”ڈیڈی نے لاؤنج میں بیٹھے تنہا

کے والد، بہن اور وکیل کا لحاظ رکھنے کو کھٹی کھٹی آواز میں مگر انتہائی غصے سے کہا پھر ہاتھ کو جھٹکا دے کر

بولے۔ ”جاؤ۔۔۔۔۔ جاؤ کرو اس سے بات۔۔۔۔۔“

ملاقات اسی گھر میں ہوئی۔

دونوں روبرو تھے۔

تیسرا ان کے درمیان کوئی تھا تو تنہا کھانے کے کمرے میں خاموشی سے نمودار ہوا وہ وجود جو ان دونوں کے باہم اختلاف

کی یادگار تھا۔

تنہا کھانے کے کمرے میں ساون بھاؤ کی طرح برس رہی تھیں اور مدثر کا سر جھکا ہوا تھا۔

”چلے جاؤ۔۔۔۔۔ چلے جاؤ یہاں سے۔۔۔۔۔ میں تمہاری صورت بھی نہیں دیکھنا نہیں چاہتی۔“ کہاں تو یہ عالم

تھا کہ تنہا کھانا کھا کر آہٹ پر اسی کے ہونے کا گمان ہوتا تھا اور کہاں یہ کہ جب وہ سامنے آیا تو وہ پھٹ پڑی تھی۔

”سوری۔۔۔۔۔ آئی ایم ریسکی سوری۔“ مدثر نے شرمندگی کا اظہار کیا۔

تنہا کھانے کے کمرے سے دیکھا۔

”میں تم سے بہت شرمندہ ہوں تنہا۔۔۔۔۔ مجرم ہوں تمہارا۔۔۔۔۔ جو چاہو سزا دے لو۔“

”سزا..... سزا تو تم نے دی ہے مجھے..... تصور کر سکتے ہو کہ کس عذاب سے گزری ہوں اور اب بھی گزر رہی ہوں۔“ وہ ہلک ہلک کر رونے لگی۔

”مجھے احساس ہے۔“

”نہیں..... تم بے حس ہو..... تم محسوس نہیں کر سکتے، وہ اذیت جو میں نے سہی ہے اور شاید..... باقی تمام زندگی بھی سہوں گی..... بے وقوف تھی میں جو آنکھیں بند کر کے تمہارے ساتھ چل پڑی..... تمہارا کیا بگڑا..... تم تو آج بھی معاشرے کو اسی طرح فیس کر رہے ہو..... تعلیم بھی ٹھانڈے سے مکمل کر لی..... اور اب اپنے سینے پر باہر کا تمغہ سجانے ملک سے باہر بھی جا رہے ہو..... مجھے کیا ملا..... شرمندگی..... ذلت..... ادھوری تعلیم..... عدم تحفظ..... مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ میں آنے والے کو کیسے پال سکوں گی؟“

”وہ میری امانت ہے..... اس کی حفاظت کرنا..... اس کی ہر ضرورت پوری کرنا میری ذمہ داری ہوگی۔“

”کس ناتے.....! تمہارا اس سے کیا تعلق؟“ اس کے لہجے میں نشتر کی انی کی سی کاٹ اور چھین تھی۔

”ایسا مت کہو، پلیز۔“

”اپنے گھر والوں سے پوچھو وہ کیا کہتے ہیں؟“ اس نے آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے پھرتا ہوا آواز میں کہا۔

”مجھے کسی سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں..... میں جانتا ہوں کہ وہ ہم دونوں کا بچہ ہے۔“

تسلیم نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ لیا اور پھوٹ پھوٹ کر انتہائی بے بسی سے رونے لگی۔ اس کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ محبت کے کھیل کا انجام اس قدر تکلیف دہ بھی ہو سکتا ہے۔ اسے دلاسا دینے کو مدثر نے اپنا ہاتھ اس کے شانے پر رکھنا چاہا مگر بنار کھکھے بھینچ لیا۔ کس ناتے وہ ایسا کر سکتا تھا۔ اس کی طمع، جلد بازی اور عاقبت نااندیشی نے اس کے اور تسلیم کے درمیان ایک حد فاصل بھینچ دی تھی۔

☆☆☆

عباد خوش تھا کہ اسے اس کی منزل مل گئی تھی۔ لڑکی والوں کے پاس وقت کم تھا باقی سب کچھ وافر..... وقت کی کمی کے پیش نظر تمام مراحل تیزی سے..... انجام پائے..... شادی ہو گئی..... ہر دو طرف کے جملہ اخراجات لڑکی کے باپ نے اٹھائے، اپنی ہونے والی بیوی اور ساس، سر کو پاکستانی کرنسی پانی کی طرح بہاتے دیکھ کر عباد کے ہوش اڑے جا رہے تھے۔

دلہن رخصت ہو کر اسی فائو اسٹار ہوٹل کے ایک سوئٹ میں گئی جہاں شادی کی تقریب انجام پائی تھی۔ عباد اور دلہن تین دن تک وہاں رہے اور امی اکیلے اپنے فلیٹ میں..... عباد کو شادی کی پہلی ہی رات دلہن کے خرخریے سننے اور اپنی اوقات کا اس وقت اندازہ ہو گیا جب دلہن نے ہوٹل کے آراستہ و پیراستہ سوئٹ میں جو توں سپت لکڑی بیڈ پر نیم دراز ہو کر اپنے پاؤں مع سینڈلز عباد کے سامنے کرتے ہوئے اس سے جوتے اتارنے کی فرمائش کی۔ عباد کو اس کے پیروں سے سینڈلز اتارنے پڑے۔

ویسے والے دن جب امی اسٹیج پر آکر عباد اور اس کی دلہن کی بلائیں لینے لگیں تو دلہن نے انتہائی بدتمیزی سے عباد سے کہا۔

”یہ تمہاری امی..... جا دو گرنی کی طرح کون سامنٹر کر رہی ہیں۔“ غصیت ہوا کہ اس نے یہ بات انگریزی میں کہی تھی اور صد شکر کہ اس وقت اسٹیج پر عباد کے رشتے داروں میں سے کوئی موجود نہیں تھا ورنہ امی کو انگریزی میں

کبھی گنی اس بات کا مطلب پتا چلتا تو وہ بہت رنجیدہ ہوتیں۔

تین دن بعد دو لہا دلہن بنی مومن منانے شمالی علاقہ جات چلے گئے۔

”ہی! عباد کے سر نے اپنی لاڈلی بیٹی سے کہا۔“ اصل میں تو تم عباد کے انگلیڈ آنے پر ایک شاندار استقبال کے بعد اپنی پسند کی جگہ پر بنی مومن منانے جاؤ گی..... فی الحال اس بہانے پاکستان کے شمالی علاقے گھوم آؤ..... آخر اپنا وطن بھی تو دیکھنا چاہیے ہیں۔“

”ڈیڈی! میرا وطن تو انگلیڈ ہے۔“ اس نے کہا۔

”ہی! تمہارے باپ اور اس کے پڑھوں کا وطن تو یہی ہے۔“

”تو اس سے مجھے کیا فرق پڑتا ہے۔“ وہ شانے اچکا کر ناگواری سے بولی۔

”اوکے..... اوکے..... ناراض مت ہو میری جان۔“

بنی مومن کے دوران عباد پر دلہن کے اطوار اور کھل گئے۔ وہ انتہائی تنگ مزاج، خود سر اور گستاخی کی حد سے بڑھ کر بدتمیز اور بد لحاظ تھی مگر پھر بھی عباد خوش تھا..... کسی معمولی گھرانے کی لڑکی سے اپنی اور امی کی ناز برداریوں سے امیر گھرانے کی لڑکی کے خرخرے اٹھانا اس لحاظ سے بہت بہتر سودا تھا کہ اپنی نوبیا ہتا دلہن کے طفیل ہی تو انگلیڈ جانے اور بہتر مستقل کے مواقع اسے میسر آ رہے تھے۔ دلہن تو سر آنکھوں پر بٹھائے جانے کے لائق تھی۔ بنی مومن سے واپس آنے کے بعد عباد ہفتہ بھر اپنی سرال ہی میں رہا۔ امی بے چاری اپنے فلیٹ میں اکیلی رہتی رہیں۔ عباد کی شادی نے انہیں تنہا کر دیا تھا۔ دن تو جو توں گزرا لیں، رات گزرا نی مشکل ہو جاتی۔ عباد ان کے لیے زندگی کا دوسرا نام تھا۔ راتوں کو اٹھ اٹھ کر وہ یہ دیکھنے کی عادی رہی تھیں کہ عباد کو سوتے میں کوئی مسئلہ تو نہیں تھا۔ چادر سر کی ہوئی تو وہ اسے چادر اڑھا تیں، لحاف پٹنگ سے نیچے لنگ رہا ہوتا تو وہ آہستگی سے لحاف کا لٹکتا حصہ اوپر اٹھا کر عباد کو ڈھانپ دیتیں۔ شادی کے بعد اس کا بستر خالی دیکھ کر امی کو رات کو نیند آنا مشکل محسوس ہوتی۔

بنی مومن سے واپسی پر عباد ایک روز امی کی اس فرمائش پر کہ جو محلے دار خواتین کسی باعث اس کی شادی میں شریک نہ ہو سکی تھیں دلہن کو دیکھنے کی آرزو مند تھیں دلہن کو اپنے گھر لے گیا۔ جن محلے دار خواتین نے دلہن کو رخصتی یا ویسے والے دن دیکھ رکھا تھا وہ بھی دوبارہ اسے دیکھنے کو گھر آئیں۔ دلہن کو آراستہ و پیراستہ روپ میں دیکھنا اور بات چینی کو اس کے چہرے پر غمازہ والی کی تھیں اب بھی تھیں مگر اصلیت عباد تھی۔ پڑوسنیوں نے عباد کی نوبیا ہتا دلہن کو انتہائی تنقیدی نظروں سے جانچا، تو لا اور اپنی رائے قائم کر لی۔ دلہن پہلی بار سرال آئی تھی۔ امی نے اس کی خاطر مدارات کے لیے خاطر خواہ بندوبست کر رکھا تھا مگر اس نے امی کے اصرار کے باوجود کسی بھی چیز کو ہاتھ نہ لگایا۔ جتنی دیر رہی اوپر ہی اوپر ہی بیٹھی رہی۔ واپس جانے کو بلڈنگ کا زینہ اترتے ہوئے اس نے عباد سے کہا۔

”اوہ میرے خدا! تم اور تمہاری ماں کتنی گندی جگہ رہتے ہو..... ذرا سیڑھیاں تو دیکھو کتنی غلط ہو رہی ہیں..... گھر کے دروازوں پر میلے پردے اور گھر کے باہر رکھے کوڑے دان..... کیسی بدبو اور کتنی ٹھن ہے یہاں..... میں تو ایک منٹ بھی رہنا پسند نہ کروں ایسے گھر میں..... تو بہ! اس سے صاف اور صحت افزا جگہ پر تو ہمارے پالتو کتے رہتے ہیں..... یہاں تو عجیب سی بدبو پھیلی ہوئی ہے۔“

عباد کو اس کے بے لاگ تبصرے پر سخت شرمندگی سے دوچار ہونے کے ساتھ اپنی غلطی کا بھی احساس ہوا..... امی سے ملوانے کے لیے دلہن کو وہاں لانے کے بجائے اسے امی کو اپنی سرال لے جانا چاہیے تھا..... خراب تو غلطی ہو چکی تھی اور اس کا کوئی مداوانہ تھا۔

عباد کی نوبت یا ہی دہن اپنے والدین کے ساتھ انگلینڈ واپس چلی گئی۔ عباد امی کے پاس آ گیا۔ اب اسے اپنی برطانوی قومیت کی حامل بیوی کے پاس جانے کے لیے حصول ویزا کی خاطر موجب قانونی تقاضوں سے گزرنا تھا۔ اسے ایک، ایک دن پہاڑ محسوس ہوتا..... انتظار کسی بھی چیز کا ہوسبر آزما ہوتا ہے۔ امی کا دل اس خیال سے بیجا جاتا کہ عباد ان سے دور سات سمندر پار چلا جائے گا۔

”آپ فکرنہ کریں، آپ کو بھی بلا لوں گا وہاں۔“ عباد امی کو پریشان دیکھتا تو انہیں دلاسا دیتا۔
”جب تمہیں انتظار کرنا پڑ رہا ہے اپنی بیوی کے پاس جانے کے لیے تو میں بھلا کس کتنی میں ہوں.....
پڑوسن بتا رہی تھیں۔ ان کی کوئی جاننے والی اپنی بیٹی، داماد سے ملنے کے لیے جانا چاہتی تھیں۔ ویزے سے انکار ہو گیا۔“ امی اسے حسرت بھری نگاہوں سے دیکھنے لگتی۔

”انکار ہو جائے تو لوگ اپیل کر دیتے ہیں۔“ عباد بولا۔

”ارے بیٹا..... اپیلوں کا وقت کہاں ہے میرے پاس۔“

”انشاء اللہ اپیل کی نوبت ہی نہیں آئے گی امی..... گورے تسلی چاہتے ہیں کہ جانے والا شخص ان کی معیشت کے لیے بوجھ تو نہیں بنے گا..... لوگ تو اس پتھر میں جاتے ہیں انگلینڈ کہ کسی بھی طرح وہاں کی شہریت حاصل کرنے کی کوشش کریں گے تاکہ اگر وہاں جا کر کام نہ بھی کریں تو گزارہ الاؤنس ملتا رہے۔ اب تو خیر اتنا آسان نہیں رہا انگلینڈ کی شہریت ملنا لیکن ایک زمانے میں آسان تھا..... لوگوں نے بہت فائدہ اٹھایا اور اب ان کی بعد کی تسلیں فائدہ اٹھا رہی ہیں۔“

”ارے بیٹا مجھے کسی چیز کا لالچ نہیں..... میرے لیے تو میری زندگی کی سب سے قیمتی متاع تم ہو..... تم سے دوری کے خیال سے میرا دل کٹا جاتا ہے.....“ امی بولیں۔

”ہمئی کے والد کا وہاں بہت بڑا کاروبار ہے۔ ان کی اسپانسر شپ سے آپ کو انشاء اللہ فوری ویزا مل جائے گا۔“
”ایک بات کہوں بیٹا..... برا مت ماننا۔“ امی نے دبی زبان سے کہا۔ ”تمہاری بیوی بہت خرابی ہے۔“
مجھے برداشت نہیں کرے گی وہ۔“

”وہاں کسی کا کسی کو برداشت کرنا یا نہ کرنے کا مسئلہ نہیں ہوتا امی..... ہر شخص کی اپنی زندگی ہوتی ہے۔“
کوئی دوسرے کی زندگی میں دخل نہیں دیتا۔“

”خواہ مخواہ تم اس کھڑاگ میں پڑے..... اپنے ہی جیسوں سے رشتہ باندھتے تو نہ تمہیں مشکل ہوتی نہ مجھے کوئی غم نہ ہوتا۔“

”مجھے تو کوئی بھی مشکل نہیں۔“

”ویزا کے انتظار میں دن گن رہے ہو یا نہیں؟“

”آسانوں کے لیے مشکل سے تو گزرنا ہی پڑتا ہے امی..... راحت، تکلیف سے گزرنے کے بعد ہی ملتی ہے۔“
”برا مت ماننا..... اس روز جب تم دہن کو یہاں لے کر آئے اور پڑوسنوں نے اسے قریب سے دیکھا تو

بعد میں مجھ سے کہا دہن عباد کے جوڑ کی نہیں..... سامنے والی کہنے لگیں۔ ایک ہی تو بہو آئی تھی آپ کے گھر میں..... ایسی تو لاتیں چوگر میں چاندنا ہوتا..... خوب باتیں بنائی ہوں گی آپ پاس والیوں نے منہ جوڑ جوڑ کر۔“
امی کے لیے میں دل گرفتہ تھی۔

”چھوڑیں امی!“ عباد نے امی کے شانے پر ہاتھ دھر کر انہیں دلاسا دینے کی کوشش کی پھر بولا۔ ”لوگوں کا

تو کام ہی ہوتا ہے..... کسی کو آگے بڑھتے یا ترقی کرتے دیکھ ہی نہیں سکتے..... جلنے لگتے ہیں..... آپ کی اس پاس والیوں کو ان کے بیٹوں، بھائیوں یا بھانجوں، بھتیجیوں کے لیے ایسا امیر کبیر رشتہ ملا تو اپنا بیٹا، بھائی، بھتیجا تھا تو میں رکھ کر پیش کر دیتیں..... ایسی عورتوں کا وہی حساب ہوتا ہے کہ انکسور ملے نہیں تو کھٹے ہیں۔“

عباد کو ثابت قدم دیکھ کر امی نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور کہا۔ ”اچھا میرے لال..... پہلے میں اٹھتے بیٹھے یہ دعا کیا کرتی تھی کہ تمہیں اچھی لڑکی ملے جو اس گھر کو جنت بنا دے..... اب دعا کرتی ہوں کہ جو فیصلہ تم نے کیا ہے خدا کرے تمہارے حق میں بہت رحمتوں، بہت برکتوں والا ثابت ہو۔“

عباد نے اپنا سراسر کے شانے پر رکھ دیا۔ امی دھیرے دھیرے اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگیں۔ امی کے ہاتھوں میں مسیحانہ گرمی اور نرمی تھی۔



ثریا، تمہید کے لیے اپنے چچا زاد بھائی کا رشتہ لائی تھی۔ لڑکا معاشیات میں ایم اے اور اسٹیٹ بینک میں ملازم تھا۔ اچھی خواہ مخواہ اور بینک کی جانب سے معقول مراعات حاصل تھیں۔ والدین حیات تھے..... دو بھائی تھے اور دو بہنیں..... بڑے بھائی اور بہنوں میں سے ایک کی شادی ہو چکی تھی۔ لڑکے کے بعد چھوٹی بہن کا نمبر تھا۔ ثریا نے لڑکے کے بارے میں ہر طرح کی ضمانت کی یقین دہانی کرائی۔

”آئی! لڑکا پانچوں وقت کا نمازی ہے، دیندار ہے، اپنا بزنس بھی کر رکھا ہے، دکانوں کو چاول سپلائی کا..... کہتا ہے کہ بینک کی نوکری معاش کی مجبوری ہے، جیسے ہی کاروبار خوب چلے گا اپنے کاروبار پر دھیان دوں گا..... تجارت، پیشہ حبیب اللہ ہے بڑی برکت رہی ہے اللہ نے اس کام میں..... بڑا بھائی شادی کے بعد الگ رہتا ہے۔ ہمارے چچا نے خود علیحدہ کر دیا تھا انہیں..... چچا کہتے ہیں بیٹے، بہو پر اپنا قبضہ جمائے رکھنے کی سوچ غلط ہوتی ہے..... پرندے بھی اپنے بچوں کو پر نکل آنے اور اڑنے کی قوت آنے تک اپنے پیروں تلے رکھتے ہیں..... جو کئی خود وہ اڑنے کے لائق ہوتے ہیں انہیں چھوڑ دیتے ہیں کہ جاؤ اپنا داندہ دکانا خود چھو..... چھوٹے کے لیے بھی ان کا یہی خیال ہے کہ بہو آنے کے بعد کچھ عرصہ اپنے ساتھ رکھ کر الگ کر دیں گے..... ماشاء اللہ چھوٹے نے ایک فلیٹ بھی لے رکھا ہے۔“

”ساتھ بھی رکھیں تو کیا حرج ہے..... آخر ماں، باپ کو بھی تو ضرورت ہوتی ہے کسی دیکھ بھال کرنے والے کی..... آج اولاد ماں، باپ کا خیال کرے گی تو کل اولاد کی اولاد اپنے ماں، باپ کا خیال رکھے گی۔“

”یہ تو ہے۔“ ثریا نے تائید کی۔

”ہم نے تو اپنی بچیوں کو ہمیشہ یہی تعلیم دی کہ جس گھر جاؤ بڑوں کو عزت اور چھوٹوں کو ان کا حق دینا..... ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنانے سے پہلے یہ سوچ لینا کہ رشتوں کی گھٹی چھاؤں میں بیٹھنا بھلا ہوتا ہے یا کسی دیوار کے سامنے سے لگ کر کھڑے ہو جانا۔ ٹھنی چھاؤں کی بات ہی اور ہوتی ہے۔ دیوار کے سامنے کا کیا ہے۔ زیادہ اپنے اوپر بہت تھوڑا زمین پر۔“ اماں نے اپنا فلسفہ حیات بیان کیا۔

”ایک چھوٹی بہن ہے، اس کا بھی رشتہ ملے ہے سگی خالہ کے ہاں، وہ بھی سال دو سال میں اپنے گھر چلی جائے گی..... چچی ہماری اللہ میاں کی گائے ہیں بہت سیدھی سادی..... گھر میں ہر سہولت ہے۔ اپنی تمہید بہت خوش رہے گی۔“

”تمہارے منہ میں کھی شکر ثریا..... رشتہ تو وہیں ہوگا جہاں اللہ نے لکھا ہوگا لیکن تم نے اس گھر کی کسی لڑکی

کے لیے کسی اپنے ہی کا رشتہ دے کر میرے دل سے بہت دعائیں لیں..... خدا کی قسم اس وقت میرا رُواں رُواں اللہ کی شکر گزاری کے بعد تمہیں دعا دے رہا ہے..... کون سوچتا ہے کسی ایسے گھر کی لڑکی اپنے گھر لانے کو جہاں ایک لڑکی پہلے ہی کوئی گل بھلائے بیٹھی ہو.....“ اماں کی آواز بھرا رہی تھی آنکھوں میں آنسو تھے۔

”نہیں، نہیں آئی.....“ ثریا نے اماں کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دوسرے ہاتھ سے اسے تھپکتے ہوئے کہا۔ ”ایسے نہیں سوچتے..... تسنیم سے غلطی ہوئی گناہ تو نہیں ہوا..... غلطی تو اللہ بھی معاف کر دیتا ہے..... اور اللہ نہ کرے اگر کسی گھر کا کوئی ایک فرد گناہ کر بھی بیٹھے تو اس کی سزا پورے گھر کو تو نہیں دی جاسکتی..... تمہید بہت اچھی، بہت کامی اور خدمت گزار لڑکی ہے، جس گھر جائے گی اپنے سلیقے اور خدمت گزار کی سے شوہر اور اس کے گھر والوں کو جیت لے گی۔“

”اللہ تمہاری زبان مبارک کرے۔“ اماں نے اپنی آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا۔
 ”آپ گھر میں انکل اور باقی لوگوں سے مشورہ کر لیں اور مجھے بتا دیں..... جس دن کہیں گی ان لوگوں کو لے آؤں گی اپنے ساتھ۔“

”کوئی منع تھوڑی کرے گا ثریا..... تم تو اب اپنوں سے بڑھ کر ہو..... تم سے کیا پردہ داری..... تمہید کے لیے رشتے آتے رہے ہیں مگر..... لوگوں کو پتا نہیں کیوں ظاہری خوب صورتی کی تلاش ہوتی ہے حالانکہ اصل خوب صورتی تو انسان کے اندر ہوتی ہے۔ پرانے لوگوں کا کہنا ہے لڑکی اور جوئی آرام دہ تلاش کرنی چاہیے..... کرنے کو کوئی یہ اعتراض بھی کر سکتا ہے کہ لڑکی اور جوئی کو کہاں ملا دیا مگر گہرائی میں جاؤ تو پرانے لوگوں کی یہ بات سونی صد درست ثابت ہے۔ جوئی لا کھل لعل جڑی اور قیمتی ہوا اگر پہننے والے پاؤں کو آرام نہ دے تو بیکار..... اسی طرح لڑکی کتنی ہی خوب صورت اور اونچے گھر کی کیوں نہ ہو جس گھر جائے اس کے لوگوں کو آرام نہ دے تو بیکار۔“
 ”سونی صد درست آئی۔“ ثریا نے تائید کہا۔

”آنے والے ہمارے سر آنکھوں پر ثریا..... مگر دیکھو..... لانے سے پہلے انہیں یہ ضرور بتا دینا کہ لڑکی کوئی ابلا پری نہیں..... اللہ کی بنائی صورت ہے..... کیا فائدہ کہ وہ کوئی لمبی چوڑی امیدیں باندھ کر آئیں اور لڑکی دیکھیں تو انکار کر دیں..... لڑکی پر بھی برا اثر پڑے گا..... سمجھ رہی ہوں تم میری بات؟“ اماں نے ثریا سے کھل کر بات کی۔

”آپ فکر نہ کریں آئی..... میں خود بھی بہنوں والی ہوں..... مجھے یہ سب معلوم ہے..... چچی میری بہت سیدھی سادی عورت ہیں..... پچا دیندار بہت ہیں، خوف خدا رکھتے ہیں دل میں..... بڑے بیٹے کے لیے بھی سیدھی سادی با پردہ لڑکی بیاہ کر لائے ہیں اور اب چھوٹے کے لیے بھی انہیں ایسی لڑکی تلاش ہے جو چھوٹے کو چھوٹا بڑے کو بڑا سمجھے۔ عزت کرے اور عزت کروائے..... انہیں اچلی چڑی نہیں اچلے دل والی لڑکی کی ضرورت ہے..... جو ہر وقت اپنی لیا پوتی میں نہ لگی رہے گھر سنبھالے..... تمہید بہت خوش رہے گی ان کے گھر میں..... انہیں بتا دیا ہے میں نے کہ لڑکی نہ تو خوب صورت ہے نہ بہت پڑھی لکھی مگر گھر داری میں طاق..... بس انہیں ایسی ہی لڑکی چاہیے۔“

”یہ بھی بتا دیا کہ ہمارے پاس لڑکی کو دینے دلانے کو بھی نہ ہونے کے برابر ہے؟“ اماں نے کچھ ہچکچاتے ہوئے کہا۔

”آپ اطمینان رکھیں آئی..... لا چکی ہمارے خاندان میں کوئی بھی نہیں..... منہ پر ضرور بات کر دیجے

ہیں..... میری طرح..... چاہے کسی کو اچھی لگے یا بری..... مگردل میں کوئی کھوٹ نہیں رکھتے۔“
 ”بہت اچھی بات ہے ثریا..... بغل میں چھری رکھ کر منہ پر رام رام کرنے سے صاف بات کر دینا بہت
 بہتر..... اچھا یہ بتاؤ.....“ اماں نے رازدارانہ انداز میں کہا۔ ”تسلیم کا قصہ بھی بتا دیا تم نے ان لوگوں کو؟“
 ”کیوں! انہیں کیوں بتانا..... آپ بھی نہ بتانا آئی..... کیا ضرورت ہے بتانے کی۔“ ثریا چونکی۔
 اماں نے ثریا کو بے یقینی سے دیکھا پھر بولیں۔ ”کبھی پتا چل بھی سکتا ہے ثریا۔“
 ”جب پتا چلے گا تو دیکھا جائے گا..... اپنے آپ بتانے کی کیا ضرورت ہے!“
 ”دیکھ لو ثریا..... بعد میں کوئی مسئلہ نہ ہو۔“

”انشاء اللہ کچھ نہیں ہوگا آئی..... ہماری تمہید اپنی کم گوئی، خدمت اور ادب، تہذیب سے ان سب کا ایسے دل
 جیت لے گی کہ انہیں پتا چلا بھی تو کوئی چوں نہیں کر سکے گا۔ اللہ بخشے میری والدہ کہا کرتی تھیں شادی سے پہلے لڑکا اور
 لڑکی والے ایک دوسرے کے بارے میں بہت چھان بین کرتے ہیں، بال کی کھال نکالتے ہیں لیکن شادی کے بعد
 لڑکی کے شوہر اور سسرال والوں کو بس لڑکی ہی سے غرض رہ جاتی ہے۔ پیچھے کیا تھا کیا نہیں..... ماں، باپ کیا ہیں.....
 بہن بھائی کیا..... اس سے کسی کو غرض نہیں ہوتی..... لڑکی اگر عقل سے کام لینا جانتی ہو تو سسرال میں اپنا پلڑا بھاری
 رکھ سکتی ہے۔ اپنی تمہید اللہ نے چاہا تو راج کرے گی..... ویسے بھی میرے چچا، چچی اور ان کے بچے لوگوں کی کمزوریاں
 دیکھنے اور طعن و تشنیع کرنے والے لوگ نہیں، خوفِ خدا رکھتے ہیں۔“ اماں کے اطمینان کو ثریا نے بالتفصیل کہا۔
 ”خاندانی لوگوں کا یہی وصف ہوتا ہے۔“ اماں بولیں۔

”آپ جب کہیں میں لے آؤں انہیں۔“
 ”جب تمہارا جی چاہے ثریا..... جب تمہیں سہولت ہو۔“
 ”آپ اپنی سہولت دیکھیں۔“

”میری سہولت کیا دیکھنی..... میں تو برسوں سے اس کرسی پر محتاج بنی پڑی ہوں۔ یہاں سے نکلوں گی
 بیٹھک میں جا بیٹھوں گی..... بچیوں کی اتنی فکر لگ رہی ہے ہر وقت دل کو کہہ چاہتی ہوں گھڑی کی چوتھائی میں یہ
 اپنے، اپنے عزت کے ٹھکانوں پر پہنچیں..... بچے کی فکر بھی لگی رہتی ہے..... سیکڑوں میل دور دوسرے شہر میں اللہ
 جانے کس حال میں رہتا ہوگا۔“

”ایک دو لڑکیاں نمٹ جائیں تو پھر اس کا بھی گھر بسا دیں۔“
 ”انشاء اللہ۔“

”کوئی لڑکی نظر میں ہے اس کے لیے؟“

اماں نے ایک سر آہ کھینچی پھر بولیں۔ ”تم سے کیا پردہ ثریا..... چھوٹی نند کی بیٹی نظر میں رکھی ہوئی تھی اس
 کے لیے مگر..... اس کے کسی دوست کے ماموں نے اسے اپنی بیٹی کے لیے اپنے شکبے میں پھنسا لیا۔“
 ”خدا عافرت کرے.....“ ثریا نے بے ساختہ بد دعا دی پھر بولی۔ ”اچھے لڑکوں پر لوگ یونہی ڈورے ڈالتے
 ہیں اپنی بہنوں، بیٹیوں کے لیے۔“

”بیٹے کے لیے تو میرے سارے ارمان دل کے دل میں ہی رہ گئے..... ٹھیکرے کی مانگ تھی..... سوچتی تھی
 بیٹیاں تو اپنے، اپنے گھر چلی جائیں گی وہی میری بیٹی بن کر رہے گی میرے پاس..... منہ دکھانے کے لیے بھی نہیں
 رہے ہم میاں، بیوی اس کے ماں، باپ کو..... نہ زبان سے کچھ کہہ سکتے ہیں ان سے..... کیا کہیں بھلا.....“ اماں

دلگرفتگی سے بوس۔

”نہیں آنٹی..... یہ تو آپ کو بتا دینا چاہیے لڑکی والوں کو..... تاکہ وہ اس کا کہیں اور کرنے کی سوچیں۔“

”کس منہ سے ثریا..... کس منہ سے..... میری تو بات کرنے کی ہمت ہی نہیں ہوتی۔“

”ہمت تو کرنی پڑے گی۔“

”سچی بات بتاؤں..... ایک ہلکی سی امید یہ بھی ہے کہ شاید کوئی ایسا معجزہ ہو جائے کہ صبح کا بھٹکا شام کو گھر

لوٹ آئے۔“

”چاہے شام کے انتظار میں لڑکی بیچاری کی زندگی میں رات ہو جائے۔“ ثریا کی صاف گوئی نے اماں کا

مروتا بھی لگا نہیں کیا اور چٹکی بجا کر بولی۔ ”یوں جاتی ہے لڑکی کی شادی کی عمر..... اپنی غرض کے لیے کسی کو انکا کر

رکھنا مناسب نہیں..... برامت ماننا آنٹی..... میں لگی لپٹی نہیں رکھتی۔“

”اچھا کرتی ہو ثریا..... تم سے بات کر کے مجھے یہ بھی احساس ہو رہا ہے کہ ہمیں ان لوگوں کو بتا دینا

چاہیے..... دیکھو بات کرتی ہوں تمہارے انکل سے..... وہی بات کریں گے بہن سے۔“

”ضرور کریں..... جیسے آپ کو اپنی بچیوں کی فکر ہے، آپ کی نند کو بھی تو ہوگی۔“

”ہاں، کیوں نہ ہوگی بھلا۔“

”چچا اور چچی سے بات کر کے بتائی ہوں آپ کو کہ کس دن آنا چاہ رہے ہیں وہ لوگ۔“

”ٹھیک ہے..... خدا تمہیں خوش رکھے۔“ اماں نے ثریا کو شکر گزاری سے دیکھا۔

☆☆☆

عائزہ شادی کے لیے مصرتھی اور منوس الجھا ہوا تھا کہ ایک دو نہیں پانچ جوان بہنیں گھر میں بیٹھی ہوئی تھیں۔

تسلیم کی بھی نہ ہونے کے برابر ہی تھی۔ کیسے کہہ سکتا تھا وہ گھر والوں سے کہ بہنیں بھلے سے بیٹھی رہیں، پہلے میری

کردو۔ والدین اور بہنوں کے لیے اس نے ابھی کیا ہی کیا تھا۔ مہینہ بھر انتظار کے بعد جو خواہ باتھ میں آئی سچی بات

تو یہ تھی کہ وہ اس کی اپنی کفالت کے لیے بھی ناکافی تھی۔ باتھ کھینچ کر خرچ کرتا۔ دو وقت کے بجائے ایک وقت کھانا

منگواتا میں سے..... بلا ضرورت باہر آنے جانے سے گریز کرتا..... دوستوں کی باہر نشتوں میں شرکت سے

بہانے بہانے معذرت کرتا، تب کہیں جا کر سات ہزار روپے ماہانہ اماں کے نام بھجوا پاتا۔ پہلا منی آرڈر اس نے

ابا کے نام بھجوا یا تھا لیکن ابا نے کہا میں تو گھر میں ہوتا نہیں ہوں پوسٹ مین سے منی آرڈر کی وصولی کے لیے مجھے دفتر

سے آدھی چھٹی لے کر ڈاک خانے جانا پڑا۔ اول تو ضرورت نہیں لیکن بھجوانا ہوتا تو آئندہ اپنی ماں کے نام سے بھجوانا۔

وہ تو گھر ہی پر ہوتی ہیں وصول کر لیں گی۔ سو اس نے اماں کے نام منی آرڈر بھجوانا شروع کر دیا تھا۔

جونیر فوجی افسران کی بے شکن وردیوں سے مرعوب رہنے والوں کو کیا معلوم کہ دفاع وطن جیسی گراں ذمے داری

اٹھانے والے قوم کے یہ جری اور نڈر سپوت بھی ایک عام فرد ہی کی طرح زندگی کے مسائل سے نبرد آزما رہتے ہیں۔

ایک اینڈ پر جائزہ سے ملنے کی خاطر اسلام آباد جانے کی خواہش کو بھی وہ اپنی پیشہ ورانہ مصروفیت کے

بہانے ممکنہ حد تک محض اس لیے ٹالے جاتا کہ اس کے وہاں جانے پر جب بصور احمد اور ان کے اہل خانہ اسے ساتھ

لے کر باہر نکلتے اور کہیں باہر کھانا پینا ہوتا تو اسے بھی اپنی جیب سے والٹ نکالنا ہوتا۔ گو بصور احمد منع کرتے مگر ان

کے منع کرنے کے باوجود وہیل خود ہی ادا کرنے کی کوشش کرتا کہ اب وہ زیر تربیت افسر نہیں کمیشن یافتہ افسر تھا مگر

بل ادا کرنے کے بعد اس کے دل کی جو حالت ہوتی وہی جانتا تھا۔ کتنی بہت سی ضرورتیں تھیں جو منہ کھولے کھڑی

تقدیم نے حجاب کی ملاقات اولیس انصاری سے کروائی۔ اولیس انصاری نے اپنی غیر معمولی مصروفیت کے باعث اپنے ہی کسی ساتھی کو..... recommend کرنا چاہا لیکن تقدیم نے کہا۔
”اولیس صاحب! یہ میری بہت اچھی دوست ہے..... کہنے کو دوست مگر بہنوں کی طرح..... آپ کسی بھی صورت خود وقت نکالیں۔“

”مس تقدیم! یہ تو میں آپ کی دوست کو لکھ کر دینے کو تیار ہوں کہ مقدمے کا فیصلہ انہی کے حق میں ہوگا..... طلاق اگر مرد کا اختیار ہے تو طلع عورت کا حق..... جب کوئی خاتون اپنے شوہر سے علیحدگی کا فیصلہ کر لے تو عدالت اسے اس کی مرضی کے خلاف شوہر کے ساتھ رہنے پر مجبور نہیں کر سکتی..... جلد یا بدیر فیصلہ عورت کے حق میں ہو جاتا ہے..... اور یہ کوئی قتل کا مقدمہ بھی نہیں کہ فیصلہ ہونے میں برسوں لگیں..... انشاء اللہ جلد ہو جائے گا۔“
”مگر وہ شخص مقدمے کو طول دینے کے لیے حرج بہ حرج جو آزار پہا ہے، پہلے اس کے وکیل نے دو ماہ کے لیے اس کی ملک میں عدم موجودگی کو جواز بنا کر بحث کے لیے کئی تاریخیں لی اور اب میری وکیل نے بیرونی سے معذرت کر لی۔ مجھے ڈر ہے کہ اگر میں نے کوئی انجانا وکیل مقرر کیا تو کہیں اسے بھی نہ توڑے وہ شخص۔“ حجاب نے خدشہ ظاہر کیا۔

”ایسا نہیں ہوتا محترمہ..... بجا کہ ہم وکیل بھی انسان ہی ہیں..... ہو سکتا ہے آپ کی سابقہ وکیل کے عذر میں اسی شخص کا ہاتھ ہو لیکن یہ تو نہیں کہ اس کے ہاتھوں ہر وکیل ہی ٹوٹا چلا جائے گا۔“
”وکیل صاحب! میں نے کہا ناں مجھے اس بات کا ڈر ہے..... وہم کہہ لیں۔“ حجاب کو خفت محسوس ہوئی۔
”وہم کا تو کوئی علاج نہیں خاتون۔“ اولیس انصاری نے مشتکی سے کہا۔ حجاب نے آنکھوں ہی آنکھوں میں تقدیم کی محنت کی کہ وہ اولیس انصاری کو مقدمے کی بیرونی پر مجبور کرے۔

”اولیس صاحب! آپ خود وقت نکالیں پلیز..... کسی بھی طرح.....“ تقدیم نے اولیس انصاری سے کہا۔
”کسی بھی طرح.....“ اولیس انصاری نے اپنے لیوں پر دھیمی سی مسکان کے ساتھ اس کے الفاظ دہرائے پھر مزید کہا۔ ”چاہے میرے پاس مرنے کے لیے بھی وقت نہیں ہو۔“
”خدا آپ کو عمر دراز عطا فرمائے۔“ تقدیم نے بے ساختہ کہا۔
اولیس انصاری کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

”زندگی بھر نمون ہوں گی۔“ تقدیم نے کہا اور اولیس انصاری کو غیر معمولی گہری نگاہوں سے اپنی طرف دیکھتے پھر کججوب سی ہو گئی۔

اولیس انصاری کی نگاہیں ساٹھ درجے کے زاویے پر حجاب کی جانب گھومیں اور اس نے حجاب سے کہا۔ ”گزشتہ پانچ سال سے میں اس این جی او کو قانونی مشاورت دے رہا ہوں جہاں آپ کی دوست حجاب رہتی ہیں..... اپنی مضبوط سفارش لاتی ہیں آپ اپنے ساتھ کہ میں آپ کا کیس لینے پر مجبور پارہا ہوں خود کو۔“
”تھینک یو.....“ تھینک یو ویری ریج وکیل صاحب.....“ حجاب کا چہرہ یک لخت ہنستا تھا۔ ”ایڈوکیٹس ٹو یو۔“
اس نے تقدیم کی طرف دیکھا۔

”تم نے میرا شکریہ ادا کیا تو الطاف کے بجائے میرے ہاتھوں قتل ہو جاؤ گی۔“ تقدیم نے مسکرا کر کہا۔
”الطاف کون؟“ تقدیم نے بتایا۔
”لا حول ولا قوۃ!“ حجاب بے ساختہ بولی۔

رہتی تھیں..... اور اس پر مستزاد شادی کے لیے عازرہ کا اصرار۔
”یار! چھینیں کا تو ہو جانے دو..... اس سے پہلے تو مجھے میرا ڈیفنڈر زوالی مراعات بھی نہیں ملیں گی۔“ ایک روز اس نے کہا۔

”دونوں مل کر بیچ کر لیں گے مونس۔“ اس نے امید دلائی۔
”دونوں مل کر کہاں..... تم نے تو ابھی ڈگری مکمل کی ہے..... کمیشن کے لیے اپلائی کرو گی..... سلیکشن پھر ٹریننگ..... پوسٹنگ۔“
”میں نے کمیشن کے لیے اپلائی کرنے کا ارادہ ملتوی کر دیا ہے۔“
”کیوں؟ وہ چونکا۔“

”میرے فریڈز کہتے ہیں سول لائف میں زیادہ آپشنز زیادہ پیسہ ہے۔“
”ہاں یہ تو ہے۔“
”میں پبلک سیکٹر کے کسی بڑے ادارے میں یا پھر کسی ملٹی نیشنل میں جاب لینے کی کوشش کروں گی۔“
”جو تمہیں مل بھی جائے گی۔“ وہ اسے گہری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولا۔
”جوٹی ہو کیا؟“ وہ مسکرائی۔ ”جوتے یقین سے یہ بات کہہ دی۔“
”جوٹی نہ سہی تمہاری ذہانت، تمہاری صلاحیتوں کا تو علم ہے ناں مجھے!“
”تھینک یو۔“ وہ مسکرائی۔ ”برنارڈ شا کا واقعہ تو سنا ہو گا تم نے!“
”کون سا واقعہ؟“

”سنا ہے برنارڈ شا کو جو اللہ کی بخشی ہوئی صورت رکھتا تھا ایک خوب صورت خاتون نے شادی کی پیشکش کی اور کہا ہماری شادی کے بعد ہمارے ہاں جو اولاد ہوگی اسے آپ کی ذہانت اور میری خوب صورتی مل گئی تو وہ کیا کمال کی مخلوق ہوگی..... برنارڈ شانے کہا اور اگر ہماری اولاد کو آپ کی ذہانت اور میری صورت مل گئی تو.....؟“
”کیا مطلب ہے تمہارا؟“

”مطلب یہ جنٹلمین کہ..... مجھے آپ کی طرح کے پیڈسم بیچے چاہئیں۔“ مونس کو اس کی بے باکی پر حیرت ہوئی۔ لڑکیاں اظہار محبت کرتے ہچکچاتی ہیں..... من پسند نو جوان سے شادی کی خواہش ظاہر کرنے میں دونوں متردد رہتی ہیں اور عازرہ.....!

”تم اپنے پیرنٹس سے بات کرو نا مونس.....“ عازرہ ہنسی۔
”تھوڑا انتظار.....“ وہ کججوب بھری نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

☆☆☆

اپنے مقدمے کی بیرونی کے لیے نیا وکیل کرنے کو حجاب نے تقدیم سے مشورہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ تقدیم نے ایک دوبار ذکر کیا تھا کہ این جی او کے قانونی معاملات کے سلسلے میں اس کا کلاسے بھی رابطہ رہتا ہے۔ حجاب نے سوچا شاید تقدیم دوسرے وکیل کی خدمات حاصل کرنے کے سلسلے میں اسے کوئی مناسب مشورہ دے سکے۔ اب تو اسے یہ خدشہ بھی ہو گیا تھا کہ کہیں دوسرا وکیل بھی پہلی وکیل کی طرح کسی نازک موڑ پر ہری جھنڈی نہ دکھائے۔ بجا کہ ہر پیشے کی کچھ اخلاقیات ہوتی ہیں سو وکلاء کی بھی تھیں مگر الطاف کے ہاتھ لے جتے اور حجاب کا دل چغلی کھاتا تھا کہ اس کی سابقہ وکیل کے انکار کے پیچھے الطاف ہی کا ہاتھ تھا۔

میں داخل ہوتے وقت جو سراپا سبکی اور غلبان تھارفع ہو گیا۔
”پچھوریاں بہت عمدہ ہیں۔“ لڑکے کے والد نے کہا۔
”تمہید نے بنائی ہیں پچا جان۔“ ثریا نے بتایا۔

”مڑا نقل بھی زبردست ہے پاپا۔“ لڑکے کی شادی شدہ بہن نے کہا۔

”تمہید ہر چیز زبردست بناتی ہے۔“ ثریا بولی۔ ”یہ جو صفہ سیٹ برائپلیک کی کڑھائی ہے یہ بھی تمہید نے کی ہے اور..... وہ جو کونے میں گلدان رکھا ہے اس میں جو پھول لگے ہیں وہ بھی تمہید ہی نے بنائے ہیں۔“
”بہت خوب صورت۔“ چچی بھی گلدان میں لگے پھولوں پر اپنی نگاہ مرکوز کیے ہوئے تھیں۔

”تمہید بیٹی! آپ جانا چاہیں تو جاسکتی ہیں..... ہم لوگ اب اپنی باتیں کریں گے۔“ چچا نے کہا۔

تمہید اٹھی تو چچی نے اسے اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے اور پیار کرتے ہوئے رخصت کیا۔
تمہید کے جانے کے بعد ثریا کے بچانے اباسے کہا۔ ”بچ پوچھیں تو ہمیں اپنے بیٹے کے لیے آپ ہی جیسے لوگوں کی تلاش تھی۔“ انہوں نے اپنا روئے خن ثریا کی طرف پھیرا اور بولے۔ ”ثریا بیٹی شکریہ..... تم نے ہمیں صحیح جگہ پہنچا کر ہمارا کام آسان کیا۔“

”ارے پچا یہ تو میرا فرض تھا..... آخر آپ بھی تو کتنی بہت سی باتوں میں میرے اور نادر کے لیے آسانیاں دیتے ہیں..... آپ کا یہ احسان میں ساری زندگی نہیں بھول سکتی کہ نادر کی نوکری آپ نے لگوائی۔“

”بیٹی ہوتی میری.....“ چچا بولے پھر انہوں نے اماں اور ابا کو دیکھا اور کہا۔ ”ثریا بیٹی نے آپ لوگوں کی اتنی تعریف کی ہے کہ میری دلی خواہش ہے آپ لوگوں سے ہماری رشتے داری قائم ہو..... یہ میرا بیٹا آپ کے سامنے بیٹھا ہے، آپ جو چاہیں اس سے سوال کریں جیسے اور جس سے چاہیں ہمارے بارے میں چھان بین کریں..... میں آپ کو اپنا اور صاحبزادے کے دفتر کا اتنا پیار فون نمبر اور اپنے اور صاحبزادے کے چند قریبی ساتھیوں اور افران کے فون نمبر دے دوں گا تاکہ آپ پوچھ گچھ کر کے اپنا اطمینان کر سکیں..... میرے محلے کا چکر لگائیں، آس پڑوس سے معلومات لیں، بیٹے کے چال چلن کے بارے میں اپنی نشانی کریں..... رشتے داروں کے اتے سچے اور فون نمبر بھی فراہم کر دوں گا..... آپ کو کئی آزادی ہے کہ جس سے چاہیں ملیں جس سے چاہیں پوچھ گچھ کریں..... اگر آپ مطمئن ہو جاتے ہیں تو میری اور میری اہلیہ کی خواہش ہوگی کہ تمہید بیٹی ہماری بیٹی بن کر جلد از جلد ہمارے گھر آجائے۔“

”آپ اپنا اطمینان بھی تو چاہیں گے..... پہلے آپ ہمارے بارے میں اطمینان کر لیں۔“ ابا بولے۔

”آپ کا اطمینان زیادہ ضروری ہے۔“ چچا نے کہا۔

”ہمارے اطمینان کے لیے یہی کافی ہے کہ ثریا آپ کی بیٹی ہیں۔“

”ہمیں بھی کسی چھان بین، کسی سے پوچھ گچھ کی ضرورت نہیں..... شریف لوگ اپنے چہروں سے پہچانے جاتے ہیں..... سب سے بڑا اطمینان دل کی گواہی ہوتی ہے..... ہمارا دل مطمئن ہے۔“ ثریا کے چچا نے کہا۔

”اللہ کی رضا اور خبر و برکت حاصل کرنے کو ہم استخارہ بھی کر لیں گے..... بلکہ آپ لوگ بھی کر لیں۔“ چچی نے کہا۔
”انشاء اللہ!“ ابا نے کہا۔

تعارفی نشست انتہائی خوشگوار ریت کے ساتھ برخواست ہوئی۔

اگلے روز ہی ثریا کے چچا کا ابا کو فون آ گیا اور انہوں نے مسرت سے معمور لہجے میں کہا۔ ”ہم دونوں میاں،

اولیں انصاری نے چونک کر حجاب کی جانب دیکھا۔ حجاب نے سر جھکا لیا اور دھیمی آواز میں بولی۔ ”بعض انسان ایسے ہی ہوتے ہیں وکیل صاحب! اس شخص نے مجھے نفسیاتی طور پر رٹا رہ کر کرنے کے لیے کیا، کیا حربے نہیں آزمائے..... میں آپ کو ضرور بتاؤں گی..... سنا ہے مریض کو اپنے معالج سے اور موکل کو اپنے وکیل سے حقائق چھپانے نہیں چاہئیں۔“

”بالکل درست سنا ہے آپ نے..... اس وقت تو میں ہائی کورٹ جانے کو اٹھ رہا ہوں..... ایسا کریں آج یا کل شام آپ میرے آفس آجائیں..... شام کو سات بجے کے بعد میں وہیں ہوتا ہوں۔“ اولیں انصاری نے اپنا وزینگ کارڈ نکال کر حجاب کی طرف بڑھایا۔ ”آنے سے پہلے احتیاطاً فون کر لیجیے گا۔“

”اوکے!“

تقدیم کے ساتھ کورٹ کے پرہنگام راستوں سے گزرتے ہوئے حجاب نے جو بڑی سی چادر اوڑھے آنکھوں کے سوا اپنا باقی چہرہ چادر سے چھپائے ہوئے تھی سرگوشی میں تقدیم سے پوچھا۔ ”وکیل صاحب کنوارے ہیں یا شادی شدہ؟“

”پتا نہیں۔“ تقدیم نے جواب دیا۔

”حیرت ہے۔“

”کیا مطلب؟“ تقدیم ٹھٹھک گئی اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔

”بندے کو اپنی معلومات اپ ٹو ڈیٹ رکھنی چاہئیں۔“ حجاب کی آنکھوں میں مسکراہٹ کوندی۔

”یو سلی گرل۔“ تقدیم نے اپنے سر کو جھٹکا اور دوبارہ تیز تیز قدم بڑھانے لگی۔ حجاب اس کے پہلو پہ پہلو تھی۔ تقدیم کی دوستی آج اس کے کتنی کام آئی تھی۔

☆☆☆

ثریا نے تمہید کے رشتے کے لیے اپنے چچا اور ان کے گھر والوں کو لانے میں لیت وعل سے کام نہیں لیا۔ اماں سے بات کرنے کے بعد تیسرے ہی دن وہ ان لوگوں کو لے آئی۔ نادر بھی ساتھ تھا۔ لڑکے کے والدین، بہنوں اور خود لڑکے کے چہرے پر بھمکی شرافت ان کے خاندانی پن کی غماز تھی۔ سیدھے سادے، مہذب اور شریف لوگ جن کے انداز و اطوار سے حلیم الطبعی عیاں تھی۔ گفتگو بہت نرمی تھی اور مذاق شست تھا۔ اماں کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ ثریا کے قریبی رشتے دار اتنے وضعدار ہوں گے۔ ثریا بے باک اور منہ پھٹ تھی۔ انداز و اطوار میں وہ ششکئی نہ تھی جو اس کے چچا اور ان کے اہل خانہ میں دیکھنے کو ملی۔ وجہ ثریا نے اس روز اماں یا کسی اور کے پوچھنے بنا اپنے چچا اور ان کے اہل خانہ کے سامنے ان خود بیان کر دی۔

”آئی!“ ثریا نے اماں کو بطور خاص مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”میری دوھیال علی گڑھ کی ہے۔ سب پڑھے لکھے اور سلجھے ہوئے لوگ..... چچا جان کی شادی اپنے خاندان میں ہی ہوئی..... چچی جان ہمارے ابا کے خالہ زاد بھائی کی بیٹی ہیں..... میری اماں دوسرے خاندان سے بیاہ کر آئی تھیں..... دلی کا خاندان تھا..... چچا رے دار لوگ..... اماں ہماری خدا بخشے اتنے لذیذ کھانے پکائی تھیں کہ لوگ انگلیاں چاٹتے رہ جاتے تھے۔“
”یہ کتنی بڑی خوشی تھی۔“ ثریا کی چچی بولیں۔ ”عورت کا اصل زور تو اس کا سلطنت اور گھر داری ہی ہوتی ہے۔“
تمہید چائے لے کر مہمانوں کے سامنے آئی تو ثریا کی چچی نے اسے بہت اپنائیت اور پیار سے اپنے نزدیک بٹھایا۔ چچی اور ان کی دونوں بیٹیوں نے تمہید سے اتنی محبت اور نرمی سے بات کی کہ چائے کی ٹرے لے کر پیشک

بیوی نے استخارہ کیا اور بلال سے بھی کروایا..... الحمد للہ بہت مبارک اشارے ملے ہیں..... اب بس آپ کی طرف سے اشارہ ملنے کی دیر ہے۔“

”جب آپ کا جی چاہے۔“ ابانے جواب دیا۔

”بہت بہت شکریہ۔“

چچا کی وضعداری نے ثریا کو شامل حال رکھا۔ ثریا اپنے شوہر نادر کے ہمراہ چچا کا یہ پیغام لے کر پہنچی کہ چچا اور ان کے گھر والے جمعہ کی شام تمہید کے لیے اپنے بیٹے کا رشتہ لے کر آرہے ہیں اور محفلی و مٹنی کے جھمیوں میں پڑنے کے بجائے اسی روز بات پکی کر کے شادی کی تاریخ بھی طے کر دینے کے خواہاں ہیں۔ ثریا کی آمد نے گھر کی فضا ہی بدل دی۔ نسیم بھی سب کے ساتھ آ بیٹھی۔ کچھ تاخیر سے سہی بالآخر تمہید کا مقدر کھلنے کا وقت آ گیا تھا۔

☆☆☆

سول جج کی عدالت کچھ کھج بھری ہوئی تھی۔ الطاف کے خلاف حجاب کے دعویٰ برائے خلع پر بحث جاری تھی۔ الطاف اپنے وکیل سیف علی خان اور حجاب اپنے وکیل اولیس انصاری کے ساتھ کرسی انصاف پر بیٹھے جج کے رد برو تھے۔ اولیس انصاری نے نہ صرف حجاب کی سابقہ وکیل کی فراہم کردہ فائل کو بے نظر غور دیکھا تھا بلکہ حجاب سے زبانی کلامی بھی ضروری نکات پر تبادلہ خیال کیا تھا۔ جس عدالت میں مقدمہ زیر سماعت تھا اس سے درخواست کر کے اس نے اب تک مقدمے کے سلسلے میں ہونے والی پیش رفت سے آگہی کے لیے اہم کاغذات کی نقول بھی حاصل کر لی تھیں۔ اس نے حجاب کو امید دلائی تھی کہ عدالت اسے خلع کا فیصلہ دینے میں اب زیادہ وقت نہیں لے گی۔

”میڈم! اس نوعیت کے مقدمات کا فیصلہ تو ہم عدالت میں جاتے ہیں اور لے آتے ہیں..... ڈیفنڈنٹ محض اپنے وسائل اور اثرو رسوخ کی بنا پر کیس کو اتنا کھینچ لے گیا ہے ورنہ اس میں اس کی طرف سے تو کچھ بھی جان نہیں۔“

”ہم تو عدالت کے چکر لگا لگا کر تھک گئے ہیں وکیل صاحب..... کبھی جج صاحب چھٹی پر چلے جاتے ہیں..... کبھی ایک سے دوسری بات سننے بغیر ہی اگلی تاریخ دے دی جاتی ہے..... بحث کے لیے..... اس مرتبہ اور کچھ نہیں تو الطاف کی ملک سے دو ماہ غیر حاضری کی بنا پر دو ماہ لمبی تاریخ دے دی گئی۔“ امی جو حجاب کے ہمراہ اولیس انصاری کے دفتر آئی تھیں دل گرفتہ لہجے میں بولیں۔

”اماں جی کوشش کریں گے کہ اب مزید تاخیری حربے نہ آزمائے جائیں۔“ اولیس انصاری نے امی کو اطمینان دلایا۔

عدالت میں بحث کے موقع پر اولیس انصاری نے کرسی انصاف پر متمکن جج سے کہا۔ ”جناب والا! میاں بیوی کا رشتہ باہمی اعتماد کا رشتہ ہوتا ہے اگر یہ اعتماد ہی نہ رہے تو زندگی کی پوری عمارت متزلزل ہو جاتی ہے۔ میری مولا کا ایک تعلیم یافتہ اور باشعور خاتون ہیں۔ جس شخص سے اس کا رشتہ مناکحت قائم ہوا اس نے اس رشتے کی بنیاد جھوٹ پر رکھی..... اس نے خود کو کنوارا ظاہر کیا جبکہ وہ پہلے سے شادی شدہ تھا اور میری مولا سے نکاح کے وقت اپنی پہلی منکوحہ کے لطن میں نمو پاتے بچے کا باپ بننے والا تھا۔ اس حقیقت کے آشکار ہونے پر میری مولا کو نہ صرف صدمہ پہنچا بلکہ معاشرے میں اس کی ساکھ پر بھی ضرب پڑی..... میری مولا کا ایک ذمے داری شہری، پاکیزہ کردار کی حامل ایک نفیس الطبع مشرقی خاتون اور شعبہ تعلیم سے وابستہ ہونے کی بنا پر نوجوان نسل کی کردار سازی اور تربیت اخلاق میں اپنا کردار ادا کر رہی ہے..... اس کا وسیع حلقہ احباب ہے، اس کی نگرانی میں چلنے والے تعلیمی ادارے کی طالبات کے کردار کو اسی کے قول و فعل سے براہ راست اثر پذیر کر رہی ملتی ہے..... میری مولا کا معاشرہ

پھرنے سے قاصر تھی۔ مدعیہ نے میرے موکل سے لفٹ مانگی اور.....
”آپ غیر ضروری طوالت میں جا رہے ہیں.....“ جج نے ٹوکا۔

”اور قطعاً جھوٹ بول رہے ہیں۔“ جناب نے صدائے احتجاج بلند کی جو الطاف کے وکیل کی خود ساختہ جھوٹی کہانی پر دل ہی دل میں نہ صرف جج و تاب کھاری تھی بلکہ شرمندہ بھی تھی کہ امی یہ سب کچھ سن کر اس کے بارے میں کیا سوچتی ہوں گی اور..... اولیس انصاری کو کیا پیغام مل رہا ہوگا..... کہ وہ ایسی تھی۔
”جج تو ابھی کھلے گامیڈم صلبہ۔“ سیف علی خان اس کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرایا اور بولا۔
وہ کانپ کر رہ گئی..... اور کیا جج کھولے گا وہ۔

سیف علی خان نے روئے سخن دوبارہ جج کی طرف کیا۔ ”جناب والا! لفٹ کے بہانے مدعیہ نے میرے موکل سے راہ ورسم بڑھائی..... اس کی قیمتی گاڑیوں میں اس کے ساتھ گھومتی پھرتی رہی..... ہونٹنگ کی..... شاپنگ کی..... اور میرے موکل کی اہلیہ کے بیڈریسٹ پر ہونے کا خطرہ خواہ فائدہ اٹھایا..... گھر کی بیوی حالت حمل میں ہو اور وضع حمل کے دن قریب تو باہر کی عورتوں کو مردو بہکانے کا کھلا موقع مل جاتا ہے..... مدعیہ نے میرے موکل کو پوری طرح اپنے دام میں پھنسا لیا اور اسے بلیک میل کرنے کو نکاح کی شرط رکھ دی..... میرا موکل ایک شریف آدمی ہے..... اپنی عزت بچانے کو اس نے مدعیہ کے ہاتھوں بلیک میل ہونے کی نسبت اس سے نکاح کر لینے کو ترجیح دی..... مدعیہ نے نکاح کے وقت پچاس تولہ طلائی زیورات، دس لاکھ روپے مہر، قیمتی عروسی لباس اور ایک مربع زمین اپنے نام کھوانے کی فرمائش کی جو میرے موکل نے اپنی سادگی اور شرافت کے باعث قبول کی۔“
”یہ جھوٹ ہے۔“ جناب کی آواز میں بھراہٹ تھی۔ اس کی نگاہیں مدافعت کی التجالیے اولیس انصاری کی طرف اٹھیں۔ وہ جج کو دیکھ رہا تھا۔

”بی بی! یہ جھوٹ کیسے ہو سکتا ہے؟“ جج نے کہا۔ ”اپنے شوہر کی جانب سے ان تمام چیزوں کے دیے جانے کا اقرار تو تم اس عدالت کے سامنے پہلے کر چکی ہو۔“
”مجھے اب بھی انکار نہیں جج صاحب..... مگر یہ کہنا کہ یہ چیزیں میرے مطالبے پر دی گئیں بالکل غلط ہے..... میں نے ایک تنکا بھی ڈیما بند نہیں کیا تھا، نہ ہی میرے گھر والوں نے..... یہ سب کچھ ہمارے مانگے بنا..... میرے گھر والوں کو اپنی امارت کے رعب میں لینے کے لیے دیا گیا..... میں نے عدالت کے سامنے اعتراف کیا کہ یہ ساری چیزیں ہماری تحویل میں ہیں اور ہم سب کچھ واپس کرنے کو تیار ہیں۔“
”اس لیے جناب والا مدعیہ نے اب میرے موکل سے بھی زیادہ موٹا ٹکار چھاس لیا ہے۔“ سیف علی خان نے برجستہ کہا۔

جناب نے ہڑبڑا کر امی کو دیکھا پھر اس کی نظریں اولیس انصاری کی طرف گھومیں مگر اسے دیکھنے کی ہمت کیے بنا پلٹ آئیں۔

”یہاں میں ایک اور بات آپ کے علم میں لانا چاہوں گا حضور والا کہ..... جو چیزیں ریکارڈ پر ہیں ان کے علاوہ بھی مدعیہ مختلف اوقات میں بہانے بہانے میرے موکل سے آف دی ریکارڈ لاکھوں روپے کی رقم دونوں ہاتھوں سے پور چکی ہے جس کا اگر ریکارڈ رکھا جاتا تو وہ رقم کروڑوں تک پہنچتی۔“

”اوہ تو!“ جناب کا بس نہ تھا سیف علی خان کا منہ نوج لیتی۔ اس نے بے بسی سے پہلے امی پھر اولیس انصاری کو دیکھا۔ اولیس انصاری نے کچھ اس طرح کا تاثر دیا جیسے کہتا ہو یہ سب کچھ میرے علم میں نہیں تھا! وہ شرم

کے متوسط طبقے کی نمائندہ ہے جبکہ اس مقدمے کا فریق دوم ایک امیر وکیر آدمی ہے جس کے بے بہا اثاثے ہیں..... پہلے سے شادی شدہ اس امیر وکیر شخص سے میری موکلہ کا رشتہ مناکحت اس کی نگرانی میں چلنے والے تعلیمی ادارے کی نوجوان غیر شادی شدہ اساتذہ... اور نو عمر طالبات کو اس پیغام کی بنیاد بھی تو بن سکتا ہے کہ شادی کے لیے امیر آدمی چھاننا اور خواہ وہ پہلے سے شادی شدہ اور بچوں والا ہی کیوں نہ ہو اس سے شادی رچاؤ۔“
”میرے فاضل دوست! آپ نے میری اور میرے موکل کی مشکل آسان کر دی۔“ الطاف کے وکیل نے مدخلت کی۔

جج نے الطاف کے وکیل کو تنبیہی انداز میں انگلی دکھائی۔
”جناب والا..... میں اس موقع پر کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔“
”میری بات ابھی پوری نہیں ہوئی ہے جناب۔“ اولیس انصاری نے کہا۔
”میں جانتا ہوں..... آپ کی شعلہ نوازی کی تو عدالتوں میں دھوم ہے، میرے دوست آپ کو تو میں زمانہ طالب علمی سے جانتا ہوں۔“ سیف علی خان استہزائیہ انداز میں مسکرایا اور اس نے جج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میرے فاضل دوست اور میں ایک ہی کالج سے فارغ التحصیل ہیں جناب والا۔“
”وکیل صاحب ذاتیات پر اتر آئے ہیں جناب والا..... میری عدالت سے استدعا ہے کہ انہیں حدود میں رہنے کا پابند کرے۔“ اولیس انصاری نے کہا۔
”ذاتیات اور غیر ضروری باتوں سے گریز کیا جائے۔“ جج نے سیف علی خان کو دیکھتے ہوئے تنبیہ جاری کی۔
”ضروری بات کی تو اجازت ہے جناب والا۔“ سیف علی خان نے کہا۔
”کیسے..... کیا کہنا چاہتے ہیں آپ؟“

”سر! جھوٹ میرے موکل نے نہیں بولا..... یہ سراسر ہمت ہے میرے موکل پر کہ اس نے مدعیہ سے اپنے رشتہ مناکحت کی بنیاد پر جھوٹ پر رجمی..... مدعیہ کو نکاح سے قبل یہ بات بہت اچھی طرح معلوم تھی کہ جس شخص سے وہ نکاح کرنے جا رہی ہے وہ شادی شدہ ہے اور اس کی بیوی اپنے پہلے بچے کی ماں بننے والی ہے..... مدعیہ کوئی گھر بیٹھی سیدھی سادی، معصوم اور لہو و شیزہ نہیں جو زندگی کے بیچ و خم سے آگاہ نہ ہو بلکہ..... گھر سے باہر نکلنے والی ایک تیز طرار عورت ہے جس کا دن بھر باہر کے لوگوں سے رابطہ رہتا ہے..... ایک تعلیمی ادارے کی نگرانی اور اس کا انتظام و انصرام کوئی معمولی بات نہیں ہوتی..... مختلف الزام اساتذہ کو ایک پلیٹ فارم پر رکھ کر ان سے کام لینا، شہر بے مہار نو عمر طالبات کو قابو رکھنا، ان کے والدین اور سرپرستوں کو مطمئن کرنا..... چنداں آسان کام نہیں..... گرگ باران دیدہ بننا پڑتا ہے..... اڑتی چڑیا کے پر گن لینے والی نظر رکھنی پڑتی ہے..... مدعیہ یہ سب کچھ کر رہی تھی..... میرے موکل سے اس کی پہلی ملاقات جو توں کے ایک بڑے اسٹور میں ہوئی جہاں میرا موکل اپنی بیاتنا بیوی کے لیے قیمتی جو توں کا ایک جوڑا خرید رہا تھا..... مدعیہ نے جو وہاں شخص وٹو شاپنگ کے لیے گئی تھی میرے موکل سے نہ صرف خریدے گئے جو توں کی قیمت دریافت کی بلکہ یہ بھی پوچھا کہ اس نے جوتے کا وہ جوڑا کس کے لیے خریدا تھا..... میرے موکل نے مدعیہ کی اس بے تکلفی پر حیران بلکہ دل ہی دل میں معترض ہوتے ہوئے اسے سرد مہری سے بتایا کہ جو توں کا وہ جوڑا اس نے اپنی بیوی کے لیے خریدا تھا۔ میرے موکل کی اس بات پر مدعیہ نے بات کو طول دینے کو پوچھا کہ بیوی ساتھ کیوں نہیں آئی؟ اس کے اس سوال پر میرے موکل نے اسے بادل نا خواستہ جواب دیا کہ وہ پریکٹس تھی اور ڈاکٹر کی ہدایت پر بیڈریسٹ پر ہونے کے باعث زیادہ چلنے

سے پانی پانی ہو گئی۔

”ایسی عورتوں کا وتیرہ یہی ہوتا ہے جناب والا۔“ سیف علی خان جج کی طرف اپنا روئے سخن کیے شعلہ نوا ئی کر رہا تھا۔ ”یہ کسی ایک شریف آدمی کی عزت سے کھیلنے پر قناعت نہیں کرتیں..... ایک کے بعد دوسرا..... دوسرے کے بعد تیسرا..... پھر چوتھا..... پھر کوئی اور..... یہ نئی اساسیوں کی تلاش میں رہتی ہیں جناب والا اور جیسے ہی انہیں نیا شکار ملتا ہے یہ پچھلے کو دکھا دے کر آگے نکل لیتی ہیں..... مدعیہ نے میرے موکل کو دونوں ہاتھوں سے لوٹا اور اب اپنے کسی نئے شکار کی خاطر اس پر غلط الزامات لگا کر بذریعہ عدالت خلع حاصل کرنا چاہتی ہے..... جناب والا میرا موکل ایک ایسے خاندان کا فرد ہے جس کے مرد ایک مرتبہ کسی عورت سے بیوی کا رشتہ استوار ہو جانے کے بعد اسے اپنی عزت سمجھتے ہیں اور اپنی عزت کو گھر سے نہیں جانے دیتے..... مدعیہ کا عدالت میں آنا اور خلع کے لیے مقدمہ دائر کرنا میرے موکل کے لیے بے عزتی اور رسوائی کا باعث بنا ہے..... عدالت سے استدعا ہے کہ مدعیہ کو بے آبروئی سے بچنے اور میرے موکل کی شرافت اور عظمت کی دلیل ہے کہ وہ مدعیہ کی تمام تر خطاؤں کے باوجود اب بھی اسے قبول کرنے اور اپنے گھر میں بسانے کو آمادہ ہے..... مؤثر عدالت سے میری گزارش ہے کہ بیان کردہ حقائق کی روشنی میں اس پیشکش کو باطل قرار دے کر مقدمہ خارج کیا جائے۔“

جناب کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ الطاف کا وکیل بھری عدالت میں یوں اس کی کردار کشی کرے گا۔ الطاف کا یہ وار اس کے گزشتہ تمام ہجمنڈوں سے زیادہ کاری تھا۔ احساسِ ذلت سے اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ اپنے وکیل اوپس انصاری، سبکی ماں اور عدالت میں موجود دوسرے لوگوں سے نظریں ملانے کی ہمت نہیں تھی۔ بس نہ تھا کہ زمین بھرتی اور وہ اس میں سما جاتی۔ کتنے رکیب الزامات لگائے تھے الطاف کے وکیل نے اس پر۔ دفعتاً اس نے امی کو چلاتے ہوئے سنا۔ ”تم لوگوں کو خدا پوچھو گا۔“ وہ کہہ رہی تھیں۔ ان کی آواز رنج و درد میں ڈوبی ہوئی تھی۔

جناب ایک ہاتھ سے دیوار کا سہارا لیتی اس چوٹی پر بیٹھ گئی جس پر لوگوں کو بیٹھے دیکھ کر انہیں باہر ہٹانے کے لیے پیش کار، عدالتی پرکارہ اور کبھی بھی جج صاحب بھی نہیں تھیں تو جن کی حدیں پار کر جاتے تھے۔ ”اماں جی آپ کیا لگتی ہو اس بی بی کی؟“ جج نے پہلے امی پھر جناب پر نظر ڈالتے ہوئے امی سے پوچھا۔ ”میں اس کی ماں ہوں..... بیٹی ہے یہ میری..... ان ہاتھوں نے پرورش کی ہے اس کی..... مجھ سے زیادہ کون جان سکتا ہے اسے۔“ امی کی آواز بھرا رہی تھی۔

جناب کا دل بھر آیا۔ امی کی ساری زندگی تو مشقت میں گزری ہی تھی، اب اس عمر میں انہیں اس کی وجہ سے یہ ذلت بھی سہی پڑ رہی تھی..... اس ذلت سے تو وہی ذلت اچھی تھی جس کا نام الطاف تھا۔ اچانک اس کے ڈھکے چہرے اور کھلی آنکھوں پر تیز روشنی پڑی..... وہ کیمبرے کی فلیش گن کی ایک تھی۔ اس نے گہرا کر اپنی آنکھوں پر ہاتھ ڈھانپ لیا پھر آنکھوں پر سے ہاتھ ہٹا کر اپنے رخ پر آنے والی روشنی کی سمت میں نظر دوڑائی۔ نہ جانے کون تھا وہ جو کیمبرہ ہاتھ میں لیے تیزی سے عدالت کے کمرے سے نکلتا دکھائی دیا۔ جناب کی سر اسیمہ لگا ہیں نہیں اور الطاف پر جا رکیں۔ اپنی مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ گہری نگاہوں سے اسی کی جانب دیکھ رہا تھا۔

باقی آئندہ

پیتل کا پیالہ

صبح یوسف



”بس میں نے کہہ دیا کہ میں صرف چارکپ، چار پٹیل اور تین چمچ کل ملا کے گیارہ برتن ہی دھوؤں گی، سن لو یہ تم..... اور ویسے بھی ابھی میرا پیندہ نہی وی پروگرام چل رہا ہے.....“ رابعہ نے قطعاً لہجے میں کہتے ہوئے ریوٹ اٹھالیا۔ ”کیا رانی، تم بھی بڑی عجیب باتیں کرتی ہو بھلا ایسے بھی کوئی برتن کن کن کے دھوتا ہے..... کبھی معمول کے برتنوں سے کھنکھس ایک برتن ہی تو زیادہ ہے جو دادا ابا کا پیتل کا پیالہ ہے اور کیا.....“ نہایت نرم لہجے میں عائشہ نے کہہ کر ریوٹ اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ ”کیا.....؟“ وہ صدمے سے چیختی تو پڑی۔ ”کیا.....! وہ بارہواں برتن وہ برتاؤں سے پڑوا دیا کا پیالہ ہے.....؟ تمہیں یاد نہیں کہ انہیں کالی کھانسی کی بیماری سے پھر بھی تم نے وہ برتن مجھے دھونے کو دے دیا۔ اوہ نو..... مجھے تو اسے دھونے کے خیال سے ابھی سے وحشت ہونے لگی ہے۔“

”بس میں نے کہہ دیا کہ میں صرف چارکپ، چار پٹیل اور تین چمچ کل ملا کے گیارہ برتن ہی دھوؤں گی، سن لو یہ تم..... اور ویسے بھی ابھی میرا پیندہ نہی وی پروگرام چل رہا ہے.....“ رابعہ نے قطعاً لہجے میں کہتے ہوئے ریوٹ اٹھالیا۔ ”کیا رانی، تم بھی بڑی عجیب باتیں کرتی ہو بھلا ایسے بھی کوئی برتن کن کن کے دھوتا ہے..... کبھی معمول کے برتنوں سے کھنکھس ایک برتن ہی تو زیادہ ہے جو دادا ابا کا پیتل کا پیالہ

”کسے کیا کرتے ہوئے وحشت ہو رہی ہے بھی.....“
ای اچانک دوسرے کمرے سے وہاں آگئیں۔

”کک..... کک کچھ نہیں امی بس ویسے ہی.....!“
راجہ کو امی کی طبیعت کا بہت اچھی طرح اندازہ تھا سواش کو گھور کر چپ چاپ باہر نکلے پراکتفا کیا کیونکہ وہ ہمیں کھڑے رہ کر امی کا بڑوں کی خدمت، ان کی عزت یا پھر مکافات عمل کے ثقیل موضوعات پر مبنی لپکھ سنا گوارا نہیں کر سکتی تھی..... اگر انہیں اس کے تار و خیالات کا علم ہو جاتا.....

معلوم نہیں وہ کسی بھی ہر چیز سے کھن کھانے والی کسی پالتو جانور یا پرندے کو برداشت ہی نہیں کر سکتی تھی اور اسے بوڑھے دادا جان سے ایک عجیب سی وحشت ہوتی ان کا رعشہ زدہ جسم ہلٹا ہوا دیکھ کر وہ آب جاتی اگر کوئی ششے کا گلاس یا کب واداکو پکڑا تا اور وہ گر جاتا تو سب سے زیادہ رانی ہی جیتی تھی۔

بچن میں آکر اس نے جلدی جلدی سبک میں پڑے برتن دھو ڈالے اور آخر میں بچن کے کونے میں رکھے ڈسٹ بن کے پاس پڑا پیتل کا وہ پیالہ بھی دھونے لگی جو دادا اب کے بھی کبھار گاؤں سے شہر میں آجائے پر ان کے زیر استعمال ہوتا اور استعمال کے بعد اچھی طرح دھو کر ڈسٹ بن کے پاس دوبارہ رکھ دیا جاتا۔

”گھر والوں نے مجھے کیا چوڑی سمجھ رکھا ہے جو ہر بار یہ پیالہ دھونے کو مجھے دے دیا جاتا ہے۔“ اس نے وہ پیالہ دھو کر زور سے ڈسٹ بن کے پاس پٹخ دیا جو لڑھکتے ہوئے نہ جانے کب سے بچن کے دروازے میں کھڑے دادا اب کے پاؤں کے قریب رک گیا۔ انہوں نے ایک نظر پیالے پر اور دوسری نظر ان کی آمد سے قطعاً انجان ڈیوئل سے ہاتھ دھوئی راجہ پر ڈالی، ہاتھ دھو کر جو بنی وہ پٹکی دادا اب کو دیکھ کر وہیں ٹھک گئی۔

”دادا اب آپ.....!“ اس نے تھوک نگلا۔

”سنجال کر رکھو، تمہارے بھی کام آئے گا.....“ وہ پیالہ اس کے ہاتھ میں تھا کہ اس پر ٹڑی نگاہ ڈال کر پلٹ گئے مگر وہ کافی دیر بعد تک وہیں کھڑے ان کے لہجے کی ٹہنی محسوس کرتی رہی..... نہ جانے کیوں اسے انجانا سا خوف محسوس ہونے لگا اور وہ پیالے کو ہاتھ میں تھامے الٹ

پلٹ کر کھینچتی رہی۔

☆☆☆

بے شمار کیلنڈروں پر لاتعداد اعداد ایک دوسرے کا تعاقب کرتے وقت کی دھند میں کھوتے رہے۔ نہ جانے کتنے دن اور رات بھی ایک دوسرے میں مدغم ہوتے اسے راجہ احمد سے راجہ انیس اور اب بیگم راجہ انیس سے انیس علی مرحوم کی بیوہ بنا گئے۔ اب وہ اپنے اکلوتے بیٹے اور بیوہ کے پاس کراچی کے پوش ایریا میں رہ رہی تھی چونکہ وہ ایک آفیسر بیٹے اور ورلنگ ڈوین بیوہ کے ہاں رہ رہی تھی اور گھر میں کام کے لیے ملازمین موجود تھے سو دن بھر اکیلے گھر میں فارغ رہتی یا پوتے، پوتی کے اسکول سے واپس آجانے پر ان کے ساتھ گن راتھی۔ بچے سارا وقت اسے اپنے پیچھے بھگائے رکھتے کیونکہ وہ صفائی پسند نہیں تھے اور وہ اپنی صفائی پسند طبیعت کے ہاتھوں مجبور اپنے لاغر وجود کو کھینچتی آہستہ آہستہ وہ پھیلاوے میں آتی رہتی۔

”ارے مومے کرمو.....! یہ اس ناہنجار کتے کو روک کیسی بددی آنکھوں سے مجھے گھورتا ہوا اس سفید صوفے پر چھلائیں لگا رہا ہے۔ اپنے گندے سنے بچوں کے ساتھ..... لگتا ہے اس کا تعلق تلوں کے کسی ادنی خاندان سے ہے بھی تو ہر دم گندہی بچائے رکھتا ہے۔“

وہ ڈرائنگ روم میں بھاگتے پیچڑ میں تھڑے TAZZ کے پیچھے بھاگ بھاگ کر ہانچے جارہی تھی۔

”ہنی.....! TAZZ مل گیا..... وہ دیکھو وائٹ صوفے کے اوپر ہنی اور بنی دونوں بہن بھائی ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے آگئے..... سارے گھر میں TAZZ کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر وہ اب تھک گئے تھے سو صوفے پر ڈھسے گئے اور اب TAZZ کو گود میں بٹھا کر اس سے باتیں کرنے لگے۔

”حسین اور بیش، جلدی سے اتارو اس نامعقول جانور کو اپنی گود سے..... کیسے دکانیڑا ہے۔“

”یہ نام ہمارے صرف اسکول میں ہیں..... باقی ہر جگہ ہمہنی اور بنی ہیں۔“

ہنی نے TAZZ بنی کی گود میں منتقل کرتے ہوئے خاصے نرٹھے لہجے میں کہا تو وہ بڑبڑاتے ہوئے بچن میں

چلی آئی۔

”پتا نہیں کیسے کیسے نام رکھ دیے ہیں آج کل کی ماؤں نے اپنے بچوں کے اصلیت تو پتا نہیں کہاں کھوکے رہ گئی ہے۔“

ہر دوسرے دن اسی طرح کی باتیں ہوتیں اور وہ کوفت کھا کر رہ جاتی۔

☆☆☆

کمر پر ہاتھ رکھے وہ جھکی فریج میں سے اپنے لیے مشروب نکال رہی تھی جب ہنی بنی کا شور بچن کی کھڑکی کے باہر سنا۔

”کون سمجھائے ان انگریز کی اولادوں کو کہ شور مت کرو میرے کان درد سے پیٹے جا رہے ہیں۔“ ہنی، بنی کو ڈانٹنے کی خاطر اس نے کھڑکی سے باہر جھانکا تو نظر ان کے لاڈلے TAZZ پر پڑ گئی۔

اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا، سہارے کے لیے فریج کو ہی تھام لیا اسے اپنی سانس سینے میں اٹکی محسوس ہو رہی تھی۔

”کرمو.....!“ درو کی شدت سے وہ چلائی..... کراہ

ایسی تھی کہ کرمو گھر کے آخری کونے سے بھاگتا آگیا۔

”کرمو..... یہ آج پھر..... یہ کیا ہے.....؟“ اس نے شہادت کی انگلی سے کھڑکی کی طرف اشارہ کیا۔

”اوہ گرنی..... آپ ایسے ہی پریشان ہوتی ہیں یہ کوئی نئی بات تھوڑی ہے۔“ کرمو کھڑکی سے باہر جھانک لینے کے بعد مطمئن سا سہارا دے کر اٹھانے لگا۔

”جانتی ہوں بہت پہلے سے یہ سب مگر.....“ مارے افسوس کے آنسوؤں کا پھندا گلے میں ہی اٹکارا گیا اور آگے وہ کچھ نہ بول پائی..... اس کی طبیعت بکڑنے لگی اور اس کی یہ حالت دیکھ کر کرمو کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا وہ تو قسمت اچھی تھی کہ اس کا بیٹا اور بیوہ واپس آگئے فی الوقت اسے یوں نر زور سے سینے کو ملتا دیکھ کر وہ دونوں بھی ہولکا گئے۔

”کرمو..... پانی لاؤ جلدی سے۔“ اس کا بیٹا چلایا۔

بیوہ اس کی کمر سہلانے لگی کرمو پانی لے آیا تو اسے پانی دیکھ کر انکا بنی آگئی۔

”ناں جی..... اٹھ کر پانی پی لیں۔“ بیوہ نے اسے سہارا دے کر اٹھاتے ہوئے پانی پلانا چاہا مگر اس نے زور

پیتل کا پیالہ

سے نفی میں سر ہلا کر پانی کا برتن ایک جھٹکے سے پیچھے کر دیا۔ پانی برتن سے جھٹک کر بہو کے پیروں کو گلیا کر گیا۔

”ماں جی.....!“ بہو چلا اٹھی۔

”آخر سارے دن کی مشقت کے بعد انسان کو اپنے ہی گھر میں بچپن نہ ملے تو وہ کہاں جائے یہاں گھر میں تو آپ عیش کر رہی ہیں ناں ہم سارا دن کام میں رہتے ہیں اور آپ کے گھر..... مجھے پتا ہے کہ آپ یہ

پانی کیوں نہیں پی رہیں ذرا خود ہی گن کر بتائیں کہ ششے کے کتنے گلاس آپ کے رعشہ زدہ ہاتھوں سے گر کر ٹوٹے،

اب میں کم از کم آپ کے لیے تو اپنے نفیس ترین وائٹ ٹروانے سے رہتی فاضلی آپ کو اسی پیتل کے پیالے میں پانی پینا ہوگا.....“

”طبیعت سے کہتی وہ ایک اٹھا کر دھپ دھپ کرتی اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی تو اس نے

شکایتی نظروں سے وہاں کھڑے بیٹے کی طرف دیکھا جو کندھے اچکا کر اپنی بیگم کے پیچھے پیچھے چلا گیا۔

اسے دو سال قبل کا کھانسی ہوئی تو ضرورت کی ہر شے پر ضرورت سے زیادہ احتیاط برتی جانے لگی اس کے استعمال کی تمام اشیاء علیحدہ کر دی گئیں کہ کوہ بیماری اب جاتی رہی تھی مگر احتیاط اب بھی باقی تھی۔ اُسے روزمرہ کے سب

کے استعمال میں آنے والے برتن استعمال کرنے کی اجازت نہ تھی کوئی اسے ہاتھ نہ ملاتا اسے کھانسی آتی تو نوکر

کے ساتھ جلد سے جلد اندر لاؤنج سے باکمرے سے باہر بھیجا جاتا۔ آج تو پھر بھی بہو کمر سہلانے کو قریب آگئی تھی۔

بے آواز آنسو اس کی آنکھوں سے گرتے اس کے ٹھہری زدہ چہرے میں غائب ہو گئے۔ نہ جانے کس نے

پیتل کا وہ دادا اب کا استعمال شدہ پیالہ پاش وغیرہ کروا کے اس کے جینز میں رکھ چھوڑا تھا۔ دیکھنے میں ویسے وہ منقش

پیالہ بہت خوبصورت تھا اور پاش کے بعد اور چمک گیا تھا مگر وہ تھا تو بیمار دادا سے منسوب اور نہ جانے اب کیسے وہ

پیالہ اس کی بہو کے ہاتھ لگا اور اب پچھلے دوسالوں سے وہ اور TAZZ ایک ہی پیالے کو استعمال کرنے پر مجبور تھے

اور ہر بار وہ TAZZ کو اس پیالے میں پانی پیتے دیکھ کر اپنی طبیعت یونہی خراب کر لیا کرتی تھی۔

پہلی بارش

صائم اکرم

ایک تو موسم سرما کی پہلی تیز بارش، اوپر سے سرد ہوا..... جو رگوں کو چیرتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے سگریٹ کا آخری ٹوٹا باہر پھینکنے کے لیے ایک لمحے کو اپنی سیاہ ٹوٹا کرولا کاشیشہ نیچے کیا تھا..... سرد اور ٹھنڈی ہوا کے تیز جھونکوں نے گاڑی کا سرد ماحول ایک لمحے میں تبدیل کر دیا تھا۔ حارث نے کھا جانے والی نظروں سے ڈرائیونگ سیٹ پر براہمان حماد کو دیکھا جواب بے پروائی سے ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ اس قدر خراب موسم میں باہر نکلنے کا ”واہیات“ مشورہ بھی چونکہ اسی کا تھا اس لیے وہ اس وقت دنیا جہان کی مصحوبیت اپنے چہرے پر سجائے دانستہ طور پر ڈرائیونگ کرنے میں مگن تھا۔ اس کے چہرے پر بھی

جعلی مصحوبیت دیکھ کر ایک دفعہ تو حارث کا دل چاہا کہ وہ اس برستی بارش میں اسے اٹھا کر باہر پھینک دے جو اسے دفتر کے گرم ماحول سے اٹھا کر زبردستی باہر لے آیا تھا۔

گاڑی آئی ایٹ سیکٹر کے خوب صورت بنگلوں کے آگے سے گزر رہی تھی۔ وہ اسلام آباد کے اس سیکٹر کے گھروں کی بھاری مالیت کا اندازہ کر سکتا تھا۔ جس وقت وہ لوگ مطلوبہ اسٹریٹ میں داخل ہوئے، اس وقت ٹھیک ٹھاک بارش شروع ہو چکی تھی۔ حماد کی گاڑی ہلکے سبز رنگ کے ٹانکوں سے بنے خوب صورت بنگلے کے آگے رک چکی تھی۔ اپنے منفرط طرز تعمیر کی وجہ سے یہ بنگلا آنے والوں پر بڑا خوشگوار تاثر



میں کچنار، سنبل اور انار کے درخت تھے، اس وقت ان کے تزاں رسیدہ پتے بارش کے پانی کے ساتھ کیارپوں میں بہہ رہے تھے۔ لان میں رنگ برنگے پودوں کی تعداد اور کانٹ چھانٹ دیکھ کر اندازہ ہو رہا تھا کہ اس پر خاصی محنت کی جانی ہے۔ داخلی دروازے کی سیڑھیوں پر ماربل کے گملے ایک ترتیب سے رکھے ہوئے تھے جو خاصا خوشگوار تاثر چھوڑ رہے تھے۔ داخلی دروازہ بہت غلٹ میں کھلا اور وہ بہت تیزی سے باہر نکلتی تھی۔

”اوہ مائی گاڈ، حماد تم آئے ہو؟ تم جیسے بے مروت، بے پروا اور کنجوس شخص سے تو میں بھی توقع بھی نہیں کر سکتی تھی، یہی وجہ تھی کہ مجھے چوکیدار نے انٹرکام پر بتایا تو مجھے بالکل یقین نہیں آیا اور میں تانو

یہیں سے اس کے ٹیسر پر پھینک دیتا ہوں۔“ حماد جل کر بولا۔

”آئیڈیا تو بہت اچھا ہے لیکن تم اچھی چیزوں پر عمل درآمد کم ہی کرتے ہو، خاصی کم عقل پانی ہے جناب نے۔“ حارث نے جواباً اسے چڑایا تھا جو دونوں ہاتھوں کو آپس میں رگڑ کر سردی کی شدت کو کم کر کے اب تیل بجا رہا تھا۔ بارش رک چکی تھی لیکن کن من ابھی جاری تھی۔ حارث نے سر اٹھا کر املتا س کے ہنسیکے درخت کی خنیدہ شاخ پر بیٹھی روبن چڑیا کو دیکھا جو سردی سے کانپ رہی تھی۔ اس کا دل تاسف کے گہرے احساس سے بھر گیا، اس کا دل چاہا کہ وہ اسے اٹھا کر گاڑی کے اندر گرم ماحول میں بیٹھا دے لیکن حمادی موجودگی میں ایسی نیکی ممکن نہیں تھی۔

گیٹ کھل چکا تھا، چوکیدار کے ساتھ حماد کے مذاکرات خاصے کامیاب رہے تھے۔ ”کیا خیال ہے گاڑی اندر نہ کر لیں؟“ اس نے مڑ کر چھانٹا تانے بیزاری سے کھڑے حارث سے پوچھا۔

”کیوں، تم نے اندر کیا دھال ڈالنا ہے یا کوئی طویل گول میز کانفرنس کرنی ہے؟“ اُدھر سے الٹا ہی جواب آیا تھا۔

”تم سے تو بات کرنا ہی فضول ہے۔“ حماد نے اسے مزید چڑایا اور گاڑی اندر لے جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا اسے معلوم تھا کہ حارث کا مزاج مزید برہم ہو جائے گا۔ گاڑی کی پچھلی سیٹ سے بڑا سا پیکٹ اٹھا کر اس نے گاڑی لاک کی اور اندر کی جانب قدم بڑھائے۔ جبکہ حارث نے بھی بیزاری سے اس کی پیروی کی۔ حالانکہ اس کا ایک فیصد بھی اندر جانے کو دل نہیں کر رہا تھا۔ وہ نئے لوگوں سے ملنے سے بہت کتراتا تھا۔ اس وجہ سے اس کے دوستوں کی تعداد بھی گنتی جتنی تھی اور بہترین دوست بھی صرف حمادی تھا۔ اس دوستی کو پائدار کرنے میں اٹی فیصد کردار اس بے چارے کا ہی تھا۔

وہ دونوں طویل روشن سے گزر رہے تھے لان

ہوئے حماد نے ترجیحی نظروں سے اپنے اس لاڈلے اور نازک مزاج دوست کو دیکھا، جو حد درجہ کم گو اور محدود قسم کے حلقہ احباب کا حامل تھا۔ اس کی زندگی چند گننے چنے لوگوں کے گرد گھومتی تھی اور اس کے حلقہ احباب میں کم از کم کسی لڑکی کی گنجائش ہرگز نہیں نکلتی تھی اور اس کی بیزاری کی سب سے بڑی وجہ بھی یہی تھی۔

حماد نے مصنوعی تنجیدگی سے اپنے عزیز اچان دوست کو گھورا۔ ”پہلی بات تو یہ ہے کہ کسی کو شادی کا تحفہ دینا ہرگز نامعقول کام نہیں ہے اور ماہ نور تو ایسی لڑکی ہے جس کی تعریف سارا آفس کرتا ہے۔“

”خدا کے واسطے اب تم دوبارہ یہ پچھل مت چلا دینا کہ وہ بہت اچھے مزاج کی بہت پر خلوص لڑکی ہے، بہت ذہین ہے ہر کسی کے کام آتی ہے، بہت شوخ اور پچھل لیکن سادہ سی لڑکی ہے وغیرہ وغیرہ..... کیونکہ پچھلے ایک ہفتے سے میں یہ ماہ نور نامہ سن کر تنگ آ گیا ہوں، مجھے لگتا ہے کہ آفس والوں نے اس سے تعریفیں کرنے کے پیسے لے رکھے ہیں یا پھر تم سب لوگ ہی ڈفر ہو اور پورے میگزین کو بس ایک وہی اپنی ذہانت کے بل بوتے پر چلا رہی ہے۔“

حارث بہت تپ کے بولا تھا۔ ”استغفر اللہ حارث جلیل، تم نے کس قدر بُنص پال رکھا ہے اس بے چاری لڑکی کے لیے۔“ اپنی طرف کا دروازہ کھولتے ہوئے حماد نے مصنوعی خلگی اور حیرانی سے کہا جبکہ حارث نے کھا جانے والی نظروں سے اس کی ادورائیٹنگ کو دیکھا اور بہ مشکل باہر نکلا۔ سرد ہوا کے جھوکے جم کو ایک پکچی میں مبتلا کر گئے تھے۔

”وہاں ڈیرے ڈال کر مت بیٹھ جانا، بس تحفہ پکڑ کر نکلنے کی کرنا، ورنہ میں قطعاً لحاظ نہیں کروں گا۔“ سردی سے ٹھہرتے ہوئے حارث نے باہر نکلنے ہی اسے دھکی دی۔

”ایسا کرتا ہوں کہ اندر جاتا ہی نہیں، یہ گفٹ

چھوڑتا تھا۔ اس بنگلے پر شوخ رنگ کے پھولوں والی بوکن ویلیا کی تیل نے اس کی دلکشی میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔

”میرا خیال ہے کہ پچھلی سیٹ سے چھاتا..... اٹھالوں..... کیونکہ مجھے ڈر ہے کہ بارش دوبارہ نہ شروع ہو جائے۔“ حماد نے اس کے خفا خفا سے چہرے کو دیکھتے ہوئے شرارت سے کہا جبکہ اس کے اس مشورے پر حارث نے کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھا۔

”تم چھاتا اٹھا ہی تو تو تمہارے حق میں بہتر ہے کیونکہ مجھے ڈر ہے کہ یہ چھاتا نہیں میں تمہارے سر پر نہ باردوں تاکہ تمہیں عقل آئے کہ ایسے موسم میں کسی کے گھر جانا کتنا واہیات کام ہے۔“ حارث کے لہجے میں طنز دیا تھا جبکہ چہرے پر خلگی نمایاں تھی۔ ”ہاں ضرور، بہت شوق سے لیکن ابھی نہیں، ابھی ہمیں اپنی کولیگ کے گھر جانا ہے۔“ حماد کے چہرے پر بڑی محظوظی مسکراہٹ تھی۔

”میری نہیں، صرف تمہاری کولیگ۔“ حارث نے فوراً ناراض انداز میں یاد دلایا۔

”یار اب یہ خواتین کی طرح ناراض ہونا چھوڑ دو، ماہ نور نہ صرف ”میری“ بلکہ ”تمہاری“ بھی کولیگ بن چکی ہے کیونکہ آفسر آف تم ہمارے آفس کو جوائن کر چکے ہو۔“ حماد کندھے اچکا کر بولا۔

”ہاں، ایسی کولیگ جس کے صرف چہرے ہی سنے ہیں اور وہ بھی شادی کے..... جبکہ تم بجائے اس کے کہ اپنے کسی اور کولیگ کو اس کی شادی کا تحفہ دینے کے لیے ساتھ لاؤ، مجھے زبردستی گھسیٹ لائے ہو، کتنا بے ہودہ کام ہے کہ کسی انجان لڑکی کو منہ اٹھا کر اس کے مایوں کے دن تحفہ دینے تشریف لے آؤ، حد ہے نامعقولیت کی۔“ حارث ایک دفعہ پھر شروع ہو چکا تھا۔ اسے واقعی حماد پر بہت زیادہ غصہ آ رہا تھا۔ جو اس کی شرافت کا اکثر ناجائز فائدہ اٹھاتا تھا۔

گاڑی کے بینڈ بریک کو اوپر کی جانب کھینچتے

WELCOME BOOK SHOP

SOLE DISTRIBUTOR of U. A. E

WELCOME BOOK SHOP

JASOOSI SUSPENSE PAKEEZA SARGUZASHT

P.O.Box 27869 Karama, Dubai Tel: 04-3961016
Fax: 04-3961015 Mobile: 050-6245817
E-mail: welbooks@emirates.net.ae

Best Export From, Pakistan

WELCOME BOOK PORT

Publisher, Exporter, Distributor

All kinds of Magazines, General Books and Educational Books

Main Urdu Bazar, Karachi Pakistan
Tel: (92-21) 32633151, 32639581 Fax: (92-21) 32638086
Email: welbooks@hotmail.com
Website: www.welbooks.com

کی شوخی پر جھنجھلا کر اسے دیکھا، جو اس وقت آنکھیں ماتھے پر رکھے، اسے مسلسل زچ کرنے پر تلا ہوا تھا۔ اسی وقت ماہ نور چائے اور دوسرے لوازمات سے پُر ٹرائی لیے اندر داخل ہوئی۔

”ماہ نور بچے، یہ چائے یہاں رکھ کر میرے کمرے سے اپنی شادی کا کارڈ تو اٹھا کر لاؤ، میں ذرا حارث کو بھی دے دوں۔“ نانو کے سادہ سے انداز پر وہ بری طرح شرمندہ ہوا اور اس نے خفت بھرے انداز میں فوراً ٹائی میں سر ہلایا۔

”نہیں، نہیں، آئی اس کی ضرورت نہیں، آپ نے کہہ دیا، یہ بی کافی ہے۔“ وہ فوراً بولکھلا کر بولا تھا۔ ”حماد بیٹا، آپ نے اپنے دوست کو بتایا نہیں کہ ماہ نور کے سب کو لپک مجھے نانو کہتے ہیں، مجھے یہ آئی شانی بالکل پسند نہیں۔“ نانو نے پیار بھرے انداز میں سرزنش کی تو وہ بری طرح شرمندہ ہو گیا جبکہ فریج فرائز بے تکلفی سے کھاتے ہوئے حماد نے بہ مشکل اپنی ہنسی کو ضبط کیا۔

”نانو ان کو بھلا کیا پتا، آپ خواہ مخواہ ان کے پیچھے پڑ گئی ہیں، وہ پہلی دفعہ تو آپ سے مل رہے ہیں۔“ ماہ نور کی جھنجھلاہٹ پر حارث نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ دل ایک دفعہ بھر باغی ہوتا ہوا محسوس ہوا تھا۔ ہلکی سی جھنجھلاہٹ سے اس کے چہرے پر ہلکی سی سرخی پھیل گئی تھی۔ جو اسے اچھا خاصا جاذب نظر بناتی تھی۔ وہ اب چپلی کباب حارث کی پلیٹ میں رکھ رہی تھی۔

”لو بیٹا حارث، پہلی دفعہ آیا ہے، آخری دفعہ تھوڑی ہے، اللہ خیر سکھ رکھے اب آنا جانا لگا رہے گا۔“ نانو کو نواسی کا جرح کرنا قطعاً نہیں بھایا تھا سچی اکٹاہٹ کے ساتھ گویا ہوئی تھیں۔ وہ کچھ دیر بعد پھر رساں سے بولیں۔

”ویسے بیٹا حارث آپ کا تعلق کس علاقے سے ہے، اللہ جانے آپ کا چہرہ مانوس سا کیوں لگ رہا ہے۔“ نانو کی تفتیش پر ماہ نور نے خائف نظروں

ہول میں انعقاد تھا۔ مایوں کا فنکشن رات نو بجے تھا جبکہ اس وقت دوپہر کے دو بج رہے تھے۔ مہندی کل اور شادی کی تقریب اس کے اگلے دن تھی۔

”بس بیٹا، آج کل ماہ نور کے والدین کی کمی شرت سے محسوس ہو رہی ہے، باپ کا انتقال تو اس کے بچپن میں ہو گیا تھا جبکہ ماں بھی پانچ سال پہلے ہیائٹس سے چل بسی۔ بس ہم دونوں ہی تانی، نواسی ایک دوسرے کے دکھ سکھ کی ساتھی ہیں۔ اس کے اکلوتے ماموں بھی کل امریکا سے آرہے ہیں۔ اس کی شادی کے بعد میں بھی اپنے بیٹے کے پاس باہر چلی جاؤں گی۔“ وہ سادہ سے انداز میں ان کو بتا رہی تھیں جبکہ ماہ نور ان کی خاطر تواضع کے لیے کچن میں جا چکی تھی۔

”بیٹا آپ کو تو پہلی دفعہ دیکھا ہے کبھی ماہ نور نے آپ کا ذکر نہیں کیا لیکن پھر بھی نہ جانے کیوں آپ کی شکل جانی پہچانی سی لگ رہی ہے۔۔۔۔۔“ نانو بہت محبت سے حارث سے پوچھ رہی تھیں۔ وہ جوابی دھڑکنوں کو سنبھالنے کا نامکمل کام بہت زیادہ جدوجہد کے ساتھ کرنے میں لگن تھا۔ وہ بری طرح چونک اٹھا لیکن اس کے بولنے سے پہلے ہی حماد بول اٹھا۔

”جی نانو، یہ میرا دوست حارث ہے، اس نے ایک ہفتہ پہلے ہی ہمارا میگزین جوآن کیا ہے، اس سے پہلے یہ الیکٹرک میڈیا میں جاب کرتا تھا لیکن میں اسے زبردستی اپنے میگزین میں لے آیا اور جس وقت اس نے جوآننگ دی تھی انہی دنوں ماہ نور اپنی شادی کی چٹھیوں پر جا چکی تھی۔“

”یہ تو بہت اچھا کیا تم نے جو اپنے دوست کو بھی اپنے ساتھ لے آئے، خاصا بھلا مانس بچہ ہے، بیٹا آپ بھی نور کی شادی میں ضرور آنا۔“

”نانو یہ بھلا مانس سا بچہ، شادی کارڈ کے دعوت نامے کے بغیر کہیں نہیں جاتا، اس کو بن بلائے جانے پر بہت شرمندگی ہوتی ہے۔“ حارث نے اس

حماد نے شاید اس کے متعلق بات کی تھی۔ تبھی اس نے اپنی راج ہنس چینی گردن کو گھما کر اسے دیکھا۔

”جی جناب، آپ کیوں ہماری طرف آنے سے کترارے تھے؟“ فضا میں چلتی گنگ سا بجا، وہ اسے دیکھ کر دلکشی سے مسکرا رہی تھی۔ حارث کو اپنی سانس رکتی ہوئی محسوس ہوئی۔ وہ سیدھا اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔

”ایسی تو کوئی بات نہیں۔“ حارث نے دانستہ نظریں چرائیں اور پھینکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بہ مشکل کہا تھا۔

”نہیں، نہیں، اب بتاؤ، جو سارا راستہ تم مجھے ذلیل کرتے آئے ہو، اور مجھے طعنہ دے رہے تھے کہ بیگانی شادی میں عبد اللہ دیوانہ۔“ حماد نے بھی حد کر دی تھی۔ اس کی آنکھوں سے شکتی شرارت اور لہجے کی شوخی حارث کو زہر لگ رہی تھی۔ اس نے کھاجانے والی نظروں سے اس میں جھفر کو دیکھا تھا۔ جس نے ماہ نور کے گھر میں داخل ہوتے ہی آنکھیں ماتھے پر رکھ لی تھیں۔

”کیا واقعی۔۔۔۔۔؟“ وہ بے ساختہ ہنسی تھی، ہنستے ہوئے اس کی آنکھوں میں ستارے سے چمکے تھے جبکہ حارث کے اندر اتنی ہی تیزی سے اندھیرے پھیلے تھے، وہ شرمندگی چھپانے کے لیے کھوکھلی سی ہنسی تھا۔ زندگی نے اس کے ساتھ بہت عجیب سا مذاق کیا تھا۔ وہ سمجھنے سے قاصر تھا۔

اسے خبر ہی نہیں ہوئی اور وہ حماد اور ماہ نور کے پیچھے اندر ڈرائنگ روم میں آچکا تھا۔ جہاں اس کی نانو بہت محبت سے ان کو خوش آمدید کہہ کر مفس کے لوگوں کا فرداً فرداً پوچھ رہی تھیں۔ ان کی گفتگو سے حارث کو اندازہ ہوا کہ وہ سب لوگوں سے بخوبی واقف ہیں اور اس کے کوئیکز کا ان کے گھر آنا جانا بھی ہے۔ ان کے گھر میں شادی والی مخصوص افراتفری نہ ہونے کے برابر تھی، شاید اس کی وجہ تمام تقاریب کا

کے سخت پہرے کے باوجود باہر بھاگی۔“ وہ حد درجہ بے تکلف، خوشگوار اور حیرت سے لبریز لہجے میں بول رہی تھی۔

زور رنگ کی لمبی قمیص اور چوڑی دار پاچاے میں اس کا دراز قد خاصا نمایاں ہو رہا تھا۔ اس کے خوب صورت پیروں میں نیس سی کوہا پوری چپل تھی، اس کی سنہری رنگت والی بڑی آنکھوں میں بہت گہرے رنگ کا کاجل تھا جبکہ دو دھیرا رنگت پرستواں سی ناک نے اس کی دلکشی میں اضافہ کر رکھا تھا۔ چہرے پر دلربا سی مسکراہٹ جی تھی اور دانت موتیوں کی طرح جگمگا رہے تھے۔ اس قدر سردی میں وہ کسی بھی قسم کے سویٹر سے بے نیاز آدمی آستینوں والی قمیص پہنے ہوئے تھی۔ اس کی کینوں تک مہندی کے خوب صورت نقش و نگار بنے ہوئے تھے اور اسی مہندی کی وجہ سے وہ آدمی آستینوں میں تھی۔

حارث کی نظریں اس پر اٹھیں اور پھر پلٹنا بھول گئیں، دل کی دھڑکنوں میں ایک اودھم سا برپا ہوا، اس کا سارا وجود زلزلوں کی زد میں آ گیا تھا۔ کوئی مایوں کی دلہن اس قدر دلکش لگ سکتی ہے اس کا اندازہ اسے زندگی میں پہلی دفعہ ہوا تھا۔ اسے یوں لگا جیسے آسمان سے کوئی اپسرا اتر کر زمین پر آگئی ہو۔ اپنے دل کی دھڑکنوں میں برپا ارتعاش اسے خوفزدہ کر رہا تھا۔ یہ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا، وہ سمجھنے سے قاصر تھا۔ بالوں کی سنہری لٹوں کو بے پروائی سے پیچھے کرتی وہ سادہ سی لڑکی ایک لمحے میں اس کی زندگی میں ایک انقلاب برپا کر گئی تھی۔

وہ بہت بے تکلفی سے حماد کے ساتھ جو گفتگو تھی۔ وہ دونوں اس کی موجودگی سے بے نیاز ایک دوسرے کے ساتھ مصروف گفتگو تھے۔ اس کی سامعیتوں میں ان کی باتوں کے کچھ الفاظ پڑتو رہے تھے لیکن اس کا دماغ انہیں سمجھنے سے قاصر تھا۔ وہ خالی خالی نظروں اور حواس باختہ انداز کے ساتھ بس انہیں دیکھ رہا تھا۔

پھاڑ کر دیکھ رہے ہو، کیا ہوا اس لڑکی کو.....؟ وہ دانستہ بے پروائی کے سے انداز میں گویا ہوا۔ گاڑی میں ایک چھینے والی خاموشی کا وقفہ آیا تھا۔ کچھ توقف کے بعد حماد سپاٹ لہجے میں بولا۔

”ماہ نور وہی لڑکی ہے۔“ حماد نے اس کی سماعتوں میں بلاست ہی تو کیا تھا۔ اس کا سارا وجود بھک کر کے اڑا تھا۔ اس نے جھٹکے سے رخ موڑ کر سخت تعجب، حیرت اور بے یقینی سے حماد کو دیکھا تھا۔ ایک لمحے کو اسے ایسا محسوس ہوا جیسے ایک ٹرین اس کے وجود کے پرچے اڑاتی ہوئی اس کے اوپر سے گزر گئی ہو۔

”کیا مطلب؟ تم نے اپنی اس کو لیک کی تصاویر میل کی تھیں؟ وہ تو میں نے دیکھی ہی نہیں تھیں۔“ حارث کے انداز میں انتہا درجے کی مایوسی تھی۔ اسے یاد آیا کہ اس نے تصاویر دیکھے بغیر ہی حماد کو نال دیا تھا کیونکہ وہ ان دنوں بالکل بھی شادی وغیرہ کے جھنجھٹ میں پڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کا دامخ شائیں شائیں کر رہا تھا جبکہ اس کی دلی حالت سے بے خبر حماد بڑی سنجیدگی سے بتا رہا تھا۔

”جی ہاں، ماہ نور وہی لڑکی ہے جسے تم نے قطعاً گھاس نہیں ڈالی، مجھے اسی وجہ سے تو حیرت ہو رہی تھی کہ تم اسے دیکھ کر بالکل بھی نہیں چوکنے، تمہارے انداز سے لگ ہی نہیں رہا تھا کہ تم نے اسے دیکھ رکھا ہے تب ہی مجھے پتا چلا کہ تم نے مجھے چونا لگا دیا تھا۔ بہت بے ہودہ انسان ہو تم.....“ حماد کو اس پر نہ جانے کیوں غصہ آ رہا تھا جبکہ وہ سخت ہنسنے والے انداز سے اس کی داستان امیر حمزہ سن رہا تھا۔

”ان دنوں اس کی نانو اس کے رشتے کے لیے بہت پریشان تھیں، مجھ سے ذکر کیا تو میں نے تمہارا بتایا لیکن تم نے مجھے گھاس ہی نہیں ڈالی اور پھر ہمارے ہی آفس کے کاغذی صاحب کے توسط سے اس کے لیے یہ رشتہ آیا تو نانو نے فوراً قبول کر لیا

”ہاں ٹھیک تھی.....“ اپنے دل کی دھڑکنوں پر بہ مشکل قابو پا کر وہ دانستہ سپاٹ لہجے میں بولا۔

”کیا..... بس ٹھیک تھی.....؟“ حماد کو جھکا لگا، اس نے سخت حیرت سے آگے کو جھک کر حارث کو دیکھا جو بیٹھ کر نظر میں جمائے بیٹھا تھا۔ ”کمال کرتے ہو یار، اچھی خاصی لڑکی تھی۔ بہت شریف، سچی ہوئی اور شکل صورت کی بھی ٹھیک ٹھاک ہے۔ تمہیں یاد ہے چھ مہینے پہلے جب میں تم پر زور ڈال رہا تھا کہ شادی کر لو.....“ حارث نے اسے کچھ ماہ پہلے کی بات یاد دلانی۔

”ہاں یاد ہے اچھی طرح، کیوں.....؟“ حارث نے سوالیہ انداز میں حماد کو دیکھا جو سنجیدگی سے گاڑی چلا رہا تھا۔ اسے یاد آیا کہ کچھ ماہ پہلے حماد پر اس کی شادی کروانے کا بھوت سوار ہوا تھا لیکن اس نے بالکل لفٹ نہیں کروائی تھی ان دنوں حماد کی بھی خالہ زاد کے ساتھ تازہ تازہ منگنی ہوئی تھی۔

”یاد ہے ناں.....؟“ اس نے گاڑی شکر پڑیاں کے پاس والے سگنل پر روکتے ہوئے پھر دوبارہ پوچھا۔

”ہاں یاد ہے.....“ حارث جھنجھلایا۔ ”تم نے کسی لڑکی کی تصاویر بھی مجھے میل کی تھیں۔“ حارث نے مزید اس کی تسلی کروائی۔

”تم نے اس لڑکی کی تصاویر دیکھی تھیں.....؟“ حماد نے بہت عجیب سا سوال کیا تھا۔

”نہیں.....“ حارث نے باہر کے مناظر کی طرف اپنی توجہ مبذول کرتے ہوئے بے توجہی سے کہا۔

”تم نے نہیں دیکھی تھیں، مجھے آج اس بات کا یقین ہو گیا.....“ حماد بہت عجیب سے انداز میں اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کے لہجے میں جھلکنا لگتا تھا کہ چوٹا گیا تھا۔

”کیوں، کیا ہوا..... ایسے کیوں آنکھیں پھاڑ

تھا۔ وہ جل جھن ہی تو گئی تھی۔

”کیوں نانو، اس میں شرم و حیا کی بھلا کیا بات ہے، شادی ہی تو ہے اور سارے زمانے کی ہوتی ہے۔“ اس کے انداز میں عجیب سی بے نیازی تھی۔

”ماشاء اللہ خوب بوڑھی نانی کا نام روشن کراؤ گی بیٹا۔“ ان کی آواز میں دبا دبا سا غصہ تھا۔ انہوں نے ناک پر انگلی رکھ کر سخت خفگی سے دونوں ٹانگیں صوفے کے اوپر رکھے آلتی پالتی مار کر بے تکلفی سے بیٹھی ماہ نور کو دیکھا۔ جو بے تکلفی سے پڑا، کچپ میں ڈبو ڈبو کر کھارہی تھی۔

”اوہو..... نانو کچھ نہیں ہوتا، ساری دنیا کی لڑکیاں اپنی شادی کے معاملات میں اب ذوق شوق سے حصہ لیتی ہیں، میں کون سا انوکھا کام کر رہی ہوں۔“ اس کے لاپرواہی پن کے انداز پر نانو نے گھور کر اسے دیکھا جو اب حماد کے ساتھ گفتگو میں مگن تھی۔ وہ بہت تفصیل کے ساتھ آفس کے معاملات کا پوچھ رہی تھی۔ حارث خاموشی سے ان دونوں کی باتیں سن رہا تھا۔ اس کی تمام تر توجہ ماہ نور کی طرف تھی۔ جو چھوٹی چھوٹی سی باتوں پر کھلکھلا کر ہنس پڑتی تھی۔ ان لوگوں نے وہاں پورے دو گھنٹے گزارے اور حیرت انگیز طور پر حارث نے ایک دفعہ بھی حماد کو واپسی کے لیے اشارہ نہیں کیا۔

واپسی کے سفر میں وہ بالکل خاموش تھا۔ نانو اور وہ ان کو گیسٹ تک چھوڑنے آئی تھیں۔ ان دونوں نے حارث کو بھی شادی پر آنے کی بہت زیادہ تلقین کی تھی۔ اس نے بھی بادل ناخواستہ سر ہلا کر انہیں اپنے آنے کی یقین دہانی کروائی تھی۔ حالانکہ اس کا جانے کا قطعاً کوئی ارادہ نہیں تھا۔

”یہ تم نے کیوں چپ شاہ کا روزہ رکھ لیا ہے؟ کیسی گلی ماہ نور تمہیں.....؟“ گاڑی سڑک پر نکالتے ہی حماد نے اس کا سنجیدہ چہرہ دیکھتے ہوئے خوشگوار لہجے میں پوچھا۔

سے انہیں دیکھا۔ اس کے تاثرات دیکھ کر حماد کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑی۔ وہ نانو کی بات تو نی طبیعت سے اچھی طرح آگاہ تھا اور ان کی اس عادت سے... ماہ نور کا چڑنا بھی اس کے لیے نیا نہیں تھا۔

”نانو میرے دوست کا تعلق مظفر آباد سے ہے، اس کے آباؤ اجداد کشمیر کے رہنے والے تھے اور یہ اکلوتا ہے۔“ حماد نے پڑا کا ایک بڑا سا ٹکڑا اپنی پلیٹ میں ڈالتے ہوئے فوراً جواب دیا جبکہ حارث دانستہ خاموش رہا۔ ان کے اس سوال پر اس کے چہرے پر ایک تاریک سا سایہ اور پورے وجود میں ایک اضطراب کی لہر برقی رو کی طرح دوڑی تھی۔

”اور والدین.....؟“ نانو کے سوال پر وہ چائے کا گھونٹ لینا بھول گیا۔ حماد نے بھی گڑبڑا کر فوراً اسے دیکھا تھا جو سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔

”ان کا 8 اکتوبر والے زلزلے میں انتقال ہو گیا تھا۔“ اس کے لہجے میں کچھ تھا کہ پورے کمرے میں خاموشی نے تیزی سے اپنی جگہ بنائی تھی۔ ماہ نور نے سخت شکایتی نظروں سے نانو کو دیکھا جو خود بھی یہ سوال کر کے اب پشیمان تھیں اور اب وہ سنبھل کر بیٹھ گئیں۔

”بہت افسوس ہوا بیٹا یہ سن کر اللہ ان کی مغفرت فرمائے۔“ نانو کی بات پر سب چپ ہو گئے تھے۔

”ہاں بھئی، میری شادی کا کھانا کھانے کون کون آرہا ہے؟“ ماہ نور نے ہلکے ہلکے انداز میں بات کر کے ماحول میں چھائی افسردگی کو کم کرنے کی کوشش کی تھی جو اسے خاصی مہنگی پڑی تھی۔ نانو نے غصہ ناک نظروں سے اسے دیکھا۔

”اے بیٹا، شرم و حیا بھی کسی چڑیا کا نام ہے، بھلا کنواری لڑکیوں کو ایسے بات کرنا زیب دیتا ہے۔“ نانو کو اس کے انداز گفتگو پر سخت غصہ آیا تھا اس لیے فوراً ہی ٹوک دیا۔ ماہ نور کی شکل دیکھ کر حارث اور حماد دونوں کو اپنی ہنسی چھپانا دشوار لگ رہا

176 ماہنامہ بیا کیبڑہ - دسمبر 2012ء

چاہیے، یہ پینڈم مرد بھی بہت بڑا مسئلہ ہوتے ہیں۔“
ملیجہ کے دل جلے الفاظ میں کوئی تلخ تجربہ پوشیدہ تھا۔
حادثہ سے اپنے آرنیکل کا ایک لفظ بھی نہیں لکھا جا رہا
تھا۔ اس نے جھنجھلا کر کمپیوٹر اسکرین کو دیکھا۔

”یار ایک نمبر کم تو چلتا ہے لیکن یہاں تو اس
کے میاں کو پانسنگ مار کر دینے کو بھی جی نہیں چاہتا۔
کالا سا اور گنجا ہونا بھی چلوٹھیک ہے لیکن اس کی چھوٹی
چھوٹی آنکھوں میں چھپی عیاری اور مکاری تو اس
تصویر میں بھی دکھائی دے رہی ہے۔“ حرا کا تاسف
کسی صورت کم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ کل کر
تصویروں پر تبصرہ کر رہی تھی۔ بچ نائم ہونے کی وجہ
سے زیادہ تر لوگ کیفی ٹیریا میں بچ کے لیے گئے
ہوئے تھے۔ اس لیے وہ دونوں خاصی بے فکر تھیں۔

”یار اس کی نانو کو اس کی ٹینشن بھی تو بہت تھی،
اوپر سے اس کی ممائی کا تو تمہیں پتا ہے، انہوں نے
اپنی ساس کو بچ کر رکھا تھا کہ اس بوجھ کو کسی کے سر پر
بس ڈال دو۔۔۔۔۔“ ملیجہ اکتاہٹ بھرے انداز سے
اسے بتا رہی تھی۔

”کیوں ہاں کو کیا تکلیف تھی وہ خود تو امریکا
میں رہتی ہیں.....“ حرا نے قدرے تلخ انداز میں
حیرت سے کہا۔

”انہیں تو تھا کہ کہیں ان کی ساس اپنے بیٹے کو
جو ان کے میاں صاحب ہیں یہ نہ کہہ دیں کہ پوتے
کے ساتھ ماہ نور کی شادی کرویں حالانکہ خود ممائی کا بیٹا
کسی کام کا نہیں..... لیکن اپنی اولاد کی خامیاں کہاں
نظر آتی ہیں۔ اس کی ممائی کو تو ویسے ہی شروع سے
اس بے چاری سے بیر تھا۔ اس لیے شادی کروا کر دم
لیا۔“ ملیجہ خاصی افسردگی سے بتا رہی تھی۔ حادثہ کو
ڈھیر دہ رنج نے ایک دفعہ پھر گھیر لیا تھا۔

”ہاں یار اماں، باپ سے محروم بچوں کا یہی
حال ہوتا ہے، ہر کوئی ان کو بوجھ ہی سمجھتا ہے لیکن کوئی
ایسے بھی نہیں کرتا جیسے آنا فانا اس کا رشتہ کیا ہے، اچھی

ہیں جب کڑی رہی تھیں۔ وہ بالکل ویسی ہی تھی جیسا کہ
تجسبی اس نے شریک حیات کے بارے میں خاکہ
اپنے ذہن میں مرتب کر رکھا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ ہو
ہو اسی سانچے میں بنی ہوئی ہو۔ اسے ایک سو ایک
نفسد یقین تھا کہ وہ اگر یہ تصاویر دیکھ لیتا تو حماد کو بھی
اس طرح کا سا جواب نہ دیتا۔ پورے چار دن کے
بعد وہ آفس گیا تو وہاں نور کی شادی کے چرچے تھے۔
”یار ماہ نور واقعی غضب ڈھارہی تھی اس ڈیپ
ریڈ کلر کے لہنگے میں۔“ مارکینگ ڈیپارٹمنٹ کی حرا
جو اس وقت ایڈیٹوریل سیکشن کی ملیجہ انصاری کے
سیکن میں آئی ہوئی اس کی شادی کی تصاویر اس کے
کمپیوٹر پر دیکھنے میں مگن تھی۔ اس کا بلند آواز میں کیا
گیا تبصرہ حادثہ کا خطرہ اب میں مبتلا کر گیا تھا۔ اس
نے بے اختیار پہلو بدلا تھا۔

ملیجہ کا یقین اس کے ساتھ والا تھا اس لیے بعض
اوقات دھیمی آواز میں کی جانے والی سرگوشیاں بھی
صاف سنائی دیتی تھیں۔ پورے آفس میں لکڑی کے
چھوٹے چھوٹے کیمین بنا کر پرائیویسی دینے کی کوشش
کی گئی تھی لیکن یہ اس صورت میں ناکام ہو جاتی جب
کوئی بھی شخص اپنے سیکن میں کھڑا ہوتا تھا۔ دائیں
بائیں کی میزوں اور کمپیوٹرز پر کھولی جانے والی ویپ
سائنس تک صاف دکھائی دیتی تھیں۔ ان چھوٹے
چھوٹے کیمین کو حماد نے نیل کی بیروں کا نام دے
رکھا تھا۔ حادثہ کے دائیں جانب ملیجہ اور بائیں
جانب حماد کا سیکن تھا۔

”لیکن آپس کی بات ہے یار، مجھے اس کا میاں
ایک آنکھ نہیں بھایا، وہ خود جتنی اسٹاکش سی لگتی ہے
اس کے مقابلے میں وہ تو کچھ بھی نہیں۔“ حرا خاصی
صاف گو بلکہ کسی حد تک منہ پھٹ بھی تھی۔ اس وقت
جوش جذبہ بات میں اس کی آواز کچھ بلند ہو گئی تھی۔ وہ
منہ چاہتے ہوئے بھی ان کی جانب متوجہ ہو گیا تھا۔

”یار میاں کو بیوی سے ایک نمبر کم ہی ہونا

پر حملہ کیا تھا لیکن یہ محبت اس کی دسترس میں کبھی نہیں
آ سکتی تھی۔ اپنے فلیٹ میں آ کر پہلی دفعہ وہ دہائیں
مار مار کر رو یا تھا۔

☆☆☆

دو دن کے بعد ماہ نور کی شادی تھی اور وہ
باوجود کوشش کے خود کو اس کی شادی پر جانے کے لیے
آمادہ نہیں کر پایا تھا۔ یہ دو دن اس کے اعصاب پر
سخت بھاری تھے۔ لمحہ لمحہ عذاب بن کر گزر رہا تھا۔ وہ
برسی طرح سے اس کے حواسوں پر سوار تھی۔ دل و
دماغ پر یہ بوجھ ناقابل برداشت تھا، پورے دو دن
وہ سخت بخارا میں پھنک رہا تھا، اس کے بعد بھی اگلے دو
دن اس کے اندر اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ آفس
جاسکے۔ اس نے اپنا سیل فون تک بند کر کے رکھ دیا
تھا۔ وہ کسی سے بھی بات کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کو نہ
جانے کیوں خود پر بے تحاشا غصہ آ رہا تھا۔ وہ اپنے
آپ سے خفا تھا اور اس کا دل ایک ضدی بچے کی
طرح کوئی بھی دلیل ماننے کو تیار نہیں تھا۔ عجیب سی
کھٹکھٹ میں دن گزر رہے تھے۔ وہ خود کو بار بار کوس
رہا تھا کہ کاش وہ تصاویر دیکھ لیتا۔ اس نے کئی ماہ پہلے
کی سیل اب کھول کر دیکھی تھی۔ جب پانی پل کے
نیچے سے گزر گیا تھا۔

وہ شاید حماد کی بہن کی مہندی کا فنکشن تھا۔ اس
دن بھی وہ زرد رنگ کے لباس میں ہنسی مسکراتی
ڈھولک بجا رہی تھی۔ اسی فنکشن میں اس کی بے
ساختہ ہنستے ہوئے اچانک ایک تصویر بنائی گئی تھی۔
بے تحاشا ہنسنے کی وجہ سے آنکھوں میں آنے والی نمی
اور دائیں گال پر پڑنے والے ڈمپل نے اس تصویر
کی دلکشی میں اضافہ کر دیا تھا۔ ایک اور سفید رنگ
کے میکش کے کام والے سوٹ میں اس کی تصویر جس
کے پس منظر میں مدھم مدھم سی روشنی تھی وہ اس میں بلا
کی سحر انگیز لگ رہی تھی۔ سفید شفاف، بے داغ اور
کاہل سے نجی سیاہ آنکھیں دیکھنے والے کو اپنے سحر

کیونکہ وہ اس کی شادی کے بعد امریکا اپنے بیٹے کے
پاس جانا چاہتی تھیں۔“ حماد نے تفصیلاً بتایا تو حارث
کو پہلی دفعہ اندازہ ہوا کہ بعض دفعہ تقدیر آپ کے
ساتھ ایسے ہی مذاق کرتی ہے، ٹھیک کہتے ہیں سیانے
کہ قسمت انسان کے دروازے پر بار بار دستک
نہیں دیتی۔ وہ عجیب سے احساسات کا شکار ہو رہا
تھا۔ حماد اس کی خاموشی سے بے نیاز آج سارے
انکشافات کرنے پر تڑپا ہوا تھا۔

”ماہ نور جب میری آپنی کی شادی پر ہمارے
گھر پہلی دفعہ آئی تو امی تو فوراً میرے حوالے سے
اس کو بہو بنانے پر پھندہ ہو گئیں لیکن کہیں پتا ہے کہ
میری سائرہ کے ساتھ کافی سالوں سے کمنٹ تھی۔
میں نے تو صاف انکار کر دیا اور امی سے کہا کہ میرے
لیے وہ بالکل بہنوں کی طرح ہے۔۔۔۔۔“ اس نے بڑی
مہارت سے موڑ کاٹا تھا۔ گاڑی میں ایک بوجھل سا
سناتا تھا۔

”بچ بتاؤ، اس لڑکی کو دیکھ کر میرے ذہن
میں سب سے پہلا نام اپنے یار کا آیا تھا۔ مجھے لگا کہ
یہ ایک پرفیکٹ کپل ہوگا۔ سب سے بڑی بات کہ نانو
جس طرح اس کی شادی کے لیے بے قرار تھیں کوئی
بھی مسئلہ نہیں ہونا تھا لیکن تو اتنا گھامڑے حال ہے
کہ میری یہ بات مانی ہو۔“ حماد کی محبت کسی بھی قسم
کے شک و شبہ سے بالاتر ہے اس کا اندازہ اسے
بخوئی تھا لیکن آج پتا نہیں کیوں اس کی آنکھیں بار بار
دھندلا رہی تھیں۔

اس کا دل کر رہا تھا کہ وہ حماد کو بولنے سے منع
کر دے، اس کی قوت گویائی کہیں کھو گئی تھی۔ وہ
بالکل خاموشی سے اس کی جھاڑن رہا تھا۔ وہ بری
طرح منہ کے بل گر رہا تھا۔ قسمت اس کے اوپر نہیں
رہی تھی۔ اس کی ذات کے پر نیچے ہی توڑے تھے۔
حارث جلیل کی زندگی میں پہلی دفعہ ہی صنف نازک کا
دغل ہوا تھا۔ محبت نے کسی خود کش بمبار کی طرح اس

خاصی خوب صورت اور اسٹائلش لڑکی تھی۔ ایک سے ایک اچھا رشتہ مل سکتا تھا اسے۔“ حرا کے لہجے میں اداسی اور تاسف کے رنگ نمایاں تھے۔

”چلو دفع کرو اب تو ہوئی شادی، بس دعا کرو کہ اللہ اس کے تعیب اچھے کرے.....“ ملیحہ نے خلوص دل سے کہا تھا۔ اس کی بات پر حرا کا دل سے بے اختیار آئین نکلا تھا۔ وہ دونوں اب تصاویر پر تبصرہ بند کر چکی تھیں۔

”ویسے یار ایک بات کہوں.....!“ حرا نے تجسس بھرے انداز میں سرگوشی کی، اس کی آواز اور انداز میں کچھ تھا کہ حرا نہ چاہتے ہوئے بھی اس جانب متوجہ ہو گیا۔

”ہاں کہو.....“ ملیحہ نے بے تابی سے کہا۔

”مجھے گالیاں مت دینا۔“ وہ تھوڑا سا ہنسی اور آہستگی سے بولی۔

”اب پھوٹ بھی پڑو، میرا تجسس بڑا حال ہو رہا ہے.....“ ملیحہ نے بے صبرے پن سے اسے کہا جو شرارت سے آنکھیں پٹپٹا رہی تھی۔

”یار وہ جو تمہارے ایڈیٹوریل سیکشن میں نیا بندہ آیا ہے۔“ حرا کی سرگوشی اتنی بھی کم نہیں تھی کہ ساتھ والے کیبن میں موجود حرا کا دل نہ پہنچتی اور ویسے بھی جب ذکر خیر بھی اسی کا ہو رہا تھا۔ حرا کا اپنے دھتے سر کو سنبھالنے میں مگن تھا کہ اس کے کان کھڑے ہو گئے۔

”کون یار.....؟“ ملیحہ کی سمجھ میں اب بھی نہیں آیا۔

”میں اس بندے کی بات کر رہی ہوں جو انگلش سیکشن میں آیا ہے، بالکل نواد خان کی طرح ہینڈسم.....“ حرا نے جھجکا کر کہا تھا۔

”حرا، تمہیں وہ ادا کار نواد خان ہینڈسم لگتا ہے؟“ ملیحہ کو اس پر سخت صدمہ ہوا تھا۔ سچی وہ انتہائی بے یقینی کے عالم میں حرا کا چہرہ دیکھ رہی تھی جس پر دبا دبا سا جوش تھا۔

”ہاں تو ہینڈسم بندہ ہر کسی کو ہینڈسم ہی لگے گا ناں، اب تمہیں خوب صورتی کے اعلیٰ معیار کے لیے بس اپنے میاں کی ہی مثال ہی نظر آتی ہے تو میں کیا کروں۔“ حرا کے طنزیہ انداز پر حرا کا دل بھی نہ چاہتے ہوئے ہلکی سی مسکراہٹ آگئی تھی۔

”اچھا، اچھا، زیادہ جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں، سیدھی طرح سے کہو کہ تم حرا کا جلیل کی بات کر رہی ہو۔“ ملیحہ نے قدرے منہ ہٹا کر اس کا نام لیا تھا۔

”ہاں یار، کاش ماہ نور کی شادی اس کے ساتھ ہو جاتی، ذرا سوچو کتنا پیارا پیکل بننا اور اتنے خوب صورت جوڑے کے بچے کتنے پیارے ہوتے ناں!“ حرا کے معصومانہ انداز پر حرا کا دل پر ایک دفعہ پھر چھریاں سی چلی تھیں۔ جبکہ اس کی بات پر ملیحہ نے ایک جھانپڑا اس کے رسید کیا تھا۔

”آہستہ بکواس کرو اس کا ساتھ والا کیبن ہے، کہیں سن نہ لے اور تم اپنے ہی سنہری فرمودات اپنے پاس ہی رکھو، کسی اور کے گوش گزار نہ کر دینا۔ دنیا میں ہینڈسم لوگوں کی کمی تو ہوئی ہے جو تمہیں صرف وہی نظر آ رہا ہے.....“ ملیحہ نے ٹھیک ٹھاک اس کی طبیعت صاف کی تھی جبکہ حرا بڑا مان کر خفگی بھرے انداز میں کہہ رہی تھی۔

”کبھی کسی کی تعریف نہ کرنا، جیسے کسی کی شان میں دو چار الفاظ کہنے سے تمہاری زبان جل جائے گی۔ بتاؤ پورے آفس میں اس کشمیری سیب جیسا بندہ کوئی اور ہے.....؟“

”اس کشمیری سیب نے اگر سن لیا ناں تو تمہیں اٹھا کر اس بلڈنگ سے باہر پھینک دے گا۔ اس کے بعد تمہاری شکل سڑے ہوئے بیگن جیسی ہو جائے گی۔“ ملیحہ ہنستے ہوئے اسے ڈرا رہی تھی۔ وہ دونوں اب ایک دوسرے کے ساتھ چھینٹ چھاڑ میں مگن تھیں۔

حرا کا دماغ پھٹنے لگا تھا۔ وہ دس منٹ کے

بعد چانک اپنے کیبن میں کھڑا ہوا تا کہ میڈیکل اسٹور سے کوئی پین کمرے کر آئے، وہ جیسے ہی کھڑا ہوا، ان دونوں نے چونک کر اسے دیکھا، ان دونوں کے چہرے فق ہوئے تھے۔ وہ جو اس باختم انداز میں ایک دوسرے کی شکل دیکھ رہی تھیں۔ ان کے پھینکے اور رفت زدہ چہروں پر..... نظر ڈالے بغیر حرا بے پروائی سے آگے بڑھ گیا تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں..... وہ باہر نکل رہا تھا جب اس نے حرا کی سخت تعجب میں ڈوبی آواز سنی۔

”اوہ مائی گاڈ، میں تو سمجھی تھی کہ یہ بھی لہجے کرنے لگیا ہوا ہے، لیکن یہ کہاں سے نکل آیا۔“

”یہ اچانک آسمان سے پڑا ہے یا زمین سے نمودار ہوا ہے، تمہیں ہزار دفعہ کہا ہے کہ اپنے پیٹے ڈھول جیسا والیوم کم رکھا کرو، چاہے وہ ہماری ساری بے ہودہ گفتگو اس نے سن لی ہو.....“ ملیحہ کا شرمندگی اور خفت سے بُرا حال تھا۔ ویسے بھی وہ ذاتی طور پر انتہائی سنجیدہ اور اپنے کام سے کام رکھنے والی لڑکی تھی۔ حرا کے بارے میں سب کو پتا تھا کہ وہ شوخ و چٹپٹ لڑکی ہے۔

”ڈینشن نہ لو.....“ میرا نہیں خیال کہ اس نے کچھ سنا ہوگا، میرا تو ذاتی خیال ہے کہ وہ میز پر سر رکھے سو رہا تھا۔ دیکھا نہیں اس کی آنکھیں کیسے سرخ ہو رہی تھیں۔“ حرا اپنے بیگ سے چاکلیٹ نکالتے ہوئے بے پروائی سے بولی تھی لیکن ملیحہ کا تاسف کسی طور بھی کم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔

”یار اگر اس نے کچھ سن لیا تو کتنی غلط بات ہوگی۔ کیا سوچتا ہوگا وہ ہمارے بارے میں.....؟“ ملیحہ خاصی حساس لڑکی تھی۔ اس لیے اس کی سوئی اڑیں اٹھی ہوئی تھی۔

”جو مرضی سوچے!“ حرا نے بے پروائی سے ہاتھ میں پکڑا ہوا پیر ڈسٹ بن میں ڈالتے ہوئے کہا۔

”ہاں کون سا فرق پڑتا ہے، تم شادی شدہ ہو اور

میں معنی شدہ! وہ اب مزے سے چاکلیٹ کھا رہی تھی۔“ ویسے اگر سن بھی لیا ہو تو اس کے لیے تو اعزاز کی بات ہے کہ ہم اپنے آفس کی سب سے خوب صورت لڑکی کے ساتھ اس کا رشتہ طے کر رہے تھے حالانکہ وہ جتنا اپنے آپ میں مگن رہتا ہے اور کسی کو لفٹ نہیں کرواتا، اس کے ساتھ ایسی نیکی کرنا تو نہیں چاہیے تھی۔“ حرا خاصی لالبا لی لڑکی تھی اور ہر بات کو چٹکیوں میں اڑانے والی۔

”ہاں اسے تو بہت خوش ہونا چاہیے ناں، تم ایک شادی شدہ لڑکی کے ساتھ اس کا رشتہ طے کروا رہی تھیں۔“ ملیحہ نے طنزیہ انداز میں اسے دیکھا جو اس کی دراز سے اب نمکونال کر بے تکلفی سے منہ کا ڈانڈہ تھیل کر رہی تھی۔

”ہاں یار، یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں۔“ وہ مونگ پھلی کا دانہ منہ میں ڈالنا بھول گئی تھی اور قدرے فکر مندی سے بولی۔ ”یار ویسے ہے تو یہ غلط بات، کیا سوچتا ہوگا وہ بھلا مانس؟“ اسے بات کافی دیر بعد سمجھ آئی تھی۔ اس لیے اب اس کا ہونق انداز دیکھ کر ملیحہ کو بے اختیار ہنسی آگئی۔ اسے پہلی دفعہ ماہ نور کی بات سمجھ آئی تھی جو اکثر کہتی تھی کہ حرا کو بات اس وقت سمجھ آتی ہے جب ساری دنیا جیج کر تھک جاتی ہے۔

☆☆☆

زندگی میں عجیب سا پھیکا پن آ گیا تھا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ زندگی کے کیونوں کے سارے رنگ ہی بے رنگ ہو گئے ہیں۔ کوئی بھی چیز اسے خوش نہیں دے رہی تھی۔ دلچسپی یا کشش نام کی چیز تو بہت سال پہلے بھی اس کی زندگی میں نہیں تھی لیکن اب اس میں ایک جھپٹے والا سا پٹن آ گیا تھا۔ اس کی بڑھتی ہوئی بیزاری اور خاموشی حماوت و تشویش میں مبتلا کر رہی تھی۔ وہ اس سے پوچھ پوچھ کر تھک گیا تھا لیکن حرا کا دل بھول کر ایک سکوت طاری تھا۔

وہ بس کسی منٹین کے مانند اپنے آفس کے کام

ماہنامہ پاکیزہ — دسمبر 2012ء

ماہنامہ پاکیزہ — دسمبر 2012ء

ماہنامہ پاکیزہ — دسمبر 2012ء

ماہنامہ پاکیزہ — دسمبر 2012ء

ماہنامہ پاکیزہ — دسمبر 2012ء

مروتی کے سارے ریکارڈ توڑنے پر آمادہ تھا۔
”یار میری کون سی اس کے ساتھ بے تکلفی یا دوستی ہے جو وہ میرے نہ آنے کا برا منائے گی۔ تم لوگ انجوائے کرو، میں نے کب منع کیا ہے لیکن مجھے اپنا کام کرنا ہے۔“ اس کے لہجے میں چھپی بیزاری اور تنگی کی حدوں کو چھوٹی صاف گوئی پر حماد ایک لمحے کو تو ہکا بکا رہ گیا۔ ناگواری کی ایک لہر نے اس پر۔۔۔ بھرپور طریقے سے حملہ کیا تھا۔ بھی وہ غلطی بھرے انداز میں گویا ہوا۔

”تمہارا دماغ ٹھیک ہے؟ سب لوگ وہاں جمع ہیں اور تم اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنانا چاہتے ہو، ویسے بھی آفس کے اکثر لوگ کہتے ہیں کہ حارث بہت مغرور سا لگتا ہے کسی سے گھٹاتا ہی نہیں ہے۔“ حماد نے ٹھیک ٹھاک اس کی کلاس لینے کی کوشش کی تھی۔
”مجھے ان کی باتوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا، وہ جو کچھ مرضی کہیں، جب میری عادت نہیں ہے ہر کسی سے بے تکلف ہونے کی تو میں کیا کروں۔۔۔۔۔“ وہ کندھے اچکا کر انتہائی بیزاری سے بولتا ہوا حماد کو سخت زہر لگا۔ اس نے کچھ لمحے ٹٹولتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا۔ جبکہ وہ اسے نظر انداز کیے ڈھٹائی سے اپنے کام میں مگن تھا۔ اس کے بے تاثر اور سپاٹ چہرے پر کوئی پلک نہ پا کر وہ ایک دم بھڑک اٹھا۔

”بھاڑ میں جاؤ تم اور تمہاری کورا اسٹوری، تمہارے دماغ کے سارے ہی پُزے ڈھیلے ہو چکے ہیں۔ تم انسانوں میں رہنے کے قابل نہیں ہو۔“ وہ پاؤں پٹختا ہوا کانفرنس روم کی طرف چلا گیا تھا۔ جہاں ماہ نوڑکی واپسی کو سیلیبریٹ کیا جا رہا تھا۔ اس کے علاوہ بھی لوگ وہاں جمع تھے۔ وہ اپنا سر جھٹک کر ایک دفعہ پھر اپنے کام میں مصروف ہو گیا تھا۔ حماد کو منانے کا ارادہ فی الحال اس نے ملوثی کر دیا تھا۔ بہت تیزی سے کی بورڈ پر انگلیاں چلانے میں مگن تھا جبکہ آنکھیں ڈبیک ٹاپ پر تھیں، اس نے بہ مشکل خود

”کیا ہو گیا ہے تم لوگوں کو؟“ ایڈیٹوریل سیکشن کی ملیجہ نے دونوں کو تنہی نظروں سے گھورا جو خود بھی ایک دوسرے کو کھانے والی نظروں سے دیکھ رہے تھے، دونوں کے تعلقات ازلی دشمنوں کی طرح سخت کشیدہ رہتے تھے۔
”چلیں بھی، سب کانفرنس روم میں چلتے ہیں اور ماہ نوڑکی واپسی سیلیبرٹی کرتے ہیں، ساجد ہمیں اچھی سی چائے پلائے گا۔“ ملیجہ کے زوردار اعلان پر پورے آفس میں ایک ہلچل مچ گئی تھی۔

”واہ جی واہ، یہ آج ایڈیٹوریل والے بڑے فیاضی کے موڈ میں ہیں ظاہر ہے کہ ان کا کورم جو پورا ہو گیا ہے۔۔۔۔۔“ حراہنتے ہوئے ماہ نور سے گلے مل رہی تھی۔ اس میگزین کے انگلش سیکشن میں چار لوگ تھے۔ ملیجہ، ماہ نور اور حماد کے بعد حارث کی صورت میں نیا اضافہ ہوا تھا۔ وہ لوگ اب خوش دلی کے ساتھ کانفرنس روم کی طرف چل پڑے۔

”آؤ ناں حارث، تم کہاں بڑی ہو؟ چلو کانفرنس روم میں چلتے ہیں، زبردستی چائے پیتے ہیں اور ماہ نور سے کپ شپ کرتے ہیں۔“ حماد اچانک ہی اس کے سر پر آکر بولا۔ وہ ایک دم چونک گیا۔ کمپیوٹر کے ماؤس پر اس کی گرفت خاصی مضبوط ہو گئی تھی۔

”نہیں یار۔۔۔ تم لوگ جاؤ، میرے سر میں درد ہے اور دیے بھی مجھے آج یہ کورا اسٹوری مکمل کرنی ہے اور اسی سلسلے میں کچھ دیر کے بعد ایک انٹرویو کے لیے بھی جانا ہے۔“ اس کے بیزار انداز پر حماد جب سے آنکھیں بھاڑے اسے ایسے دیکھ رہا تھا جیسے کوئی بہت بڑا غیر معمولی بات سن لی ہو۔

”تم آن حارث کیا ہو گیا ہے، ابھی ڈیڈ لائن میں بہت دن پڑے ہیں اور پھر ماہ نور ہمارے سیکشن کی ہے برا لگتا ہے۔“ حماد نے سنجیدگی سے اسے سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ بھی آج ٹوکھائی اور بے

ہوئے میگزین کے ایڈیٹر کا حوالہ دیا جو ہر میٹنگ میں اس کے کام کی تعریف کرتے تھے۔
”شکر ہے ماہ نور تم آئیں، قسم سے میں نے تمہیں بہت مس کیا۔“ ایڈیٹوریل سیکشن کی مائزہ کے چہرے پر اسے دیکھ کر بہار آگئی تھی، وہ اس کے کام میں خاصی مدد کر دیتی تھی اور اس کے دیے گئے آئیڈیاز پر اس نے کام کر کے خاصی تعریف وصول کی تھی۔

”لو کام چور لوگوں کو تو خوش ہوگی ناں۔۔۔۔۔“ سرکولیشن کے فہد نے مائزہ پر طنز کیا کیونکہ سارے اسٹاف کو علم تھا کہ مائزہ کے منفرد کام کے پیچھے ماہ نور کا دماغ ہوتا ہے۔

”ہاں، تم نے جو آسمان پر فتح کے جھنڈے گاڑ رکھے ہیں۔ میں نے بھی وہ دیکھ لیے ہیں۔ سارے آفس کو پتا ہے کہ جب سے تم نے اپنا ننھوں قدم سرکولیشن ڈیپارٹمنٹ میں رکھا ہے۔ میگزین کی سرکولیشن آدھی رہ گئی ہے۔“ مائزہ نے بھی حساب برابر کیا۔ اس کی ننھی مٹی سی ناگ غصے کی زیادتی سے سرخ ہو گئی تھی۔ حارث کو پہلی دفعہ اندازہ ہوا تھا کہ وہ لوگ آپس میں کافی بے تکلف تھے اور بالکل ایک خاندان کا سا ماحول تھا۔ سارا دن چھیڑ چھاڑ جاری رہتی۔ بعض دفعہ ماحول کی گرمی کو کم کرنے کے لیے اسٹنٹ ایڈیٹر کو اپنے آفس سے باہر آنا پڑتا تھا لیکن وہ لوگ بھی خامسے تیز تھے ان کے جاتے ہی اپنے اپنے کیمین میں پھر کھڑے ہو جاتے تھے۔ پہلی دفعہ تو حارث کو لگا تھا کہ وہ اندرون شہر کے کسی پرانے محلے میں آگیا ہو جہاں خواتین اپنے اپنے دروازوں پر کھڑی ایک دوسرے کے ساتھ بحث و مباحثہ میں مصروف دکھائی دیتی ہیں۔ یہ ماحول بعض دفعہ لکھے کے کام میں خاصا حائل ہوتا تھا لیکن مارکیٹنگ ڈیپارٹمنٹ کو سمجھانا بھینس کے آگے بچانے کے مترادف تھا۔

کے جاتا۔ آفس سے گھر اور گھر سے آفس تک اس کی زندگی پہلی ہی محدود تھی اب تو اور بھی زیادہ اس نے خود کو ایک دائرے میں مقید کر لیا تھا۔ اس کی حد درجہ سنجیدگی، بالعلقی اور کسی حد تک بے حس انداز کی بنا پر آفس کے بہت کم لوگ ہی اسے مخاطب کرنے کی جرأت کرتے تھے۔ حماد نے بھی تنگ آکر اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔ اور ویسے بھی کوئی دیواروں سے کہاں تک ٹکریں مار سکتا ہے۔ اس کا پورا خاندان 8 اکتوبر کے زلزلے کی نذر ہو گیا تھا۔ ان دنوں وہ لاہور میں پنجاب یونیورسٹی میں پڑھ رہا تھا۔ اس کے بعد اس کے لیے زندگی کے سارے ہی مفہوم بدل گئے تھے۔

☆☆☆

اس دن اچانک ہی پورے آفس میں ہلچل پیدا ہوئی۔ جب ننھی مسکرائی کھلکھلاتی ہوئی ماہ نور چھٹیوں کے بعد آفس آگئی۔۔۔۔۔ وہ حد درجہ خوش باش اور بات بات پر قہقہہ لگا رہی تھی۔ میرون رنگ کے سوٹ میں اس کی شہابی رنگت کندن کی طرح دمک رہی تھی۔ آنکھوں میں جھپکے والے ستاروں سے اس نے بہ مشکل نظریں چڑائی تھیں۔ حارث کو پہلی دفعہ احساس ہوا تھا کہ زندگی اب اس کے لیے اور زیادہ مشکل ہو جائے گی۔

”تم پھر آگئی ہو، ہم تو سمجھے تھے کہ جان چھوٹ گئی لیکن ہماری ایسی قسمت کہاں؟“ حماد نے اسے دیکھتے ہی بلند آواز میں شرارت سے کہا اور اس نے ہاتھ میں پکڑا ایک آفس بوائے ساجد کے ہاتھ میں پکڑاتے ہوئے اپنا مخصوص ٹھکانا ہوا قہقہہ فضا میں بلند کیا تھا۔

”منہ دھو رکھو، مجھ سے تم لوگوں کی اتنی آسانی سے جان نہیں چھوٹ سکتی اور پھر میرے جیسا ٹیلنٹ اس پورے دفتر میں نہیں۔ بے شک جاکر راشد صاحب سے پوچھ لو۔“ اس نے جواباً اسے چڑاتے

چرائی تھیں۔

”اس کی آواز بہت خوب صورت ہے ماہ نور، موسیقی کی خاصی شہید ہے اسے، بہت کمال غزلیں گاتا ہے یہ.....“ حماد نے سچ چورا ہے ہر اس کا بھانڈا پھوڑا تھا۔ حارث کے لیے یہ بات انتہائی غیر متوقع تھی۔ اس لیے اس کے چہرے پر پھیلنے والی ناپسندیدگی کسی سے بھی نہیں چھپی رہ سکی۔

”جی ایسا کچھ نہیں ہے... حماد کو یہی اول فول بولنے کی عادت ہے.....“ اس نے حد درجہ سنجیدہ انداز میں کہا تھا۔

”جی اس بات کا تو ہمیں پہلے ہی سے پتا ہے، آپ ٹینشن نہ لیں۔ آپ سب لوگ بھی میرے اعزاز میں سجا ہی یہ محفل ختم کریں۔ باس نے کانفرنس روم میں جھانک لیا تو آپ سب لوگ ہمیشہ کی طرح میرے ہی کندھوں پر بندوق رکھ کر جلادیں گے اور میری پہلے ہی دن اچھی طبیعت صاف ہو جائے گی۔“ وہ چائے کا خالی کپ ٹرے میں رکھ کر فوراً کھڑی ہو گئی..... باقی سب لوگوں نے بھی اس کی پیروی کی تو حارث نے سکون کی سانس لی۔ اسے اس طرح کی محفلوں سے بڑی ابھرن ہوتی تھی اور خصوصاً اس وقت جب اسے مرکز نگاہ بنایا جائے۔ وہ کچھ عرصے سے خاصاً آدم پیزا رسا ہو گیا تھا۔

میگزین کی ایک کور اسٹوری کے لیے ایڈیٹر صاحب کچھ لوگوں کو ملک کے ٹینشن زدہ علاقوں میں بھیجنا چاہتے تھے۔ باجوڑ ایجنسی کے لیے اس نے اپنا نام پیش کیا تو باقی سب لوگ حیران رہ گئے۔ حماد نے تو اسے اچھا خاصا جھاڑ دیا تھا لیکن وہ کچھ بھی سننے کو تیار نہیں تھا۔ وہ..... آفس کے ماحول سے پکڑے کے لیے جانا چاہتا تھا جہاں اس کا لہو نہ سولی پر گر رہا تھا۔

پندرہ دن کے بعد وہ واپس آیا تو اس کے پاس لکھنے کے لیے اچھا خاص مواد تھا۔ کاپی کی ڈیٹ سر پر سوار تھی اس لیے ہر بندہ ہی مصروف دکھائی دے رہا

پاکستان ریلوے کی ٹرینوں جیسا ہے۔ بس اعلان ہی سننے رہتے ہیں کہ آ رہی ہے جبکہ تم لوگ بھی بس اسی طرح اعلان کرتے رہتے ہو اور ہر مہینے راشد صاحب سے جھاڑ کھاتے ہو۔“ وہ ڈھٹائی سے ہنستے ہوئے سینڈ وچ کھا رہا تھا۔

”اسے چھوڑ دو تم بتاؤ ماہ نور، ہنی مون پر کہاں، کہاں گئیں؟ اس دن فون کیا تو نانو بتا رہی تھیں کہ سوات گئی ہوئی ہو۔“ ملیجہ نے ٹیک کو نفاس سے کاٹتے ہوئے ماہ نور کو مخاطب کیا جو مسکراتے ہوئے سب کی ٹوک جھوک سن رہی تھی۔

”ہاں بس ایک دو جگہوں پر ہی گئے، میرے تو سر پر کاپی کی ڈیڈ لائن سوار تھی اور تمہیں پتا ہے ناں کہ راشد صاحب کام کے معاملے میں کتنے بدلچاڑ ہیں، ایک منٹ میں بندے کی طبیعت صاف کر دیتے ہیں۔ اس لیے سچ بات ہے کہ میں نے کوئی انجوائے ہی نہیں کیا۔“ اس کی صاف گوئی عروج پر تھی۔ وہ بہت نفاس سے کہاں کاٹنے کے ساتھ کھا رہی تھی۔

حارث نے کن انکھیوں سے اسے دیکھا اس میں ایک خاص قسم کی کشش اور تمکنت تھی جو اسے دوسروں سے ممتاز کرتی تھی۔ سب لوگوں کی توجہ اس کی طرف تھی۔

”آپ خاموش رہنے کے علاوہ کیا کرتے ہیں.....؟“ اس نے اچانک ہی حارث کو متوجہ کیا تھا چونکہ وہ اس اچانک حملے کے لیے تیار نہیں تھا اس لیے گڑبڑا کر رہ گیا۔ اس کے چہرے پر پھیلنے والی بدحواسی پر حماد کا قہقہہ برا بے ساختہ تھا۔

”بس کوئی خاص نہیں، فارغ وقت میں، میں مطالعے کا شغف رکھتا ہوں.....“ حارث نے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا اور سنجیدگی سے بولا۔

”اوہ مائی گاڈ، خاصی گاڑی اردو بولتے ہیں آپ.....“ ماہ نور کھلکھلا کر ہنس دی۔ حارث نے اس کے دائیں گال پر ابھرے ڈمپل سے بہ مشکل آنکھیں

دے کر بولی تھی۔ حارث کی شرمندگی میں دگنا اضافہ ہوا تھا۔ وہ وہیں جم کر کھڑی تھی۔ حارث کا دل عجیب سی بغاوت پر اتر رہا تھا۔

”چلیں انھیں فوراً یہ کام بعد میں کر لیجیے گا۔ وہاں سب لوگ انتظار کر رہے ہیں۔ پہلے ہی انگلش سیکشن کے صرف چار لوگ ہیں ان میں سے بھی ایک غیر حاضر ہو تو بات کچھ بنتی نہیں ہے۔ وہاں اردو سیکشن والوں کا پلڑا بھاری ہے۔ شاباش انھیں، انھیں.....“ ماہ نور کا لہجہ اتنا حتی تھا کہ وہ چاہنے کے باوجود منع نہیں کر پایا تھا۔ اسے لگا تھا کہ اس کی قوت گویائی سلب ہو گئی ہو۔ وہ اب بے تکلفی سے اس کا کمپیوٹر شٹ ڈاؤن کر رہی تھی۔ وہ اس کے اس حق جتانے انداز پر کچھ بھی نہیں بول پایا تھا۔ اسے پتا ہی نہیں چلا کہ وہ کب اس کے پیچھے کانفرنس روم میں داخل ہو گیا تھا۔ اسے اندر آتے دیکھ کر سب لوگوں نے تالیاں بجا کر اسے مزید شرمندہ کر دیا تھا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔

”بھینکس ماہ نور، یہ کمال بس آپ ہی کر سکتی تھیں، ورنہ یہ نواب صاحب میری تھوڑی سننے ہیں۔“ حماد کی چالاکی اسے فوراً سمجھ آ گئی تھی۔ اس کا خفت بھرا جھینپا جھینپا سا انداز سب کے چہروں پر مسکراہٹیں لانے کا موجب بن گیا تھا۔

”جناب ہم جائیں اور کام نہ ہو، ایسے تو حالات نہیں.....“ وہ بڑے شاہانہ انداز سے اپنی شرٹ کا نا دیدہ کالر کھڑا کرتے ہوئے بولی تھی۔

”ہاں یہ تو ہے، یقین کرو، ماہ نور کے آنے کے بعد اب مجھے یقین ہے کہ کاپی ناٹم پر چلی جائے گی۔ ورنہ حماد کی سستی اور کاپی سے ایک زمانہ آگاہ ہے۔“ اردو سیکشن کی شازمہ نے شرارت سے کہا تھا۔ حماد کا ریکارڈ تھا کہ وہ اپنا کام ڈیڈ لائن والے دن ہی جمع کرواتا تھا۔

”چلو میں سست سہی لیکن تم لوگوں کا حال بھی تو

کو اپنے کام کی طرف متوجہ کیا تھا۔

”بہت افسوس اور دکھ کی بات ہے اور میرے لیے ڈوب مرنے کا مقام ہے کہ میرے ایک کولیک کو میری آمد کی قطعاً خوشی نہیں ہوئی۔“ وہ ایک دم ہی اس کے سامنے آ کر بولی تھی۔ اس نے بھٹکے سے سر اٹھا کر دیکھا، وہ اس سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑی دونوں ہاتھ سینے پر باندھے بغور اس کا جائزہ لینے میں مگن تھی۔ وہ بوکھلا کر کھڑا ہو گیا تھا۔

”ایسی تو کوئی بات نہیں.....“ وہ اس کی شکوہ کرتی آنکھوں کے آگے گڑبڑا گیا تھا۔ اسے ہرگز توقع نہیں تھی کہ وہ اس طرح اچانک اس کے سر پر آجائے گی۔

”اگر ایسی کوئی بات نہیں تو پھر ”ویسی“ بات یہ ہی ہو سکتی ہے کہ آپ کو ہم لوگ اس قابل نہیں لگتے کہ ہمارے ساتھ بیٹھ کر ایک کپ چائے پی سکیں۔“ وہ بلا کی پُر اعتماد تھی۔ خوب صورتی اور خود اعتمادی دونوں چیزیں مل کر کیسے بد مقابل کے چھٹے بھڑائی ہیں اس کا اندازہ حارث کو پہلی دفعہ ہوا تھا۔

”ایسی یا ویسی کوئی بات نہیں۔ بس میں نے سوچا کہ آپ لوگ پرانے دوست ہیں۔ اس لیے مل کر انجوائے کریں اور میں کور اسٹوری مکمل کر لیتا ہوں۔“ اس نے انتہائی خفت بھرے انداز میں بوکھلا کر صفائی دی۔

”پہلی بات تو یہ ہے کہ دوست کوئی پرانا یا نیا نہیں ہوتا بس دوست ہوتا ہے۔ جہاں تک بات اسٹوری کے مکمل کرنے کی ہے تو وہ ہم ڈیڈ لائن سے ایک دن پہلے ہی دیتے ہیں۔ ہماری سابقہ تاریخ اٹھا کر دیکھ لیں۔ آپ دس دن پہلے دے کر ایڈیٹر صاحب کی عادتیں خراب نہ کریں۔ بہت سے بے چارے کام چور لوگوں کی زندگی خراب کر دیں گے وہ آپ کی مثالیں دے دے کر.....“ وہ انتہائی دلچسپ انداز سے مسکراتے ہوئے اپنی گردن کو خم

تھا۔ کسی کو بھی ایک دوسرے سے بات کرنے کی فرصت نہیں تھی۔

”حادث پلیر اگر آپ مائنڈ نہ کریں اور آپ کے پاس فرصت ہو تو کیا آپ میرا یہ آرٹیکل چیک کر دیں گے، مجھے لگتا ہے کہ اس میں کافی غلطیاں ہیں.....“ اس دن وہ اچانک ہی اس کے کیمین میں آکر انتہائی سنجیدہ انداز میں بولی تھی۔ حادث نے چونک کر اس کے تھکے تھکے سے چہرے کو دیکھا۔ وہ پچھلی ہی مسکراہٹ کے ساتھ کہہ رہی تھی۔

”سوری، میں آپ کو تنگ کر رہی ہوں لیکن مجھے کوئی اور بندہ فری نہیں ملا۔ اوپر سے راشد صاحب کا مزاج بھی صبح سے خاصا برہم ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ کل تک ڈی ان کی میز پر ہو اور میری ساس کی طبیعت خاصی خراب ہے مجھے گھر جانا ہے۔ اگر یہ آرٹیکل راشد صاحب کو نہ ملا تو وہ میری اچھی خاصی کلاس لے لیں گے۔“

”اٹس اوکے..... میں... کر دوں گا، آپ جائیں۔“ اس کے مختصر جواب پر اس نے بڑی ممنون لگا ہوں سے اسے دیکھا تھا۔

”سوری میں ملیجہ کو کہہ دیتی لیکن وہ ایک انٹرویو کے لیے باہر گئی ہوئی ہے۔“ وہ شرمندہ سے انداز میں مزید وضاحت دے رہی تھی اس کا یہ انداز حادث کے لیے تکلیف کا باعث بن رہا تھا۔

”اٹس اوکے ماہ نور، مجھے کوئی پرابلم نہیں، میں اپنا کام کر کے دے چکا ہوں۔“ اس کے دو ٹوک انداز پر وہ کچھ مطمئن ہوئی۔

”اصل میں میری چار سالہ جاب میں پہلی دفعہ ایسا ہوا ہے۔ اس سے پہلے میں ہی سب کو ریلیف دیتی تھی لیکن.....“ وہ خاصی الجھی ہوئی تھی۔ حادث کو اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کس اندرونی خلفشار کا شکار ہے۔ ”ماہ نور.....“ آپ کیوں اتنی شینس ہو رہی ہیں۔ جاب میں ایسا ہو جاتا ہے۔ مجھے مداد بنے بتایا تھا کہ

آپ اکثر اس کی مدد کرتی رہتی تھیں جب اسے کوئی ایئر چنسی ہوتی تھی۔ اس لیے آپ بے فکر ہو کر چل چائیں، میں کر لوں گا۔“ اس نے خلافِ عادت اتنی تفصیل سے جواب دیا تھا۔ وہ پچھلے سے انداز میں مسکرائی اور کچھ بھی کہے بغیر آگے بڑھ گئی۔ اس کے آرٹیکل کا سرسری انداز میں جائزہ لینے سے اسے فوراً اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کا انداز تحریر خاصا مٹاڑ کن تھا۔ اس نے کافی چونکا دینے والے انداز سے حقائق لکھے تھے لیکن لکھتے ہوئے وہ شاید ذہنی طور پر حاضر نہیں تھی اس لیے اس نے موضوع کے متعلق اعداد و شمار پچھلے سال کے دے دیے تھے۔ جس نے اس کی تحریر کا حسن کم کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ پیرا گراف میں بھی ربط نہیں تھا۔ اسے آرٹیکل کو ایک بھر پور شکل دینے میں پورے تین گھنٹے لگے تھے لیکن وہ اب خاصا مطمئن تھا۔

اگلے دن میگزین کی ڈی دیکھ کر اسے دھچکا لگا۔ اس آرٹیکل پر ماہ نور کے ساتھ حادث کا نام بھی تھا، حالانکہ پروف ریڈنگ کے دوران اس نے خود دیکھا تھا کہ اس تحریر پر صرف ماہ نور کا نام تھا۔ وہ ڈی اٹھا کر ماہ نور کے کیمین میں آ گیا۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرائی۔ حادث نے اس کی آنکھوں کے نیچے پھیلے حلقوں کو حیرت سے دیکھا۔ ایک ماہ میں ہی وہ خاصی مر جھای گئی تھی۔ شاید گھر اور آفس کی مصروفیات نے اسے خود سے بے پروا کر دیا تھا۔

”یہ اس آرٹیکل پر میرا نام کس نے لکھا.....؟“ حادث نے بغیر تمہید کے انتہائی سنجیدگی سے پوچھا تھا۔ اسے اپنا نام وہاں دیکھ کر قطعاً خوشی نہیں ہوئی تھی۔ ”یہ نام میں نے لکھا تھا، اصل میں راشد صاحب آرٹیکل کی بہت تعریف کر رہے تھے، میرے ضمیر نے گوارا نہیں کیا کہ میں آپ کی محنت پر اپنا نام لکھوا دوں کیونکہ اس میں آدھی محنت تو آپ کی شامل تھی۔“ وہ بہت صاف گوشتی اس کا اندازہ حادث کو

ابھی ابھی ہوا تھا۔ ”لیکن میں نے اس غرض سے تو اس آرٹیکل کو جنم نہیں کیا تھا اور ویسے بھی میں نے صرف کچھ دنوں کو رینج اور کچھ اعداد و شمار کی درستگی کے علاوہ کچھ نہیں کیا۔“ وہ کچھ ناراض سے انداز میں وضاحت دے رہا تھا۔ اس کے چہرے کے نقوش بڑے بڑے سے لگ رہے تھے۔

”آپ ناراض کیوں ہو رہے ہیں؟“ وہ بھی اپنی سیٹ سے کھڑی ہو گئی تھی۔ ”آپ کو اپنا نام اس آرٹیکل پر اچھا نہیں لگ رہا یا میرے نام کے ساتھ اچھا نہیں لگ رہا.....؟“ وہ دونوں بازو سینے پر باندھ کر بڑے آرام سے پوچھ رہی تھی۔ حادث کو اس کی بولتی آنکھوں سے الجھن ہوئی۔ وہ اس کی بات پر گڑبڑا سا گیا۔

”مجھے آپ کی محنت پر اپنا نام اچھا نہیں لگا۔“ وہ سنبھل کر گویا ہوا۔

”حالانکہ میرا ذاتی خیال ہے کہ آپ نے جس طرح تمام چیزوں کو ایک ردیم کے ساتھ ترتیب دیا ہے اور اعداد و شمار کی درستگی کی ہے۔ اس نے ساری تحریر کی شکل ہی تبدیل کر دی ہے ورنہ کل میں جتنی دھڑلہ تھی کبھی اتنے عمدہ طریقے سے اس کو نہیں لکھ سکتی تھی۔“ وہ کیمین کی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بڑی صاف گوئی سے بتا رہی تھی۔

”آپ نے جس کام کے لیے میں مجھے کہا تھا میں نے وہ ہی کیا ہے۔ آپ پلیر اس پر سے میرا نام ہٹا دیں۔ مجھے اچھا نہیں لگ رہا۔“ اس نے اپنے دل کے اندر برپا ہوتے ارتعاش سے گھبرا کر قدرے دھڑکنے انداز میں کہا تو وہ ہنس پڑی۔

”بہت عجیب ہیں آپ، ورنہ لوگ تو اس بات پر مرنے مارنے پر اتر آتے ہیں کہ ان کی ہلکی سی محنت ہی کیوں کسی اور کے کھاتے میں جائے۔“ ”آئی ایم سوری..... میرا شمار ایسے لوگوں میں

نہیں ہوتا۔“ وہ اپنی بات کہہ کر رکھ نہیں۔ اس نے ڈسٹر اننگ ڈیپارٹمنٹ کے وائس صاحب کو اپنا نام اس پر سے ہٹانے کو کہہ دیا تھا۔ اس کے دو ٹوک اور حتیٰ انداز پر ماہ نور نے بھی مزید کچھ نہیں کہا تھا لیکن اس کے بعد سے وہ اسے کوئی بھی کام کہنے سے محتاط ہو گئی تھی اس کا اندازہ اس دن اسے ملیجہ کو اپنا آرٹیکل دیتے ہوئے دیکھ کر ہو گیا تھا۔

”یار تم اپنی ساس سے پوچھو کہ ان کو مسئلہ کیا ہے، نہ تمہیں جاب چھوڑنے دیتی ہیں نہ ڈھنگ سے جاب کرنے دے رہی ہیں۔ پرتیرے دن ان کی طبیعت خراب ہو جاتی ہے تو آخر تمہیں ہی کیوں آفس میں تنگ کیا جاتا ہے۔ بانی دوہوئیں کیا وہ نمائش میں رکھنے کے لیے لائی ہیں۔“ ملیجہ جھجھلا کر قدرے بلند آواز میں بولی تھی۔

”یار مجھے خود سمجھ نہیں آتی کہ ان کے ساتھ کیا مسئلہ ہے۔ ذرا ساسر میں درد بھی ہوتا ہے تو وہ اپنے بیٹے کو کراچی فون کھڑکا دیتی ہیں اور وہ صاحب مجھ پر گر جتنا شروع ہو جاتے ہیں کہ میں ان کی غیر موجودگی میں ان کی والدہ کا خیال نہیں رکھتی، گھر میں بھی کمپیوٹر کے پاس بھی جانی ہوں تو ان کو خفقان ہونے لگتا ہے، مجھے تو خود سمجھ نہیں آ رہی کہ اپنا آفس کا کام کم کروں؟“ اس کی آواز کی سنجیدگی میں اب رنجیدگی کا عنصر غالب آ گیا تھا۔ حادث نے جھجھلا کر ان چھوٹے چھوٹے دڑبے نما کیمینوں کو دیکھا۔ جہاں کسی کی بھی پرائیویسی قائم نہیں ہو سکتی تھی۔

”انتہائی اماں کا غم ہے تو موصوف خود کیوں نہیں جاب چھوڑ کر کراچی سے اسلام آباد آ جاتے۔ تمہیں کیوں بار بار تنگ کر رہے ہیں، کل بھی راشد صاحب خفا ہو کر کہہ رہے تھے کہ ماہ نور کی شادی کے بعد کارکردگی پچاس فیصد کم ہو گئی ہے۔ اوپر سے تمہاری آئے دن کی فل اور ہاف ڈے کی چٹھیوں نے ان کا موڈ آف کر رکھا ہے۔“

آنے میں دیر نہیں لگتی۔“ وہ مزید اب اسی موضوع پر بے تکان بول رہے تھے۔ باقی سب لوگ سر جھکائے ان کی تلخ مگر سچی باتوں کو ہضم کرنے کا دشوار کن مرحلہ دشوار کن طریقے سے ہی عبور کر رہے تھے۔ مینگ پورے دو گھنٹے جاری رہی تھی۔

”راشد صاحب کا لگتا ہے کہ دماغ خراب ہو گیا ہے ٹھیک کہا ہے کسی نے.....“ اختیار کسی بھی انسان کو بے اختیار کر دیتا ہے اور یہ بات راشد صاحب پر بالکل فٹ بیٹھی ہے۔“ راشد صاحب کے مینگ روم سے نکلے ہی میچہ بری طرح پھٹ پڑی تھی۔

”بہت غلط بات کی ہے سر نے انہیں وہ وقت بھول گیا جب میرا ایکسڈنٹ ہوا تھا اور میچہ میٹری لیو پر تھی تب انگلش سیکشن کا سارا کام ہی ماہ نور نے کیا تھا۔“ حماد کو بھی سخت برا لگا تھا کہ انہوں نے پوری مینگ میں بس ماہ نور کو ہی آڑے ہاتھوں لے کر خوب رگیدا تھا۔ وہ بے چاری بالکل چپ رہی تھی، اسے وہ وقت یاد آ رہا تھا جب ایسی ہی مینگ میں وہ اسے اور اس کے کام کو گھنٹوں سرائتے تھے۔

”اس کے علاوہ بھی تو بے شمار مواقع رہا ماہ نور گدھوں کی طرح چار چار بندوں کا کام کرتی تھی۔ اب دیکھو کیسے بد لحاظ ہو گئے ہیں ذرا بھی نام کو مروت نہیں ان میں.....“ میچہ نے جگ سے پانی گلاس میں اٹھیلے ہوئے ایک دفعہ پھر ہڑاس نکالی تھی۔ اس وقت وہ چاروں ہی مینگ روم میں تھے۔ حادثہ بالکل خاموش تھا اسے بالکل بھی سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ اس موقع پر کیا کہے۔

”اُس اوکے یار..... راشد صاحب غلط نہیں کہہ رہے، پچھلے دو، تین ماہ سے وہ میرا کافی لحاظ کر چکے ہیں۔ انہوں نے اپنا میگزین بھی تو چلانا ہے ناں.....“ وہ ضبط کے کڑے مراحل سے گزر کر بہ مشکل مسکرائی تھی۔

”کیوں.....؟ کیا ہوا ہے ان کے میگزین

کلاس لینے کے لیے منعقد کی تھی۔ رسی گفتگو کے بعد وہ انتہائی سخت انداز میں کہہ رہے تھے۔

”کسی بھی کامیابی کو حاصل کر لینا میرے نزدیک کوئی مشکل کام نہیں، مشکل کام یہ ہے کہ آپ کسی رپویشن کو برقرار رکھتے ہیں۔ یاد رکھیں کہ کسی بھی آرگنائزیشن میں آپ کا قد آپ کی محنت اور قابلیت سے ہوتا ہے۔ ادارے آپ کی محنت کے بل پر ہی چلتے ہیں اور آپ کی کارکردگی کی بنیاد پر ہی آپ کے مقام کا تعین ہوتا ہے۔“ راشد صاحب نے بطور خاص ماہ نور کی طرف جتنا ہی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

ماہ نور نے بیٹھے بیٹھے خفت بھرے انداز سے پہلو بدلا تھا سب کی نظریں بے اختیار اس کی طرف اٹھیں۔ راشد صاحب نے ادھر ادھر گھما پھرا کر کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد ایک دفعہ پھر ڈائریکٹ ماہ نور سے کہا تھا۔

”ہاں جی ماہ نور..... اب آپ کے کیا ارادے ہیں؟ میرا خیال ہے کہ آپ اپنی جاب کے بارے میں سیرسلی سوچیں۔ اگر آپ گھر اور ملازمت میں توازن نہیں رکھ پارہیں تو آپ کو سنجیدہ ہو کر کوئی فیصلہ کر لینا چاہیے کیونکہ آئے دن کی چٹنیوں کی اب مزید کوئی گنجائش نہیں نکلتی۔ آپ کو فیور دینے کا مطلب یہ ہے کہ مجھے باقی لوگوں کو بھی دینا ہوگا۔“

راشد صاحب کی بد لحاظی پر ماہ نور کا منہ سرخ ہو گیا تھا۔ بھرے منہ میں بے عزتی کا احساس ہی اتنا شدید تھا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے جن کو چھپانے کے لیے اس نے سر نیچے کر لیا تھا۔ وہاں سے وہ اس کے باقی کو لیکر کبھی اپنے پاس کی یہ بات بالکل اچھی نہیں لگتی تھی۔

”کوئی بھی ادارہ اپنے اصول و ضوابط پر عمل کر کے ہی اپنا وجود قائم رکھ سکتا ہے اگر اسے ہی قوانین کی نظر خود دھجیاں اڑانے لگیں تو پھر زوال کے موسم کو

ماں، بیٹا تمہیں ریلیکس ہونے دیں گے.....“ نے جھنجھلا کر کہا تھا۔ ان کی باتوں سے حادثہ کا دل دکھ اور رنجیدگی کے احساس سے جھل جھلکا تھا۔ اسے پہلی دفعہ اندازہ ہوا تھا کہ اس کے تنہا چہرے کے پیچھے کون سے عوامل کارفرما ہیں۔

”..... اللہ ہی اپنے بندوں کو آسانیاں دے گا۔“ یہ انساؤں کے طرف کی بات نہیں۔ ان کا دل چاہتا تو سانس بھی گن کر لینے دیں۔ باقی اپنے حصے کی دھکی فصل تو خود کاٹنا پڑتی ہے مجھے تو بچپن سے اس کا تجربہ ہے۔ خیر یا سوری میں نے تمہیں بھی پریشان کر دیا تھا۔ دفع کرو، اچھی سی چائے منگواؤ مل کر پی رہے ہیں.....“ وہ زبردستی کے بنائش انداز میں بولی تھی۔

”تم کبھی نہیں سدھ سکتیں..... یاد رکھنا کہ اپنے حق کے لیے خود جنگ لڑنا پڑتی ہے ورنہ کوئی ہمسائے سے آکر آپ کے لیے نہیں لڑتا.....“ میچہ نے اٹھ اٹھے اسے ایک دفعہ پھر سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

”یار چھوڑو، ان جنگوں کو، مجھے تو ویسے ہی لڑائی کا سوچ کر ہی وحشت ہوتی ہے۔ میں نے ان جنگوں سے بچنے کے لیے کبھی..... مضمون کو بھی ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ بہت برا لگتا تھا یہ مضمون.....“ وہ بے پروائی سے ہاتھ جھاڑ رہی تھی۔ جبکہ میچہ بھی اس سے مایوس ہو کر اب کھڑی ہوئی تھی وہ دونوں اب کانفرنس روم کی طرف جا رہی تھی۔

☆☆☆

وہ دو دن سے پھر غیر حاضر تھی اور راشد صاحب کا پارہ آسمان کو چھو رہا تھا۔ اس نے کی انٹرویو کے لیے حانا تھا لیکن کسی گھریلو مسئلے کی وجہ سے آفس نہیں آسکی تھی۔ وہ اور حماد انٹرویو تو کر آئے تھے لیکن راشد صاحب اس دفعہ اسے کوئی بھی رعایت دینے کے موڈ میں نہیں نظر آ رہے تھے۔ ان کے حزانہ کی برہمی اس دن ایڈیٹوریل والوں کی مینگ میں عروج پر تھی جو انہوں نے خصوصاً انگلش سیکشن کی

پرائیویٹ جاب میں اس طرح کی چیزوں کا لوگ زیادہ دیر تک لحاظ نہیں کرتے.....“ میچہ نے صاف گوئی سے کہا تو وہ ایک لمحے کو چپ ہو گئی۔

”بس یار عجیب سی پچویشن میں پھنس گئی ہوں، نا تو امریکا چلی گئی ہیں۔ وہاں بھی نہیں جاسکتی، نہ جاب سے مزید پچھنی لے سکتی ہوں، میاں صاحب نے صاف صاف لفظوں میں کہہ دیا ہے کہ میری تنخواہ کے بغیر گھر نہیں چل سکتا اس لیے جاب چھوڑنے کا خیال دوبارہ بھی ذہن میں لانا بھی نہیں، ورنہ میرا تو شادی کے بعد گھر داری کے ساتھ ساتھ ملازمت کر کے کولہو کے تیل بننے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔“ ماہ نور کے انداز میں تھکن ہی تھکن تھی۔

”لو یہ اچھی سی موصوف نے، شادی سے پہلے کیسے گھر چلا رہے تھے جناب.....؟“ میچہ کو یک دم ہی غصہ آ گیا تھا۔

”پتا نہیں یار کیسے چلا رہے تھے لیکن اب تو لگتا ہے جیسے میری جاب کے بغیر کچھ بھی نہیں ہوگا۔ پچھلے ماہ بھی بجلی، گیس کے بل میرے ذمے ڈال دیے گئے تھے۔ اس دفعہ پتا نہیں کیا کریں گے.....“ وہ بھی آج شاید خاصی افسردہ تھی اس لیے بھی بھرے انداز میں ہنسی تھی۔

”تمہارا دماغ ٹھیک ہے، صاف انکار کر دو، یہ شوہروں کی اس قسم سے تعلق رکھتے ہیں جو آہستہ آہستہ ساری ذمے داریاں بیوی کے کندھوں پر منتقل کر کے خود چین کی بانہری بجاتے ہیں.....“ میچہ کے انداز میں سختی عود آئی تھی جبکہ اس کی بات پر وہ استہزائیہ انداز میں ہنس رہی تھی۔

”یار کون سی احمقوں کی جنت میں رہتی ہو..... تم خود بتاؤ ایما انداز سے بھلا بندہ ایسے کیسے کا سا جواب دے سکتا ہے۔ میرے جیسا بندہ تو ہرگز نہیں.....“

”ٹھیک ہے پھر اپنی اسی مروت کے ہاتھوں تنگ ہوتی رہنا کیونکہ مجھے تو نہیں لگتا کہ وہ

فارغ مجھ سے رہا نہیں جاتا۔ آپ کے آرٹیکل کا موضوع مجھے دلچسپ لگا تو میں لکھے بغیر نہیں رہ سکا۔“ وہ اس سے آنکھیں چرا کر صفائی دے رہا تھا۔

”حادث آپ کیسے جرنلسٹ ہیں، آپ کو تو ڈھنگ سے جھوٹ بولنا بھی نہیں آتا۔۔۔۔۔“ وہ ٹکلی باندھے اسے ٹیوتی نظروں سے دیکھتے ہوئے سادہ سے لہجے میں بولی۔ ”حالانکہ اصل بات یہ ہے کہ آپ کو ڈرتھا کہ سر آتے ہی مجھ پر برسنا شروع کر دیں گے اس لیے آپ نے صرف اور صرف مجھے ان کے عتاب سے بچانے کے لیے میرا آرٹیکل اس تاریخ کو دے دیا، جس تاریخ کو مجھے پلاننگ کیلنڈر کے مطابق دینا تھا۔“ وہ سو فیصد درست کہہ رہی تھی۔ حادث چاہتے ہوئے بھی اس کی تردید نہیں کر سکا کیونکہ حقیقت یہی تھی۔ وہ بالکل کچھ بھی نہیں بول سکا تھا۔

”کیا مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔۔۔۔۔؟“ اس نے خود کو سنبالتے ہوئے بڑی گہری نظروں سے اس کے تھکے تھکے انداز کو دیکھا تھا۔

”پتا نہیں۔۔۔۔۔“ اس نے کندھے اچکائے۔ ”لیکن میں شاید آپ کے احسان کا بدلہ نہ چکا سکوں۔۔۔۔۔“ وہ گہری سانس لے کر بولی تھی۔ اضطراب اور افسردگی اس کے سارے وجود سے عیاں تھی اور وہ اسے چھپانے کی دانستہ کوشش کر بھی نہیں رہی تھی۔

”تو میں نے کب آپ سے ایسا کوئی مطالبہ کیا ہے۔۔۔۔۔؟“ وہ اب انتہائی اعتماد کے ساتھ براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

”ضروری بھی تو نہیں ہوتا کہ ہر مطالبے کو لفظوں کو پیرا ہن دیا جائے۔ بہت سی چیزیں آپ کی آنکھیں، انداز اور جسمانی اعضا کی جنبش سے بھی جھلک جاتی ہیں۔“ اس نے انتہائی عجیب انداز سے اسے دیکھا تھا جیسے وہ اسے بہت کچھ جتنا چاہ رہی ہو۔ حادث گڑ بڑا سا گیا تھا۔

کر بھی کام کر لیا، ورنہ ہمارے گھر میں تو میری نندوں اور ساس کی جھج جھج سے بندہ ایک لفظ بھی سکون سے نہیں پڑھ سکتا، لکھنا تو بہت دور کی بات ہے۔“ ”میرا آرٹیکل۔۔۔۔۔!“ وہ کچھ توقف کے بعد چونکی اور بے ساختہ مڑ کر حادث کو دیکھا جس کی آنکھوں میں ایک ہلکی سی التجا تھی۔ اسے ساری بات سمجھ میں آگئی تھی۔ وہ دانستہ خاموش رہی۔

”حادث مجھے اپنے فیچر کو آپ کے ساتھ ڈسک کرنا ہے، کیا آپ میننگ روم میں آئیں گے۔۔۔۔۔“ وہ اس کے سنجیدہ انداز پر گڑ بڑا کر فوراً ہی کھڑا ہو گیا تھا۔

”آپ نے میرے نام سے آرٹیکل کیوں لکھا۔۔۔۔۔؟“ میننگ روم میں داخل ہوتے ہی، بڑی فرصت کے ساتھ کرسی پر بیٹھتے ہی اس نے براہ راست اس سے پوچھ لیا تھا۔ حادث کو اس کے سنجیدہ لہجے سے معاملے کی سنگینی کا اندازہ ہوا۔ اس کی خوب صورت آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقوں سے نظریں چراتے ہوئے حادث نے اپنا خشک گلابہ مشکل تر کیا۔

”میں معذرت خواہ ہوں کہ آپ کو انفارم نہیں کر سکا۔ اصل میں میرے پاس آپ کا نیکٹ نمبر نہیں تھا اور کسی اور سے پوچھنا مجھے مناسب نہیں لگا تھا۔“ اس کی آنکھوں میں چھپی گہری سنجیدگی سے گھبرا کر اس نے فوراً وضاحت دی۔

”اور اگر راشد صاحب مجھے آتے ہی اپنے آفس میں بلا کر اس آرٹیکل پر گفت و شنید شروع کر دیتے اور میں لاعلمی کا اظہار کر دیتی تو آپ کو پتا ہے کہ میرے لیے کس قدر عجیب صورت حال بن جاتی۔“ وہ براہ اعتماد نظروں سے اس پر نظریں بھراتے ہوئے بھی حادث کو اپنا اعتماد و فضا میں تحلیل ہوتا محسوس ہوا۔

”آئی ایم سوری۔۔۔۔۔ لیکن یقین کریں میری نیت بالکل صاف تھی۔ میں اپنا کام کر چکا تھا اور

اگلا پورا ہفتہ وہ بالکل باقاعدگی کے ساتھ آپ کی آئی رہی۔ راشد صاحب کا مزاج جو سوانیزہ سے تھا اب بالکل نارمل ہو گیا تھا۔ جس کے بعد وہ خاموشی کی گنجائش ملی۔ اس دن ہائینٹک پلاننگ کی میٹنگ تھی جب ہمدانے بتایا کہ ماہ نور چھٹی پر ہے کیونکہ اس کے میاں صاحب کرپچی سے چھٹی پر آئے ہوئے ہیں۔ اس کی اطلاع پر حادث کے اعصاب نہ جانے کیوں تن سے گئے تھے۔ اشتعال، غصہ، بے بسی، پتا نہیں کون کون سے جذبات اٹاٹا کر آ رہے تھے۔ اگلے دو دن وہ غیر حاضر رہی تھی۔ تیسرے دن جب وہ آفس آئی تو اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ وہ حد درجہ پرشورہ دکھائی دے رہی تھی۔

”یہ تم نے کیا جلیہ بنایا ہوا ہے؟ طبیعت تو ٹھیک ہے ناں۔۔۔۔۔؟“ وہ ابھی ابھی ملجھ کے کہیں میں آئی تھی جو اس کی حالت دیکھ کر چونک گئی تھی۔

”بس یا طبیعت ٹھیک نہیں تھی، فلو ہو رہا تھا۔ تم یہ بتاؤ راشد صاحب گرجے برسے تو نہیں۔۔۔۔۔؟“ اس کی رنجیدگی چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔ حادث نے گردن اٹھا کر اسے دیکھا جس کی پشت اس کی جانب تھی۔ وہ خاصے ڈھیلے ڈھالے انداز میں کھڑی تھی۔ سیاہ سوٹ میں وہ کوئی اداس شام کا حصہ لگ رہی تھی۔

”تمہاری قسمت اچھی تھی۔ راشد صاحب بھی آج ہی اپنے گاؤں سے واپس آئے ہیں، ان کی والدہ بیمار تھیں۔ آتے ہی انہوں نے تمہارا شاندار سا آرٹیکل پڑھا تو آتش آتش کراٹھے۔ ابھی سارے آفس کے سامنے تمہاری تقریروں کے پل باندھ کر گئے ہیں۔“ ”مجھے خوشگوار انداز میں اطلاع دی۔“ ”میرا آرٹیکل، کون سا۔۔۔۔۔؟“ وہ زبردست چونکی تھی۔ اس کے انداز میں اس قدر حیرت تھی کہ حادث کو اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

”وہی آرٹیکل جو تم نے انہیں کل گھر سے میل کیا تھا۔ ویسے یار یہ بھی تمہاری ہمت ہے جو گھر میں بیٹھ

کو۔۔۔۔۔ ہمیشہ وقت پر ہی تو نکلتا رہا ہے۔ ہر وقت ڈیڈ لائن کا سر پر ہوا سوار کر رکھا ہوتا ہے۔ اب کیا ہم ایک مہینے میں دو دفعہ میگزین نکالنا شروع کر دیں۔۔۔۔۔“ ”بس ایسے ہی دماغ کی خرابی ہے اور کچھ نہیں، ورنہ پچھلے دو ماہ سے بھی میگزین اپنے وقت پر ہی پرنٹ ہونے کے لیے گیا ہے۔ خیر چھوڑو، اس بات کو، ماہ نور زیادہ دل پر لینے کی ضرورت نہیں۔“ ہمدانے ہلکے پھلکے انداز میں کہا تو وہ جبراً مسکرا دی۔ ”مس ماہ نور، ڈونٹ ٹیک ٹینشن۔۔۔۔۔ میرے لائق جب بھی کوئی کام ہو آپ مجھے کہہ سکتی ہیں۔“ حادث نے بڑے بڑے تلے انداز میں کہا تھا وہ اس کے محتاط انداز پر کھل کر مسکرائی تھی۔ اس کے بولنے سے پہلے ہی ہمدانے بول پڑا تھا۔

”اوئے یہ بی بی۔“ ”مس“ ”نہیں“ ”مسز“ بن چکی ہیں تمہیں کیوں بھول جاتا ہے۔ یہ سارا فساد ان کے مسز بننے کے بعد ہی شروع ہوا ہے۔ ورنہ اس سے پہلے تو محترمہ ہم سب کے کام بھی نمٹا دیا کرتی تھیں۔ ان کی شادی کے بعد ہم تو خود بھی بہت دھکی ہیں سارا کام خود کرنا پڑتا ہے۔“

”بہت فضول ہو حمدانم۔۔۔۔۔“ وہ بے ساختہ ہنس پڑی تھی۔ ان تینوں نے سکون کی سانس لی، وہ اب کچھ پرسکون نظر آ رہی تھی۔

”تھیک یو حادث، آپ سب لوگوں کی محبت کی وجہ سے تو میں یہاں ہوں۔ ورنہ میری اتنے سال کی سروس میں یہ پہلی دفعہ راشد صاحب مجھ پر برہم ہوئے ہیں اور یہ سب میری اپنی کوتاہی کی وجہ سے ہوا ہے، اس لیے مجھے ان کے کوئی گلہ نہیں۔“ وہ خاصے مثبت مزاج کی حامل لڑکی تھی۔ اس بات کا حادث کو ابھی ابھی اندازہ ہوا تھا۔ حادث سمیت سب نے بڑی رشک بھری نظروں سے اسے دیکھا تھا۔ وہ اب بالکل نارمل انداز میں سب کے ساتھ جو گفتگو تھی۔

فی الحال تو اس گھر کوچ کر ایک نیا گھر خریدنے کا ارادہ ہے۔ اب پرانے گھر میں بالکل نہیں رہ سکتا۔ سب لوگ چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے یاد آئیں گے۔“ حارث کی وضاحت سے عبداللہ کچھ مطمئن نظر آنے لگا تھا۔

”ہاں، یہ ٹھیک ہے، میں بھی حیران تھا کہ ایک خالص مبن پرست نہ کیسے اپنی بنیادوں سے کٹ کر دور رہ سکتا ہے۔“ وہ عبداللہ کی حیرانی پر مسکرایا تھا۔ اسے واقعی اپنے علاقے سے محبت نہیں عشق تھا۔ یہاں آکر اس کی ساری تسکین اتر جاتی تھی۔ اس کی مستقبل کی پلاننگ میں ہمیشہ سے تھا کہ وہ ہمیں آکر سیٹ ہوگا۔

☆☆☆

وہ پورے پانچ دن کے بعد گھر آیا تو ڈائیو ٹرینٹل سے اسے حماد پک کرنے آیا تھا۔ آج موسم کے تیز خاصے خطرناک تھے۔ بادلوں کے گرجنے کے ساتھ ساتھ بجلی بھی خوب چمک رہی تھی۔ اس وقت شام کے چھ بج رہے تھے۔ ٹرینٹل سے باہر نکلتے ہی اس پر باقاعدہ کچی طاری ہو گئی تھی۔ باہر بارش اپنے زوروں پر تھی۔ آج تو حماد بھی خلاف توقع خاصا سنجیدہ تھا۔ اس نے راستے میں کوئی مہلجوری نہیں چھوڑی تھی۔

”تمہارے چہرے پر کیوں بارہ بجے ہوئے ہیں، خبر ہے نا؟ کہیں راشد صاحب نے آفس سے چھٹی تو نہیں کر دی۔“ حارث نے ہلکے پھلکے انداز میں اسے چھیڑا۔

”نہیں یار، ایسی کوئی بات نہیں، ایک تو تسکین سے چہرہ لٹکا ہوا لگ رہا ہے پھر صبح سے عجیب سی ٹینشن ہے۔ سارا دن کورٹ میں گزرا اس لیے سارا دن کی بخل خواری کی وجہ سے چہرے پر غصہ برس رہی ہے۔“ حماد نے باقاعدہ منہ کھول کر جمائی لینے ہوئے وضاحت کی۔

”میں نے تمہیں منع بھی کیا تھا کہ مجھے پک

چوتھے دن وہ اپنے ایک دوست کی مدد سے ایک پارٹی ڈیلر سے ملا۔ اس کو اپنے کھنڈر گھر کی فروخت کے لیے ابتدائی مراحل طے کرنے کو کہا۔

”اس کا مطلب ہے کہ تم اب مظفر آباد سے ہمیشہ کے لیے رابطہ ختم کر لینا چاہتے ہو۔“ اس کا کشمیری دوست عبداللہ اس کو ہرگز بولا تھا۔ وہ وہیں اس شہر میں اپنی بوڑھی ماں کے ساتھ مقیم تھا۔ اس کا بانی خاندان بھی اسی زلزلے کی نذر ہو گیا تھا۔

”نہیں یار..... تمہیں کس نے کہا؟ بھلا اپنی بنیادوں سے کون رابطہ ختم کر سکتا ہے۔“ حارث بے بسی سے مسکرایا تھا۔

”پھر تم اس گھر کو فروخت کرنے کے بجائے اسے دوبارہ کیوں نہیں بنواتے۔ کسی اچھی سی لڑکی کے ساتھ شادی کر کے دوبارہ یہاں آ کر رہنا۔“

عبداللہ نے اسے خلوص دل سے مشورہ دیا تھا۔ اچھی لڑکی کے نام سے اس کے ذہن میں فوراً ماہ نور کا تصور آیا تھا جسے اس نے بڑی بے دردی سے جھکا تھا۔

”یار مجھ سے کون شادی کرے گا، کوئی آگاہی چھپا نہیں رہا۔“ وہ استہزاء سے اسے انداز سے ہنسا تو عبداللہ نے سخت برا مانا تھا۔

”تم کون سی دنیا میں رہتے ہو یار..... آج کل تو لوگ اکیلے بندے کو خوش ہو کر لڑکی دیتے ہیں کہ سسرال کا جھنجھٹ نہیں ہوگا پھر تمہارا پیچھا کیوں نہیں ہے مانا کہ سارا گھر اس زلزلے میں شہید ہو گیا لیکن تمہارے ایک تایا اینڈا میں مقیم ہیں پھر ہم لوگ نہیں ہیں کیا، مجھے بتاؤ میں اور بے خود تمہارا رشتہ مانگنے جاؤں گے۔“ عبداللہ کی ناراضی اس کے لیے بڑی فطری سی خوشی کا باعث بنی تھی۔ اس لیے اس نے ممنون نظروں سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

”سوری یار، میرا ہرگز مقصد تمہاری دل آزادی نہیں تھا۔ تم میرے بھائیوں جیسے دوست ہو، سارا بچپن ساتھ گزرا ہے، میں ضرور تمہیں بتاؤں گا،

”اُس اوکے..... حارث، اتنا قائل ہونے کی ضرورت نہیں، میں چاہے کسی بتاؤں یا نہ بتاؤں لیکن سب کو پتا ہے کہ میری کارکردگی کا گراف جو بری طرح نیچے آیا ہے اس کے پیچھے میرے گھر کی مسائل ہی ہیں۔ ہم سب لوگ بہت سالوں سے اکٹھے کام کر رہے ہیں اس لیے سب ہی ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ اب جہاں تک سسرال والوں کا تعلق ہے تو سب ہی اچھے ہیں۔ بس ایک نالائق بھوسے اُن کا واسطہ پڑ گیا ہے جو گھر اور جواب میں توازن نہیں رکھ پارہی۔“ اس نے بہت سلجھے اور نپے تلے انداز میں بہت کچھ کہہ دیا تھا۔

”جلیں، اللہ سب کو آسانیاں دے، میرے لائق جب بھی کوئی خدمت ہو آپ مجھے بلا جھجک کہہ سکتی ہیں۔“ حارث کی بات پر وہ بے ساختہ ہنسی۔

”بس اتنی گزارش ہے کہ جو چیز اندر ہنر صاحب کے روم میں بھجبا کریں، مجھے کم از کم بتا ضرور دیا کریں، کئی دن بے خبری میں میرے ساتھ آپ بھی نہ مارے جائیں۔ میرے ستارے تو ویسے بھی آج کل گردش میں ہیں۔“ اس نے بھی ہلکا سا سرخم کر کے اسے اطمینان دلایا تو وہ دونوں باہر نکل آئے۔

☆☆☆

کاپی پریس میں جانے کے بعد کچھ دن خاصے سکون سے گزرے تھے۔ حارث بھی چار پانچ دن کی چھٹی لے کر مظفر آباد آ گیا تھا۔ یہاں آکر سارے ہی زخموں کے ٹانکے اٹھڑ جاتے تھے۔ اب تو وہاں بھی زندگی رواں دواں تھی لیکن 18 اکتوبر کے زلزلے میں شہید ہو جانے والے افراد کے باقی گھر والوں کے لیے گویا زندگی ایک مقام پر آ کر رک گئی تھی۔ یہی حال حارث کا تھا۔

تین دن تو اس کا کچھ بھی کرنے کو جی نہیں چاہا تھا۔ ہر طرف یادوں کی ایسی قبریں تھیں جنہیں دیکھ کر اور صرف سوچ کر ہی زخم دہانی دینے لگتے تھے۔

”پتا نہیں آپ کیا کہنا چاہ رہی ہیں، یقین کریں مجھے سمجھ نہیں آرہی.....“ اس نے بوکھلا کر وضاحت دی تھی۔ نہ جانے کیوں اسے ہمیشہ اپنا اعتماد اس نازک کی لڑکی کے سامنے متزلزل ہوتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔

”حارث صاحب چیزیں اس وقت سمجھ میں آتی ہیں جب اسے سمجھنا چاہتے ہیں ورنہ تو کسی کو بے وقوف بنانا بالکل بھی مشکل کام نہیں اور ایسی صورت میں جب اگلا بندہ بھی بے وقوف بننے کو تیار ہو۔“ وہ پھر عجیب انداز سے مسکرائی۔

”آپ کو کیا لگتا ہے کہ میں آپ کو بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہا ہوں.....“ حارث نے اپنے دونوں بازو سینے پر باندھتے ہوئے دو ٹوک انداز اپنایا۔

”میں نے ایسا کب کہا؟ میں تو یہ کہنے کی کوشش کر رہی ہوں کہ جب کسی کے اوپر احسان کرتے ہیں تو صاف صاف طریقے سے بتا دیتے ہیں۔ بعض دفعہ آپ کی کسی اچھے مقصد کے لیے بھی گھما پھرا کر کی جانے والی کوشش اگلے بندے کو ہرٹ بھی کر سکتی ہے۔ ہر بندہ عقلمند تھوڑی ہوتا ہے۔“

”لیکن مجھے اتنا اندازہ ہے کہ آپ بے وقوف ہرگز نہیں، اچھی خاصی سمجھدار خاتون ہیں اور چیزوں کو اسی انداز میں لیتی ہیں جس انداز میں لینا چاہیے۔“ حارث نے اس کے رنجیدہ چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے دانستہ خوشگوار انداز اختیار کیا تو وہ اس دفعہ بے ساختہ مسکرائی۔

”آپ کے اندازے خاصے غلط ہوتے ہیں۔ اس بات کا اندازہ آج مجھے ابھی ابھی ہوا ہے.....“ وہ اب کھل کر مسکرا رہی تھی۔

”آپ کی سسرال والے کیسے ہیں؟“ حارث کے منہ سے اچانک پھسلا تھا۔ وہ اپنی بات پر بڑی طرح گڑبڑا دیا..... ”آئی ایم سوری میں کچھ پریش ہو گیا.....“

”ہاں یار، کچھ ڈاکومنٹس پر ماہ نور کے سائن لینے ہیں.....“ اس کی سوالیہ نظروں پر حماد نے فوراً وضاحت دی تو وہ خاموش ہو گیا۔ وہ نہ جانے کیوں اس کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ لیکن یہ اب ناگزیر ہو چکا تھا۔

جب گاڑی ان کے آتش گلابی بوگن ویلیا پھولوں سے ڈھکے جنگلے میں داخل ہوئی تو ماحول میں عجیب سی سوگواریت اور اداسی چھائی ہوئی تھی۔ بارش رک گئی تھی۔ وہ دونوں گاڑی سے اترے تو حارث کو بے اختیار وہ لمحہ یاد آ گیا جب اس نے پہلی دفعہ اس برآمدے میں ہنسی مسکرائی اور زندگی سے بھرپور ماہ نور کو دیکھا تھا لیکن دس منٹ بعد نانوکے ساتھ اندر آتی ماہ نور کو دیکھ کر حارث کو دھچکا لگا تھا۔ سیاہ شال کو اچھی طرح لپیٹے انتہائی رنجیدہ اور شدت گریہ سے سوجی ہوئی آنکھوں سے حارث اور حماد دونوں نے ہی نظریں چرائی تھیں۔ ساتھ ہی بادامی رنگ کے سوٹ میں پیشینہ شال اچھی طرح لپیٹے نانوبھی خاصی خاموش تھیں۔

”نانو یہ کچھ ڈاکومنٹس پر ماہ نور کے سائن کروانے تھے۔ میں نے سوچا کہ کل پھر آفس سے چھٹی کر کے یہ کام نمٹا ہی دوں.....“ حماد نے دانستہ ہلکے ہچکے انداز میں کہا۔ اس کی بات پر ماہ نور نے شکایتی سی ایک نگاہ نانوپر ڈالی ضرور لیکن وہ خاموش رہی۔ وہ اب سر جھکائے سامنے والے صوفے پر بیٹھی تھی۔

”جزاک اللہ، اور تم کیسے ہوئے؟ بہت عرصے کے بعد چکر لگایا۔“ نانو اب مکمل طور پر حارث کی طرف متوجہ تھیں۔ جو اس وقت انتہائی مضطرب انداز میں وہاں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ دھواں بن کے فضا میں تحلیل ہو جائے۔ ماہ نور کی سوگواریت اور اس کا حلیہ اسے اذیت دے رہا تھا۔

”بس نانو، ماہ نور کی شادی کے بعد آپ فوراً امریکا چلی گئیں۔ اس کے بعد اب آئی ہیں تو ملاقات

”یار دماغ خراب ہو گیا ہے ان کا پچھلے ایک ماہ سے اسے تنگ کر رہے تھے کہ تمہاری نانوکا جو آئی ایٹ والا بنگلا ہے۔ وہ خالی ہے ان سے کہو کہ وہ تمہارے نام کر دیں تو پھر ہم سب وہاں شفٹ ہو جاتے ہیں۔“ حمادی بات پر حارث کو جھٹکا لگا تھا جبکہ وہ مزید کہہ رہا تھا۔ ”ماہ نور اس مطالبے کو نظر انداز کیے جا رہی تھی۔ اس کا نام نہاد غیرت مند میاں کراچی سے آیا ہوا تھا۔ تین دن پہلے جب ماہ نور نے جنگلے کے سلسلے میں اپنی نانو سے بات کرنے کے سلسلے میں معذرت کر لی تو اس نے پیش میں آ کر ہاتھ پکڑ کر اسے گھر سے نکال دیا۔ اندازہ کرو اس گھٹیا شخص کی ذہنیت کا۔ اس کا رات گیارہ بجے ملیجہ کوفون آیا جو وہ کسی پی سی او سے کر رہی تھی۔ تب جا کر وہ اپنے میاں کے ساتھ اسے لے کر آئی۔ بہت بری حالت تھی اس بے چاری کی۔“ حماد کے غصے پر اب رنجیدگی غالب آ گئی تھی۔

”یہ تو بہت ہی چپ حرکت کی ہے اس کے میاں نے۔“ حارث نے اپنے اندر اٹھتی ہوئی اشتعال کی لہر کو یہ مشکل دباتے ہوئے کہا تھا۔ ”اب نانوکیا کہتی ہیں؟“

”انہوں نے کیا کہنا ہے، مجھے کل بھی بلوایا تھا کہ اس گھر کو ماہ نور کے نام کروانے کے سلسلے کے کاغذات تیار کرواؤ جبکہ ماہ نور ایسا ہرگز نہیں چاہتی۔“ حماد نے کھل کر بتایا۔ اس کی گاڑی فیض آباد سے اب آئی ایٹ سیکٹر کی طرف رواں دواں تھی۔ بارش کی تندہ اور تیزی میں کی آگئی تھی اور اندھیرا بڑی تیزی کے ساتھ پھیلتا جا رہا تھا۔

”یہ کیا ہم ماہ نور کے گھر جا رہے ہیں؟“ اس نے جانے پہچانے راستوں پر گاڑی کو رواں دواں دیکھ کر کہا تھا۔ حارث کو آج سے سات آٹھ ماہ پہلے کی سرد شام یاد آگئی تھی۔ وہ شام جس کے اندھیرے اس کی ساری زندگی پر محیط ہو گئے تھے۔

چاہیے۔“ حماد نے گاڑی کا وائپر آن کرتے ہوئے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

”یہ کسی کی بزدلی نے آپ کو اتنا سیخ پا کر رکھا ہے کچھ روشنی ڈالنا پسند کریں گے آپ.....“ حارث نے طنزیہ انداز سے اس کی طرف دیکھا جو بڑی توجہ سے تیز بارش میں بڑی مہارت کے ساتھ ڈرائیو کر رہا تھا۔

”یار کس پر سیخ پا ہونا ہے، میری زندگی میں خاندان کی خواتین کے علاوہ صرف چن کر چھ سات خواتین ہیں، جن میں ماہ نور اور اس کی نانو سرفہرست ہیں۔ جنہیں ساری دنیا میں اعتبار کرنے کے لیے صرف میں ہی ملتا ہوں۔ بس پچھلے دو تین دن سے ماہ نور... اور نانو نے دماغ خراب کر رکھا ہے۔ مجھے نانو سے اس قدر بے مروتی کی توقع ہرگز نہیں تھی۔“ اس نے ایک سرد آہ بھر کر تفصیل سے بتایا۔ اس کی بات پر حارث بری طرح سے چونکا تھا۔ اسے علم ہی نہیں تھا کہ ماہ نور کی نانو پاکستان آچکی تھیں۔

”ماہ نور کی نانو۔ کب آئیں پاکستان.....؟“ اس نے تعجب سے پوچھا۔

”وہ تو شاید اب بھی نہ آئیں اگر ماہ نور کے سسرال والے اسے گھر سے نہ نکال دیتے۔ تین دن وہ ملیجہ کے گھر رہی ہے بے چاری۔ کل ہی نانو صاحبہ پاکستان پہنچی ہیں۔ تب سے ایک ہی بات کی گردان کے جاری ہیں کہ جیسے بھی حالات ہیں بس اپنے گھر میں گزارہ کرو۔“ حماد نے اپنی طرف سے اس کے سر پر ہم ہی تو پھوڑا تھا۔ ایک لمحے کو وہ ششدر رہ گیا۔ اسے سمجھ ہی نہیں آ رہی تھی کہ وہ اس خبر پر کس طرح ری ایکٹ کرے۔ تھوڑا سا سنبھل کر اس نے پوچھا۔

”لیکن اس کے سسرال والوں نے کیوں اسے گھر سے نکالا.....؟“ حارث کو سن کر ہی اتنی تکلیف ہوئی تھی تو جس پر ہنسی ہوگی اس کا کیا حال ہوگا۔ وہ یہ سوچنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ دل کی رگوں میں درد الجھ رہا تھا۔

کرنے مت آؤ، جی ایون سیکٹر سے یہاں پنڈی.... آنے میں اچھا خاصا ٹائم لگتا ہے اوپر سے اس روڈ پر ٹریفک بھی تو اتنا ہے۔“ حارث کی بات پر اس نے کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھا اور طنزیہ انداز میں کہا۔

”خدا کے واسطے یار، یہ اپنا مروت نامہ بند کر دو، ایک سر میں درد نہیں ہے تمہاری اس قسم کی بکواس سے شروع ہو جائے گا۔ ہزار دفعہ کہا ہے کہ میرے ساتھ اس طرح کی گفتگو نہ کیا کرو مجھے بڑی سخت قسم کی بدبھنی ہونے لگتی ہے۔“

”اچھا، نہیں کرتا، تم یہ بتاؤ کہ کورٹ کس چکر میں گھومتے رہے ہو۔“ حارث نے بات بدلتے ہوئے پوچھا تو اس کی بات پر ایک دفعہ پھر حماد کے چہرے کے زاویے بدلتے لگے۔ وہ اب خاصا تپ کر بولا تھا۔ ”یار ہمارے معاشرے میں جتنا ظلم ایک عورت پر کرتی ہے اور کوئی نہیں کرتا ہوگا۔ شادی بیاہ کو ان عورتوں نے مسئلہ کشمیر بنا رکھا ہے۔ پہلے شادی نہ ہونے پر لڑکی کو نارچہ کرتے ہیں اور اس کے بعد کسی لوہے لنگڑے کے ساتھ بیاہ دیتے ہیں، پھر کہا جاتا ہے کہ چاہے صبح شام جوتے کھاؤ لیکن بسنا تم نے میاں کے گھر ہی ہے۔“

”کیا مطلب..... یہ تم نے کیا عورتوں کے حقوق کی تنظیم بنائی ہے میری غیر موجودگی میں.....؟“ حارث نے سخت حیرت سے اس کا حد درجہ تپا ہوا چہرہ دیکھا تھا۔

”یار جب ایک ہی صنف کے لوگ ظالم بھی ہوں اور مظلوم بھی۔ وہاں حقوق کی جنگ لڑنا بہت مشکل کام ہے۔ ویسے بھی شریف عورتوں کو ہی زیادہ مسئلے ہوتے ہیں ورنہ اگر کوئی ہٹلر ٹائپ ٹھان پاں کرنے والی خاتون ہو، اس سے تو ویسے ہی سارا خاندان ڈرتا ہے اور کوئی اسے چھیڑنے کی غلطی نہیں کرتا۔ لڑکیوں کی قوم کو بزدل ہرگز نہیں ہونا

ان کے بیٹے کے نام ہرگز نہیں کریں گی۔ پھر بیس کہ وہ لوگ کیا کہتے ہیں اس کے بعد کوئی نیا لائحہ عمل تیار کرتے ہیں۔“ حماد نے انتہائی سنجیدگی سے دو ٹوک انداز میں کہا۔

”میرا تو خیال تھا بیٹا یہ گھر ان دونوں کی چیز ہے جس کے نام سے ہو کوئی فرق نہیں پڑتا، خواہ خواہ اس بندے کو ضد دلانے کا کیا فائدہ.....؟“ نانو کے انداز گفتگو میں مصالحت کا عنصر نمایاں تھا۔ ان کی بات پر ماہ نور نے ایک جھٹکے سے سر اٹھا کر سخت شکایتی نظروں سے انہیں دیکھا۔

”آپ کی اسی مصالحت پسندی کو وہ لوگ بزدلی سے تعبیر دے کر مذاق اڑاتے ہیں آپ کا۔“ وہ جھٹکے سے کھڑی ہوئی اور انگلی اٹھا کر بولی۔ ”لیکن یاد رکھیں نانو کہ کروڑوں کا بنگلا اپنے نام لگا کر جب پھر کسی اور چیز کے لیے انہوں نے مجھے گھر سے نکالا تو خدا کی قسم میں کسی دارالامان میں چلی جاؤں گی لیکن مگر کبھی اپنی بے عزتی کروانے ان لالچی لوگوں کے گھر نہیں جاؤں گی۔“ اپنی بات مکمل کر کے وہ کسی تیر کی طرح کمرے سے نکلی تھی۔ اس کے کمرے سے جاتے ہی نانو بے بس انداز سے مسکرائیں۔

”بیٹا یہ تو بے وقوف اور نادان ہے، سمجھتی ہے کہ مجھے اس کی پریشانی کا اندازہ نہیں..... حالانکہ مجھے اس کے حالات کا بخوبی پتا ہے، یقین کرو، سوچ کر ہی دل پھٹتا ہے۔ میں نے تو اسے تھیل کا چھالا بنا کر بالا تھا لیکن قسمت سے کون لڑ سکتا ہے۔ اسے معلوم نہیں کہ اس کی بوڑھی نانی میں اب سکت نہیں۔ اس امید پر کہ کبھی نہ کبھی تو حالات بدلیں گے اسے سمجھتا کرنے پر مجبور کرتی ہوں، اس کے علاوہ چارہ بھی تو کوئی نہیں۔ اس کو گلہ ہے کہ میں پاکستان میں کیوں نہیں رہتی تو بیٹا میں شوگر اور دل کی مریضہ ہوں اکیلے اتنے بڑے گھر میں کیسے رہوں؟“ نانو کی اپنی مجبوریوں کی فہرست خاصی طویل تھی۔

ہے؟ تم خود بتاؤ کہ اس شادی نے مجھے تماشائیں بنا دیا۔ ایک لمحے کو سکون حاصل نہیں۔ ان لالچی لوگوں کی نیت بھرنے کا نام نہیں لے رہی۔ میری ساری جیوری سیل کر کے موصوف گاڑی لے چکے ہیں۔ سارا اینک بیٹلس زیرو کر دیا ہے۔ پورے گھر کی ذمے داری مجھ پر ڈال دی ہے۔ چلو یہ سب بھی ٹھیک سہی لیکن مجھے دن رات ذہنی ٹینشن تو نہ دیں۔“ وہ بھڑائی ہوئی آواز میں بے تحاشا ذہیت بھرے انداز سے کہہ رہی تھی۔

”میرے لیے تو ڈوب مرنے کا مقام ہے۔ میری گھر کی شادی شدہ زندگی کو لوگ آفس میں ہنس کر ڈسکس کرتے ہیں۔ راشد صاحب نے بھری میٹنگ میں سب کے سامنے کہہ دیا اور اس پر ہی اکتفا نہیں کیا پھر مجھے آفس میں بلا کر پوچھا کہ آپ کے میاں چھوٹی چھوٹی باتوں پر آفس میں کیوں فون کرتے ہیں۔ جس دن اس بندے نے دھکے مار مار کر مجھے گھر سے نکالا۔ آس پاس کوٹھیوں کے چوکیداروں نے مفت میں یہ تماشا دیکھا۔ اس کے بعد ملیر اور اس کے میاں مجھے لینے آئے تو ملیر کے میاں اور سسرال والوں نے کرید کرید کر مجھ سے پوچھا کہ کیا واقعی بنگلے کی ملکیت کی وجہ سے انہوں نے مجھے گھر سے نکالا ہے یا اندرون خانہ کو کوئی اور بات ہے۔“ اس کے لہجے میں چھپی شرمندگی، کوفت اور رنجیدگی اب ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ اس کمرے کے سب ہی کینوں نے ایک دوسرے سے نظریں چرائی تھیں۔

”میرے اعصاب پر سوار ہو کر ان لوگوں نے میری ساری صلاحیتوں کو زنگ لگا دیا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ میں اب ذہنی کام کر ہی نہیں سکتی۔ ہر روز ایک نیا ڈراما تیار ہوتا ہے۔ مجھے خود بخود نہیں آتی کہ میں کیا کروں؟“ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا تھا۔

”نانو، آپ ان لوگوں سے صاف، صاف بات کریں کہ گھر صرف ماہ نور کے نام ہی ہوگا۔ آپ

”حماد داغ اس کا نہیں، میرا خراب ہے۔ بقول نانو میرے اندر ہی گھر بسانے کی اہلیت نہیں۔“ اس نے سخت شکایتی نظروں سے نانو کی طرف دیکھا تھا۔ ”حماد تم نے ماہ نور کا انداز گفتگو دیکھا ہے، میں نے بھلا اس طرح سے اس کی تربیت کی تھی۔ ایک تو اس کی پریشانی میں امریکہ سے بھاگی چلی آئی ہوں..... آگے سے صاحبزادی کے مزاج ہی نہیں مل رہے وہ تو چلو خیر پرانی اولاد ہے اس سے کیا گلہ لیکن یہ صاحبزادی ہی ناک پر کبھی نہیں بیٹھتے دے رہیں۔“ نانو کی بات پر انہیں اندازہ ہوا کہ دونوں کے تعلقات خالصہ کشیدہ تھے۔ ماہ نور ان سے حد درجہ بدگمان تھی تو نانو کو بھی اس سے بہت سے گلے تھے۔

”وہ اگر مجھے گھر سے نہ نکالتا اور ملیر کے میاں آپ سے صاف صاف یہ نہ کہتے کہ ہم لوگ جوان لڑکی کی ذمے داری نہیں اٹھا سکتے تو آپ نے بالکل بھی پاکستان نہیں آنا تھا۔ آپ تو مجھے ان لالچی اور خود غرض لوگوں کے ہاتھ تھا کر ایسے بھائی جیسے میں آپ کی سگی اولاد کی اولاد نہیں بلکہ لے پالک تھی۔ میری ماما زندہ ہوتیں تو میں دیکھتی کہ وہ کیسے مجھے چھوڑ کر جاتیں۔“ ماہ نور ان سے سخت ناراض تھی۔ اس ناراضی میں بدگمانی کا عنصر غالب تھا۔

”لو دیکھو بھلا، ساری زندگی کیلجے سے لگا کر رکھا۔ پڑھایا لکھایا، بہو اور بیٹے کی خشکی بھی اور ایک کال پر اتنا لمبا سفر کر کے بھاگی آئی ہوں تب بھی اسے بوڑھی نانی کی محبت اور خلوص پر شک ہے۔“ نانو کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ اس جذباتی ماحول کو دیکھ کر وہ دونوں ہی بوکھلا گئے تھے۔ ایسی صورت حال کا تو انہیں بالکل بھی اندازہ نہیں تھا۔

”کیا ہو گیا ہے ماہ نور تمہیں.....؟ کیوں ایسی بچکانہ باتیں کر رہی ہو.....“ حماد کا زور بس اسی پر چل سکتا تھا اس لیے اس نے پہلے اسی کی کلاس لی۔ ”حماد تم مجھ سے پوچھ رہے ہو کہ مجھے کیا ہوا

ہو رہی ہے۔“ اس نے بردباری سے جواب دیا تو وہ سر ہلا کر ملازمہ کو چائے کی ہدایت کرنے لگیں۔

”نانو، آپ حماد بے چارے کو بتا کیوں نہیں دیتیں کہ یہ سارے ڈاکو منٹس دوبارہ تیار کروانے ہوں گے.....“ کمرے کی خاموشی کو ماہ نور کی منہ پر آواز نے توڑا تھا۔ اس کی آنکھوں اور لہجے میں ٹپ ٹپ ٹپ ٹپ تھی۔ اس کی بات پر نانو کے چہرے کا رنگ تیزی سے اڑا تھا جبکہ حادث اور حماد نے انتہائی تعجب اور بے یقینی سے ماہ نور کے طنز پر انداز کو دیکھا، وہ بھی اسی اسٹائل میں بات کرنے کی عادی نہیں تھی۔

”کیا ہوا نانو.....؟“ حماد نے سخت حیرت سے ان کے چہرے پر پھیلنا ہوا پچھلا پن دیکھا تھا۔ وہ دانستہ خاموش رہی تھیں۔ حماد اور حادث دونوں کو ہی بے چینی ہوئی تھی۔ نانو کا ہمیشہ انہوں نے دنگ سا انداز ہی دیکھا تھا لیکن وہ اس وقت کسی ہارے ہوئے لشکر کا حصہ لگ رہی تھیں۔

”نانو کو کچھ میں نہیں آ رہا کہ وہ کیسے بتائیں کہ ان کے جیتے داماد کو جب پتا چلا کہ یہ لوگ تو آسانی سے بنگلا اپنی بیٹی کے نام کرنے کو تیار ہو گئے ہیں تو اسے اپنی غلطی کا شدید احساس ہوا۔ اب موصوف نے مطالبہ کیا ہے کہ بنگلا ماہ نور کے نہیں ان کے اپنے نام پر ہوگا۔ ظاہر ہے کہ موصوف نے ان کی بیٹی کے ساتھ شادی کر کے ان کی سات پشتوں پر احسان جو کیا ہے۔“ ماہ نور بولی نہیں پھنکاری تھی۔ کمرے میں ایک دم ہی ایک بو جھل سا سناٹا پھیل گیا۔ حماد نے سخت بے یقینی سے پہلے ماہ نور اور اس کے بعد پھر نانو کا خاموش، خفت زدہ چہرہ دیکھا تھا۔ ان دونوں کی خاموشی معاملے کی سنگینی کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔

”نانو، اس بندے کا داغ تو نہیں خراب ہو گیا؟ بنگلا اس کے نام کس خوشی میں کیا جائے، وہ اپنے حواسوں میں ہے کہ نہیں؟“ حماد اس مطالبے پر بری طرح مشتعل ہوا تھا۔

ویسے بھی اس گھر میں خوش نہیں۔ آپ بھی اس حقیقت کو تسلیم کر لیں اور یہ تلخ حقیقت بھی مان لیں کہ ابھی تو بنگلا آپ کے نام پر تھا جو آپ ماہ نور کے نام کروا رہی ہیں کل کو کوئی اور ڈیمانڈ کریں گے تو کیا آپ پوری کر دیں گی، پھر کیا کریں گی؟ اس لیے بہتر یہی ہے کہ جو کل ہونا ہے وہ آج ہی ہو جائے۔“ حماد اس قدر تلخ انداز کے ساتھ بھی بات کر سکتا ہے اس بات کا اندازہ حارث کو ابھی ابھی ہوا تھا۔

”پھر کیا بنے گا ماہ نور کا.....؟“ نانو کے چہرے پر کچھ ایسا تھا جو حارث اور حماد دونوں کو ہی ان پر رحم آیا تھا۔

”اگر خدا نخواستہ کچھ ہوتا ہے تو میں آج آپ کو لکھ کر دینے کو تیار ہوں کہ ماہ نور آپ کی نہیں میری ذمہ داری ہوگی.....“ وہ سو فیصد بھرپور اعتماد کے ساتھ مزید کہہ رہا تھا۔ ”مجھے ماہ نور اپنی بہنوں کی طرح عزیز ہے، میرا چھوٹا بھائی میڈیکل کے آخری سال میں ہے وہ شاید ماہ نور سے ایک آدھ سال عمر میں چھوٹا ہو..... لیکن ہمیں کوئی اعتراض نہیں اگر وہ لوگ صرف اس ناجائز مطالبے کی بنا پر ماہ نور کو چھوڑتے ہیں تو جس دن ماہ نور کی عدت ختم ہوگی اس سے اگلے دن ہم لوگ اسے لے جائیں گے۔ اب بتائیں آپ کو منظور ہے؟“ حماد کے دل کی سپائی اس کے چہرے اور لہجے سے صاف جھلک رہی تھی۔ اس کی بات پر حارث کچھ بے چین ہوا۔ اس نے بلا ارادہ پہلو بدل کر نانو کا ہکا بکا چہرہ دیکھا تھا۔ جس پر اطمینان کے رنگ آہستہ آہستہ واپس آرہے تھے۔

واپسی کے سفر میں وہ دونوں بالکل خاموش تھے۔ حماد کی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا جبکہ حارث کے دل میں کوئی دکھ انگڑائیاں لے کر بیدار ہو رہا تھا۔ اس نے خلوص دل سے اس لڑکی کے لیے دعا کی تھی کہ اللہ اس کے لیے وہ کرے جو اس کے حق میں بہتر ہو۔

☆☆☆

”لیکن نانودے! اس طرح اووری ایکٹ کرنے والی لڑکی ہرگز نہیں تھی۔ کوئی نہ کوئی ایسی بات تو ہے ناں جس نے اتنی صابر، سمجھدار اور اچھی لڑکی کو اس طرح سے بولنے پر مجبور کر دیا۔“ حماد کو اس کی باتوں سے سخت دکھ پہنچا تھا اس لیے خود کو اس کے دفاع میں بولنے سے روک نہیں سکا تھا۔

”پھر بیٹا، آپ بتا دو کہ میں کیا کروں.....؟“ نانو کی بے بسی بھی عروج پر تھی۔

”آپ بس انتہائی سمجھداری اور تحمل کے ساتھ اس معاملے کو نبھائیں، اس بات کو ذہن سے نکال دیں کہ ماہ نور کا گھر خراب نہ ہو جائے کیونکہ جو چیز انسان کی قسمت میں لکھی ہو وہ ہو کر رہتی ہے۔ ابھی فوراً گھر اس شخص کے نام کرنے کی ضرورت نہیں۔ صرف تیل دیکھیں اور اس کی دھار دیکھیں۔ اپنے رویے میں ان کو کوئی چلک نہ دکھائیں وہ آپ لوگوں کو خواتین سمجھ کر ہراساں کر رہا ہے۔ آپ کے دو ٹوک انداز پر اگر غفلت ہوئے تو سمجھ جائیں گے۔“ حماد نے خلوص دل سے انہیں مشورہ دیا تھا۔ حارث بس خاموشی سے ان کی گفتگو سن رہا تھا۔ اس نے کوئی تبصرہ نہیں کیا تھا۔ اسے پہلی دفعہ ان خواتین کی بے بسی کا اندازہ ہوا تھا۔

”اور اگر وہ لوگ طیش میں آگئے تو.....؟“ نانو کو سوطر کے اندیشے لاحق تھے۔

”لیواٹ نانو، کیا ہوگا زیادہ سے زیادہ، یہ تعلق ختم کر دیں گے ناں، تو کر دیں۔“ حماد کے صاف گوانداز پر نانو دل ہی ہو گئیں۔

”استغفر اللہ بیٹا، کیسی باتیں کرتے ہو، کیا بنے گا پھر اس بچی کا.....؟“

”پہلے تو آپ اس بات کو ذہن سے نکال دیں کہ وہ کوئی بچی ہے۔ وہ ماشاء اللہ پڑھی لکھی، سمجھدار اور ذہین لڑکی ہے۔ اپنے پیروں پر کھڑی ہے۔ اسے ایسے لوے لٹڑے تعلق کی کوئی ضرورت نہیں۔ وہ

اسپتال گئے ہوئے ہیں۔ مس ماہ نور کی نانوکو ہلکا سا انجانا ایک ہوا ہے۔ اب ہم لوگ بھی سوچ رہے تھے کہ اسپتال چلے جائیں اور خواتین ان کے گھر۔“ اعظم نے یونی اس کی معلومات میں اضافہ کیا تھا۔ وہ ہلکا سا سر ہلکا اپنی سیٹ پر آکر بیٹھ گیا تھا۔ اس کا دماغ بالکل خالی تھا۔ کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ سیل فون چار جنگ پر لگا کر اس نے بلا ارادہ ماہ نور کا نمبر ڈائل کیا تو وہ بند جا رہا تھا۔ وہ کچھ دیر تو بیٹھا سوچتا رہا۔ آفس کے کچھ لوگ اسپتال اور خواتین ان کے گھر کو روانہ ہو چکی تھیں۔ اس نے پھر حماد کا نمبر ملایا جو پہلی ہی بیل پر ریسو کر لیا گیا تھا۔

”کہاں چلے گئے تھے یار تم، کل سے؟“ ایک سوا یک دفعہ تمہارا نمبر مل چکا ہوں۔“ آگے سے تھکا تھکا سا حماد بول رہا تھا۔

”سوری یار، نمبر بند تھا۔ تم بتاؤ کہ نانوکو کی طبیعت کیسی ہے؟“ اس نے بے تانی سے دریافت کیا۔

”اب تو کچھ بہتر ہے، کل شام سات بجے۔“ نانوکو کی بوکھلائی ہوئی کال آئی تو میں فوراً پہنچا۔ میں ہی ان دونوں کو اس سسرال لے کر پہنچا تھا۔ وہاں تو کہرام برپا تھا۔ اس کی ساس ماہ نور کو دیکھ کر آپے سے باہر ہو گئیں اور ان لوگوں کو گھر کے صحن سے ہی واپس بھیج دیا۔ گھر پہنچتے ہی نانوکو کی طبیعت خراب ہو گئی تب سے اسپتال میں ہیں۔“ حماد نے تفصیل سے بتایا۔

”ماہ نور کے پاس کون ہے؟“ اس نے کچھ جھجکتے ہوئے پوچھا تھا۔

”ماہ نور کے پاس میری امی اور بہنیں ہیں۔ وہ بے چاری بالکل خاموش ہے، کل سے ایک لفظ نہیں بولی۔ سخت صدمے سے گزر رہی ہے۔“ حماد نے تاسف بھرے انداز میں بتایا۔ حارث کو اس کے احساسات کا بے خوبی اندازہ تھا۔

شام کو وہ اسپتال گیا تو نانوکو کی حالت کچھ بہتر تھی

حادثہ ہوا ہے۔“ حرا بلند آواز میں سب کو بتا رہی تھی۔ ”اچھا ماہ نور کی اس لالچی خاندان سے جان چھوٹ گئی۔“ مازہ تب کر بولی تھی وہ بری طرح ٹھنکا تھا۔ اس معاملے کی سمجھ نہیں آ رہی تھی۔

”کیا ہوا اعظم صاحب؟“ حارث نے دھڑکتے دل سے سرکیشن کے اعظم سے پوچھا جو بالکل خاموش کھڑا تھا۔

”کچھ نہیں، کل کے جہاز والے حادثے میں مس ماہ نور کے شوہر بھی وفات پا گئے وہ بھی کراچی سے آ رہے تھے۔ ان کی ڈیڈ باڈی مل گئی ہے۔ ہم سب لوگ افسوس کے لیے ان کے گھر جانا چاہ رہے تھے لیکن راشد صاحب نے منع کر دیا۔ وہ اور حماد ادھر ہی گئے ہوئے ہیں۔“ اعظم کی بات پر حارث کو ایک لمحے کو آفس کی چھت اپنے اوپر گر گئی ہوئی محسوس ہوئی۔ وہ تقدیر کے اس وار پر ہکا بکا رہ گیا تھا اس کا دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا۔

”راشد صاحب نے ان کے گھر جانے سے منع کیوں کر دیا؟“ وہ بے مشکل بولا تھا۔

”وہ کہہ رہے تھے کہ ان کی نانوکو کی طبیعت خراب ہے اور وہ اسپتال میں ہیں اور مس ماہ نور عدت میں ہیں۔ اس لیے خواتین میں سے کسی نے جانا ہے تو وہ جائیں۔“ اعظم نے بہت سلجھ ہوئے انداز میں اسے بتایا۔ ”کیا ہوا سراسر آپ کو علم نہیں تھا کیا؟“ اعظم شاید اس کے چہرے کے تاثرات کو دیکھ کر چونکا تھا۔

”نہیں، اصل میں کل میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ سیل فون کل شام پانچ بجے سے بند ہے صبح آن کیا تو چار جنگ ختم تھی۔ اس لیے یہی سوچا تھا کہ آفس جاکر چارج کرتا ہوں۔“ اس نے فوراً وضاحت کی۔ اسے یقین تھا کہ کل حماد نے اس سے رابطہ کرنے کی لازمی کوشش کی ہوگی۔

”آج صبح سے راشد صاحب اور حماد صاحب

ہے۔“ ملیجہ نے انتہائی افسردگی سے بتایا تو حرا کو بھی دھچکا سا لگا۔

”یارتہماری ساس پاگل تو نہیں؟“

”پتا نہیں یار لیکن ہم سب کو پاگل بہت اچھی طرح سے بنا جاتی ہیں۔“ ملیجہ کی سے ہنسی تو حارث نے تاسف بھری نظروں سے سامنے عین میں اپنے کمپیوٹر پر مصروف ماہ نور کو دیکھا۔

”کیا بنا ماہ نور کے مسئلے کا۔ اس کی نانوکو بھی لگتا ہے اپنا بنگلا اپنی نواسی سے زیادہ عزیز ہے۔“ حرا کی بات پر حارث کو سخت افسوس ہوا۔ واقعی اس کی گھریلو زندگی کو لوگ خوب ڈسکس کر رہے تھے۔

”نہیں یار، وہ ایسی خاتون نہیں ہیں۔ بہت نفس طبیعت کی حامل سمجھدار خاتون ہیں۔ ماہ نور کے میاں کی ضد کے آگے انہوں نے ہتھیار پھینک دیے ہیں اور کہا ہے کہ بنگلا اس کے نام کر دیں گی۔ اب کراچی سے آ رہا ہے وہ کمینہ انسان۔“ ملیجہ کی بات پر وہ چونکا۔ اس کا سارا دھیان بٹ گیا تھا۔ اس سے اپنے آرنیکل کا ایک لفظ بھی نہیں لکھا جا رہا تھا۔ اگلے ہفتے کا تب تقدیر نے کچھ اور ہی اس کی زندگی میں رقم کر رکھا تھا۔ اس کا اندازہ اسے اس دن آفس آنے کے بعد لگا۔

پورے آفس میں ایک شور برپا تھا۔ سب لوگ کام چھوڑے ایک جگہ اکٹھے تھے۔ ایک دن پہلے کراچی سے اسلام آباد آنے والا جھو جائز لائن کا طیارہ خراب موسم کی وجہ سے لینڈنگ سے کچھ منٹ پہلے ایک رہائشی علاقے میں گر کر تباہ ہو گیا تھا۔ اس وجہ سے سب لوگ اس حادثے کے متعلق اپنی اپنی رائے کا اظہار کر رہے تھے۔

”یار بے چاری ماہ نور، اس کی نانوکو تو بہت ہی برا حال ہے۔ وہ لوگ ان کے گھر گئیں تو گھر والوں نے اندر ہی آنے نہیں دیا۔ اس کی ساس جالوں کی طرح تین کر رہی تھیں کہ ماہ نور کی خواست کی وجہ سے یہ

وہ پورا ایک ہفتہ افس نہیں آئی تھی اور اس دفعہ خلاف توقع راشد صاحب نے خود اسے چھٹی دی تھی۔ اس نے اپنا سارا کام گھر بیٹھ کر ہی نبھایا تھا۔ حماد ہی سے پتا چلا تھا کہ نانوکو کے انکار پر اس کامیاب خاصا چراغ پا ہوا تھا۔ اس نے ماہ نور کو گھر لے کر جانے سے صاف انکار کر دیا تھا اور خود واپس کراچی چلا گیا تھا۔ ماہ نور اب پچھلے دو ماہ سے اپنی نانوکو کے پاس ہی تھی۔ اس نے ملیجہ کے عین میں بھی آنا چھوڑ دیا تھا۔ اس کی وجہ بھی ایک دن حارث کو اچانک ہی پتا چلی تھی جب حرا کے استفسار پر ملیجہ نے خفت زدہ لہجے میں بتایا تھا۔

”یار میں کیا کروں، مجھے ماہ نور سے سخت شرمندگی ہے۔ اس بے چاری کو میری تندوں اور ساس نے بھگوان بھگوان کرنا پڑی ہیں۔ ایک تو وہ پہلے ہی سخت پریشانی کا شکار تھی، اوپر سے میری ساس اٹھتے۔“ کہہ رہی تھیں کہ گھر سامنے کے لیے عورت کو اپنا دل مارنا پڑتا ہے تب جا کر گھر بیٹے ہیں لیکن آج کل کی نوجوان نسل میں قوت برداشت ہی نہیں۔ اس نے دو دن میرے گھر عذاب کے کاٹے تھے۔“

”اوہ سوسید یار، اس میں تمہارا تو کوئی قصور نہیں۔ تم نے تو ان سے نہیں کہاں تھاناں۔“ حرا نے اسے تسلی دی۔

”ہاں یار، میں نے تو نہیں کہا تھا لیکن انہوں نے اس پر اکتفا نہیں کیا۔ ہمارے گھر کے ایک چھوٹے سے مسئلے پر فوراً ماہ نور کو فون کھڑکے خوب سنائی کہ تم اپنا گھر خراب کر رہی ہو اب الٹا ان کی بہو کو بھی پٹیاں پڑھا کر گراہ کر رہی ہو حالانکہ اس بے چاری کے فرشتوں کو بھی ہمارے گھر کے مسئلے کا علم نہیں۔ اس نے تو مجھ سے ذکر تک نہیں کیا لیکن میری نند نے ہی ایک دن اپنی اماں کا یہ کارنامہ فخریہ انداز سے سنایا تو میرے تو پیروں سے جان نکل گئی پھر مجھے پتا چلا کہ اس نے مجھ سے بات چیت کم کیوں کر دی

میں ہی واپس چلے گئے لیکن جانے سے پہلے انہوں نے حارث اور حماد کا خصوصی شکریہ ادا کیا تھا۔ وہ اچھے خاصے شریف انسان تھے۔ اپنے قیام کے دوران انہوں نے یہ بنگلہ بھی اپنی نگرانی میں ماہ نور کے نام کر دیا تھا۔ جس کی اطلاع امریکا پہنچنے ہی ان کی بیگم کی برداشت کا پیمانہ چھلک گیا تھا جس کی وجہ سے ماموں جان کو عجلت میں واپس جانا پڑا۔

ماہ نور نے اپنا استعفیٰ آفس بھجوا دیا تھا جو راشد صاحب نے فوراً ہی پھاڑ کر ردی کی نوکری کی نذر کر دیا تھا۔ اگلے ہی دن وہ نانوں کے پاس پہنچ گئے۔ ماہ نور کی طبیعت اچھی طرح صاف کرنے کے بعد اسے دوران عدت آفس آنے سے منع کرنے کے ساتھ ساتھ کچھ آسان سی آسانٹنس اس کے سپرد کر دی تھیں جو وہ گھر

”اس نے تو بہت مایوس کن باتیں بتائیں کہ وہ حد درجہ لاپچی، خود غرض اور کمال درجے کا جھوٹا انسان ہے۔ اس نے آدھے آفس کے لوگوں سے قرضہ لے رکھا ہے۔ انتہائی جھگڑا لومطیعت کا حامل ہے۔ میں نے اس وقت نانوں کو بتایا تھا لیکن انہوں نے مجھے ماہ نور کو بتانے سے منع کر دیا تھا کیونکہ شادی ہو چکی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ اس کی دل آزاری ہو گی۔“ حماد نے اس پر انکشاف ہی تو کیا تھا۔

”حیرت ہے کہ تم نے مجھے بھی نہیں بتایا؟“ حارث بھی جی بھر کر حیران ہوا تھا۔

”یار کیا بتاتا اور پھر اس بے چاری کا بھرم توڑ کر مجھے کیا ملتا، اسے تو خود شادی کے ایک ہفتے بعد ہی پتا چل گیا تھا پھر بھی اس نے چھ ماہ ان کے گھر میں گزار دیے، یہ بھی اس کا ہی حوصلہ ہے.....“ حماد نے ایک اور انکشاف کیا تھا۔

”پھر تو یہ حادثہ تو اس کے حق میں اچھا ہی ہوا۔“ حارث کے منہ سے ایک دم ہی نکلا تھا۔

”یار ہمیں یہ کہنا زیب تو نہیں دیتا۔ اس حادثے میں اتنی انسانی جائیں ضائع ہوئی ہیں اللہ اس شخص کی بھی مغفرت کرے لیکن ماہ نور کے حوالے سے جس نے بھی یہ سنا ہی کہا کہ یہ اس کے حق میں اچھا ہوا۔ بس اللہ معاف کرے انسان کہ اعمال ایسے نہیں ہونے چاہیے کہ لوگ اس کی موت پر ایسے جملے ادا کریں۔“ حماد نے قدرے نرم اور دھیمے انداز میں کہہ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ زبردستی مسکرا دیا۔

اس رات اس نے حماد کو زبردستی گھر بھیج دیا تھا اور وہ ان کے پاس اسپتال میں ٹھہر گیا تھا۔ اگلا پورا ایک ہفتہ دونوں نے پوری ذمہ داری سے یہ ڈیوٹی نبھائی تھی۔ جس دن نانو گھر شفٹ ہوئیں اسی دن ماہ نور کے ماموں امریکا سے آگئے تھے۔ وہ آئے تو پورے پندرہ دن کے لیے تھے لیکن اپنی بیوی کی پے درپے آنے والی فون کالز کی وجہ سے مجبوراً دس دن

”یار میں بندہ بشر ہوں مجھے پلزز فرشتوں کی نظر سے مت دیکھو۔ جہاں تک بات ماہ نور کی ہے تو اصل میں ہم دونوں کا پانچ سالہ ساتھ ہے۔ ہم دونوں کی جو اننگ بھی آفس میں ایک ہی دن کی ہے پھر وہ سادہ مزاج کی حامل بہت شریف اور سنجیدگی لڑکی ہے۔ پہلے ہی دن سے ہم دونوں کی آپس میں اچھی انڈر اسٹینڈنگ ہو گئی تھی۔ دن رات ان کے گھر آنا جانا تھا اوپر سے نانو بھی مجھ پر بہت اعتماد کرتی تھیں اس لیے مجھے ان کے گھر میں ایک فرد کی سی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔“ وہ سادہ سے لہجے میں بتا رہا تھا۔ ”اس کے حوالے سے میں یہ سب کچھ جو ان کے ساتھ کر رہا ہوں، ان کا حق ہے پھر میری سسر کی شادی پر ماہ نور نے ہر طرح میرا ساتھ دیا تھا۔ کچھ معاشی مسائل تھے اس حوالے سے بھی اس نے مکمل سپورٹ کی تھی۔ میرے اوپر بھی ان کے بہت احسانات ہیں۔“ وہ بات کرتے کرتے لمحے بھر کو سانس لینے لگا۔

”دوسری بات یہ ہے مجھے حقیقت میں ان دونوں خواتین سے انیت سی ہو گئی ہے۔ ایک اور بات یہ ہے کہ ماہ نور کی شادی کے سلسلے میں مجھ سے غلطی ہوئی جس کی وجہ سے میں بہت زیادہ کٹھن محسوس کرتا ہوں۔ نانوں نے اس کے میاں صاحب کی پوچھ پڑتال کی ذمہ داری مجھ پر ڈالی تھی۔ وہ چونکہ کراچی میں تھا اس لیے میں نے ایک دوست کے ذمے یہ کام لگا دیا۔ اس نے لگتا ہے کہ سرسری طور پر ہی پوچھ کر مجھے اوکے کی رپورٹ دے دی اور یوں نانوں بالکل مطمئن ہو گئیں۔ مجھے تو فوراً آفس کے کسی کام سے بعد میں کراچی جانا ہوا تو موصوف کے ایک کولیگ سے اتفاقاً ملاقات ہو گئی۔ اس نے تو میری آنکھیں کھول دیں۔“ حماد کی بات پر وہ بری طرح چوٹا تھا۔

”کیوں، اس نے کیا کہا؟.....“

لیکن وہ حد درجہ مضطرب اور بے چین تھیں۔ رنجیدگی اور دکھ ان کے انگ انگ سے عیاں ہو رہا تھا۔ وہ بار بار حماد سے ماہ نور کی طبیعت کا پوچھ رہی تھیں۔ اسپتال میں بھی انیس اسی کی ٹینشن تھی۔ حماد انہیں نرم الفاظ میں تسلی دے رہا تھا۔

”ماہ نور کے ماموں کو اس حادثے کی اطلاع دے دی کہ نہیں؟“ نانوں کو غنودگی میں جاتا دیکھا کر حارث نے آہستگی سے پوچھا تھا۔

”ہاں بتا دیا تھا لیکن ان کو فوری طور پر فلائٹ نہیں مل رہی پھر اس کی ممانی کا رویہ بھی عجیب سا تھا وہ اپنی ساس کی طبیعت پوچھنے کے بجائے مجھ سے طنزیہ انداز میں دریافت کر رہی تھیں کہ میں کون ہوں اور امریکا کال کرنا ضروری تھی کیا؟ مجھے تو ان خاتون کی ذہنی حالت پر شبہ ہو رہا تھا۔“ حماد کے چہرے سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اسے ماہ نور کی ممانی کی بے حسی نے کتنا دکھ پہنچایا ہے۔ وہ دونوں باتیں کرتے کرتے باہر کارڈیور میں رکھی شیخ پر آکر بیٹھ گئے تھے۔

”حماد تم بہت اچھے دوست ہی نہیں بے غرض اور اچھے انسان بھی ہو۔ میں نے تم جیسے لوگ بہت کم دیکھے ہیں۔“ حارث کی اچانک کی جانے والی بات نے حماد کو حقیقتاً ہکا بکا کر دیا تھا۔

”یا اللہ خیر..... کل رات سے ایک بھی لمحے کو میں نہیں سو یا ایسی ہیکی ہیکی باتیں میں کروں تو سمجھ میں آتی ہیں لیکن یہ تمہیں بیٹھے بٹھائے کیا ہوا ہے؟“ حماد نے تعجب بھرے انداز میں جھک کر ہلکے پھلکے لہجے میں اس سے پوچھا تھا۔

”یار تم جس خلوص نیت سے نانوں اور ماہ نور کا خیال رکھ رہے ہو۔ ایسی بے غرض خدمت اور احساس کا جذبہ میں نے پہلی دفعہ کسی میں دیکھا ہے۔“ اس نے صاف گوئی سے کہا۔ حماد اس کی بات پر کھل کر ہنسا تھا۔

دنیا بھر میں

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کی مطبوعات

سپنس ڈائجسٹ جاسوسی ڈائجسٹ پکیر ڈائجسٹ ٹریڈ

منگوانے کیلئے ہمارے مقرر کردہ ایکسپورٹرز

ویکم ٹریڈرز

سے رابطہ کریں

WELCOME TRADERS

189-E, Block-2, P.E.C.H.S, Karachi,

Pakistan

Tel: (92-21) 34545513, 34520214.

Fax (92-21) 3454885.

Cell # 0333-4315950

Email: zaidi@welcome.com.pk

Website: www.welcome.com.pk

دانت نہیں بتایا کہ آپ ہی وہ ہیں، آپ سے بات کرنے کے بعد اس نے نانو کو ٹال دیا تھا کہ آپ شاید فی الحال شادی کرنے میں انٹرنسڈ نہیں اس لیے نانو اس بات کو بھول بھال گئیں لیکن مجھے آپ کا چہرہ اچھی طرح یاد تھا اور کچھ حماد ہر وقت آپ کی باتیں کرتا رہتا تھا۔ وہ بہت تفصیل کے ساتھ بتا رہی تھی۔ حارث کو سخت شرمندگی اور خفت کے مرحلے سے گزرنا پڑ رہا تھا۔

”آئی ایم سوری، حماد نے آپ کا ذکر ضرور کیا تھا اور شاید کچھ تصاویر بھی بھیجی تھیں۔“
”وہ تصاویر جو آپ نے دیکھی ہی نہیں تھیں۔“ اس نے فوراً بات کاٹ کے کہا تو وہ زبردست طریقے سے چونکا۔
”آپ سے کس نے کہا کہ میں نے نہیں دیکھی۔۔۔۔۔؟“

”اس لیے کہ جب آپ پہلی دفعہ ہمارے گھر آئے تو نہ ہی مجھے دیکھ کر چوٹے اور نہ ہی آپ کے کسی انداز سے ایسا لگ رہا تھا کہ آپ مجھے یا نانو کو پہلے سے جانتے ہیں۔“ ماہ نور کے سو فیصد درست اندازے پر اسے شک سا لگتا تھا۔

”آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں کیونکہ میں نے واقعی وہ تصاویر نہیں دیکھی تھیں۔ کیونکہ مجھے اس وقت زندگی یا اپنے مستقبل کے حوالے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔“ وہ تھوڑا سا سنجھل کر بولا۔ ”لیکن مجھے بعد میں بے تحاشا افسوس ہوا تھا کیونکہ اگر میں واقعی حماد کی بات کو بنجیدگی سے لے کر ای میل چیک کر لیتا تو آپ کو کبھی مس نہ کرتا۔ آپ بالکل ویسی ہی تھیں جیسا کہ ۱۰ اکتوبر والے حادثے سے پہلے میں اپنی لائف پارٹنر کے متعلق کبھی کچھ سوچتا تھا۔“ اس نے بھی گھما پھرا کر بتانے کے بجائے دو ٹوک انداز میں کہا۔ وہ ایک لکھے کوچہ ہوئی حارث کو لگا کہ جیسے کال کٹ گئی ہو۔ اس سے پہلے وہ کچھ بولتا، اس کی

لیے ضروری ہے کہ آپ امریکا ہی جائیں۔۔۔۔۔؟“
اس نے صاف صاف الفاظ میں بات کرنے کی ٹھان لی تھی۔

”پھر کہاں جاؤں۔۔۔۔۔؟“ اس کی بات نے حارث کے دل کی دھڑکنوں میں ارتعاش برپا کر دیا تھا۔
”آپ اس شہر میں بھی تو جا سکتی ہیں جہاں حقیقتاً سب لوگوں نے اپنی اپنی زندگی کو نئے سرے سے گزارنے کے لیے جدوجہد شروع کر رکھی ہے۔“

”کہاں۔۔۔۔۔؟“ وہ بری طرح چونکی تھی۔
”مظفر آباد۔۔۔۔۔!“ حارث نے مکمل اعتماد کے ساتھ کہا تھا۔

”کیا۔۔۔۔۔ مظفر آباد۔۔۔۔۔ وہ کیسے؟“ دوسری جانب وہ سخت حیران ہوئی تھی۔ اس کی تعجب انگیز آواز نے حارث کے چہرے پر مسکراہٹ پھیلادی تھی۔
”جی مظفر آباد میں، جہاں لوگوں نے زلزلے

میں اپنے بہت سے پیاروں کو کھویا اور اپنے گھر بار اپنی آنکھوں سے تباہ ہوتے دیکھے، وہاں کوئی بھی کسی کے ماضی کو نہیں کر دیتا، یقین کریں آپ وہاں میرے ساتھ بہت خوش رہیں گی۔ میں بھی اپنا گھر وہیں دوبارہ آباد کرنا چاہتا ہوں۔“ اس کے لہجے کی سچائی وہ اتنی دور ہوتے ہوئے بھی محسوس کر سکتی تھی۔ وہ بالکل خاموش ہو گئی تھی۔

”آپ کی اس بات کا ازالہ کرنا چاہتے ہیں جو آپ نے ایک دفعہ پہلے میرا پریو پوزل ریجٹ کر کے کی تھی۔۔۔۔۔“ اس کی بات نے حارث کا دماغ بھک سے اڑا دیا تھا۔

”آپ کو کس نے کہا کہ میں نے آپ کا پریو پوزل ریجٹ کیا تھا؟“ وہ یہ مشکل بولا تھا۔
”حماد نے جب آپ کے رشتے کی نانو سے بات کی تھی تو ساتھ میں تصاویر بھی دکھائی تھیں۔ اس لیے جب آپ پہلی دفعہ ہمارے گھر آئے تو نانو کو آپ کا چہرہ جانا پہچانا سا لگا لیکن اس وقت حماد نے

ساتھ آپ کے گھر پہنچ جائیں۔“ اس کا لہجہ تھوڑا نہیں بلکہ اچھا خاصا خوشگوار تھا جو حارث کی سماعتوں کو بھلا لگا ورنہ آفس کی کولنگز سے یہ یہی سننے کو مل رہا تھا کہ وہ بہت زیادہ قنوطیت کا شکار ہو رہی ہے۔

”میرے لیے تو یہ بہت اعزاز کی بات ہوگی میڈم۔۔۔۔۔“ وہ ہلکا سا ہنستا تھا۔ اسے علم تھا کہ واقعی نانو نے یہ کرنا تھا۔ وہ اس سے کافی مانوس ہو گئی تھیں۔
”حماد کو دبئی سے واپس آ رہا ہے۔۔۔۔۔؟“

اس کی بات پر کوئی تبصرہ کیے بغیر اچانک ہی بات کا رخ بدلا تھا۔ حماد پچھلے پندرہ دن سے آفس کے ہی ایک اسائنمنٹ کے سلسلے میں دبئی گیا ہوا تھا۔
”وہ شاید منگل تک واپس آ جائے کیوں کوئی

کام تھا کیا۔۔۔۔۔؟“ حارث نے جواب دے کر پوچھا۔
اتنے عرصے کے بعد اس کی آواز سننا اچھا لگ رہا تھا اس لیے وہ بات کو خود ہی طویل کرنا چاہ رہا تھا۔
”ہاں کام تو تھا، نانو نے میرے امریکا کے

ویزے کے لیے اپلائی کیا تھا۔ اس سلسلے میں کوئی پیش رفت ہوئی کہ نہیں وہی پوچھنا تھا۔“ اس کا سادہ سا انداز اسے بری طرح چونکا گیا تھا۔

”آپ امریکا جا رہی ہیں؟“ وہ غلت بھرے انداز میں بولا۔ ایک عجیب سی بے چینی نے اس کا حصار کیا تھا۔

”جی۔۔۔۔۔! ارادہ تو یہی ہے۔ ماموں بھی بار بار بلارہے ہیں اور پھر میں آفس بھی دوبارہ جوائن نہیں کرنا چاہتی، وہاں سب لوگ میرے ساتھ ہونے والے سانحے سے باخبر ہیں جبکہ میں اپنے ماضی کو بھلا کر نئے سرے سے اپنی زندگی کا آغاز کرنا چاہتی ہوں۔“ وہ خاصے مثبت انداز میں اپنی زندگی کے بارے میں سوچ رہی تھی یہ بات حارث کو اچھی تو لگی تھی لیکن اس کی امریکا روانگی کی خبر نے اس کے اندر حشر سا برپا کر دیا تھا۔

”نئے سرے سے زندگی کا آغاز کرنے کے

بیٹھ کر آرام سے کر سکتی تھی۔ ان کی اس بات سے سارے آفس کے لوگوں کی نظروں میں ان کی قدردانیت میں اضافہ ہو گیا تھا۔ سب ہی نے ان کے اس اقدام کو سراہا تھا۔ حارث کئی دفعہ نانو سے ملنے گیا تھا لیکن ماہ نور سے اس کی ملاقات نہیں ہو پائی تھی۔ اب تو نانو کے ساتھ اس کی کافی بے تکلفی ہو گئی تھی، وہ حماد کے بغیر بھی ان سے ملنے چلا جاتا۔ وہ اس کی آمد پر کھل سی جاتی تھیں۔ انہیں ایک اچھا سامع میسر آ گیا تھا۔ جسے وہ تفصیل کے ساتھ اپنے ماضی کے قصے مزے لے لے کر سناتی تھیں۔

چار مہینے دیکھتے ہی دیکھتے گزر گئے تھے۔

☆☆☆

اس دن اچانک ہی ماہ نور کی اس کے نمبر پر کال آ گئی تھی۔ وہ سخت تعجب کا شکار ہوا جبکہ دوسری جانب وہ اس کی شدید حیرت سے بے ہوش ہو گئی تھی۔
”حارث آپ پچھلے چار دن سے گھر نہیں آئے، نانو بہت اپ سیٹ ہو رہی ہیں۔ آج بھی اصرار کر کے مجھے کہا ہے کہ میں آپ کو کال کروں اور مجھے بھی آپ سے کچھ کام ہے۔“

”جی ضرور کہیے۔“ وہ ہمدن گوش ہوا۔
اصل میں ایک دو آرٹیکل آپ کو میل کر رہی ہوں، کوئی کی بیشی ہو تو اسے چیک کر لیجیے گا اور کل اپنی نگرانی میں ان کے پرنٹس نکلا کر ارشد صاحب کی میز پر رکھوا دیجیے گا۔“ وہ جتنی بنجیدگی سے کہہ رہی تھی اس سے زیادہ توجہ سے وہ اس کی بات سن رہا تھا۔

”جی ضرور، میں آرٹیکل دیکھ لوں گا، ڈونٹ وری۔۔۔۔۔ باقی نانو سے کہہ دیجیے گا کہ مجھے پچھلے دو تین دن سے فلو ہو رہا تھا اور گلا بھی خراب تھا اس لیے نہیں آسکا۔“ اس نے بھی فوراً وضاحت دی۔ اس کی بات کے جواب میں وہ فوراً بولی۔

”یہ اطلاع اگر میں نے ان کو دے دی تو وہ فوراً ادراک والی چائے کا پورا تھرماں بنوا کر ڈرائیور کے

”ہاں، اسے اچھی طرح علم ہے کہ میں کس کی بات کر رہا ہوں..... لیکن وہ اس میں قطعاً انٹرنسٹ نہیں تھی.....“ حماد نے وضاحت کی تو وہ کچھ ہلکا ہوا۔

”اب بیٹا تم میرا انتظار کرو، اب تو میں اگلے ہندو دن تک پاکستان نہیں آؤں گا جب تک تم میری منتیں نہیں کرو گے پھر آکر سوچ بچار کرنے کے بعد نانوسے تمہارے رشتے کی بات کروں گا۔“ وہ ہنستے ہوئے باقاعدہ اسے چڑا رہا تھا جبکہ حادث اس کی شرارت پر ہنسا تھا۔

اس دن فلو سے اس کا برا حال تھا۔ کھانسی اور چھینکوں نے الگ مت مار رکھی تھی۔ موسم خاصا سرد تھا۔ ہلکی ہلکی بارش نے خنکی میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔ نانو نے اسے بالکل بیئر کے سامنے بٹھا رکھا تھا۔ ادراک والی چائے اسے تین دفعہ پلا کر اب وہ چکن کارن سوپ زبردستی پلا رہی تھیں۔

سوپ کا بیچ اپنے پیالے میں رکھنے کے بعد اس نے ایک زوردار چھینک ماری تھی اور اپنے کوٹ کی جیب سے کچھ کاغذات نکال کر نانو کی جانب بڑھائے تھے۔ جو سخت حیرانی سے اسے ٹٹو سے اپنی سرخ ناک رگڑتے ہوئے دیکھ رہی تھیں۔

”نانو، آپ مجھے اس عرصے میں کچھ نہ کچھ جان ہی گئی ہوں گی۔ میرے ایک ہی تایا ہیں جو کینیڈا میں ہیں اور کم از کم میری خاطر پاکستان نہیں آسکتے۔ یہ ہمارے مظفر آباد والے گھر اور ایک پلاٹ کے کاغذات ہیں جو میں ماہ نور کے نام کر دوں گا.....“ اتنی سی بات کہہ کر اس نے ایک اور چھینک ماری تھی جبکہ اس کی بات پر نانو کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ وہ سخت حواس باختہ انداز میں اس کشمیری سیب جیسے لڑکے کو دیکھ رہی تھیں جس کی شرافت کی وہ دل ہی دل میں سخت معترف تھیں لیکن اس کی بات سمجھنے سے قاصر تھیں۔

”میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھے اپنی فرزندگی میں لے لیں۔ میں آپ کے ہاتھ کی ادراک کی چائے

میرے ڈاکٹر کزن کو دکھی انسانیت کی خدمت کا خاصا شوق ہے۔ اس کو میں راضی کر ہی لیتا، وہ ویسے بھی سب سے یہی کہتا ہے کہ حماد بھائی میرے لیے لڑکی پسند کریں گے۔“ اس کی شرارت عروج پر تھی۔

”اور اگر وہ نہ مانتا.....؟“ حادث کی سوئی وہیں اٹکی ہوئی تھی۔

”کیسے نہ مانتا.....؟ ہر کوئی تمہارے جیسا ذفر تھوڑی ہوتا ہے اور تم کس خوشی میں اتنے سنجیدہ ہو رہے ہو، اس دفعہ تو میں نے تمہیں ہی حلال کرنا تھا۔ مکمل ارادہ تھا میرا کیونکہ مجھ سے تمہاری خاموش محبت ہضم نہیں ہو رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ میرا یار آخر کتنے آرٹیکل لکھ کر دے گا۔ حد ہوتی ہے ہر بات کی اس لیے دن رات اپنے ڈاکٹر بھائی کا ذکر کرتا تھا۔“ اس کے غیر سنجیدہ انداز پر حادث کو نہ چاہتے ہوئے بھی ہنسی آگئی۔

”بہت خبیث چیز ہوتی، میرے احساسات سے کھیلتے رہے ہو مجال ہے کبھی سلی کے دبول بھی کہے ہوں۔“ حادث نے اسے جھجھاڑا۔

”اب تمہیں خود ہی وحید مراد کی طرح اکیلے دیواروں سے لپٹ لپٹ کر رونے کا شوق تھا تو میں کیا کرتا اور سلی بھی کس بل بوتے پر دیتا۔ کون سا پتا تھا کہ یہ حادثہ ہو جائے گا۔ اوپر سے تم دن رات ماہ نور کے حصے کا کام کر کے دے رہے تھے میں نے سوچا کہ اچھا ہے کام پر لگا ہوا ہے بچہ..... اگر تمہیں بتا دیتا کہ پتر میں سب جانتا ہوں تو تم نے میری شرما شری میں میری بہن بے چاری کا کام بھی نہیں کر کے دینا تھا..... اور میں تو ہوں ہی ہڈ حرام، مجھ سے اپنا کام پورا نہیں ہوتا تو کسی اور کا کیا کرتا۔“ حماد اب کھل کر مس رہا تھا۔

”ماہ نور کو پتا ہے کہ تم اپنے بھائی نہیں بلکہ اپنے کزن ڈاکٹر کی نانوسے بات کرتے رہے ہو۔“ اس نے کچھ سوچ کر پوچھا۔

فون بند کر دیا تھا۔ اس کی ہنسی میں شامل رضامندی نے حادث کے دل میں ڈھیروں پھول کھلا دیے تھے۔ اس نے فریش ہو کر پہلی کال حماد کو ملائی تھی۔ جو خاصا حیران ہو رہا تھا۔

”تمہاری نزدیک کی نظر خاصی کمزور ہے میرے بھائی، دینی سے ایک اچھا سا چشمہ ضرور بخرا کر لیتے آنا.....“ اس کے شوخ انداز پر وہ جی بھر کر حیران ہوا۔ ایک تو اس کی اچانک کال ہی غیر متوقع تھی اور اوپر سے اس کا خوشگوار انداز.....

”کیوں، کیا ہوا؟ مجھے کون سی نزدیک کی چیز نظر نہیں آ رہی جو مجھے تم دینی جیسی ہنسلی جگہ سے چشمہ خریدنے کو کہہ رہے ہو۔“ دوسری جانب وہ بھی چکا تھا۔

”تمہیں مجھ جیسا چھ فٹ کا انسان نظر نہیں آ رہا۔ میں تو تمہیں بے غرض سا انسان سمجھتا تھا لیکن تم کتنے خود غرض نکلے، اس کا اندازہ مجھے اب ہو رہا ہے.....“ حادث نے مصنوعی ناراض لہجے میں کہا۔

”اس لیے تو کہتا تھا کہ یار مجھے فرشتوں کی نظر سے دیکھنا چھوڑ دوں لیکن خیر بتاؤ ہوا کیا ہے.....؟“ دوسری جانب وہ بھی غیر سنجیدہ تھا۔

”ہوا یہ ہے کہ ماہ نور کی عدت ختم ہو چکی ہے۔ اس کے بعد اگر تم اپنے کسی ڈاکٹر بھائی کا رشتہ لے کر آئے تو تمہارے بھائی کی ٹانگوں کی ضمانت میں نہیں دے سکتا جبکہ تمہیں کچھ نہیں کہہ سکتا، آخر کو اپنے یار غار ہو۔“ اس کی بات پر وہ چھت بھارت بھارت لگا کر ہنسا۔

”کون سا ڈاکٹر بھائی؟ تمہیں پتا تو ہے کہ میں اپنے بھائیوں میں سب سے چھوٹا ہوں۔ وہ تو نانوکو تسلی دینے کے لیے اپنے چچا کے بیٹے کے بارے میں کہا تھا۔“ اس کی بات پر حادث کا دماغ ٹھک سے اڑا۔

”کتنے خبیث ہوتی، اگر نانو سنجیدہ ہو جاتیں تو.....“ وہ خفا ہوا تھا۔

”سنجیدہ ہو جاتیں تب بھی کوئی بات نہیں،

آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی۔

”ہاں..... پھر تصاویر نہ دیکھنے کا سوگ آپ نے کئی ماہ تک منایا اور احتجاج شادی میں بھی شریک نہیں ہوئے.....“ وہ شاید دوسری جانب ہنسی تھی۔ اس کی بات پر حادث کا بے ساختہ قبضہ فضا میں گونجا تھا۔

”پھر مجھے نانوسے آج ہی بات کر لینی چاہیے یا میں مزید کچھ دن انتظار کر لوں، ویسے بھی آپ کی عدت ختم ہو چکی ہے۔“ وہ تھوڑا سا شوخ ہوا۔

”جانے دیں حادث صاحب، آپ کسی اچھی سی لڑکی کو دیکھ کر اس کے ساتھ اپنا گھر بسائیں۔ مجھ پر تو ویسے ہی نحوست اور شادی شدہ ہونے کا ٹھپا لگ چکا ہے۔“ وہ تھوڑا سا تلخ ہوئی۔

”جہاں تک نحوست کا تعلق ہے تو میں الحمد للہ مسلمان ہوں ایسی فضولیات پر یقین نہیں رکھتا۔ جہاں تک شادی شدہ ہونے کا تعلق ہے تو مجھے اس سے بھی فرق نہیں پڑتا۔ ویسے بھی اسلام میں بیوہ کے ساتھ نکاح کرنا ثواب کا کام ہے۔“ اپنی بات کے اختتام پر وہ تھوڑا سا ہنسا۔

”ہاں جہاں تک اچھی لڑکی کا تعلق ہے تو آپ کے علاوہ میں کسی اور لڑکی کو جانتا نہیں، مجھے آپ ہی اچھی لگتی ہیں پھر حماد کہتا ہے کہ آپ دنیا کی سب سے اچھی لڑکی ہیں۔“

”حماد کا کیا ہے وہ تو بے وقوف سا ہے اسے کیا پتا، تبھی تو اچھے خاصے بھائی کا رشتہ ایک بیوہ کے لیے لانے کے چکروں میں ہے۔“ ماہ نور کے لہجے کی کھنک لوٹ آئی تھی۔

”میں اس دفعہ حماد کو ایسا کوئی فضول پروپوزل لانے کی اجازت نہیں دوں گا۔ کسی بھی کام کا نہیں ہے اس کا بھائی، میرے خیال میں مجھے ادراک والی چائے آج ہی پنی کرنا تو سے بات کر لینی چاہیے۔“ وہ شرارتی انداز میں گویا ہوا۔

”آپ کا دماغ تو ادراک والی چائے کے بغیر بھی خوب چلتا ہے.....“ وہ ہلکا سا ہنسی۔ اس نے

میرا پیارا مہوٹی

شیریں حیدر

”یہ کیا ہے؟“ میں نے حیرت کی زیادتی سے
چخ کر ڈاکرے پوچھا۔
”کیا ہے.....“ ڈاکر بنے۔ ”نظر نہیں آ رہا
رانی کہ کیا ہے!“

”نظر آ رہا ہے کہ طوطا ہے مگر کہاں سے پکڑا
آپ نے اور کیوں؟“ میں نے اس گہرے سرمئی
طوطے کو دیکھ کر اپنا وجود یوں سمیٹا جیسے وہ مجھے کھا ہی
جائے گا..... حالانکہ وہ پنجرے میں بند تھا۔



تھا..... دیکھنے کا یہ مرحلہ وہ پوری دل جمعی کے ساتھ
انجام دے رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے جھلکتے جذبے
ماہ نور کو گھبراہٹ میں مبتلا تو کر رہے تھے لیکن وہ انتہائی
اعتماد کے ساتھ اس کے بالکل سامنے کھڑی تھی۔ اس
نے ایک چھتری اور جائے کا تھر ماس اس کی جانب
بڑھایا تھا۔ ماہ نور کی آنکھوں کی بھوت اور چہرے پر
پھیلی مسکراہٹ حارث کو تقویت دے رہی تھی۔
”تھینک یو.....“ آپ جائے بہت اچھی بناتی
ہیں۔“ اس نے بہ مشکل بات کو مکمل کیا۔ اس دفعہ کی
چھینک پوری رفتار کے ساتھ آئی تھی۔ اس نے کوٹ
کی جیب سے فوراً ٹشو نکالا۔

”اور آپ آر ٹیکل بہت اچھے لکھتے ہیں۔“ وہ
اس کی شرارت پر ہنسا تو ساتھ ہی کھاسی کا بھر پور حملہ
ہو گیا۔ اس نے انتہائی خفت بھرے انداز میں ماہ نور کو
دیکھا جو بے ساختہ اس کی حالت پر ہنسنے جا رہی تھی۔
”یقین کریں میری ساری زندگی میں پہلی دفعہ
کسی لڑکی سے اظہار محبت کا موقع آیا تو وہ بھی اس
کبخت کھانسی، فلو اور چھینکوں کی نذر ہو گیا۔ حالانکہ
میں آپ کو بتانا چاہتا تھا کہ آپ ہنسنے ہوئے بہت
اچھی لگتی ہیں اور.....“ اس سے پہلے کہ وہ اپنی بات
مکمل کرتا لگا تار دو تین چھینکوں نے اس کی حالت
پھر خراب کر دی۔

”یقین کریں کہ ایسی شدید بری حالت میں
بھی بار بار اظہار محبت کی کوشش کرنے والا بندہ میں
نے بھی زندگی میں پہلی دفعہ ہی دیکھا ہے۔“ ہنسنے
ہنسنے ماہ نور کی آنکھوں میں پانی آ گیا تھا۔ اسے ہنستا
دیکھ کر وہ بھی قہقہہ لگا کر ہنستا تھا۔ ان دونوں کی ہنسی کی
آواز نے اندر کمرے میں کھڑکی کے پاس بیٹھی نانوکا
دل اطمینان سے بھر دیا تھا۔ انہیں یقین ہو گیا تھا کہ
صبح سے برسنے والی سرما کی یہ بارش ان کی فواہی کے
لیے بہت سی خوشیوں کی پیا مبر ثابت ہوگی۔

*

ساری زندگی پینا چاہتا ہوں.....“ اس نے ایک دفعہ
پھر چھینک ماری۔ اس کی بات پر نانوکا پر گویا شادی
مرگ کی سی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ انہیں ساری
بات سمجھ میں آ گئی تھی۔

”لیکن بیٹا یہ ادک والی چائے میں نے نہیں ماہ نور
نے بنائی ہے.....“ وہ اپنے پو پلے منہ کے ساتھ
کھلکھلا کر ہنسی تھیں۔ ٹشو کے ساتھ اپنی ناک کو گرٹتا
ہوا اس کا ہاتھ وہیں ساکت ہو گیا۔ وہ ایک دم بوکھلا سا
گیا جبکہ نانوکا اس کی شکل دیکھ کر ہنسنے جا رہی تھیں۔
”یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔ اس کا مطلب
ہے کہ مجھے مستقبل میں دوبارہ کوئی ایسا مسئلہ ہوا تو گھر
سے باہر جانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔“ وہ بوکھلا
کر اور بھی اوٹ پٹانگ بول گیا لیکن اس کی باتیں
نانوکا کی دلہانیت کا باعث بن رہی تھیں۔

”بس میری خواہش ہے کہ جب حماد پاکستان
آئے تو میں اور ماہ نور دونوں اسے ائیر پورٹ لینے
جائیں۔ اس وقت اس کے چہرے پر پھیننے والی بے
ساختہ خوشی اور حیرت کو میں اپنے کمرے میں قید کرنا
چاہتا ہوں۔“
”اس کا مطلب ہے کہ تم وقت ضائع کرنا نہیں
چاہتے.....“ نانوکا نے اس کی چوری پکڑی تھی، وہ اب
مسکرا رہی تھیں۔

”نہیں نانوکا، میں نیک کام میں دیر نہیں کرنا
چاہتا.....“ وہ تھوڑا سا پر اعتماد ہوا لیکن برا ہوا اس
چھینک کا جس نے اس کا سارا اعتماد بھک کر کے
اڑا دیا تھا۔ نانوکا رضامندی نے اس کا داغ بالکل
ہی ہلکا بھلکا کر دیا تھا۔

وہ گھر سے باہر نکلا تو وہ ایک دم ہی گیسٹ روم
سے باہر نکلی تھی۔ باہر موسم بہت زیادہ سرد تھا۔ ہلکی ہلکی
سی بارش کی کن کن سن ہو رہی تھی۔ رائل بلوشال میں وہ
اسے پہلے کی نسبت کچھ کمزور لگی تھی لیکن چار ماہ میں
دن کے بعد اس دشمنی جال کو دیکھنا ایک خوشگوار مرحلہ

”تمہاری عمر کی تو میری زوجہ مرحومہ تھیں!“ ابا نے ارشاد فرمایا، وہ نہایت غصے میں تھے۔
”ابا یہ آپ کو سرتاج کہنے سے تو رہیں.....“
ان کے مبالغے کی انتہا پر مجھے بھی پیش آ گیا تھا۔ ”تو کیا یہ آپ کو انکل کہہ لیں یا پھر آپ بھائی کہلوانا پسند کریں گے؟“

”کافی ہیں چھ بہنیں میری اور انکل تو میں تم سے بھی نہیں کہلوانا.....“ انہوں نے بھی اسی پیش بھرے انداز میں کہا تھا۔ ”اور سب سے بنیادی بات یہ ہے کہ اسے ضرورت ہی کیا ہے مجھے مخاطب کرنے کی؟ اپنے کام سے کام رکھے بس اور میرے کمرے کی صفائی کے علاوہ کسی بھی کام کے لیے میرے پاس پہنچنے بھی نہیں!“ انہوں نے حکم صادر کیا اور اس کے بعد عفت کے لیے حد مقرر ہو گئی۔ وہ یوں بھی اپنے کام سے کام رکھنے والی مظلوم سی عورت تھی، ڈری اور سہمی سی راتنی..... سب سے بڑی سہولت اس کے ساتھ یہ تھی کہ وہ کبھی چھٹی پر نہیں جاتی تھی۔

اسے جانا بھی کس کے پاس تھا؟ شادی کے بعد اولاد نہ ہوئی تو شوہر نے طلاق دے کر گھر سے نکال دیا۔ ماں باپ تھے نہیں اور ان کے گھر پر اب اس کی بھابیوں کا راج تھا جو اپنی اس نند کو کسی طرح بھی گھر میں برداشت نہ کر سکتی تھیں، اس لیے عفت کو جب تک اس گھر میں رہنا تھا جب تک کہ ہم خود اسے گھر سے نہ نکالتے۔ خاموشی سے وہ کام کرتی رہتی، جو کھانے کو ل جاتا اسی پر خوش ہو جاتی اور جو پہننے کو دے دیا جاتا اس پر بھی شکر گزار ہوتی چاہے وہ میری اترن ہی کیوں نہ ہوئی۔

”باجی آپ مجھے اپنے کپڑے نہ دیا کریں.....“ ایک بار اس نے مجھ سے کہا تو میں اس کا منہ دیکھنے لگی۔

”وہ آپ کے سر پر ہیں ناں..... وہ دن کو اسٹور روم میں آئے تو..... مجھے آپ سمجھے!“ اس کے آپ کا سر کہنے پر مجھے ہنسی بھی آئی کہ میری ساس

اعتراض تھا کہ ابا بغیر دستک دیے میرے کمرے میں آ جاتے تھے اور بچن وغیرہ میں ہوتی تو میرے سر پر آن کھڑے ہوتے اور خطرناک حد تک میرے قریب.....

☆☆☆

میں بیاہ کر اس گھر میں آئی تو اس گھر میں تین مرد تھے میرے سسر، سسر اور ایک اور چچا..... یعنی کہ ملازم لڑکا..... میں اس گھر میں اکلونی صنف نازک تھی۔ سرمندا تے ہی اولے بڑے کہ مصداق شادی کے چند ہفتے کے بعد ہی نوید لکھی کہ قدرت نے مجھے ماں کے عہدے پر فائز کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے آتے ہی دن رات لگا کر گھر کا نقشہ بدل دیا تھا اور میرے سلیقے سے گھر کی شکل نکل آئی تھی مگر اب دن رات کی الٹیوں اور مٹکی نے مجھے ناکوں پہنے چبوا دیے اور میں نے ڈاکر سے کہہ کر ایک صاف ستھری سی ادھیڑ عمر ملازمہ کا بندوبست کر لیا۔ ملازم لڑکے کو ڈاکر نے ہمیں اور ملازمت دلوا دی تھی۔

مجھے اس کے سامنے الٹی مٹکی کی کیفیت میں رہنا شرمندگی میں مبتلا کر دیتا تھا اور یوں بھی اس گھر کو عورت کی ضرورت تھی، اس کا احساس ڈاکر کو بھی ہو گیا تھا۔ ابا کے ساتھ مجھے کبھی بھار گھر میں تنہا رہنا پڑتا تو مجھے عجیب سا لگتا تھا۔ عفت کے آنے سے دوسرا ہٹ ہو گئی تھی، وہ ایک صاف ستھری عورت تھی مگر ابا کے دل میں اس کے خلاف نفرت کا زہر پہلے دن ہی بھر گیا تھا جب میں نے ابا کو بتایا کہ ابا یہ عفت ہے اور عفت نے انتہائی ادب سے کہا تھا۔

”ابا السلام علیکم“

”میں کہاں سے تمہارا ابا لگتا ہوں مائی.....“ انہوں نے غصے سے اسے گھورا تھا۔

”وہ..... وہ.....“ عفت بیچارہ آئیں بائیں شائیل کرنے لگی۔

”تو میں اور کیا کہوں آپ کو ابا؟“ اس کے منہ سے پھر غلطی سے نکل گیا۔

اسے باتیں کرنا سکھا دیں گے جب تک علی بڑا ہو جائے گا!“ ڈاکر نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔

”مگر آپ کے پاس اتنے پیسے آئے کہاں سے؟“ میں نے چتون چڑھا کر پوچھا۔ ”ابھی چار دن پہلے تولان کے ایک جوڑے کے لیے آپ سے پیسے مانگے تو آپ نے صاف انکار کر دیا تھا!“

”ابا نے دیئے تھے.....“ ڈاکر کے الفاظ تھے یا حیرت کا ہم جو عین میرے سر پر پڑتا تھا۔

”جھوٹ بول رہے ہیں آپ..... ابا تو کسی کو اپنا بخار بھی نہیں دیتے اور آپ کہہ رہے ہیں کہ انہوں نے یہ پیسے.....“

”سچ کہہ رہا ہوں!“

”مگر کس خوشی میں؟“

”وہ اس روز میرا اور تمہارا بھگڑا ہوا تھا

ناں..... تو میں پریشان ہو کر ان کے کمرے میں چلا

گیا تھا، انہوں نے اس روز مجھے یہ رقم دی تھی.....“

”تو یوں کہیں ناں کہ یہ رقم آپ کو میری بے

عزتی کرنے پر انعام میں ملی تھی.....“ میری نظروں

کے سامنے وہ منظر گھوم گیا تھا جب میرے اور ڈاکر

کے درمیان زور شور سے بھگڑا ہو رہا تھا تو مجھے اپنے

کمرے کی کھڑکی کے باہر ایک ہیولہ نظر آیا تھا اور وہ

ہیولہ ابا کے سوا کسی کا بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ میں کھڑکی

کی طرف بڑھی تھی تو وہ ہیولہ تیزی سے غائب ہو گیا

تھا اور جب ڈاکر کو علم ہوا تو انہوں نے کہا تھا کہ اگر ابا

نے ساری بات سن لی ہوگی تو مجھے ہاتھ باندھ کر ان

سے معافی مانگنا ہوگی۔ اسی لیے ڈاکر بھگڑا اور

چھوڑ کر ابا کے کمرے میں چلے گئے تھے اور جب ابا

نے اپنی زندگی بھر میں پہلی بار انہیں یہ رقم دیدی ہوگی

تو وہ سمجھے کہ ابا نے کچھ نہیں سنا، جبکہ میں..... صرف

میں جانتی تھی کہ ابا نے وہ رقم ڈاکر کو رشوت کے طور پر

دی تھی تاکہ ڈاکر کو ان پر اعتماد سے بھر جائیں میں آپ

کو یہ تو بتاؤں کہ ہمارے درمیان بھگڑا کس بات پر

ہوا تھا، صرف اس بات پر کہ مجھے اس بات پر

”پکڑا نہیں یار..... خرید کر لایا ہوں!“

”کتنے میں اور کیوں؟“ میں نے بیزارگی کا

اظہار کیا، ایک ملازمہ بھی جو سارے گھر کے کام

کرنے کے لیے تھی مگر اس کی بھی پوری مدد کرنا پڑتی

تھی، دوسرے ملازم کی سکت نہ تھی۔ اب یہ نئی ذمے

داری اٹھانا آسان کام نہیں لگ رہا تھا، میں نے اپنی

طرف سے ہینڈ زاپ کر دیئے۔

”پندرہ ہزار میں.....“

”دماغ کو کیا ہو گیا ہے آپ کے ڈاکر جو پندرہ

سو میں یہ چوڑہ نما طوطا اٹھالائے آپ؟“ میں غصے کو

نہ دبا سکی تھی۔

”پندرہ ہزار کہا ہے میں نے رانی!“ ڈاکر نے

تھج کی اور میں جو سمجھ رہی تھی کہ ڈاکر کے منہ سے

غلطی سے پندرہ ہزار نکلا ہے، حیرت سے اچھل ہی تو

پڑی۔

”یہ ننھا سا طوطا..... پ پ.....“ الفاظ

میرے منہ میں پھنس گئے۔

”پورے ایک ماہ کا ہے..... اور بہت اچھی

نسل ہے یہ.....“ ڈاکر نے وضاحت کی۔ ”اتنا ننھا

بھی نہیں..... ایک ہفتے کی عمر کا تو دس ہزار میں بھی مل

رہا تھا!“

”مگر کس لیے لائے ہیں آپ اسے؟“ میں

نے اپنا سوال دہرایا جسے ڈاکر نے نظر انداز کر دیا

تھا۔

”علی کے لیے..... وہ کتنا خوش ہوگا!“ ان کا

چہرہ چمک رہا تھا۔

”علی ابھی ایک سال اور آٹھ ماہ کا ہے

ڈاکر..... اور اسے خوش کرنے کے لیے دو سو روپے کا

گیند بھی کافی ہوتا ہے..... اس کی ماں کے لیے

سوئے کا تحفہ لا سکتے تھے آپ اتنی رقم سے!“ میں

بالکل رونے والی ہو گئی تھی۔

”میں نے اس طرح کا باتیں کرنا طوطا دیکھا

سارہ، تو مجھے بہت اچھا لگا اور میں نے سوچا کہ ہم بھی

مرحومہ زندہ ہوتیں تو شاید وہ بھی یہی کہتیں۔
”کیا تمہیں میرے حصے کی ڈانٹ پڑ گئی؟“
میں نے ہنس کر اس سے پوچھا۔
”نہیں بابی..... وہ!“ وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

”یہ..... وہ کیا؟“ میں نے اس سے پوچھا۔
اصل میں میری پشت دروازے کی طرف تھی، میں کپڑے استری کر رہی تھی اور جب ذرا سی آہٹ پر پٹی تو وہ میرے اس قدر قریب تھے کہ میں بچتے بچتے ہنسی نکال گئی..... اور وہ کہنے لگے۔ ”سوری! میں سمجھا سا رہے!“ عفت کی بات مکمل ہوئی تو میری کیفیت عجیب سی تھی۔ وہ شاید میرے چہرے سے کچھ اخذ کر گئی، پوچھنے لگی۔ ”آپ ٹھیک تو ہیں؟“
”ہاں ہاں!“ میں نے سر جھٹک کر کہا، اسے میں کیا بتانی، یہ بات تو جب میں نے اپنی سگی ماں کو بتائی تو انہوں نے میرے خوب لتے لیے کہ میں نے اتنے شریف آدمی کو شک کی نظر سے دیکھا..... صرف یہی نہیں بلکہ اماں نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ ڈرامے دیکھ دیکھ کر آج کل کی لڑکیوں کے دماغ خراب ہو گئے ہیں۔

”میں آپ کے لیے غنڈا پانی لاتی ہوں!“
کہہ کر وہ چلی گئی اور میں کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ جب تک وہ پانی لے کر آئی، میں فیصلہ کر چکی تھی کہ کسی نہ کسی کو مجھے اپنے دل کا حال بتانا ہوگا، اگرچہ عفت میری ملازمہ بھی مگر جب میری ماں نے ہی میری بات پریشان نہیں کیا تھا تو میں یہ بوجھ ایک ملازمہ کے ساتھ ہی بانٹنے کو تیار ہو گئی تھی۔

”عفت کیا تمہیں لگتا ہے کہ اگر اسٹور میں تمہاری جگہ میں ہوتی تو اب اس طرح چپکے سے وہاں داخل ہونا درست تھا؟“ اس نے ایک عجیب سی نظر سے مجھے دیکھا۔

”تو کیا میرا اندازہ درست تھا؟“ وہ بڑبڑائی تھی۔

”کیسا اندازہ؟“ میں نے سوال کیا۔
”مجھے لگا کہ آپ گھر میں ڈری ڈری سی رہتی ہیں.....“ وہ رکی تھی۔ ”پہلے میں بھی کہ آپ کے شوہر کا مزاج سخت ہے مگر.....“

”وہ تو بہت اچھے ہیں عفت.....“ میں نے پوری سچائی سے کہا تھا، چند ایک باتوں کے سوا ان میں کوئی خرابی نظر نہ آتی تھی اور وہ چند ایک باتیں بھی اتنی اہم نہ تھیں۔

”تو یہاں بھی وہی کہانی ہے.....“ اس نے گہری سانس لے کر کہا۔

”کون سی کہانی؟“ میں نے فوراً سوال کیا، دل میں خیال آیا کہ جہاں کہیں پہلے کام کرتی تھی وہاں بھی کچھ ایسا ہی ہوگا۔

”میری اپنی کہانی.....“ کہتے وقت اس کا انداز عجیب سا تھا، میں اس کا منہ تک رہی تھی۔
”آپ اپنے والدین سے بات کریں!“

”ہونہ.....“ میں نے اپنی امی سے بات، وہ تو انا مجھے ہی ڈانٹنے لگیں..... میں نے اسے بتایا۔ ”سوچ رہی ہوں کہ ذکر سے بات کروں!“

”ان سے تو کبھی بات نہ کیجیے گا.....“ اس نے فوراً کہا۔ ”یہی غلطی میں نے کی تھی اور طلاق کا داغ سجا کر آ گئی.....“ اس کا کہنا تھا کہ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ ”ان بیٹوں نے اپنے باپوں کے بت اپنے من میں بڑے اونچے سنگھاسن پر بٹھا کر رکھے ہوتے ہیں.....“

”ارے تم تو یوں بول رہی ہو جیسے کوئی پڑھا لکھا بول رہا ہو۔“ میں نے حیرت سے کہا۔

”زیادہ نہیں سارہ بی بی، مگر بی اے کیا ہے میں نے.....“ اس نے جیسے میرے سر پر بم پھوٹا تھا۔

”تو اتنی پڑھائی بھی تمہارے کام نہ آئی؟“ میں اس کی اپنے برابر کی قابلیت سے بہت متاثر ہو گئی تھی۔

”جب قسمت کا پھیر انسان کے سامنے آن

ذاکر گھر لوٹے تو ان کے ہاتھ میں علی کے لیے کچھ نہ کچھ ہوتا، ابابا کی دوائیں اور اب اس میں اضافہ ہو گیا تھا، وہ موتی..... (اس طوطے کا نام علی نے موتی رکھ دیا تھا)۔ موتی کے لیے بھی خوراک آرہی ہوئی تھی، بھی بادام اور بھی موگک پھلیاں، یہ سب موتی کی مرغوب غذا تھیں۔ ذکر کا کافی وقت موتی کے پاس گزارتے، علی کو اٹھا کر اس کے بچرے کے پاس گھڑے ہو کر اس سے باتیں کیے جاتے، علی بھی اپنی تو تلی زبان میں اس سے باتیں کرتا۔

”خواہ خواہ آپ باپ بیٹا اس کے ساتھ سر کھاتے رہتے ہیں.....“ میں چڑ کر کہتی۔ ”یہ تو صرف بابا..... ماما اور دوا کہتا ہے۔ امی کے پاس ایک طوطا تھا وہ تو بڑی باتیں کرتا تھا، جو کچھ اس کو سکھایا جاتا تھا، وہی بولتا تھا.....“ میں نے اتر کر کہا تھا۔

”یہ اس طرح کا طوطا نہیں ہے پاگل.....“ ذکر نے چڑ کر کہا تھا۔ ”یہ خاص طوطے ہیں.....“ ”اچھا ان میں کیا خاص ہے؟“ میں نے طنز سے کہا تھا۔ ”یہ کیا سونے کے انڈے دے گا؟“ ”تمہیں جوش جذبات میں یہ بھی بھول گیا رانی کہ انڈے طوطیاں دیتی ہیں، طوطے نہیں!“ ذکر نے ہنس کر کہا تھا۔

”آپ نے کہا کہ خاص طوطا ہے تو میں سمجھی کہ شاید.....“ میں نے اپنی خفت مٹانے کے لیے ان سے بھی بلند ہتھ بٹھایا۔

”میں نے انٹرنیٹ پر پڑھا ہے کہ طوطوں کی اس قسم کے پاس دماغ بھی ہوتا ہے اور یہ اس سے سوچتے ہیں، ان کے دماغ میں کم از کم دس ہزار الفاظ ذخیرہ کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے..... یہ دوسروں کی باتوں کو سنتے، انہیں اپنے حافظے میں محفوظ کرتے اور پھر اپنی مرضی سے بولتے ہیں..... تنہائی انہیں مار دیتی ہے.....“ میں حیرت سے ذکر کی باتیں سن رہی تھی۔

”یہ جو کچھ بولتا ہے، وہی ہے جو علی کی زبان سے سنتا ہے، تم نے غور نہیں کیا کہ جب یہ بولتا ہے تو یوں لگتا

کہ اہوتا ہے تو کچھ کام نہیں آتا!“ میں نے بے بسی سے سوال کیا۔

”کیا ذکر کی طرف سے کسی بڑے وقت کا؟“ میں نے جیسے چڑ کر پوچھا تھا۔

”نہیں..... اللہ کی طرف سے اس وقت کا جب وہ خود اس کو ظاہر کرے گا!“ اس نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا تھا۔ ”میرے سر کی بدکرداری اور میرے الزامات کی صداقت میرے شوہر پر ظاہر ہوئی تھی مگر اس وقت بہت نقصان ہو چکا تھا، اس نے آؤ تاؤ دیکھے بغیر مجھے طلاق دے دی تھی..... اب بیانات بھجواتا ہے!“

”اگر وہ اچھا آدمی تھا تو تم سوچ لو.....“ میں نے اسے مشورہ دیا۔ ”حلالہ کر کے!“

”نہیں سارہ بی بی.....“ اس نے فوراً مجھے ٹوکا۔ ”جو مرد ایک بار کسی عورت کو ٹھکرا دیتا ہے، وہ اس کے دل سے ایسا گرتا ہے کہ بھی دوبارہ عورت اسے وہ مقام نہیں دے پاتی..... اور اچھا آدمی وہ ہوتا ہے جو کسی کی اچھائی کو تسلیم کرے، اس نے مجھے برا سمجھا تو وہ خود کیونکر اچھا ہو سکتا ہے؟“ اس نے

بہت گہری بات کی اور اس کے بعد اس موضوع پر بات ختم ہو گئی مگر یہ ہوا کہ ہم کوشش کرتے کہ ابابا کے کمرے میں ہم دونوں میں سے کوئی بھی اکیلا نہ جائے اور نہ ہی انہیں کسی قسم کا موقع دیا جائے۔ ابابا کی عبادتیں طویل ہو گئیں، وہ اپنے کمرے میں ہی بند ہو کر رہ گئے اور جب بھی ذکر آ کر ان کے سامنے ان کی دن بھر کی مصروفیات کی تفصیل پوچھتے تو وہ کہتے کہ ان کا دن عبادت میں ہی گزارا۔ میں سوچتی تھی کہ عفت نے جی بچ کہا تھا، اگر میں ابابا کے بارے میں ذکر سے کچھ کہتی تو ذکر مجھ پر ناراض ہوتے کہ میں ان کے اتنے عبادت گزار باپ پر الزام لگا رہی ہوں۔

ہے کہ علی بول رہا ہے.....“

”سارے بچے اور سارے طوطے اسی طرح بولتے ہیں.....“ میں نے چڑکھاتھا۔

علی اب ڈھائی برس کا ہونے والا تھا اور دوسرے کی آمد آمد تھی، گرمی میں مزاج یونہی گرم رہتا کہ میں ذرا ذرا سی بات پر چڑ جاتی تھی۔ ذرا میری کیفیت کو سمجھتے تھے مگر ایک بات اور جو مجھے پریشان کرتی تھی وہ ابا کا طریقہ واردات تھا، انہیں جب بھی موقع ملتا۔ ”وار“ کر جاتے تھے۔ اب اگلے ہی دن کیا ہوا تھا کہ میں نہانے کے لیے غسل خانے میں چلی گئی اور نہایتے ہوئے یاد آیا کہ عفت تو علی کا کمر صاف کر رہی تھی اور میں نے چولہے پر گوشت چڑھا دیا تھا، وہیں سے دروازہ آدھا کھول کر اسے آواز دے کر کہا کہ میں غسل خانے میں ہوں وہ چولہے پر چڑھی ہانڈی دیکھ لے۔

نہا کر نکلی تو عفت میرے کمرے میں قالین پر بیٹھی سسک رہی تھی، میرا دل دھک سے رہ گیا.....

”کیا ہوا عفت؟ علی کہاں ہے؟“

”وہ تو سو رہا ہے بی بی.....“ اس نے سسک کر کہا۔

”تو تمہیں کیا ہوا ہے؟“

”وہ..... وہ..... آپ کے سر.....“ اس نے رک رک کر کہا۔

”کچن میں آگئے تھے جی اور.....“

میرے تلوے اور تھیلیاں جلنے لگیں، مجھے اٹھ کر وہ تمام نہ لیتی تو میں پورے قد سے جا گرتی۔ اسی نے پکڑ کر مجھے صوفے پر بٹھایا۔

”میں نے انہیں اللہ کا واسطہ دیا مگر پھر بھی، تب میں نے انہیں غچے دیا اور بھاگ کر یہاں آ کر اندر سے دروازہ بند کر لیا۔“

میں نے اس کا ہاتھ تمام لیا جو جھنڈا ٹھاڑ ہو رہا تھا۔ اب میں نے سوچ لیا تھا کہ ذکر سے بات کرنا ضروری ہو گیا تھا۔

”آپ صاحب سے بات نہ کریں بی بی!“

اس نے میرے آگے ہاتھ جوڑے۔ ”ہم کافی

احتیاط کر رہے تھے مگر جب آپ نے آواز دے کر بتایا کہ آپ نہا رہی ہیں تو انہوں نے سن لیا ہوگا!“

”چلو ذکر کو تو نہیں بتاؤں گی مگر ان سے جا کر بات تو کر کے دیکھوں۔“

میں نے چپل اڑی اور ان کے کمرے کے دروازے پر جا کر دستک دینے لگی، اندر سے کوئی جواب نہ آیا تو میں نے دروازے کو دھکیلا.....

دروازہ کھلا ہی تھا اور وہ اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھے قرآن پڑھ رہے تھے۔

”آؤ آؤ بیٹا..... کیسی ہو؟“ میں ان کے سامنے ہی بیٹھ کر ایک کونے پر تنک گئی، انہوں نے مجھ پر چھونک ماری۔

”سنا یہ طبیعت کیسی ہے؟“ میں ان سے اتنے فاصلے پر بیٹھی تھی کہ ان کا ہاتھ مجھ تک نہ پہنچ سکے۔

”ٹھیک ہوں.....“ میں نے بے رخی سے کہا۔

”آپ سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں.....“

”ایک کپ چائے ل سکتی ہے بیٹا، صبح سے اسی نشست پر بیٹھا قرآن پڑھ رہا ہوں، جسم میں تھکاؤ سی ہوگئی ہے.....“

”ابھی تھوڑی دیر پہلے تو آپ اٹھ کر کچن میں گئے تھے.....“ میں نے کہہ کر لب بٹھینچے۔

”تم نے خواب دیکھا ہوگا.....“ وہ بڑے ”میں تو صبح سے یہاں سے اٹھا تک نہیں!“ انہوں نے میری طرف دیکھ کر بغیر کہا۔

”میں نے تو نہیں..... عفت نے ضرور آپ کو کچن میں دیکھا ہے اور جاگتے میں دیکھا ہے اور جاگتے میں کوئی خواب نہیں دیکھتا ابا.....“ میں نے غصے سے کہا۔

”تمہیں اس بیچ ملازمہ کی بات پر میری بات کی نسبت زیادہ یقین ہے تو میں کیا کہہ سکتا ہوں؟“

انہوں نے کندھے اچکا کر کہا۔

”میں آپ پر تو نہیں..... مگر اس قرآن پر ضرور یقین رکھتی ہوں اور اگر آپ اسے ہاتھ میں لے کر کہہ رہے ہیں تو جی ہی کہہ رہے ہوں گے.....“

میں نے اٹھتے ہوئے کہا، اپنی بات کے رد عمل میں مجھے ان کے چہرے پر ایک سایہ سا لہراتا ہوا نظر آیا تھا۔

☆☆☆

ان دنوں گھر میں ایسے عجیب و غریب واقعات ہونے لگے کہ مجھے لگا شاید واقعی مجھے اور عفت کو وہم ہونا تھا کیا ابا..... اس روز میں اپنے کمرے میں تھی کہ علی کو سلامتی ہوئی عفت بھاگ کر آئی اور کہنے لگی۔

”آپ نے مجھے آواز دی ہے بی بی؟“

”نہیں تو.....“ میں شاید لینے لینے اٹھ گئی تھی۔

”اچھا مجھے لگا جیسے آپ نے مجھے پکارا ہو.....“

عفت کہاں ہو، جلدی آؤ..... میں تو جی پریشان ہو کر بھاگی کہ نہیں.....“ وہ رکی۔

”کہیں طبیعت نہ خراب ہوگئی ہو؟“ میں نے اس کر کہا۔

”نہیں..... میرا دھیان آپ کے سر کی طرف چلا گیا تھا.....“ اس وقت میں اس کی بات سے زیادہ اس کے آپ کا سر کہنے سے محفوظ ہوئی تھی۔

”ان کی طرف تمہارے دھیان کا جانا کچھ ٹھیک نہیں.....“ میں نے اس کر کہا تو وہ ملول سی ہو گئی۔

”جج میں سمجھی کہ کہیں وہ آپ کے کمرے میں.....“ وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی مگر اب میں نے سوچ رکھا تھا کہ ایسا کچھ بھی ہوا تو مجھے ذکر سے اپنے انجام کی پروا کیے بغیر بات کرنا ہوگی۔

”اچھا تم جاؤ کہیں علی نہ جاگ جائے.....“

میں نے بات بدلی۔

”آپ اندر سے اپنا دروازہ بند کر لیں.....“

کہیں بیٹھے بیٹھے سو ہی نہ جائیں!“ وہ کہہ کر چلی گئی اور میں نے اٹھ کر اپنا دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

سوئے میں ہی میری آواز اپنے فون کی تیز گھنٹی کی آواز سے کھلی، فون میرے سر ہانے پڑا تھا مگر اب

میرا بیبا موتی

گھنٹی نہیں بج رہی تھی۔ میں نے اٹھا کر دیکھا، کوئی کال بھی نہیں آئی تھی تو گویا میرے کان بجے تھے یا خواب میں گھنٹی بجی تھی۔ میں نے کروٹ بدلی سارہ..... بی بی!

آواز آئی، میں اچھل کر اپنے بیڈ سے اتری اور باہر کو لپکی۔

علی کے کمرے کا دروازہ بند تھا اور سارہ بی بی..... سارہ بی بی کی آوازیں آرہی تھیں۔

میں نے دروازہ دھڑ دھڑایا..... اندر سے عفت کی ہلکی سی آواز آئی تو میرا دل لرزنے لگا.....

”ابا..... ابا.....“ میں نے زور زور سے دروازہ کھٹکھٹاتے ہوئے کہا۔

”کیا ہوا ہے بیٹا؟“ مجھے اپنے عقب سے ابا کی آواز آئی۔

”کیوں چلا چلا کر مجھے بلارہی ہو، میں سمجھا کہیں آگ واگ لگ گئی ہے!“

”وہ میں سمجھی کہ آپ اندر ہیں!“ بدحواسی میں میرے منہ سے نکل گیا۔

”میرا خیال ہے کہ یہ کرا تو علی کا ہے اور اس کے ساتھ تمہاری وہ گھٹیا سی ملازمہ سوئی ہے.....“ ان کی اس بات پر میں عجیب سی صورت حال میں پھنس گئی تھی، اتنی دیر میں عفت نے بھی اٹھ کر دروازہ کھول دیا تھا، صاف لگ رہا تھا کہ وہ سو رہی تھی۔ ”لو دیکھ لو.....“ ابا نے کہا۔

”کیا ہوا بی بی؟“ عفت نے پوچھا۔

”تم مجھے آوازیں دے رہی تھیں.....“ میں بڑبڑائی۔

”میرا خیال ہے کہ تمہیں ڈاکٹر کو دکھا کر اپنے کانوں کا علاج کروانے کی ضرورت ہے.....“ ابا غصے سے کہہ کر جانے لگے، ان کا غصہ عفت کو دیکھ کر ہمیشہ بڑھ جاتا تھا۔

”جی اچھا.....“ میں نے آہستگی سے کہا تو وہ اپنے کمرے کی طرف چل دیے۔

”یقین کرو عفت..... بالکل اسی طرح جیسے دن کو تم نے سمجھا کہ میں تمہیں بلارہی ہوں اور تمہارے ذہن میں جو خیال آیا تھا، وہی خیال میرے ذہن میں آیا تھا جب تم نے مجھے

وہ باہر نہ جائے مگر چوتھی دفعہ بھی کھنٹی مسلسل بج رہی تھی کہ ابا پھر باہر نکل آئے..... میں نے انہیں بتایا کہ شاید کھنٹی میں کوئی مسئلہ تھا کیونکہ باہر کوئی نہ تھا، ابا خود باہر جا کر اس کی تصدیق کر کے آئے۔

”ذاکر آئے تو اسے کہنا کہ اسے چیک ضرور کروائے.....“ کہہ کر وہ اپنے کمرے میں چلے گئے۔ میں کچھ کہتی، اس سے پہلے ہی میرے فون کی کھنٹی بجنے لگی..... فون میرے پاس ہی پڑا تھا، کوئی کال نہیں آ رہی تھی۔ میں نے خوف سے اپنے فون کو دیکھا.....

”کس کی کال ہے بی بی، فون اٹھائیں ناں.....“ عفت نے میرے چہرے کو دیکھ کر کہا۔

”کوئی کال نہیں ہے.....“ میں نے سرسراہٹ سے بولی آواز میں کہا تھا۔

”شاید اس میں بھی شارٹ سرکٹ ہو گیا ہو؟“ عفت کی بات پر میری ہنسی نکل گئی، وہ بی بی کے پاس تو تھی مگر جلد بیٹیکنالوجی سے تاملد.....

یہ کوئی ایسی بات نہ تھی جسے ذاکر سے چھپایا جا سکتا اس لیے میں نے ابا کی موجودگی میں، ابا اور عفت کی گواہیوں کے ساتھ..... ساری باتیں بڑھا چڑھا کر ذاکر کو بتائیں..... ”پہلے تو ابا کہتے تھے کہ میرے کان بج رہے ہیں مگر یہ ساری آوازیں عفت اور ابا نے بھی سنی ہیں.....“ میں اپنی طرف سے بھر پور تحسین بھری کہانی ذاکر کو سنارہی تھی۔

”آپ سب لوگوں کا خیال بالکل غلط ہے..... نہ کسی کے کان خراب ہیں نہ کوئی کھنٹی.....“

”تو پھر کیا خراب ہے؟“ میں نے فوراً پوچھا۔

”یہ سب آوازیں موتی نکالتا ہے.....“ ذاکر کا کہنا تھا کہ ہم سب کو ذاکر کی ذہنی حالت پر شبہ ہونے لگا، ذاکر نے ٹیلی وژن کی آواز بند کر دی، ہم سب ہمہ تن گوش ہو گئے۔

”مما..... آکس کریم کھانی ہے.....“ علی بول رہا تھا مگر علی تو وہاں تھا نہیں۔

”سارہ.....“ ابا کی آواز تھی..... ”سارہ.....“

میری طرح تمہیں بھی لگتا ہے کہ میں تمہیں پکار رہی ہوں.....“ میں نے مسکرا کر کہا تو وہ میری طرف دیکھنے لگی۔

”آپ آیت الکرسی پڑھا کریں.....“ اس نے کہا تو میں اس کا منہ دیکھنے لگی، گویا وہ بھی وہی سوچ رہی تھی جو میں سوچ چکی تھی..... کوئی جادو یا ٹونا!

☆☆☆

”ارے بھی..... باہر کھنٹی بج رہی ہے، کیا سو رہے ہو تم سب لوگ؟“ ابا کی دہاڑ پر عفت چپن میں سے بھاگی، میں دھلے ہوئے کپڑے کر رہی تھی۔ طبیعت پر بوجھ بڑھ رہا تھا، جوں جوں وقت قریب آ رہا تھا مجھے لگ رہا تھا کسی نے مجھے کچھ کر دیا ہے.....

”باہر تو کوئی نہیں ہے جی!“ عفت نے واپس آ کر کہا تھا۔

”کوئی نہیں ہے تو کھنٹی کیا جنات بجا رہے تھے؟“ ابا نے کہا تو ہم دونوں ایک دوسرے کو چونک کر دیکھنے لگیں۔ ”محلے کے ڈاؤر لڑکے ہوں گے اور سچی کر رہے ہوں گے!“ حتیٰ اندازہ لگا کر وہ اپنے کمرے کی طرف چل دیے۔

”ابا کو کون سمجھائے کہ ہم کسی اس طرح کے محلے میں نہیں رہتے، ڈیفنس میں رہتے ہیں جہاں لوگوں کے پاس وقت نہیں ہوتا کہ کسی کے گھر کی کھنٹی کی کام سے بھی بجا دیں کجا کہ شرارت کرنے کے لیے اور وہ بھی اس وقت جب سب بچوں کے سکول کاؤن کا وقت ہے.....“

”ممکن ہے کوئی مانگنے والا ہو.....“ عفت نے اندازہ لگایا۔

”ہاں..... ہو سکتا ہے کیونکہ مانگنے والوں کے محلے اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ ڈیفنس میں ہیں یا بھائی لوہاری.....“ ہم دونوں ہنس دیں، کھنٹی ایک بار پھر بجی تھی..... عفت باہر کو لپکی اور پھر کوئی تو اسی خبر کے ساتھ کہ باہر کوئی نہیں تھا تین انداز میں طرح ہوا تو میں نے اس سے کہہ دیا کہ اب

ساتھ کر رہے ہوں اور وہ جواب میں خاموش رہتا رہا۔

”میں نے تو کبھی اس کے کمالات نہیں دیکھے نہ ہی کبھی میں نے اسے بات کرتے ہوئے سنا ہے..... اگر یہ اس کی آواز ہے تو اسے کہیں کہ دو بارہ یہ فقرہ کہے.....“ میں نے ذاکر کو چیلنج کیا۔

”ارے وہ اپنے مزاج کا ہے، یوں کہنے سے بات نہیں کرتا اب اس کی مرضی ہوتی ہے تو وہ خود ہی بولتا ہے، عام روٹین میں وہ ہمیں سن کر ہماری آوازیں کو اپنے حافظے میں محفوظ کر لیتا ہے اور جب اس کا جی چاہتا ہے وہ بولنے لگتا ہے.....“

”اپنے مزاج کا.....“ ہونہ..... مولا جٹ ہو گیا، موتی نہ ہوا! میں کچھ اور بھی کہتی مگر میرے فون کی کھنٹی بجنے لگی اور میں اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی..... فون اٹھایا تو کھنٹی خاموش ہو چکی تھی، کوئی کال نہیں آئی تھی، میں فون ہاتھ میں پکڑ کر اسے درمیکر دیکھتی رہی پھر اسے ہاتھ میں لیے لائونج میں آ گئی، سوچ رہی تھی کہ ذاکر کو بتاؤں مگر میرے وہاں جانے تک ابا بھی وہاں آ چکے تھے اور ان کے سامنے بات کرتی تو وہ مجھ سے کہتے کہ میں ڈاکٹر کو دکھا کر اپنا علاج کرواؤں۔

”عفت تمہیں میرے فون کی کھنٹی کی آواز آتی تھی؟“ میں چپن میں جا کر عفت سے پوچھ رہی تھی۔

”ہاں.....“ اس نے مختصر کہا۔

”مگر میں وہاں گئی تو کوئی کال نہیں آئی اور ابا پہلی بار نہیں ہوا..... کئی بار ابا سوچا ہے اور ظاہر ہے کہ اگر تمہیں بھی آواز آتی تھی تو اس کا مطلب ہے کہ میرے کان نہیں بج رہے تھے.....“ میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا تھا۔

”ممکن ہے کہ آپ کے کان میں کوئی مسئلہ ہو؟“ عفت نے کہا۔

”میرا تو خیال ہے کہ ہم دونوں کے کانوں میں کوئی مسئلہ ہے..... ابھی تم تسلیم کر چکی ہو کہ تم نے بھی فون کی کھنٹی کی آواز سنی تھی اور اس کے علاوہ

بار بار پکارا تھا.....“ میں نے عفت کو صفائی پیش کی۔

”مگر میں نے تو آپ کو نہیں پکارا.....“ عفت نے کہا تھا۔

”اس حالت میں لگتا ہے کہ آپ کو یہ مسئلہ ہو رہا ہے.....“

”مگر تمہاری تو یہ حالت نہیں ہے پھر تمہیں کیوں لگا کہ میں نے تمہیں پکارا ہے؟“ میں نے ہوا میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”کچھ نہ کچھ تو ہو رہا ہے.....“ میں نے بڑبڑا کر اپنے بدترین خدشے کا اظہار کیا۔ ”شاید کوئی جادو ٹونا وغیرہ!“

☆☆☆

”پارایک بیٹھی سی پی تو دے دے بابا کو.....“ میں اور علی لائونج میں بیٹھے تھے، عفت نے ہمیں چائے دی تھی اور اب وہ ڈسٹنگ کر رہی تھی، ابا اپنے کمرے میں تھے اور علی بھی اپنے کمرے میں سو رہا تھا، میں نے مڑ کر دیکھا کہ شاید علی جاگ کر آ گیا تھا مگر کوئی نہ تھا۔

”علی تو اپنے کمرے میں سو رہا ہے.....“ میں نے ذاکر سے کہا۔

”تو؟“ ذاکر نے اخبار سے نظر ہٹا کر پوچھا۔

”ابھی آپ نے کہا کہ.....“ میں نے وضاحت کی۔

”میں نے نہیں رانی..... وہ میرے موتی بیٹے نے کہا ہے.....“ وہ ہنس کر بولے۔

”اچھا لطیفہ ہے.....“ میں نے غصے سے کہا۔

”میں کیا آپ کی آوازیں پہچانتی؟“

”تم میری آواز تو ضرور پہچانتی ہو مگر موتی کے کمالات کو نہیں جانتی ہو.....“ سچ تو یہ تھا کہ علی اور ذاکر کا کافی وقت اس کے ساتھ گزرتا تھا، عفت اس کا پیچہ صاف کر دیتی تھی مگر اس سے زیادہ ہم نے کبھی اسے لفٹ نہس کرانی تھی جبکہ وہ باپ بیٹا تو اس کے ساتھ یوں باتیں کرتے جیسے گھر آئے مہمان کے

جی کہانیوں آپ سیدوں تک سیدوں کا بے مثال مجموعہ

سرگزشت

ماہنامہ

دسمبر 2012ء

کی جھلکیاں

اختر اردو

اردو کے ایک بڑے ادیب کی سوانح حیات
خوش نوا: پوری دنیا میں آوازی بدلت تھلکہ
بچا دینے والے گلوکار کا تذکرہ

زور آور بادشاہ

ان دو پہلوں بھائیوں کا زندگی نامہ جو
دشمنی کا شکار ہو گئے

موگن

ایک معدوم ہوتی نسل جو پانی پر زندگی
گزارتی ہے، خشکی پر رہنا اسے پسند نہیں

خواب ہو گئے

عزم و استقلال اور قسمت کے گرد گھومتی
ایک نوجوان کی دلچسپ آپ بیتی

لکھنؤ

اور بھی بہت سے سچے واقعات،
معلوماتی تحریروں

ہر شمارہ خاص شمارہ جسے آپ
محفوظ رکھنا ضروری سمجھیں گے

آج ہی نزدیک بک اسٹال پر اپنا شمارہ مختص کر لیں

خاص شمارہ..... ہر شمارہ خاص شمارہ..... ہر شمارہ خاص شمارہ

ماہنامہ پاکیزہ - دسمبر 2012ء - 219

ہستان، اور وہ بھی ملازمہ کے ساتھ..... امی نے مجھے
نہر کا..... مجھے تو شرم آ رہی ہے تمہاری اس سوچ پر!
”آپ کو کس طرح سمجھاؤں امی..... کس
طرح یقین دلاؤں؟“ میری آنکھوں سے آنسو بہنے
لگے تھے۔

ذاکر لوٹے تو ان کے پاس کوئی اچھی خبر نہ تھی،
عفت گھر پر نہ تھی..... ”جانے کیا کچھ لے کر روفو چکر
ہو گئی ہے، ہم خود ہی گھر جا کر چیک کر لینا، ابا کو تو کچھ
علم ہے نہ ہی ان کو بتا کر گئی ہے.....“ میں نے نظر اٹھا
کرا می کو دیکھا، جن کی نظر صاف کہہ رہی تھی کہ دیکھ لیا
تھنے.....

☆☆☆

مجھے کافی کمزوری تھی اور امی چاہتی تھیں کہ مجھے
اپنے ساتھ اپنے گھر لے جاتیں مگر ابا کی مجبوری ایسی
تھی کہ امی کو میرے ساتھ ہمارے گھر آنا پڑا کیونکہ ابا
تو نہیں جاتے بھی نہ تھے۔ عفت کے نہ ہونے سے کافی
مسئلہ ہو گیا تھا کرا می اپنی ملازمہ ساتھ لے آئی تھیں
اس لیے گزارہ ہو رہا تھا۔

”اپنی ملازمہ کا خیال رکھیے گا امی اور اسے ہر
وقت اپنی نظر کے سامنے رکھیں.....“ میں نے امی
سے کہا تو وہ غصے سے مجھے گھورنے لگیں۔

”تمہارے ذہن سے لگتا ہے کہ ابھی تک وہ
کیڑا نکلا نہیں.....“ انہوں نے ڈانٹا۔ ”وہ تمہیں
دھوکا دے کر چلی گئی پھر بھی.....“

”وہ مجھے دھوکا دے کر نہیں گئی امی، جانے اس
بے چاری کے ساتھ کیا ہوا ہوگا، میں صحت یاب ہو کر
اسے ڈھونڈوں گی اور اسی سے پوچھوں گی..... مگر جو
میں کہہ رہی ہوں اس کا خیال کیجیے گا!“ امی مجھے گھور
کر رہ گئیں۔

امی کی ملازمہ ننھی کافی کم عمر لڑکی تھی، فارغ
الوقت میں مجھے دیانی اور میرے سر میں تیل کی مالش
بھی کر دیتی، اس کے علاوہ صرف علی کی دیکھ بھال
کرتی تھی۔ اس روز بھی مجھے غنودگی سی ہو رہی تھی،

اسپتال جا رہے ہیں، عفت جاگے تو اسے بتا دیں اور
وہ بعد میں آ کر عفت کو بھی لے جائیں گے۔
بیچر آپریشن کے بعد ہوش میں آئی تو بہت
دیر کے بعد خیال آیا کہ عفت اسپتال میں نہ تھی، ذاکر
نے مجھے بتایا کہ میں بے ہوش ہوئی تھی اور وہ مجھے خود
ہی اٹھا کر لائے تھے اور عفت گھر پر ہی تھی۔
”آپ گھر جائیں ذاکر.....“ میں نے گھبرا کر
کہا۔

”کیوں کیا ہو گیا ہے؟“ ذاکر نے حیرت سے
پوچھا۔

”عفت گھر پر اکیلی ہے ناں..... پریشان ہو
گی.....“ میں نے بات بتائی، یوں بھی امی یہاں ہیں
تو اسے گھر سے لے کر علی کے پاس چھوڑ دیں!“
”عفت اکیلی نہیں ہے سارہ..... ابا بھی تو ہیں
ناں گھر پر.....“

”یہی تو مسئلہ ہے کہ وہ ابا کے ساتھ گھر پر اکیلی
ہے.....“ میری بڑبڑاہٹ سے ذاکر کوئی مفہوم نہ اخذ
کر سکے۔ البتہ یہ ہوا کہ وہ اٹھ کر چلے گئے۔

”یہ کیا بکواس کی تھی تم نے.....“ امی نے ذاکر
کے جاتے ہی میرے لتے لیے۔ ”جو ذاکر سن لیتا تو؟“
”آپ تو جانے کیسے ہر بات سن لیتی
ہیں.....“

”مگر تم نے یہ بات کی کیسے؟“ امی کون سا
میری جان چھوڑنے والی تھیں۔

”آپ کو بتایا تو تھا امی.....“ میں نے چڑ کر
کہا۔

”جانے تمہیں ہو کیا گیا ہے..... پہلے اپنے
اس شریف سے سر پر شک تھا اب اپنی اس شکست
ملازمہ کو شک کی نظر سے دیکھ رہی ہو.....“

”مجھے عفت پر شک نہیں ہے امی.....“ میں نے
آنکھیں میچ کر کہا۔ ”مجھے ابی ابا پر شک ہے!“
”شرم کرو سارہ..... ذاکر نے تو کیا سوچے گا،
اتنے عبادت گزار شخص پر ایسا گھناؤنا الزام بلکہ

سارہ.....“ ذاکر مجھے پکار رہے تھے..... ”سارہ بی بی
..... جلدی آئیں.....“ عفت مجھے پکار رہی تھی۔
مگر نہیں، یہ سب ناکام موتی کر رہا تھا۔ ہم سب
حیرت سے آنکھیں پھاڑے اسے تک رہے تھے۔
”آپ لوگ اسے میرے جاتے ہی برا آمدے
میں نکال دیتے ہیں، اسی لیے تو میں اسے لاؤنج میں
رکھتا ہوں کہ ہماری باتیں سنے اور انہیں سکھے، جو تھوڑا
بہت اس نے سیکھا ہے وہ بھی جب میں اپنی چھٹی
والے دن اسے لاؤنج میں رکھتا ہوں یا جو وقت میں
اور علی اسے دیتے ہیں تو اس نے اتنا کچھ سیکھا ہے۔
ذاکر وضاحت کر رہے تھے اور موتی نے اب کسی
انگریزی فلم کے ڈائلاگ دولوگوں کی آواز میں بولنا
شروع کر دیے تھے۔ ہم سب کھلکھلا کر ہنس رہے
تھے..... مجھے ٹوٹ کر موتی پر بیار آیا۔

اس کے بعد میری موتی سے بہت دوستی ہو گئی
اور میں بھی اسے ذاکر کی طرح موتی بیٹا کہنے لگی اور
اسے مستقل لاؤنج میں جگہ مل گئی، اب میں اور عفت
بھی اس سے اسی طرح باتیں کرتے جیسے علی اور ذاکر
کرتے تھے اور وہ سر جھکا کر خاموشی سے سنتا رہتا اور
کبھی کبھار جب وہ موڈ میں ہوتا تو خود ہی ہماری
باتوں کو دہراتا رہتا۔ اب تو بھی فون کی یا گھر کی کھٹی
نہجی تو ہم اسے سمجھ کر نظر انداز کر دیتے کہ موتی ہوگا
اور بعد ازاں علم ہوتا کہ واقعی کسی کی کال تھی یا
دروازے پر کوئی کھٹی، بجا رہا تھا۔

☆☆☆

میری طبیعت خراب رہنے لگی تو امی آ کر علی کو
اپنے پاس لے گئیں، عفت بھی علی کے ساتھ جانا چاہ
رہی تھی مگر میں نے اسے روک لیا کہ مجھے اس کی
اسپتال میں ضرورت ہوگی..... مگر خدا کا کرنا ایسا ہوا
کہ رات کے ایسے پہر میں اور اس قدر تیزی سے
میری حالت بگڑی کہ میں بے ہوش ہو گئی اور ذاکر
نے مجھے خود ہی اٹھا کر گاڑی میں ڈالا اور عفت کو
جگانا مناسب نہ سمجھا۔ ابا کو جگا کر بتا دیا کہ اس طرح

218 ماہنامہ پاکیزہ - دسمبر 2012ء

کہہ رہا ہے میرا پیارا سا دوست؟“ علی چپکوں پہکوں رونے لگا۔

”ارے نہیں بابا..... ناو پنجرہ بیچنے کی بات کر رہی تھیں.....“ امی نے فوراً بات بتائی اور علی کے آنسو پونچھے، علی ان کے گلے لگ گیا۔

”چلو اچھا ہے.....“ ذاکر اس رات کہہ رہے تھے۔ ”کسی اور کے نہ سہی، موتی کے ڈر سے ہی ابا اب خود کو بدل لیں گے..... سوری سارو..... میں نے تمہیں غلط سمجھا اور تم سے اس بات پر ناراضی کا اظہار کیا، اصل میں اپنے ابا پر اعتماد ہی اتنا ہے مجھے..... میرا مطلب ہے کہ تھا!“ میں ہنس دی۔

”آپ اب بھی ابا پر اعتماد ہی رکھیں..... انسان کتنا ہی عبادت گزار اور پرہیزگار کیوں نہ ہو، شیطان ہر وقت اسے بہکانے میں مصروف رہتا ہے اور وہ بھی نہ کبھی کامیاب ہو ہی جاتا ہے.....“ میں ذاکر سے یہ بھی نہ کہہ سکتی تھی کہ جو انسان اپنی گود میں قرآن رکھ کر جھوٹ بول سکتا ہے وہ شیطان کا شکار نہیں بلکہ اس کا چیلہ ہوتا ہے مگر میں ذاکر کا سراں سے زیادہ جھکا ہوا نہیں دیکھ سکتی..... ہم دونوں نے عفت کو ڈھونڈ کر اس سے ابا کی طرف سے معافی مانگی اور ذاکر نے اسے اپنے کسی جاننے والے کے توسط سے اسے ایک بیوہ کے پاس ملازمت دلوا دی جو خود بھی ملازمت کرتی تھی اور اور اس کے پاس اس کی ماں اور ساس بھی تھیں، اس گھر میں صرف تین عورتیں تھیں، عفت چوٹی ہو گئی، اب اس کی عزت کو کم از کم خطرہ نہیں ہوگا۔

موتی کی خوراک کا میں اسی طرح خیال رکھتی ہوں جس طرح علی اور ثنا کی خوراک کا اور ابا..... وہ اب کھانے کے اوقات کے علاوہ اپنے کمرے سے کم کم ہی باہر نکلتے مگر جب وہ موتی کے پنجرے کے پاس سے گزرتے تو اسے یوں گھوری مارتے کہ جیسے اسے کچا ہی چبا جائیں گے۔

”یہ کس طرح یوں ڈرا سے کر لیتا ہے؟“ امی نے حیرت سے سوال کیا۔

”ڈرانا نہیں امی، یہ ہم سب کی باتیں سنتا اور میں اپنے حافظے میں محفوظ کرتا ہے اور جب یہ اپنی زبان میں ہوتا ہے تو ہر کسی کی کہی ہوئی بات، اسی لب و لہجہ میں دہرا دیتا ہے.....“ میں نے امی کو بتایا۔

”حیران کن.....“ جانے امی نے موتی کی مصلحت کو حیران کن کہا تھا یا پھر اس واقعے کو جو ابھی موتی نے بیان کیا تھا اور جو صاف گواہی تھا عفت کے بے گناہ اور ابا کے تصور وار ہونے کی۔

”کیا کرنے لگے ہیں ذاکر آپ؟“ میں نے باکرہ ذاکر سے کہا جو پنجرہ کھول رہے تھے۔ ”پنجرہ نہ کھولیں، یہ اڑ جائے گا.....“

”سارہ باجی..... جلدی آئیں!“ موتی نے نفٹ کی آواز میں مجھے پکارا۔ یہ اس بات کا ثبوت بن گیا کہ اس سے قبل بھی عفت نے مجھے پکارا ہو گا حالانکہ ایسا عفت اس وقت کہتی تھی جب علی اس کی بات نہیں سنتا تھا۔

”میں اسے مار ڈالوں گا!“ ذاکر نے کہا۔

”ارے..... پندرہ ہزار میں اسے لے کر آئے تھے اور ابھی اس روز آپ بتا رہے تھے کہ اس وقت اس کی قیمت دو لاکھ کے قریب ہے، کیوں اپنا نقصان کر رہے ہیں، اس سے بہتر ہے کہ اسے بیچ دیں!“ میں نے چلا کر کہا۔

”بیچ دوں..... تاکہ اسے جو بھی خریدے، وہاں جا کر یہ ہمارے گھر کی کہانی سب کو سنائے؟“ ذاکر نے غصے سے کہا۔

”دکھی کو کیا علم کہ یہ کس کے گھر کی کہانی ہے؟“ امی نے رساں سے کہا۔ ”کچھ دن کا وقفہ ڈال کر اسے بیچ دو..... یہ بھول بھال جائے گا اس کہانی کو!“

”نہیں پتا..... میں موتی کو نہیں بیچوں گا.....“

”بیٹا تو وہ مجھے کبھی نہیں کہتے، تمہیں کیسے دیا.....“ وہ کافی شاطر لگ رہی تھی۔ ”اور کبھی پکڑنے پر انہوں نے تمہیں سو روپے کا یہ نوٹ دیا.....“ میں نے اس کے گریبان سے نوٹ نکالا۔

”ای جیسے سکتے میں چلی گئیں..... اور کچھ نہ سوچا تو اس کے ایک تھپڑ تھپی کے دیا۔“

”حرام خور.....“ امی میرے سر کا غصہ اس نکال رہی تھیں..... ”تیرا تو میں بندوشت کرتا ہوں..... ایسے شریف آدمی ہیں وہ تو!“

”وہ جی میں نے کیا کیا ہے..... انہوں نے اگر خود ہی خوش ہو کر مجھے انعام دیا ہے تو.....“

”تیری کس بات سے خوش ہو کر انعام دیا ہے انہوں نے تھی؟“ میں نے غصے سے پوچھا۔

”یہ تو مجھے نہیں پتا جی.....“ امی جانے دل ہی دل میں کیا سوچ رہی تھیں..... ان کا بھرم ٹوٹا بھی تو اپنے گھر کی ملازمہ کے سامنے۔

☆☆☆

”بکواس بند کر.....“ ہم سب کے کان کھڑے ہو گئے۔ ابا میاں کی آواز تھی مگر ابا تو ہمارے ساتھ بیٹھے تھے، امی نے خمی کو واہیں بھجوا دیا تھا، میں، علی، امی اور ابا لاؤنج میں ہی بیٹھے تھے جب اس آواز نے ہماری توجہ اپنی طرف مبذول کی..... امی کے لیے موتی کو یوں سنتا حیران کن تجربہ تھا۔

”اللہ کے واسطے ابا.....“ مجھے اپنی بیٹی سمجھیں..... ”عفت کی آواز کی ہو، ہونقل۔“

”خترے بند کر اور سیدھی طرح میرے کمرے میں چل.....“ ابا میاں کا ڈائلاگ موتی نے دہرایا اور اس کے بعد اس نے کئی منٹ تک عفت کی چپکوں کی آواز نکالی، ہم سب سُن بیٹھے تھے، سب سے پہلے منظر سے ابا اٹھ کر اپنے کمرے میں جا کر غائب ہو گئے..... تو یہ تھا وہ وقت، جب میری بات کی گواہی ہوتا تھی، عفت کہتی تھی کہ وقت خود ہر کسی کے چ کو کچ اور جھوٹ کو جھوٹ ثابت کرتا ہے۔ اس کے بعد ذاکر

اس کے ہاتھوں میں ایسا ہی مزہ تھا، امی کوئی بیٹائی کر رہی تھیں کہ انہوں نے اسے پانی لینے کو بھیجا اور جب وہ پانی لے کر لوٹی تو حواس باختہ سی تھی اور اس کی سانس پھولی ہوئی تھی..... ”کیا ہوا ہے، اتنا بھاگ کر آنے کی کیا ضرورت تھی؟“

”کچھ نہیں جی.....“ اس نے خود پر قابو پایا۔ ”میں نے سوچا آپ کو پیاس لگی ہوگی.....“

”اچھا اچھا، چل بیٹھے، دبا باجی کی ٹانگیں.....“ زیادہ مکے نہ لگا! ”وہ امی کی ڈانٹ سن کر بیٹھ کر میری پنڈلیوں پر تیل کی مالش کرنے لگی.....“

”ابھی مجھے اس کے گریبان سے جھانکتا لال نوٹ نظر آیا، جو صاف لگ رہا تھا کہ ابھی اڑسا گیا تھا، وہ کافی دیر سے مجھے مالش کر رہی تھی اور اس سے پہلے مجھے یہ نوٹ نظر نہ آتا تھا..... مگر میں اس سے کیا پوچھوں۔“

”پانی پکچ سے لائی ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”جی باجی.....“ وہ اب کافی سنبھل چکی تھی۔

”ابا اس وقت اپنے لیے بادام کی سردائی بناتے ہیں، جانے انہوں نے آج بنائی ہوگی کہ نہیں.....“

”ہاں جی.....“ وہ فوراً بولی۔ ”وہ کچھ بنا تو رہے تھے جی بلینڈر والے جگ میں.....“

”اچھا ابا پکچ میں ہی تھے.....“ میں نے امی کو دیکھ کر کہا۔ ”تم ان سے پوچھ ہی لیتیں کہ کوئی مدد کی ضرورت ہو تو.....“ امی نے مجھ کو دیکھ کر گہری سانس لی۔

”وہ جی کی تھی میں نے ان کی مدد.....“ اس نے تھوک نکل کر کہا۔

”کیا مدد کی تھی؟“ میں نے فوراً سوال داغا۔

”جی، جو انہوں نے کہا تھا.....“

”کیا کہا تھا انہوں نے؟“ میں نے غصے سے پوچھا۔

”وہ جی..... کچھ خاص نہیں جی.....“ وہ شپٹا گئی۔ ”بس کہنے لگے وہاں سے گلاس پکڑا دو بیٹا.....“



مکمل ناول

مجھے رنگ دکھائے

شوکت یونس

وہ دن عالیہ کی زندگی کا اہم ترین دن تھا۔ اس دن اس کی سالگرہ تھی..... وہ پورے اٹھارہ برس کی ہو گئی تھی اور اسی دن اس کا اے کیولز کا رزلٹ نکلا تھا۔ اس نے سات AS لیے تھے اور اپنی کلاس میں ٹاپ کیا تھا..... وہ بہت خوش تھی۔ ماما اور بابا بھی بے حد خوش تھے۔ وہ زندگی میں بھی اتنی خوش نہیں ہوئی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا..... وہ کیا کرے! اس شام تقریباً سارے رشتے داران کے گھر پر

کزن کی شادیاں اس کے سامنے ہوئی تھیں۔ کسی نے ان سے ان کی مرضی نہیں پوچھی تھی۔ ماں، باپ کی خواہش کے سامنے انہوں نے سر جھکا دیا تھا۔ عالیہ نا فرمان نہیں تھی۔ وہ خاندان کی اس روایت کو توڑنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ بابا کا سر جھکانا نہیں چاہتی تھی۔ وہ انہیں خوش دیکھنا چاہتی تھی مگر وہ خود خوش نہیں ہوئی۔ شادی کے بارے میں اس نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا اور پھر اتنی جلدی۔؟ وہ تو بہت سا پڑھنا چاہتی تھی۔ وہ سارے بھائی بہن بہت لائق فائق تھے۔ پڑھائی۔ پڑھائی۔ اور پڑھائی۔ اس کے علاوہ ان کی اور کوئی مصروفیت نہیں تھی۔

ہمایوں انجینئرنگ انسٹی ٹیوٹ میں تھا، وہ چاروں بہنیں ایک ہی اسکول میں پڑھتی تھیں۔ عالیہ اور مہرین میں بہت کم فرق تھا۔ وہ اس سے ایک سال پیچھے تھی۔ وہ دونوں ایک کمرے میں رہتی تھیں۔ ایمن اور فاطمہ چھوٹی کلاسوں میں تھیں اور ان کا بیڈروم الگ تھا۔

آج سے پہلے وہ سب لوگ کتنے خوش تھے۔ اس نے کبھی بھول کر بھی نہیں سوچا تھا کہ اچانک زندگی میں یہ موڑ اتنی جلدی آجائے گا، وہ رو رو کر تھک گئی تھی۔ وہ رات اس پر بہت بھاری تھی۔

وہ جانتی تھی بابا کے اس فیصلے پر ماما خوش نہیں تھیں۔ ہائی اور بہنیں بھی خوش نہیں تھے۔ مگر اب کیا، کیا جاسکتا تھا؟ اس تاریک رات کا سویرا بھی بہت غمناک تھا۔ وہ جیگر اپنی کامیابی کا جشن بھی نہیں منا سکتی تھی کہ اسے وہ روح فرخنا سنائی گئی تھی۔ ساری رات اس نے جاگ کر گزاری تھی۔ صبح فجر کی نماز پڑھ کر اس کی آنکھ کھلی تھی۔ مہرین نے دیکھا وہ گہری نیند سو رہی تھی۔ وہ غم سے نڈھال تھی۔ اس کے رخسار آنسوؤں سے بھیکے ہوئے تھے۔ اور سوتے ہوئے بھی وہ سسکیاں لے رہی تھی۔ مہرین کو اس پر بے اختیار پیار آ گیا۔ اس نے جھک کر اس

پیار کر رہی تھیں۔ اسے سمجھا رہی تھیں مگر وہ کسی سے بھی نہیں سنہل رہی تھی۔ یہ صدمہ اس کے لیے ناقابل برداشت تھا مگر بابا کی مرضی کے سامنے سب خاموش تھے۔ کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ اے لیول لڑکی کے لیے بہت مناسب تعلیم تھی۔ فرح ممائی کو بابا کے اس فیصلے پر بہت اعتراض تھا۔ ان کا خیال تھا کہ ادھوری تعلیم بجائے فائدے کے لڑکیوں کے لیے نقصان دہ ہوتی ہے۔ کم از کم بی اے یا بی ایس سی تو ضرور کرنا چاہیے اور اتنی چھوٹی عمر میں شادی نہیں ہونی چاہیے مگر وہاں ان کی سننے والا کوئی نہیں تھا۔

نکاح کے بعد اسے گھر داری سیکھنا تھی تاکہ اگلے گھر جا کر اسے کوئی تکلیف نہ ہو اور ہمیشہ کی طرح اچھی بچیوں کے مانند اس نے بابا کے فیصلے کے سامنے سر جھکا دیا تھا۔

ہمایوں اور تینوں بہنیں بے حد غمزدہ تھیں۔ مگر وہ کیا کر سکتے تھے۔ وہ چپ چاپ اپنے کمرے میں چلی آئی۔ دروازہ بند کر کے وہ بہت روئی۔ بے تحاشا رونے کے بعد بھی دل تھا کہ بھر بھر آ رہا تھا۔ آنسو تھے کے تھمنے میں نہیں آ رہے تھے۔ مہرین، ایمن اور فاطمہ بھی اس کے ساتھ آنسو بہا رہی تھیں۔ صبح کا آغاز کتنا خوب صورت ہوا تھا۔ وہ اپنی کامیابی کی نوید سن کر پھولے نہیں سار رہی تھی مگر وہ شام اس کے لیے کتنا بڑا صدمہ لے کر آئی تھی، وہ جانتی تھی کہ بابا کے دوست وقار صاحب کون تھے۔ اور ان کا بیٹا کیا کرتا ہے؟ اور اگر وہ جانتی بھی ہوتی۔ تو شادی تو وہ ہرگز نہیں کر سکتی تھی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ ان سے جا کر پوچھے کہ یہ انہوں نے کیا کیا۔؟ اتنا بڑا فیصلہ انہوں نے اس سے پوچھے بغیر کس طرح کر لیا۔

یہ تو وہ جانتی تھی کہ ان کے خاندان میں لڑکیوں سے ان کی پسندنا پسند پوچھنے کا رواج نہیں تھا۔ اس کی

تمہارا نکاح ہے۔۔۔۔۔ ان کے دوست وقار صاحب کے بیٹے کے ساتھ سنا تم نے۔۔۔۔۔؟“ ان کی آواز غم سے بوچھل تھی اور لہجہ دکھ سے بھرا ہوا تھا۔

”نہیں ماما۔۔۔۔۔ وہ ایک دم خوفزدہ ہو گئی۔“ ماما اتنی جلدی۔۔۔۔۔ یہ نہیں ہو سکتا۔“

”بیٹے! یہ تمہارے بابا کا فیصلہ ہے، ان کا خیال ہے لڑکی کی شادی اٹھارہ سال کی عمر میں ہو چانی چاہیے۔ تمہارے بعد تمہاری تین بہنیں اور بھی ہیں۔“ اور ایک بھائی بھی ہے ماما۔۔۔۔۔ جو بیس سال کا ہو چکا ہے۔ پھر اس کا بھی نکاح ہو جانا چاہیے۔ وہ رو دینے لگی۔ مارے صدمے کے وہ نڈھال ہو رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا وہ کس طرح ری ایکٹ کرے۔

”نہیں ماما! یہ نہیں ہو سکتا۔۔۔۔۔ ابھی میں پڑھنا چاہتی ہوں، میں ڈاکٹر بننا چاہتی ہوں۔ میں ابھی شادی نہیں کر سکتی۔۔۔۔۔ اتنی جلدی میری شادی کیونکر ہو سکتی ہے؟“ اس کی آنکھوں میں دھواں سا بھر رہا تھا۔ اور پھر اس نے زار و قطار رونا شروع کر دیا۔ مانے آگے بڑھ کر اسے سینے سے لگا لیا۔

”نہیں۔۔۔۔۔ عالیہ! میری بیٹی روؤ نہیں۔۔۔۔۔ تمہاری عمر میں میری بھی شادی ہو گئی تھی۔“ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اسے اور کس طرح تسلی دیں۔ وہ ان کی بڑی بیٹی تھی اور انہیں بے حد پیاری تھی۔ ان کے درمیان بے مثال انڈر اسٹینڈنگ تھی، وہ اپنے دل کی ہر بات اس سے کر لیا کرتی تھیں۔ ہر بات میں اس سے مشورہ لیا کرتی تھیں اور اس کی زندگی کا فیصلہ انہوں نے اس کے مشورے کے بغیر ہی کر لیا تھا۔ وہ بہت میچورڈ اور مجتہد پرکھی تھی، اپنی عمر کے لحاظ سے وہ بہت پختہ ذہن کی مالک تھی۔ وہ ماں کی مرضی ان کے اشاروں سے سمجھ جایا کرتی تھی مگر اس شام وہ خود پر قابو نہیں رکھ سکی تھی۔ وہ بکھر کر رہی تھی۔ راحت خالہ، فرزانہ چچی اور میرا پچھو اسے

جمع تھے اسے مبارک باد دینے کے لیے۔۔۔۔۔ اسد بچا، فرزانہ چچی، شاہد ماموں اور فرح ممائی، پچھو اور ان کا سارا خاندان اور چھوٹے بڑے سارے کزن۔۔۔۔۔

کلیک، پھول اور تحائف وصول کر کے وہ بہت خوش ہو رہی تھی کولڈ ڈرنکس اور جائے کا دور چل رہا تھا۔ وہ سب کا شکریہ ادا کر رہی تھی۔۔۔۔۔ جب ہی ماما نے اسے اپنے بیڈروم میں بلا لیا۔ وہ گلابی لباس میں بے حد حسین۔ اور تروتازہ لگ رہی تھی۔

”عالیہ! دھر آؤ۔۔۔۔۔ میرے پاس بیٹھو۔۔۔۔۔ اور میری بات دھیان سے سنو۔“

”اچھا ماما۔۔۔۔۔“ اس نے دیکھا فرزانہ چچی اور راحت خالہ بھی ان کے کمرے میں موجود تھیں۔ اس کی ماں بے حد سنجیدہ تھیں اور ان کے چہرے پر جانے کیا تھا کہ وہ چونک گئی۔ فرزانہ چچی اور راحت خالہ اسے کس طرح دیکھ رہی تھیں، ان کی نگاہوں میں جانے کیا تھا وہ پریشان ہو گئی۔

”ماما کیا بات ہے؟“ وہ جانے کیا کہنے جاری تھیں۔۔۔۔۔؟ وہ خوش نہیں تھیں، ان کے چہرے پر گہرے ملال کا رنگ تھا۔ ان کی آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک تھی۔ جنہیں چھپانے کی کوشش میں وہ ناکام ہوئی جاری تھیں۔ ان کی خاموشی طویل ہو گئی تھی۔

”ماما! کیا بات ہے، چچی جان، راحت خالہ آپ بتائیں کیا ہوا ہے؟“

”کچھ نہیں ہوا بیٹے۔“ وہ سخت کشمکش میں مبتلا تھیں جیسے انہیں الفاظ نہیں مل رہے تھے۔

”عالیہ! تمہارے بابائے ایک فیصلہ کیا ہے۔“

”کیا ماما؟“ وہ پریشان ہو گئی۔

”عالیہ! کل رات تمہارا نکاح ہے۔“

”جی۔۔۔۔۔؟“ اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔۔۔۔۔ ماما کیا کہہ رہی تھیں۔ ماما! آپ کیا کہہ رہی ہیں؟“

”عالیہ! تمہارے بابا نے فیصلہ کیا ہے۔۔۔۔۔ کل

ایک اُن بڑھ اور نرزی جاہل عورت ہیں.....“ عالیہ بابا کو یہ سب کچھ نہیں کہہ سکتی تھی..... وہ بھلا بابا سے یہ سب کس طرح کہہ سکتی تھی..... وہ خاموشی سے آنسوؤں کو پتتی رہی..... حالانکہ اس کا دل چاہ رہا تھا وہ بابا سے پوچھے..... وہ اتنی جلدی اسے خود سے کیوں جدا کرنا چاہتے ہیں؟ کیا وہ اس سے تنگ آ چکے ہیں؟ کیا واقعی بیٹیاں والدین پر بوجھ ہوتی ہیں؟ مگر وہ ان سے ایک بھی سوال نہ کر سکی..... بابا اس کے ساتھ ہی پرنسپل کے دفتر تک آئے تھے، وہ ان سے مل کر بہت خوش ہو رہے تھے، اس کی ساری کامیابیوں کا کریڈٹ وصول کر رہے تھے، خوشی سے ان کا سر بلند کر دیا تھا۔ اب اسے کالج نہیں جانا تھا، مزید پڑھانی نہیں کرنا تھی، اب اسے گھر پر ہی رہنا تھا، گھر داری سیکھنا تھی، اماور مہرین دن رات شادی کی تیاریوں میں مصروف تھیں۔ وہ ان کے ہزار اصرار پر بھی بازار..... شاپنگ کے لیے جانے کے لیے تیار نہیں ہوتی تھی۔ اس نے باورچی خانے میں خود کو اس طرح مصروف کر لیا تھا کہ اب اس کے پاس سوچنے کے لیے ایک لمحہ بھی نہیں تھا۔

اس عرصے میں اس کا رنگ نکھر کر اور بھی صاف ہو گیا تھا اس کی صحت پہلے کے مقابلے میں زیادہ اچھی ہو گئی تھی۔ سارا دن وہ مزے مزے کے کھانے بناتی، سارے گھر والوں کی داد وصول کرتی اور لمبی تان کر سوجاتی۔ شب و روز کی یہی مصروفیت تھی۔

☆☆☆

اور پھر وہ دن آ گیا..... جس کے آنے سے وہ بہت گھبراتی تھی۔ جس کے بارے میں وہ سوچنا بھی نہیں چاہتی تھی..... جس کا انتظار اس نے بھی نہیں کیا تھا۔

اور وہ دن کتنی جلدی آ گیا۔ وہ سرخ رنگ کے عروسی لباس میں بے پناہ حسین لگ رہی تھی۔ قیمتی زیورات اور میک اپ میں..... اس نے آج زندگی

قالینوں اور خشک میوؤں کا کاروبار بیرون ملک تک پھیلایا ہوا تھا..... وہ کراچی کے ایک پوش علاقے میں رہتے تھے۔ سعودی عربوں کا اکلوتا بھائی تھا۔

اس نے عالیہ کو انتہائی قیمتی ہیرے کی انگلی پھنائی تھی۔ باقی ساری چیزیں بھی بہت خوب صورت اور قیمتی تھیں، کوئی ایک چیز بھی اسے خوش نہیں کر سکتی تھی۔

اگلے دن صبح ہی صبح پرنسپل کا فون آ گیا، انہوں نے اسے کیسے بلایا تھا..... وہ اس کا رزلٹ ساری کلاس کے ساتھ سلیمریٹ کرنا چاہ رہے تھے۔ وہ ان سے بات کر کے بہت خوش ہوئی تھی..... مگر پھر جو

اس نے رونا شروع کیا تو اس کے آنسو ہی نہیں تھم رہے تھے۔ ایسی خوشیاں تو اب اس کے لیے ہمیشہ کے لیے اجنبی ہو چکی تھیں۔ ماما نے اسے بہت پیار کیا..... بابا نے نہ صرف اسے پیار کیا..... بلکہ

ہزار روپے کا ایک نوٹ انعام میں بھی دیا۔ ”چلو میں تمہیں اسکول ڈراپ کروں گا..... اور واپسی پر یکم بھی کروں گا۔“

اس کے پاس کافی پیسے جمع ہو گئے تھے..... وہ اپنی پوری کلاس کو ٹریٹ دے سکتی تھی مگر جب دل ہی خوش نہ ہو..... وہ بادل ناخواستہ تیار ہو گئی تھی۔

صاف لگ رہا تھا وہ دل سے تیار نہیں ہوئی تھی۔ اس کے پورے وجود پر ایک اداسی چھائی ہوئی تھی۔ وہ جانتی تھی..... اس نکاح سے کوئی بھی خوش نہیں تھا..... شاید بابا بھی نہیں..... وہ راستے بھرا سے سمجھاتے رہے۔

”دیکھو عالیہ! اچھے رشتے بار بار نہیں ملتے..... تم شادی کے بعد بھی تو بڑھ سکتی ہو..... بہت سی لڑکیاں شادی کے بعد بڑھتی ہیں۔“

”ہاں بڑھتی ہوں گی بابا..... ضرور بڑھتی ہوں گی.....“ وہ سوچ رہی تھی۔ ”بابا! جب آپ نے ہی مجھے بڑھنے نہیں دیا تو سراسر والے کس طرح بڑھنے دیں گے۔“ فرح ممانی کہہ رہی تھیں سعود کی والدہ

تھے۔ اس کا دل گھبرا رہا تھا۔

”کیا ہوا عالیہ.....؟“

”پانی.....“

مہرین نے اٹھ کر اسے پانی پلایا۔

”کیا کوئی خواب دیکھا ہے؟“

”ہاں مہرین..... بڑا عجیب خواب تھا..... کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔“ اس نے اپنا خواب جب راحت خالہ کو سنایا تو وہ گہری سوچ میں ڈوب گئیں۔

”اس کا مطلب تو یہ ہے کہ یہاں رشتہ نہیں کرنا چاہیے۔“

”کیا.....؟“ وہ چونک گئی۔

”کیا وہ کوئی بزرگ تھے؟“

”جانتیں خالہ.....“

اور جب وہ خواب اس نے ماما کو سنایا تو وہ بھی جیسے مراقبے میں چلی گئیں..... پھر بہت سوچ سوچ کر وہ بولیں۔

”عالیہ! اپنے اس خواب کا ذکر کسی سے نہ کرنا۔“

”بابا سے بھی نہیں؟“

”نہیں..... اب کچھ نہیں ہو سکتا..... سب کچھ

طے ہو چکا ہے۔“ مگر اس کا دل کہہ رہا تھا اب بھی

سب کچھ ہو سکتا ہے۔ بے شک سب کچھ طے ہو چکا

ہے مگر اب بھی اگر بابا کچھ کرنا چاہیں تو وہ اس نکاح

کو روک سکتے ہیں..... انتظار کیا جاسکتا ہے،

انتخاب..... بدلا جاسکتا ہے۔ بہت کچھ کیا جاسکتا تھا

مگر شاید اس کا مقدر یہی تھا۔

اور رات کو اس کا نکاح سعود سے ہو گیا۔ اس

نے تو اسے نہیں دیکھا تھا مگر سب لوگ کہہ رہے تھے

کہ وہ بہت خوش شکل اور ہنڈسم نوجوان تھا۔ اگرچہ وہ

عمر میں اس سے سات سال بڑا تھا..... انگریز سے

قانون کی ڈگری لے کر وہ لوٹا تھا..... اور حال ہی میں

اس نے وکالت شروع کی تھی۔ انکل وقار صاحب

ثروت اور صاحب حیثیت انسان تھے اور ان کا

کے رخسار پر پیرا کیا۔ عالیہ بڑا کراٹھ بیٹھی۔

وہ کیسا خواب تھا..... یاد کر کے وہ ڈر گئی..... وہ

پسینے سے شرابور ہو رہی تھی۔ اس خواب کو یاد کرنا

چاہا..... شاید وہ کوئی مجید تھی..... مسجد سے ملحق وہ ایک

بے حد صاف ستھرا اور منور کمرہ تھا، روشن دان سے

جیسے نور کی کرنیں اندر آ رہی تھیں..... وہ ننگے پاؤں

تھی اور اس نے سرخ رنگ کا دوپٹا اوڑھ رکھا تھا۔

جونہی وہ کمرے میں داخل ہوئی ایک بہت بھاری

مردانہ آواز ابھری۔

”السلام علیکم.....“ اس نے دیکھا وہ سفید

لباس میں ملبوس تھے۔ سرخ دینیر ایرانی قالین بچھے

تھے اس کے پاؤں قالین میں جنس رہے تھے۔ وہ

قالین کی نرم مٹ محسوس کر رہی تھی۔

”وعلیکم السلام.....“ اس نے جواب دیا۔

”بیٹھ جاؤ.....“

وہ بیٹھ گئی..... کمرے میں روح میں اتر جانے

والی ایک مہک پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے ایک لمبی اور

گہری سانس لی اور وہ مہک اس کے سینے میں اتر

گئی۔ وہ نہیں جانتی تھی..... سفید لباس میں وہ کون

تھے۔ روشن دان سے اُترتی ہوئی روشنی ان کے

چہرے پر پڑ رہی تھی۔ نہایت روشن پیشانی تھی۔

آنکھیں بھی ہوئی تھیں، سرخ و سفید رنگت پر سنہری

داڑھی بچ رہی تھی۔ انہوں نے اپنے سامنے رکھے

ہوئے سبز دوپٹے کی طرف اشارہ کیا۔

”دوپٹہ بدل کر لو۔“

”جی.....“ وہ جیسے ان کی شخصیت کے سحر میں جکڑ

گئی تھی۔ اور پھر اس کی آنکھ کھل گئی۔ یہ کیسا خواب تھا.....

وہ ساری رات جاگ کر فجر کی نماز پڑھ کر سوئی

تھی۔ صبح دم ابھی اس کی آنکھ کھلی تھی کہ اس نے دیکھا

مہرین اس کے قریب بیٹھی تلاوت قرآن پاک کر رہی

تھی۔ باہر ابھی ملگجیا سویرا تھا۔ گھر بھر میں سناٹا چھایا

ہوا تھا۔ بابا شاید ابھی لوٹ کر مسجد سے نہیں آئے

اسے دیکھا بھی نہیں تھا اور نہ عالیہ نے انہیں دیکھا تھا۔ آخر لڑکی دہن اسی لیے بنتی ہے ناں..... بھتیجی اور سنورتی ہے کہ اس کے شوہر نے اسے پہلی مرتبہ دیکھنا ہوتا ہے۔ مگر یہاں تو شوہر صاحب پتا نہیں کہاں تھے؟ اور صبح ہونے والی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اٹھ کر کپڑے بدل لے۔ اس نے ایک ایک کر کے زیور اتارنا شروع کر دیے۔ دوپٹا نہ کر کے رکھا اور ڈریسنگ روم میں آگئی اس نے شب خوابی کا لباس نکالا۔ سارے زیور سنجال کر ڈریسنگ ٹیبل کی دروازے میں رکھے۔ اس نے دیکھا ڈریسنگ ٹیبل پر پانچ زیورات کے ڈبے رکھے تھے۔ اس نے کھول کر دیکھا وہ بے حد حسین اور قیمتی سیٹ تھے۔ ڈبے پر کارڈ چپکے ہوئے تھے۔ وہ اس کی ساس، سر، نندوں اور سب کی طرف سے اس کے لیے تحائف تھے۔ وہ بہت حیران تھی کہ یہ کیا طریقہ تھا؟ یہ کون سا انداز تھا؟ کسی نے اسے ان کے بارے میں بتانا بھی گوارا نہیں کیا۔ شاید صبح یہ لوگ اسے منہ دکھائی میں دیں گے۔ فجر کی اذانیں ہو رہی تھیں، تب ہی سعود اندر آئے۔ وہ یک دم کھڑی ہو گئی۔ ”اسلام علیکم.....“

”ہیلو.....“ وہ دوپٹے کے بغیر کھڑی تھی..... اسے عجیب سا لگ رہا تھا۔ وہ اس کے قریب آگئے۔ ”وہ میرا دوپٹا.....“ وہ بے حد زور سے کہتی تھی۔ ”رہنے دو..... دوپٹے کے بغیر..... تمہارا یہ انداز آئی لائک اٹ۔“ عالیہ پریشان ہو گئی۔ وہ شاید نشے کی حالت میں تھے۔ وہ اس کے بے حد قریب کھڑے تھے۔ ایک ناگوار سی بدبو سے اس کا دماغ الٹ رہا تھا۔ انہوں نے اسے کندھوں سے تھامنے کی کوشش کی تو ان کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ وہ تقریباً اس پر گر پڑے تھے۔ عالیہ انہیں سہارا دے کر بیڈنگ لائی۔ ”سوری! میں لیٹ ہو گیا۔ تم بہت پیاری لگ رہی ہو۔“ وہ بے ربط بول رہے تھے۔

پریشان ہو گیا تھا۔ ”چھوڑیں ان باتوں کو۔“ سعودی وہی کزن جس نے اس کا میک اپ کیا تھا بولی۔ ”بھابی کو پریشان مت کریں، آپ چائے پینیں گی بھابی یا کافی؟ آپ جو لیتا چاہیں..... تیار ہے۔“

”پلیز! مجھے کافی لادیں۔“

کافی بہت ہی اچھی بنی ہوئی تھی۔ پی کروہ ایک دم فریش ہو گئی۔ آہستہ آہستہ سب لوگ اٹھ کر چلے گئے تھے اور وہ کمرے میں اکیلی رہ گئی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے..... سامنے کلاک میں اس نے وقت دیکھا..... تین بج رہے تھے۔ تنہا اور نیند سے برا حال تھا۔ گاؤں کیے کا سہارا لے کر اس نے بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائی۔

نیند کے غلبے سے اس کی آنکھیں بند ہوئی جارہی تھیں۔ تب ہی آہٹ ہوئی..... اس نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ سامنے اس کی ساس تھیں۔ وہ ان کے احترام میں کھڑی ہونے جا رہی تھی کہ انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے منع کر دیا۔ ”بلیز رہو..... کوئی ضرورت نہیں اٹھنے کی..... میرا خیال ہے تم کپڑے بدل لو..... سعود تو دیر سے آئے گا۔“

”جی.....!“ وہ حیران رہ گئی۔ چار تو بجنے والے تھے۔ ”اب اور وہ کتنی دیر سے آئیں گے۔“ اس کا جی چاہا وہ ان سے پوچھے۔

”سعود کہاں گئے ہیں؟“ مگر وہ خاموش رہی۔ ”یہ پھل اور مٹھائی رکھی ہے جی چاہے تو کھا لیتا.....“

”جی۔“ اور وہ پردے برابر کر کے چلی گئیں۔ ان کے جانے کے بعد وہ کتنی دیر تک حیران پریشان بیٹھی رہی۔

”کیا اس طرح ہوتا ہے؟ فلموں اور کہانیوں میں تو اس طرح نہیں ہوتا.....“ ابھی تو سعود نے

رو رو کر خراب نہ کرو۔“ مگر اسے میک اپ کا ہوش کہاں تھا؟ بابل سے پچھڑنے کا غم..... بہن بھائیوں کو چھوڑنے کا دکھ..... اور بالکل اجنبی لوگوں کے درمیان جانے کا خوف..... ہر احساس پر حاوی ہو گیا تھا۔ پھولوں سے سجی ہوئی سفید بنی ایم ڈیلیو میں مدغم سی موسیقی اور کسی بے حد اچھے انگریزی بشری خوشبو نے اندر کے ماحول کو بہت خوب صورت بنا رکھا تھا.....

سعود آگے بیٹھے تھے اور پچھلی سیٹ پر وہ اپنی ساس کے ہمراہ بیٹھی تھیں۔ اچانک ہی اس پر ایک گہری بے حسی طاری ہو گئی تھی۔ وہ کچھ بھی محسوس نہیں کر رہی تھی۔ نہ اسے کسی کی ہنڈک اور نہ وہ مہک.....

اس کی خواب گاہ عروسی کو بے حد خوب صورت انداز سے سجایا گیا تھا۔ گلابی دیواریں..... گلابی پردے..... گلابی قالین..... گلابی بیڈ کور..... اور گلابی رنگ کے گلابوں سے سکرامہک رہا تھا۔

پنک شیڈ کے لیپسوں سے چمن چھن کر آتی روشنی کمرے میں ایک خوابناک سی فضا بنا رہی تھی۔ گلابی رنگ اس کا پسندیدہ رنگ تھا۔ اچانک ہی وہ سب کچھ اسے بہت اچھا لگنے لگا۔ تھوڑی دیر پہلے سعود کی ایک کزن نے اس کا میک اپ نئے سرے سے کیا تھا..... اور وہ تو صوفی لہجہ میں بولی۔

”بھابی آپ بہت پیاری لگ رہی ہیں۔ آج تو سعود بھائی کی خیر نہیں۔“

”سعود بے کہاں.....؟“ کسی نے پوچھا تھا۔ ”کہاں ہو سکتا ہے؟“ ایک طنز سے بھری تلخ آواز ابھری۔

”سعود کب آئے گا؟“

”فرصت ملے گی تو آئے گا ناں؟“ استہزائیہ کہاں لہ

”کیا مطلب.....؟“

”مطلب کیا تم نہیں جانتیں.....؟ مطلب بھی میں ہی تمہیں سمجھاؤں؟“

یہ کس قسم کی گفتگو ہو رہی تھی۔ عالیہ کا دل

میں پہلی بار میک اپ کیا تھا۔ شرارے کے ساتھ اونچی ایڑی کی جوتی پہنے وہ بہت دراز قد لگ رہی تھی۔ جس نے اسے دیکھا بے اختیار تعریفی کلمات اس کے منہ سے نکلے۔

بہت خوب صورت جوڑا تھا۔ شاید چاند اور سورج کی جوڑی والا محاورہ ان ہی کے لیے بنایا گیا تھا اور آج چاند اور سورج زمین پر اتر آئے تھے۔

رخصتی کے وقت وہ بہت روئی..... اور اس طرح روئی کہ بابا اور ماما کو اسے سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ ہر آنکھ اشک بار تھی۔ ماما کو تو یوں لگ رہا تھا جیسے ان کے دل کے ایک ٹکڑے کو ان سے الگ کر کے کوئی لے جا رہا تھا۔ بابا کی دل کی بھی یہی کیفیت تھی۔ ابھی کل کی تو بات تھی۔ ہمایوں کے بعد جب وہ پیدا ہوئی تھی تو وہ کتنے خوش ہوئے تھے۔ بسم اللہ پڑھ کر انہوں نے اسے گود میں لیا تھا۔ بیٹا اگر خدا کی نعمت تھا تو بیٹی اللہ کی رحمت تھی۔ اسے گود میں لے کر ان کا دامن خوشیوں سے بھر گیا تھا۔ انہوں نے پیار سے مغلوب ہو کر اس کی پیشانی پر بوسہ دیا تھا اور فوراً شکرانے کے دو فلفل پڑھے تھے۔ انہوں نے بہت شوق سے اس کا نام عالیہ رکھا تھا۔ عالیہ کے بعد اگر چہ ان کے گھر میں تین رحمتیں اور بھی آئی تھیں۔

مہرین، امین، اور فاطمہ بھی انہیں بے حد عزیز تھیں مگر عالیہ کی تو بات ہی اور تھی..... وہ بہت پیاری..... فرمانبردار اور لائق ترین بچی تھی۔ اس نے ہمیشہ فخر سے ان کا سر بلند کیا تھا اور رخصتی کے وقت بھی انہوں نے اسے یہی کہا تھا۔

”مجھے امید ہے عالیہ! جس طرح آج تک تم نے ہر جگہ میرا سر فخر سے بلند کیا ہے، اپنی سسرال جا کر بھی مجھے اسی طرح سر بلند رکھو گی۔“ وہ ان کے سینے میں چہرہ چھپائے روئے جا رہی تھی۔ بچی جان، پچھو اور راحت خاں اسے سمجھا سمجھا کر تھک گئی تھیں۔

”اتنی محنت سے کیے گئے میک اپ کو اس طرح

”کیا تم اس شادی سے خوش نہیں ہو؟“ عالیہ نے حیرت سے دیکھا۔
 ”کیا مطلب؟“
 ”مطلب یہ کہ؟“ وہ ہنسنے لگی۔
 ”کیا کوئی یار..... یاد آ رہا ہے..... یا کوئی پرانا عاشق..... رو کیوں رہی ہو؟“ وہ رونا بھول گئی۔ وہ صدے سے سناکت ہو گئی۔ وہ کیا کہہ رہے تھے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ سعود نے ایک قہقہہ لگایا۔

قارئین متوجہ ہوں

پرچا
نہیں ملتا

کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پرچا نہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

☆ بک اسٹال کا نام جہاں پر چاہا وہاں پرچا ملے گا۔
 ☆ شہر اور علاقے کا نام۔
 ☆ موبائل نمبر یا PTCL یا ایس پی ایل فون نمبر

رابطے اور مزید معلومات کے لیے

نثار عباس

03012454188

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

سپنس، جاسوسی، پاکیزہ، سرگشت

63-C نمبر 11 سینٹین ویش ہاؤس اتھارٹی بین روڈ، کراچی

سب سب کے لیے

35802552-35386783-35804200

ای میل: jdpgroup@hotmail.com

رات اس نے کھانا نہیں کھا یا تھا۔ اس نے خوب پیٹ بھر کر ناشتا کیا..... اور گرم گرم چائے پی کر جیسے وہ تازہ دم ہو گئی۔ وہاں بے شمار لوگ تھے مگر سعود وہاں نہیں تھے۔ عالیہ وہاں کسی کو نہیں جانتی تھی وہ چپ چاپ بیٹھی لوگوں کی باتیں سن رہی تھی کسی کی توجہ اس کی طرف نہیں تھی۔

وہاں کافی ہنگامہ تھا..... ایک افراتفری کا عالم تھا۔ سب لوگ رات ویسے کی تیاریوں میں کافی پرجوش تھے۔ لباس، رنگ اور زیورات زیر بحث تھے۔ وہاں شادی والے گھر کی ساری رونقیں تھیں مگر اس کا دل سائیں سائیں کر رہا تھا۔ اس کے اندر ایک گہری خاموشی تھی اور سنا..... پتا نہیں کیوں..... آنے والے وقت سے وہ خوفزدہ تھی۔ شاید یہ خاموشی کسی طوفان کے آنے سے پہلے والی خاموشی تھی۔

”عالیہ! سعود تمہیں بلارہا ہے۔ اپنے کمرے میں جاؤ۔“ اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ کانپ گئی۔ ”خدا یا! کتنا مشکل لگ رہا ہے اپنے کمرے میں جانا.....“ اس کے قدم من من بھر کے ہو رہے تھے۔ وہ جب کمرے میں داخل ہوئی تو سعود..... بیڈ پر دراز تھے۔

”آئیے جناب.....“ وہ بہت خوش دلی سے بولے۔
 ”کیا حال چال ہیں؟“
 وہ سمٹ کر رہ گئی۔
 ”پلیز دروازہ ہلاک کر دو۔“
 ”جی.....؟“ وہ ٹھٹھک کر کھڑی ہو گئی۔

”میں نے کہا محترمہ..... دروازہ بند کر دیجیے۔“ اس نے دروازہ ہلاک کر دیا۔
 ”اب یہاں تشریف لے آئیں.....“ سعود نے اپنے پہلو میں اس کے لیے جگہ بنائی..... وہ آہستگی سے بیٹھ گئی۔

اس کی رضا کے بغیر انہوں نے اس کی عزت نفس کو کس طرح پامال کیا تھا۔ وہ روئے جاری تھی اور سعود اسے حیران ہو کر دیکھ رہے تھے۔

رہا تھا۔ کبل اوڑھ کر وہ صوفے پر لیٹ گئی۔ اس پر ایک غنودگی طاری ہو رہی تھی۔ بہت جلد وہ گہری نیند سو گئی۔ ایسی نیند تو اسے آج بہت دنوں کے بعد آئی تھی اور جب اس کی آنکھ کھلی..... تو کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ سعود جانے کب اٹھ کر چلے گئے تھے۔ ایک عجیب سی ہمدردی کا احساس ہو رہا تھا۔ رات شاید اس نے کوئی بھیانک خواب دیکھا تھا۔ لگتا تھا اندر جیسے شیشے کی کوئی بہت نازک چیز چکنا چور ہو گئی تھی اور ساری کرچیاں پورے جسم میں پیوست ہو گئی تھیں۔ ایک شدید قسم کی تکلیف کا احساس ہو رہا تھا۔ اس نے وال کلاک میں وقت دیکھا..... دوپہر کے ساڑھے بارہ بجے تھے..... وہ کتنی دیر تک سوئی رہی تھی..... اسے صبح جلد اٹھنے کی عادت تھی۔ دیر تک سونا اسے پسند نہیں تھا مگر رات.....

رات کس طرح اس کے دل کو پامال کر کے گزری تھی۔ اس کی روح تک دکھ کے احساس سے شکستہ تھی۔ وہ واش روم میں چلی گئی۔ نہہرا کراس نے ایک ہلکے کام والا جوڑا پہنا..... اپنے لمبے بالوں کو سادگی سے ایک ڈھیلی چوٹی کی صورت میں سمیٹا..... ہلکے رنگ کی لب اسٹک لگائی..... اور ڈرائنگ ٹیبل پر پڑی ہوئی پرفیومزری بوتلوں میں سے ایک کا انتخاب کر کے اسپرے کیا..... تب ہی سعود کی بڑی بہن اندر آ گئیں۔

”السلام علیکم.....“ وہ ان کے احترام میں کھڑی ہو گئی۔ انہوں نے اس کے سلام کا جواب نہیں دیا۔
 ”میرا تو خیال تھا کہ تم سو رہی ہو گی..... تیار ہو گئی ہو تو باہر آ جاؤ۔ سب لوگ ناشتا کر رہے ہیں۔“
 ”جی اچھا.....“ وہ ان کے ہمراہ باہر آ گئی۔ شادی والا گھر مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ وسیع و عریض میز کھانے کے انواع و اقسام سے بھری ہوئی تھی۔ تازہ پرائے اور آلیٹ کی خوشبو بہت اشتہا انگیز تھی۔ اسے ایک دم ہی بھوک کا احساس ہونے لگا۔

”وہ میں نے تمہارے..... لیے کچھ خریدا تھا۔ تمہیں منہ دکھائی میں دینے کے لیے..... تم دیکھ لو۔ یہیں کہیں رکھا ہو گا۔“ وہ بیڈ پر گر پڑے تھے۔ عالیہ تھوڑی دیر کھڑی رہی پھر اس نے اندازہ لگایا..... وہ سوچے تھے اس نے جھک کر انہیں سیدھا کرنے کی کوشش کی، ان کے جوتے اور جرابیں اتاریں۔ اپنا لباس تبدیل کر کے اس نے وضو کیا..... اور وضو کرتے وقت اس کے آنسو جاری ہو گئے۔ کیا وہ نماز پڑھ رہی تھی؟ وہ تو روئے جاری تھی۔ اس کا پورا وجود لرز رہا تھا۔ یہ کیا تھا؟ اس نے سعود کو کس حال میں دیکھا تھا۔ صدے سے اس کا دل پھٹ رہا تھا۔ ایسا تو وہ کبھی مگر کبھی نہیں سوچ سکتی تھی۔ یہ اس کے لیے زندگی کا سب سے بڑا صدمہ تھا۔ بابا نے اپنی نیک اور پاکدامن بیٹی کے لیے یہ انتخاب کیا تھا..... کیوں.....؟ یقیناً وہ نہیں جانتے ہوں گے؟ مگر کیوں..... وہ کیوں نہیں جان سکے، انہیں جاننا چاہیے تھا، انہیں اپنی بیٹی سوچنے سے پہلے پوری طرح سے اپنی تسلی کرنا چاہیے تھی، چھان بین کرنا چاہیے تھی، لوگوں سے پوچھنا چاہیے تھا، کوئی اس طرح کرتا ہے بابا..... اس طرح آنکھیں بند کر کے کوئی اپنی بیٹی کسی کے سپرد کرتا ہے، آپ نے ایسا کیوں کیا.....؟ آپ کو اتنی جلدی کیا تھی، جب آپ خود ان لوگوں کو جانتے نہیں تھے تو رشتے داری کرنے کی ضرورت کیا تھی؟ اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کو انسان مقدر کے کھاتے میں ڈال کر کیوں مطمئن ہو جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ یہ تو نہیں کہتا..... کہ اپنے فرائض کی تکمیل کے لیے کسی پر اس طرح اندھا دھند اعتماد کر لیا جائے.....! دکھ اور غصے سے اس کی بری حالت تھی..... نماز کے بعد وہ کوئی دعا مانگ ہی نہیں سکی..... اس کے سارے وجود پر ایک گہری ٹھٹھکن طاری تھی اور سردی کے احساس سے اس کا جسم کانپ

232

انتہائی فیشن اسٹیل خواتین تھیں..... کئے ہوئے بال..... سیلو بس شرٹس..... گہرا ایک اپ..... ایک خاتون ٹانگ برٹا نگ رکھے سگریٹ کے کش لگا رہی تھیں۔ وہ جھج گئی۔

”آؤ..... آؤ عالیہ!“

”السلام علیکم!“

”علیکم السلام مسعود..... کیا حال ہے؟“

”جی میں ٹھیک ہوں۔“

”آؤ بیٹھو.....“ وہ بیٹھ گئی..... تب ہی مسعود بھی

آگئے..... وہ کالا کوٹ اور سفید پینٹ پہنے ہوئے تھے۔ ہاتھ میں بریف کیس تھا۔ شاید وہ کورٹ سے گھر آئے تھے۔ ان خواتین کو دیکھ کر وہ چل اٹھے۔

”آہا..... آج تو بڑے بڑے لوگ آئے ہوئے ہیں، اور سناؤ، نفیسہ..... متاशा کیا حال ہیں؟“ وہ ان سے گلے مل رہے تھے۔ گال سے گال ملا کر پیار کر رہے تھے۔

”میری بیگم سے ملے آپ لوگ.....؟“

”ہاں بھئی سودی..... تمہاری بیگم تو بہت پیاری ہیں۔ بڑے خوش قسمت ہو بیٹی۔“

”امی جی! کوئی خاطر خاطر تو کریں ہمارے مہمانوں کی.....“

”ہاں سودی! میں نے کہہ دیا ہے..... کہ کھانا کھا کے جانا..... میں ایسے نہیں جانے دوں گی۔ چلے خانسا ماں لے کر آ رہا ہے۔“

”اور سودی کیا حال ہے..... بڑے خوش نظر آ رہے ہو۔“

”کیوں، خوش نہیں ہونا چاہیے.....؟“ وہ ہنسنے لگی۔

”کیوں نہیں.....؟“

”متاशा! تم میری شادی پر کیوں نہیں آئیں؟“

”یہ صدمہ میں برداشت نہیں کر سکتی تھی۔“ ایک زبردست تہمت بڑا..... ان کی ہنسی میں ای بھی شامل تھیں۔ یہ کس قسم کی گفتگو ہو رہی تھی.....

عالیہ کو الجھن ہو رہی تھی۔

”عالیہ! ان سے ملو..... یہ میری دوست نفیسہ اور یہ متاशा ہیں..... میری بہت پرانی دوست.....“

”جی میں مل چکی ہوں۔“ وہ آہستگی سے بولی۔

”میں ذرا فریش ہو جاؤں.....“ مسعود کہتے ہوئے کمرے کی طرف بڑھے۔ عالیہ بھی ان کے پیچھے ہی اپنے کمرے میں چلی آئی۔

”کیسی لگیں میری فرینڈز.....؟“ وہ بہت خوش ہو کر پوچھ رہے تھے۔

”کیا مردوں کی دوست عورتیں بھی ہوتی ہیں؟“ وہ معصومیت سے پوچھ رہی تھی۔

”کس دنیا میں رہتی ہو پوہی.....؟“ وہ ہنسنے لگی۔

عالیہ نے ان کا کوٹ لے کر بیگر میں لٹکایا۔

آج پہلی مرتبہ اسے پتا چلا..... کہ وہ کتنے خوش شکل اور وجیہ تھے۔ چھ فٹ کے قریب قد..... بہت صحت مند اور کسرتی جسم تھا..... صاف گندمی رنگت..... سیاہ بڑی بڑی آنکھیں..... کشادہ پیشانی اور گھنے سیاہ بال..... بھرے بھرے ہونٹ اور گھنی مونچھوں نے انہیں بہت خوب اور وجیہ بنا دیا تھا۔

”کاش اس اچھی شکل کے ساتھ ساتھ اگر وہ اچھے کردار کے مالک بھی ہوتے..... تو..... کاش ان کا مقدر ہی اتنا اچھا ہوتا.....“ عالیہ نے سوچا۔ بے اختیار..... اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

اگلے دن جب وہ اپنا بستر وغیرہ بنا کر کمرے سے باہر آئی تو آج پھر لاؤنج میں ان کے خاص مہمان آئے ہوئے تھے۔

”عالیہ! آؤ..... یہ میرے بیٹے کی دوستیں ہیں، ان سے ملو آؤ..... یہ فیصلہ ہے..... اور یہ آسیہ.....“

آج پھر ایک نیا صدمہ منہ کھولے کھڑا تھا.....

”خدا! کیا اب ہر روز ان صدموں سے گزرنا پڑے گا..... میں آخر کہاں تک برداشت کروں گی... اور کیا دیکھوں گی.....؟“

”یا اللہ!“ اس نے دعا مانگی..... ”مجھ پر وہ بوجھ نہ ڈال جو میں برداشت نہ کر سکوں..... بے شک تو اپنے بندوں کو ان کے طرف سے بڑھ کر نہیں آزماتا۔“

اسے بہت افسوس ہو رہا تھا..... کیا مسعود کا میسٹ اتنا خراب تھا..... وہ دونوں انتہائی تھروڈ کلاس قسم کی عورتیں تھیں۔ بالکل ان پڑھے..... جاہل..... گنوار عجیب طرح باتیں کرتی ہوئی..... شوخ بیک اپ..... شوخ ملبوسات..... اور انتہائی فضول قسم کے زیورات پہنے ہوئے تھیں۔

ناک میں تھنی..... کانوں کی پوری لو بالیوں سے بھری ہوئی تھیں..... ہاتھوں اور پیروں میں انتہائی فضول قسم کی انگوٹھیاں پہنی ہوئی تھیں۔ انتہائی گھٹیا اور واہیات باتیں..... اور بے ہودہ قسم کے مذاق..... جنہیں امی جی اور دونوں نہیں بہت انبجائے کر رہی تھیں۔

چھوٹی آپا کے پاس بے ہودہ قسم کے لطفیوں کا کافی ذخیرہ تھا..... جس سے نہ صرف امی جی بلکہ وہ سب بہت لطف اندوز ہو رہی تھیں۔ جبکہ عالیہ بد مزہ ہو رہی تھی..... وہ ان کی باتوں پر مسکرا تک نہیں سکی..... وہ دونوں خواتین شاید بہت جلدی میں تھیں۔ چائے پی کر اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔ امی جی انہیں کھانے کے لیے روک رہی تھیں۔

”کھانا کھا کے جانا..... سودی کو آجانے دو پھر۔“

”پھر کسی دن آئیں گے..... آج تو ہم سودی کی دلہن کو دیکھنے آئے تھے۔“

انہوں نے مسعود کا انتظار نہیں کیا تھا..... آپا انہیں گیٹ تک چھوڑنے لگی تھیں۔

”امی جی! مسعود کی ایسی فضول عورتیں بھی دوست ہیں؟“

”کیا مطلب ہے تمہارا.....؟“ انہیں عالیہ کا سوال بہت برا لگا تھا۔

”میرا مطلب ہے..... کل بھی ایسی ہی چپ

سی عورتیں آئی تھیں۔

”تمہیں کیا تکلیف ہے..... اپنی حدیں نہ بڑھو..... نہیں تو مجھ سے مار کھاؤ گی.....“

”جی!“ وہ حیران رہ گئی۔

”جی.....“ انہوں نے اس کا منہ چڑایا.....

”منہ سنبھال کے بات کیا کرو..... نہیں تو ایسا تھپڑ پڑے گا کہ دن میں تارے نظر آجائیں گے۔“ وہ دہاڑ دہاڑ بول رہی تھیں۔ عالیہ ڈر گئی۔ وہ انتہائی غصے میں تھیں..... عالیہ بری طرح ڈر گئی..... ان سے کچھ بعید نہیں تھی کہ وہ اسے مار بھی سکتی تھیں۔ وہ سر جھکا کر خاموشی سے سنتی رہی۔ اس رات مسعود جب کمرے میں آئے تو بے حد غصے میں تھے۔

”یہ آج تم نے کیا بکواس کی تھی؟“

”جی.....؟“

”امی جی بتا رہی تھیں کہ تم نے میری دوستوں کو برا بھلا کہا ہے۔“

”برا بھلا تو نہیں.....“ وہ اپنی صفائی پیش کرنا چاہتی تھی مگر مسعود دہاڑ کر بولے۔

”اگر آئندہ ایسی بکواس کی تو میں تمہارا منہ توڑ دوں گا۔“

صدے کے مارے وہ لنگ ہو گئی تھی۔ وہ ایک لفظ بھی نہیں بول سکی..... جتنے غصے میں وہ آئے تھے اس سے زیادہ غصے میں وہ کمرے سے باہر چلے گئے۔ اسے چکر سا آگیا..... وہ کس قسم کے لوگوں میں آگئی تھی؟ ایک دم ہی دل متلانے لگا..... وہ تیزی سے اٹھ کر واش روم میں گئی..... تو اسے فٹے ہو گئی..... اب یہ نئی افتاد کیا تھی.....؟ کہیں اسے ہیضہ نہ ہو گیا ہو.....

طبیعت تھی..... کہ سنبھل ہی نہیں رہی تھی..... وہاں کوئی نہیں تھا، وہ کس کو بتاتی..... امی جی سے بات کرنے کوئی نہیں جا رہا تھا۔ اس نے سوچا وہ ما کو بتائے..... مگر وہ گون سا اس کا دکھ بانٹ

لیں گی..... الٹا اسی کو ڈانٹ دیں گی اور ڈانٹ کھانے کو اس کا جی نہیں چاہ رہا تھا۔ اس نے فریج کھول کر دیکھا..... وہ ڈرنکس اور فروٹ سے بھرا ہوا تھا..... چاکلیٹ اور آئس کریم بھی تھی..... اس نے دو آلو بخارے دھو کر کھائے..... اور بڈ ہال سی ہو کر لیٹ گئی۔ دوپہر شام میں دھل گئی تھی..... کسی نے اسے دوپہر کے کھانے تک کا نہیں پوچھا تھا..... وہ کچن میں چلی آئی..... خانسا ماں چائے بنا رہا تھا۔

”چھوٹی بیگم صاحب..... کچھ چاہیے جی؟“

”کھانے کے لیے کیا ہے؟“

”آپ نے دوپہر کا کھانا نہیں کھایا..... بیگم صاحب! آپ اپنے کمرے میں جائیں..... میں کھانا گرم کر کے لاتا ہوں۔“

”شکریہ۔“

کھانا بے حد لذیذ تھا..... خانسا ماں کے ہاتھ میں بہت لذت تھی۔ اس نے خوب سیر ہو کر کھایا..... رات کو سعود کا موڈ اچھا تھا مگر وہ بالکل چپ تھی..... اکثر وہ گھر پر ہی اپنا پینے پلانے کا شوق پورا کر لیا کرتے تھے۔ بیڑ کے کین سے فرنگ لدا ہوا تھا۔ ان کو اس طرح پیٹے ہوئے دیکھنا بہت تکلیف دہ تھا۔ وہ اٹھ کر باہر لان میں چلی جایا کرتی تھی۔ اس طرح واک بھی ہو جاتی تھی اور تسبیحات بھی مکمل ہو جاتی تھیں۔ آج بھی جب وہ اٹھ کر جانے لگی..... تو سعود نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”کہاں جا رہی ہو..... بیٹھ جاؤ۔“ وہ صوفے پر ان کے قریب بیٹھ گئی لیکن اس کا دل متلا رہا تھا۔ وہ ایکائیاں لیتے ہوئے اٹھی..... تو سعود نے اسے حیران ہو کر دیکھا۔

”کیا ہوا ہے؟ طبیعت تو ٹھیک ہے.....؟“ وہ دوڑ کر واش روم میں چلی گئی..... الٹیاں کر کر کے وہ بڈ ہال ہو رہی تھی۔ منہ دھو کر جب وہ باہر آئی..... تو سعود مسکرائے۔

”خیر ہے..... الٹیاں کیوں آرہی ہیں؟ کہیں پریگنٹ تو نہیں ہوگئی ہو؟“

”کیا.....؟“ اسے ایک شاک سا لگا۔

”ہاں..... ٹیٹ کر دانا پڑے گا۔ صبح ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں۔ لیکن تم سیلف ٹیٹ بھی کر سکتی ہو۔ یہ میرے پاس کچھ اگلس رکھی ہیں۔“ وہ سائڈ ٹیبل کی دراز میں کچھ ڈسٹونڈ رہے تھے پھر انہوں نے اسے طریقہ سمجھایا۔ وہ ان سے پوچھنا چاہتی تھی کہ یہ انہوں نے کھیرانی سائڈ ٹیبل کی دراز میں کس کے لیے رکھی ہوئی تھیں مگر وہ خاموش رہی..... وہ خوش نہیں تھی..... وہ اتنی جلدی ماں نہیں بننا چاہتی تھی..... وہ اس ماحول میں بچہ پیدا کرنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ اس رشتے کو مضبوط نہیں بنانا چاہتی تھی۔ وہ ان لوگوں کے ساتھ کوئی نیا رشتہ قائم نہیں کرنا چاہتی تھی مگر اس کے چاہنے یا نہ چاہنے سے کیا ہوتا ہے کیا یہ اس کے اختیار میں تھا؟ سعود ٹیٹ میں بہت دلچسپی لے رہے تھے۔ رزلٹ پوزیو تھا..... وہ بے حد خوش ہوئے۔

”صبح اسپتال چلیں گے..... گائنا کولو جسٹ سے ملنا ہوگا۔ صبح تیار ہو جانا۔“

”جی اچھا.....“ وہ بڈ ہال سی لیٹی رہی..... اور سعود اس کے سامنے بیٹھ کر پیتے رہے۔

پتا نہیں کیوں..... اسے رونا آئے جارہا تھا۔ آنے والا بچہ اس گھر میں آکر کیا ماحول دیکھے گا.....؟ اس دن جب اسپتال سے وہ گھر آئی تو پہلی مرتبہ اس کے سر اس کے کمرے میں آئے..... وہ بے حد خوش تھے۔ انہوں نے اسے مبارک باد دی..... اور اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے دعائیں دیں۔ اس شام کو ماما اور بابا پہلی مرتبہ اس کے گھر آئے مٹھائی اور پھل لے کر۔ وہ بہت خوش تھے۔

”تم پریشان کیوں ہو عالیہ؟ تمہیں تو خوش ہونا چاہیے..... اللہ تعالیٰ تمہیں اتنے بڑے اعزاز سے نواز رہا ہے۔“

”جی ماما..... میں خوش ہوں.....“

”لگ تو نہیں رہی ہو.....“

”وہ مجھے الٹیاں آرہی ہیں ناں.....“

”الٹیاں تو اس حال میں آتی ہیں..... یہ تو نارمل بات ہے، کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے۔“

”جی اچھا!“

”سب لوگ کہتے اچھے ہیں..... سعود تو بہار کتنا خیال رکھتا ہے..... تمہاری ساس اور مندریں کتنی اچھی ہیں، گھر بار، نوکر چاکر، گاڑیاں..... کسی چیز کی کمی نہیں ہے..... اللہ کا شکر ادا کیا کرو۔ اللہ نے تمہیں زندگی کی ہر نعمت سے نوازا ہے۔ خوش رہا کرو۔ ویسے بھی اس حال میں خوش رہنا بہت ضروری ہے۔“

”جی اچھا.....“ ماما کی باتیں سن کر وہ ایک گہرے دکھ میں ڈوب گئی۔ وہ ان سے پوچھنا چاہتی تھی کیا گھر بار، نوکر چاکر اور گاڑیاں زندگی کی خوشیوں کی ضمانت ہوتی ہیں مگر وہ ان سے بحث نہیں کرنا چاہتی تھی کیونکہ اس کے لیے دستور زباں بندی نافذ کر دیا گیا تھا۔ اسے ماما سے بہت جگہ تھا..... ماں ہو کر وہ اس کا حال نہیں جانتی تھیں تو پھر کوئی دوسرا کس طرح جان سکتا تھا؟ اس ایک سال کے عرصے میں وہ صرف دو تین مرتبہ ہی میکے گئی تھی۔ دل کے اندر کہیں وہ ان سے ناراض تھی..... ان سے ملنے کو اس کا جی ہی نہیں چاہتا تھا..... کبھی کبھی اس کا جی چاہتا وہ ماما سے پوچھے..... بظاہر جو نظر آ رہا ہوتا ہے کیا حقیقت میں بھی اسی طرح ہوتا ہے.....؟ وہ ماں ہو کر نہیں جان سکتی تھیں تو وہ بابا سے کیا امید رکھتی..... ان کی چار بیٹیاں تھیں..... اور بقول ان کے وہ اپنی ایک بیٹی کے فرض سے سبکدوش ہو گئے تھے یعنی ایک بیٹی کے بوجھ سے آزاد ہو گئے تھے۔ جب بھی ماما سے بات ہوتی..... وہ اسے سمجھاتیں۔

”تمہیں خود کو ان کے ماحول کے مطابق ڈھال لینا چاہیے..... مرد تو دراصل اپنے ہی ماحول

میں ہوتا ہے۔ بدلنا تو لڑکی کو پڑتا ہے..... لڑکی کو اپنے آپ کو مٹا کر سسرال کی پسند اور خواہش کے مطابق..... اور اس نے تو اپنے آپ کو فدا کر دیا تھا..... مگر پھر بھی شوہر کے دل میں کوئی جگہ نہیں بنا پائی تھی..... اور نہ اپنی ساس کی نظروں میں کوئی مقام حاصل کر سکی تھی۔ شاید شادی شدہ زندگی ایسی ہی ہوتی ہوگی.....! بظاہر نظر آنے والی زندگی حقیقت میں اتنی ہی مختلف ہوتی ہوگی۔ بظاہر خوش نظر آنے والی عورتیں اندر سے اتنی ہی ناخوش ہوتی ہوں گی مگر عالیہ نے ہوش سنبھال کر اپنے گھر میں تو ایسا نہیں دیکھا تھا..... ماما حقیقت میں خوش تھیں..... بابا ان کی عزت کرتے تھے..... ان کا بہت خیال رکھتے تھے۔ ان کا گھر تو امن، چین اور خوشیوں کا گہوارہ تھا۔ ماما بھلا اس کا دکھ کیسے جان سکتی تھیں..... جبکہ وہ اس آگ کے سمندر سے گزری ہی نہیں تھیں.....؟

☆☆☆

اس دن بھی اس کی طبیعت بہت خراب تھی..... صبح کے وقت بستر سے اٹھا ہی نہیں جاتا تھا..... اس عرصے میں وہ بہت کمزور ہو گئی تھی۔

”اٹھ جاؤ عالیہ بیگم..... کیا بخوس شکل لے کر لیٹی رہتی ہو.....؟“ سعود طنز سے بھرے لہجے میں بولے۔

”میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“

”بی بی تم انوکھا بچہ نہیں پیدا کر رہی ہو، دنیا کی ساری عورتیں یہی کام کرتی ہیں۔ بھی اٹھ کر خاوند کو اپنے ہاتھ سے ناشتا کروایا کرو، اس کے کپڑے استری کیا کرو، اس کے جوتے پالش کیا کرو، اپنے ہاتھ سے اسے ٹائی باندھا کرو، محبت سے مسکرا کر اسے گیٹ تک رخصت کیا کرو۔“ وہ خاموشی سے سنتی رہی..... شاید وہ سچ کہہ رہے تھے۔ اسے یہ سب کچھ کرنا چاہیے..... اس کی طبیعت ذرا سنبھل جائے تو وہ ضرور ان کی اس خواہش کو پورا کرے گی۔ دراصل ان کے گھر میں ہر کام نوکروں کے سپرد تھا۔ ملازموں

اس کے سامنے کھڑا ہوتا تھا۔

”دکھو! یہ سلسلہ کہاں جا کر ختم ہوگا؟ باری تعالیٰ! مجھے اور کتنی آزمائشوں سے گزرنا پڑے گا؟ آخر تک تک.....؟“ اباجی سے یہ امید نہیں تھی.....

جانے کیوں وہ سوچتی تھی اس گھر میں اباجی ہی اس کے خیر خواہ تھے اور شاید اس کے ہمدرد بھی..... مگر یہ تو سب کیا دھڑائی ان کا تھا۔ وہ آج ایک نئے صدمے سے دوچار تھی۔ وہ جس حالت میں گھر پہنچی تھی یہ تو ہو نہیں سکتا تھا کہ ماما کو اس کی حالت کا اندازہ نہیں ہو.....؟ آخر وہ ماں تھیں..... ماں سے زیادہ کون

اپنے بچے کے حال کو جانتا ہے؟ مگر جب اس نے کہا کہ وہ ہاتھ روم میں گر گئی تھی، اس کا پاؤں پھسل گیا تھا..... جس کی وجہ سے اس کے بازو اور کندھے پر چوٹیں آئی تھیں..... تو کیا ان کو یقین آ گیا تھا.....؟ کیا واقعی ان کو یقین آ گیا.....؟ لیکن اس وقت وہ کچھ بھی سوچنے کی پوزیشن میں نہیں تھی..... اگلے دن ماما اسے اسپتال..... لے کر گئیں..... اس کی گائناکولوجسٹ کے پاس.....

شکر ہے..... اس کا بچہ ٹھیک تھا..... اس نے اللہ کا شکر ادا کیا..... مگر جس دن سے وہ حاملہ ہوئی تھی..... وہ سخت ڈپریشن میں تھی..... ماما نے اسے تسلی دی۔

”اس حالت میں ڈپریشن ہو جاتی ہے، پوسٹ ڈیپریو ڈپریشن بھی ہو جاتا ہے..... مگر آہستہ آہستہ..... ٹھیک ہو جاتا ہے۔“

مگر اس رات اس سے مزید برداشت نہیں ہو سکا..... اور اس نے اپنا دل کھول کر مہرین کے سامنے رکھ دیا۔ شادی کی رات سے لے کر آج صبح تک اس نے مہرین سے ہر بات شیئر کی..... اور بے چاری مہرین کے تو حواس کم ہو گئے تھے۔ اس کی پیاری بہن جو اس کی بہترین دوست بھی تھی۔ اسے وہ اس صدمے سے دوچار کرنا نہیں چاہتی تھی اسے غمزدہ

”میں اسے بتا دوں گا..... تم تیار ہو جاؤ۔“

اودھ خدا! جیسے ہوا کا ایک خوشگوار جھونکا آیا تھا۔ اس کی ساس گھر پر نہیں تھیں۔

”اباجی! امی جی ہمیں ناراض نہ ہو جائیں..... میں نے ان سے تو اجازت لی ہی نہیں۔“

”کوئی بات نہیں..... تم فکر نہ کرو..... کوئی ناراض نہیں ہوگا..... بس تم تیار ہو جاؤ۔“

”تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے.....؟“

”جی، میں بالکل ٹھیک ہوں.....“

”مجھے تو ٹھیک نہیں لگ رہیں..... بیٹا! یہاں تم خوش تو ہو.....؟“

”جی اباجی.....“

”سعود تمہارا خیال رکھتا ہے؟“

”جی اباجی..... بہت خیال رکھتے ہیں.....“

اس نے یہ مشکل ضروری چیزیں بیک میں رکھیں اور جلدی سے گاڑی میں آکر بیٹھ گئی۔

”یہ کیا ہوا ہے..... یہ چوٹ کیسے لگی؟“ وہ اس کے چہرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔

”وہ اباجی! میں صبح گر گئی تھی۔“

”اپنا خیال رکھا کرو.....“ شکر ہے انہوں نے یہ نہیں پوچھا تھا کہ کیوں اور کیسے گر گئی تھیں۔

وہ گاڑی ڈرائیو کر رہے تھے..... اور عالیہ خاموش بیٹھی تھی۔ ”دراصل سعود کو اس کی ماں کے لاڈ اور پیار نے بہت بگاڑ دیا ہے..... مجھے تو اس کی شادی کی بہت فکر تھی کہ اسے کون رشتہ دے گا.....؟

خاندان اور آس پاس کے لوگ تو اس کی عادتوں اور خصلتوں سے واقف تھے..... ان میں سے تو کوئی اسے رشتہ دیتا نہیں تھا..... اس لیے تمہارے ابا نے جو نبی ہاں کی..... فوراً نکاح کر کے اس رشتے کو پکا کر دیا..... کہ ہمیں تمہارے ابا اس کی اصلیت جان کر انکار ہی نہ کر دیں..... ان کی اس خود غرضی پر وہ دکھ سے ساکت ہو گئی۔ ہر روز..... ہر قدم پر ایک نیا انکشاف

گی..... مگر وہ غم نہ رہی تھیں۔

”سودی اور مارا..... امدے اور تکلیف کی انتہا ہو گئی تھی۔ اس کا ذہن مکمل اندھیرے میں ڈوب گیا۔ پتا نہیں وہ کتنی دیر بے ہوش بڑی رہی تھی۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ اس نے اٹھنا چاہا..... تو کراہ کر گر پڑی..... جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔

معلوم نہیں وہ ٹھیک بھی تھی کہ نہیں، اس کا بچہ زندہ بھی تھا کہ نہیں..... پہلا خیال اسے یہی آیا تھا۔

”یا اللہ خیر..... ہمیں بچے کو نہ کچھ ہو گیا ہو؟“

تب ہی فون کی گھنٹی بج اٹھی..... وہ سننا نہیں چاہتی تھی اس میں اتنی ہمت نہیں تھی۔ مگر گھنٹی مسلسل بج رہی تھی۔ اس نمبر پر سوائے ماما اور بابا کے اور کوئی فون نہیں کرتا تھا..... اس نے ریسپور اٹھا کر کان سے لگایا۔

”عالیہ! تم کہاں ہو..... فون کیوں نہیں اٹھا رہی تھیں..... تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟“

”جی ماما..... میں ٹھیک ہوں.....“

”نہیں..... مجھے تمہاری آواز ٹھیک نہیں لگ رہی..... تمہارے بابا چاہتے ہیں کہ تم کچھ دنوں کے لیے ہمارے گھر آ جاؤ..... آج انہوں نے تمہارے سر سے بات کی ہے۔“

”جی اچھا.....“ اس نے ریسپور رکھ دیا..... شکر ہے، وہ خود ہی بولتی رہی تھیں..... ورنہ وہ اپنا بھر کم طرح رکھتی تھی۔ سارا دن وہ اپنے کمرے میں ایکیلی بستر پر پڑی رہی تھی۔ کسی نے اس کا حال تک نہیں پوچھا تھا۔ شام کو اس کے سر دروازے پر دستک دے کر اندر آ گئے۔

”عالیہ بچے! کیا حال ہے؟“

”جی، میں ٹھیک ہوں۔“

”تمہارے ابا کا فون آیا تھا..... تم پکینگ کر لو..... میں تمہیں چھوڑ آتا ہوں۔“

”جی اچھا..... مگر سعود سے تو پوچھا ہی نہیں۔“

کی ایک فون تھی، جو بڑے اچھے طریقے سے اپنے فرائض انجام دیتی تھی۔ سعود ٹھیک کہتے ہیں..... آخر بیوی کی بھی کچھ ذمے داریاں ہوتی ہیں، اسے خود پر شرمندگی ہو رہی تھی۔

”کیا سوچ رہی ہو.....؟“

”کچھ نہیں.....“ وہ نامی بولی۔

”میں کیا بکواس کر رہا ہوں.....“ وہ شدید غصے میں بولی۔

”میں نے سنا نہیں.....“

”تم نے سنا نہیں..... کیا تم بہری ہو.....؟“

اٹھو..... بستر کا پیچھا چھوڑو..... کیا بیماروں کی طرح سارا دن پڑی رہتی ہو، امی بھی کل یہی کہہ رہی تھیں۔

”اچھا..... تو یہ امی جی کی پڑھائی ہوئی پٹی ہے۔“ بے اختیار اس کے منہ سے نکل گیا۔

”کیا کہہ رہی ہو..... امی جی کی شان میں گستاخی کر رہی ہو.....“ انہوں نے ایک جھٹکے سے اسے بستر سے اٹھایا..... اور اپنے سامنے کھڑا کر دیا..... بالوں سے بچھ کر اس کا چہرہ قریب کیا۔

”کس بات کا تمہیں غور ہے؟ بتاؤ.....“

جواب دو..... بولتی کیوں نہیں ہو؟ جواب دیتے ہوئے تمہاری شان میں کمی آتی ہے۔ پریگنٹ ہو کر اتر رہی ہو، ابھی ٹھنڈوں اور کولوں سے تمہارا مزاج درست کر دوں گا..... سمجھیں..... نہ یہ بچہ رہے گا.....

اور نہ یہ تمہارا گھمنڈ.....“ وہ چیخ چیخ کر بول رہے تھے..... اور وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اس کا رنگ خطرناک حد تک زرد ہو گیا تھا۔ انہوں نے ایک جھٹکا دے کر اسے نیچے گرا دیا..... وہ اب ان کی ٹھوکروں کی زد میں تھی..... اس میں اتنی بھی سکت نہیں تھی کہ وہ چیخ ہی سکتی، تکلیف کی شدت سے وہ کراہ رہی تھی.....

بند ہوتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ اس نے دیکھا..... امی جی اور بڑی آپا اس کے کمرے میں داخل ہوئی تھیں..... اس نے سوچا وہ اسے سعود سے بچالیں

دو لاکھ کئی لکھی گونے میں اور ملک گھر میں

گھر بیٹھے

رسالے حاصل کیجیے

جاسوسی ڈائجسٹ سسٹمز ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ ماہنامہ سرگزشت

باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں، اپنے دروازے پر

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زر سالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 700 روپے

امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 7,000 روپے

بقیہ ممالک کے لیے 6,000 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد

رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے

ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر

رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔

یہ آپ کی طرف سے اپنے پیاروں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے

ہر دن ملک سے قارئین صرف دو ٹریلین یونین ہائی گرام کے

ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر

بھاری بینک فیس عاید ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔

رابطہ: شرعباس (فون نمبر: 0301-2454188)

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63، فیز 11، بینشین ڈسٹری بیوٹرز، اٹھارہویں کویٹہ روڈ، کراچی

فون: 35895313، فیکس: 35802551

ماہنامہ پاکیزہ - دسمبر 2012ء - 24

میرے سعود کا وارث..... ہمیں لڑکی نہیں چاہیے۔“
اس کا جی چاہتا..... وہ ان سے کہے..... کیا اس کے
اختیار میں تھا.....؟ کیا یہ ای جی کے اختیار میں
تھا؟ ان کے چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔ اور اب
ڈاکٹروں نے اسے جڑواں بچوں کی نوید سنائی تھی۔
الہا ساؤنڈ میں ہر مرتبہ ڈاکٹر کو بچے کی پوزیشن سمجھ
میں نہیں آتی تھی..... پتا نہیں کیا ہوگا؟ آخری دنوں
میں اس کا وزن بہت بڑھ گیا تھا..... سانس لینی بھی
دشوار ہو رہی تھی..... وزن کے باوجود اندرونی طور پر
بہت کمزور ہو رہی تھی اور پھر زندگی اور موت کی کشمکش
میں مبتلا ہو کر اس نے دو جڑواں بچوں کو جنم دیا۔
سارے خاندان میں خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ اس نے
ایک نہیں دو دو بیٹوں کی خوشخبری دی تھی۔ اس کا خیال
تھا..... دو بیٹوں کی ماں بن کر شاید اس کی ذات کی
اہمیت کچھ بڑھ جائے گی مگر یہاں تو اس کی اہمیت
پہلے سے بھی کم ہو گئی تھی۔ اس کے وجود کو تو بالکل ہی
نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ البتہ دونوں بچوں کو بہت
زیادہ ہاتھوں ہاتھ لیا گیا تھا۔ ان کی خوشی کا تو کوئی
عالم ہی نہیں تھا..... دعوتوں اور منہائیوں کا سلسلہ تھا
کہ ختم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ سعود نے آتش بازی
سے لے کر رقص و سرور کی محفلیں تک سجانے کی انتہا
کر دی تھی اور اُدھر..... ماما اور بابا نے صدقات اور
خیرات کی انتہا کر دی تھی..... اپنی پیاری بیٹی کی صحت
اور زندگی کے لیے انہوں نے سجدوں میں گر کر اور
آنسو بہا کر دعا میں مانگی تھیں اور جب ڈاکٹر نے
انہیں بچوں کی نوید سنائی تھی..... تو وہ حدہ شکر
بجالائے تھے۔ اللہ نے ان کی بیٹی کو نئی زندگی عطا
فرمائی تھی۔ دونوں بچے بہت پیارے تھے..... اباجی
نے پوتوں کے نام پہلے سے سوچ رکھے تھے۔ شیر
سلیمان..... اور شیر زمان..... دونوں کی شکلیں بھی
ایک دوسرے سے مختلف تھیں اور مزاج بھی.....
دونوں ماشاء اللہ صحت مند تھے۔ عالیہ حیران تھی۔

کے گھر رہی..... اور اس نے یہ سات دن اپنے
پیارے بھائی اور تین بہنوں کے ساتھ مل کر بہت
خوشگوار گزارے۔ اگلے ہفتے جب اسے لینے کے
لیے سعود آئے تو وہ تازہ دم ان کے ساتھ جانے کے
لیے تیار تھی۔ وہ جب گھر پہنچی..... تو امی جی لاؤنچ
میں بیٹھی ہوئی تھیں۔
”آگئی بی بی..... بڑی خوش لگ رہی
ہو..... یہاں تمہیں کیا موت بڑی رہتی ہے۔“ وہ
خاموشی سے اپنے کمرے میں آ گئی۔ وقت کئی مہم
رفقار سے گزر رہا تھا۔ پانچ وقت کی نماز تو وہ شروع
سے پڑھتی تھی مگر اب اس کا زیادہ تر وقت قرآن
پاک کی تلاوت اور تسبیحات میں گزرتا تھا..... نماز
حاجت پڑھ کر وہ بہت تفصیل کے ساتھ دعا مانگتی تھی۔
ماما نے انہیں بچپن سے سکھایا تھا جو کچھ مانگنا ہے اللہ
سے مانگو..... وہ زمین اور آسمانوں کے خزانوں کا
مالک ہے..... وہ ہر چیز پر قادر ہے..... ہر چیز اس
کے دست قدرت میں ہے۔“ ماما نے اسے کہا تھا۔
”حاملہ لڑکیوں کو سورہ یوسف اور سورہ مریم ضرور پڑھنی
چاہیے۔“ جس طرح ماما نے اسے دعا سکھائی تھی وہ
اسی طرح مانگتی تھی۔
”اے باری تعالیٰ! مجھے صحت مند، تندرست،
لمبی زندگی والا نازل بچہ عطا فرما..... مجھے نیک اور
صالح اولاد سے نواز.....“ اور اللہ تعالیٰ سے دعا
مانگ کر اس کا دل یقین و ایمان کے احساس سے بھر
جاتا تھا..... اللہ! جو لوگوں کے مجیدوں کو جانتا ہے۔
جو سننے والا..... اور بہت زیادہ عطا کرنے والا ہے۔
جو اپنے بندوں کے حال سے خبردار اور باریک بین
ہے۔“ اے باری تعالیٰ..... میں تیری عبادت کرتی
ہوں اور تجھ سے ہی مدد مانگتی ہوں۔“ جوں جوں
وقت قریب آ رہا تھا..... پتا نہیں کیوں..... اسے ڈر
لگنے لگا تھا۔
امی جی نے کہا تھا..... ”لڑکا ہونا چاہیے.....“

دیکھ کر وہ اور بھی دکھی ہو گئی۔ مگر وہ کیا کرتی.....؟ بہت
مجبور ہو کر اس نے مہرین سے وہ سب کچھ کہا تھا.....
لیکن اب کیا ہو سکتا تھا.....؟ وہ اپنی پیاری بہن کے
لیے کر ہی کیا سکتی تھی..... بہت دنوں کے بعد آج
رات وہ اس طرح پرسکون ہو کر سوئی تھی..... کتنے
عرصے بعد ایسی گہری نیند آئی تھی۔ اس رات اس نے
پھر وہی خواب دیکھا..... وہی حجرہ تھا..... وہی مہم سا
اندھیرا تھا..... عنابی ویز قایلین بچھا تھا..... وہ ننگے
پاؤں تھی..... اور قایلین کی نرمابٹ میں اس کے
پاؤں دھنس رہے تھے۔ وہ سامنے بیٹھے تھے..... ان
کے چہرے کے ایک حصے پر روشنی پڑ رہی تھی..... ان
کی روشن پیشانی دمک رہی تھی..... آنکھیں جھکی ہوئی
تھیں..... سمجھو یہ سنہری داڑھی ان کے چہرے پر بہت
اچھی لگ رہی تھی..... سر پر نماز والی سفید ٹوپی تھی.....
وہ سفید لباس میں تھے..... اور وہ دو زانو بیٹھے
تھے..... وہی دلی میں اتر جانے والی مہک چاروں
طرف پھیلی ہوئی تھی۔
انہوں نے اسے نام لے کر پکارا تھا۔
”عالیہ! انا للہ وانا الیہ راجعون کثرت سے
پڑھا کرو۔“ اور اس کی آنکھ کھل گئی.....
وہ وہی..... پڑھ رہی تھی..... اور اس کے دل پر ایک
سکون سا نازل ہو رہا تھا..... اسے اپنا جسم بالکل ہلکا
پھلکا محسوس ہو رہا تھا۔ اور ایک روحانی خوشی کا
احساس ہو رہا تھا۔ فجر کی اذان ہو رہی تھی۔ اس نے
نماز پڑھ کر انا للہ..... کی بے شمار تسبیحات پڑھیں اور
جیسے عیم کا بوجھ اس کے دل سے سرک گیا۔ اللہ کی مدد
اس کے شامل حال تھی..... اپنے ایک نیک بندے کی
ذریعہ وہ اس کی رہنمائی کر رہا تھا..... اسی اطمینان
اور سکون کی کیفیت میں ڈوب کر وہ بے فکر سو گئی۔ صبح
وہ ایک بدلی ہوئی عالیہ تھی..... اسے جیسے کا جیسے ایک
نیا حوصلہ مل گیا تھا..... ہر دم اور فکر سے آزاد..... اس
نے اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کر دیا تھا۔ وہ پورا ہفتہ ماما

”وہ رات کو شیر و کا پٹی چھینج کرنے کے لیے
اٹھی تھی کہ چکر اگیا..... سردیوار سے جاگلا۔“
”بیٹا اپنا خیال رکھا کرو..... ایک دم ہڑ بڑا کر
رات کو نہ اٹھا کرو، اچھا ہے..... ایک بچہ کو تمہاری
ساس سنبھالتی ہیں، ورنہ تو تمہارے لیے بڑی مشکل
ہو جاتی.....“
”نہیں ماما..... آپ کیسی باتیں کرتی ہیں.....
کوئی مشکل نہ ہوتی..... وہ اسے ڈبے کا دودھ
پلا رہی ہیں۔“
”کوئی بات نہیں بیٹا..... تم پہلے ہی بہت کمزور
ہو..... اپنی خوراک کا بہت زیادہ خیال رکھو..... میں
یہ تمہارے لیے تجخیری بنا کر لاتی ہوں..... ہر روز صبح
تھوڑی سی کھا کر گرم دودھ پی لیا کرنا..... ناشتا بے

اللہ نے اس کے حصے کا رزق بھی اس کی چھتائیوں میں اتارا تھا..... مگر اسے اس نعمت سے محروم کر دیا گیا تھا۔ وہ کتنی مجبور مائل تھی۔ سوائے رونے کے وہ کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے سوا اس کے پاس چارہ بھی کیا تھا اور جب وہ اپنے کمرے میں بچے کا کاٹ رکھوا رہی تھی تو سعود نے بچے کو کمرے میں رکھنے کی اجازت نہیں دی۔

”اسے تم امی کے حوالے کر دو..... میں رات کو جاگ نہیں سکتا۔ مجھے بچوں کے رونے سے سخت نفرت ہے۔“

”پلیز..... سعود..... ایسا مت کیجیے..... یہ ہمارا بچہ ہے، ہم اس کے بغیر کس طرح رہ سکتے ہیں۔“

”تم اپنی بات کرو..... میں تو اس کے بغیر بہت خوش رہ سکتا ہوں۔“

”استغفار..... سعود اللہ سے ڈریں..... ناشکری
... مت کیجیے۔“ اس کا دل کانپ اٹھا تھا۔

”میں ساتھ والا کمرہ اس کے لیے ٹھیک کر لیتی ہوں۔“

”نہیں..... وہ کرا اکثر میرے استعمال میں رہتا ہے۔“

”سعود پلینر.....“ وہ رو پڑی..... ”ایسا نہ
کرس۔“

”اچھا..... چلو..... ٹھیک ہے۔“ وہ مان گئے
..... بالکل غیر متوقع طور پر..... جس کا اسے گمان تھا
اور نہ یقین..... اور جب وہ سائڈروم میں شہر سلیمان
کی چیزیں رکھوا رہی تھی تو وہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ وہ
کانی بڑا کرتھا۔ ایک طرف صونے رکھے ہوئے
تھے اور ایک طرف وسیع و عریض بیڈ..... وہاں انتہائی
چستی اور خوب صورت فرنیچر تھا..... کمرے کی کلر اسکیم
رُست اور آف وائٹ تھی..... اس کا ایک دروازہ ان
کے بیڈ روم میں کھلتا تھا..... اور ایک باہر برآمدے
میں..... شدید وہ گیٹ روم تھا..... مگر گیٹ روم تو مگر

کر بولی۔ پتا نہیں اس میں اتنی ہمت کہاں سے آگئی تھی۔ ”میں اپنے بچے خود پالوں گی۔“

”کیا کہا.....؟“ انہوں نے اسے بالوں سے پکڑ کر اس کا چہرہ اپنے قریب کر لیا..... ”ذرا پھر سے کہو..... تم نے کیا کہا ہے؟“

”مجھے میرے بچے جاہیں۔“

”اچھا..... یہ بچے تم پیچھے سے لے کر آئی ہو..... کچھ جانتاؤ..... یہ بچے میرے ہیں بھی کہ نہیں۔“ انہوں نے اسے اس زور سے دھکا دیا کہ وہ دیوار سے جا لگی۔ اس کے سر میں شدید چوٹ لگی تھی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے تارے ناچ رہے تھے..... درد کی شدت سے جیسے آگ سی لگی تھی..... اس کا جی جاہ رہا تھا کہ کچھ چیخ کر بولے۔

”ہاں، یہ بچے میرے ہیں..... یہ بچے تمہارے نہیں ہیں..... بچے صرف میرے ہیں..... میں نے انہیں نو مہینے تک اپنی کوکھ میں رکھا ہے۔ اپنے خون سے انہیں سینچا ہے۔ درودِ سہہ کر میں نے انہیں جنم دیا ہے۔ تمہاری ماں انہیں مجھ سے کس طرح چھین سکتی ہے۔ میں نے انہیں اپنی جان پر کھیل کر جنم دیا ہے۔ تمہاری ماں انہیں مجھ سے کس طرح دور کر سکتی ہیں؟“ مگر وہ ایک لفظ بھی نہ کہہ سکی..... لیکن پھر جانے ان لوگوں کو کیا خیال آیا تھا..... انہوں نے شیر سلیمان کو اسے دے دیا تھا۔ اور وہ اسے گلے لگا کر بہت روئی..... کتنی دیر تک روتی رہی..... سو یا ہوا بچہ جاگ گیا تھا..... اور اب وہ رو رہا تھا وہ جانتی تھی وہ بھوکا رو رہا تھا..... اسے بھوک لگی تھی..... اور اللہ نے اس کا رزق پہلے اس کے سینے میں اتار دیا تھا۔ اس کے لیے دودھ کی نہریں جاری کر دی تھیں۔ وہ جب شیر سلیمان کو دودھ پلا رہی تھی تو اسے شیرِ زمان یاد آ رہا تھا..... پتا نہیں اس نے دودھ پیا ہوگا کہ نہیں..... وہ رو نہ رہا ہو..... پتا نہیں وہ سو رہا تھا یا جاگ رہا تھا؟ وہ اپنی ماں کے لُس کو ڈھونڈ رہا ہوگا۔

انہیں صرف دیکھتے رہنے سے ہی دل خوشی سے بھر جاتا تھا۔ ان پر بے تحاشا اُنڈر مڈ کر پیا راتا۔ پتا نہیں..... یہ پیار کے سوتے کہاں سے پھوٹے تھے، اس کا تو بس سارا وجود ہی جل تھل ہو گیا تھا..... شاید یہی مامتا تھی..... کتنی صدیوں کے بعد وہ ہنسی تھی..... ایک سچی اور کھرہی ہنسی..... سب کچھ اچانک ہی کتنا اچھا لگنے لگا تھا۔ وہ ہر وقت دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کرتی..... چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے..... لیٹے ہوئے سوتے ہوئے..... ابھی وہ پوری طرح اللہ کا شکر بھی ادا نہیں کر پائی تھی کہ امی جان نے شاہی فرمان جاری کر دیا۔ ”دونوں بچے میرے پاس رہیں گے.....“
عالیہ کو کیا پتا کہ بچے کس طرح پالے جاتے ہیں۔“
”نہیں..... پلیز.....“ سعود اس طرح مت کیجیے..... مجھے بچوں سے دور مت کیجیے..... ہر ماں جانتی ہے کہ بچے کس طرح پالے جاتے ہیں۔“
”اچھا.....“ وہ طنز یہ بنے۔ ”آج سے پہلے تم نے کتنے بچوں کو پالا ہے؟“

”وہ تو ٹھیک ہے، سہو دگر پلیر.....“ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے..... ”مجھ پر یہ ظلم نہ کیجیے۔“

”اچھا تو ظلم ہے..... بچے دادی کے پاس رہیں یہ ظلم ہے؟“ وہ زہر خند لہجے میں بولے..... ”واقعی اس سے بڑا ظلم تو کوئی ہو ہی نہیں سکتا..... بڑی آپا اور چھوٹی آپا بھی ایسی چاہتی ہیں کہ بچے ان کے پاس رہیں..... اور پھر یہ بچے میں نے تمہارے لیے پیدا نہیں کیے۔ اپنی ماں اور بہنوں کے لیے پیدا کیے ہیں۔“

”مگر وہ میرا دودھ پتے ہیں۔“

”دودھ ڈبوں کا بھی پرایا جاسکتا ہے۔“
”بچے کی صحت کے لیے ماں کا دودھ بہت ضروری ہے۔“

”اوشٹ اپ..... میں تمہاری بکواس نہیں سن سکتا.....“

”میں انے بجے کی کو نہیں دوں گی.....“ وہ چیخ

شک بعد میں کر لیا کرو۔“ بچوں کی پیدائش کے بعد اس میں کافی تبدیلی آگئی تھی۔ اس نے حالات سے سمجھوتا کر لیا تھا۔ کیونکہ ماما نے کہا تھا۔ ”جو عورت قربانی نہ دے سکے اور حالات سے سمجھوتا نہ کر سکے وہ عورت ہی نہیں۔۔۔۔۔ گھر کے حالات ٹھیک رکھنے کے لیے عورت کو بہت قریبائیاں دینا پڑتی ہیں اور قدم قدم پر سمجھوتے کرنا پڑتے ہیں۔ ورنہ زندگی بہت مشکل ہو جاتی ہے۔“ اور وہ اپنی زندگی کو مزید مشکل نہیں بنانا چاہتی تھی۔ اپنے لیے اس نے خود آسانیاں پیدا کر لی تھیں۔ اب وہ ہر روز باہر لاؤنج میں بیٹھنے لگی تھی۔ شاید اس لیے کہ امی جی سارا دن لاؤنج میں گزارتی تھیں۔۔۔۔۔ اس طرح شیر زمان اس کی نظروں کے سامنے رہتا تھا۔ وہ اکثر اس کے سارے کام اپنے ہاتھ سے کرنے کی کوشش کرتی۔۔۔۔۔ اس کا فیڈر دھو کر دودھ بنا کر دیتی۔۔۔۔۔ اسے دودھ پلا کر اسے سلا دیتی۔۔۔۔۔ اس کی پیپی تبدیل کر دیتی۔۔۔۔۔ اسے امی جی بھر کر پیار کرتی۔۔۔۔۔ اسے اپنی گود میں سلا لیتی۔

امی جی کے پاس قسم قسم کی عورتوں کا جھگڑا رہتا تھا۔ جس قسم کی وہ باتیں کرتی تھیں۔ وہ اس کے ذوق سلیم پر بے حد گراں گزرتی تھیں۔۔۔۔۔ سارا وقت غیبتیں کرنے اور غیبتیں سننے کے علاوہ ان کے پاس اور کوئی کام نہیں تھا۔ وہ دوسروں کے معاملات میں بہت دلچسپی لیتی تھیں۔۔۔۔۔ تجسس اور گریڈان میں کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔۔۔۔۔ انتہائی گندے اور بے ہودہ لطفیوں کا تبادلہ ہوتا اور وہ لوگ ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو جاتے۔۔۔۔۔ جبکہ وہ مسکرا بھی نہیں پاتی۔ چھوٹی آپا کے پاس تو ایسے دواہیات لطفیوں کا بھی نہ ختم ہونے والا ذخیرہ تھا اور امی جی تو سب سے زیادہ لطف اندوز ہوتی تھیں۔ اسے حیرت ہوتی۔۔۔۔۔ بجائے بیٹی کو منع کرنے کے وہ اس کی اور زیادہ حوصلہ افزائی کرتی

تھیں۔ اسے ایک عجیب بدمزگی کا احساس ہوتا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ وہ وہاں سے اٹھ کر چلی جائے مگر شیر زمان نے اسے خود سے باندھ کر رکھا ہوا تھا۔۔۔۔۔ وہ شیر سلیمان کے مقابلے میں کمزور تھا۔ امی جی اسے عجیب طریقے سے ڈریس اپ کرتی تھیں۔ وہ لڑکا تھا مگر اسے لڑکیوں والے فرائد پہنائے جاتے۔ ہر روز سر میں تیل لگاتیں، وہ بڑے فخر سے سب کو بتاتیں کہ وہ شیر زمان کی اصلی گھی سے ماش کرتی تھیں۔ آنکھوں میں بھر بھر کے سرمہ لگاتیں۔۔۔۔۔ کاش وہ اسے ہر روز نہ لایا بھی دیا کرتیں۔۔۔۔۔ اس سے ایک عجیب سی بسا آتی تھی۔۔۔۔۔

”واہ! میرا شیر بہادر“ عالیہ کا اسے دیکھ دیکھ کر دل کڑھتا۔۔۔۔۔ مگر وہ کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی اور سحود سے تو کچھ کہنا ہی بیکار تھا۔ کتنے دنوں سے ماما کہہ رہی تھیں کہ وہ کچھ دنوں کے لیے دونوں بچوں کو لے کر ان کے گھر رہنے کو آئے۔ مگر وہ جانتی تھی ایسا ممکن نہیں۔۔۔۔۔ وہ شیر زمان کو اس کے ساتھ ہر گز نہیں جانے دیں گی۔ اس لیے وہ باڈل ناخواستہ ماما کے گھر جانے کے لیے تیار ہو گئی تھی۔ شیر سلیمان کا سارا سامان گاڑی میں رکھا جا چکا تھا۔ وہ امی جی کو خدا حافظ کہنے کے لیے لاؤنج میں آئی تو وہ اسے دیکھ کر بہت حیران ہوئیں۔

”کہان کی تیاریاں بی بی بی۔۔۔۔۔؟“

”بابا کے گھر۔۔۔۔۔ وہ ماما کہہ رہی تھیں کہ دونوں بچوں کو لے کر ملنے کے لیے آؤ۔“

”اچھا۔۔۔۔۔! کوئی ضرورت نہیں ہے، بچوں کو ساتھ لے کر جانے کی۔۔۔۔۔“ انہوں نے شیر سلیمان کو اس کی گود سے لیا۔ ”بڑی آئیں تمہاری ماما۔۔۔۔۔ وہ کون ہوتی ہیں ہمارے بچوں کو بلوانے والی، جاؤ ان سے کہہ دینا منہ دھو کر رکھیں یہ ان کے بچے نہیں

ہیں۔ یہ ہماری اولاد ہے۔“ اور وہ کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ بھی وہ انہیں دیکھتی۔۔۔۔۔ اور کبھی اپنی خالی گود کو۔۔۔۔۔ اور کبھی شیر سلیمان کو۔۔۔۔۔ جو اس کے پاس آنے کے لیے ضد کر رہا تھا۔ بے اختیار اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

”پلیز امی جی! اس طرح نہ کریں۔۔۔۔۔ شیر سلیمان میرا دودھ پیتا ہے۔“

”پتا ہے۔۔۔۔۔ دودھ پیتا ہے تمہارا۔۔۔۔۔ وہ ڈبے کا دودھ پی سکتا ہے۔۔۔۔۔ شیر زمان کی طرح۔۔۔۔۔ تم جاؤ اپنی ماں کو جا کے مل آؤ فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔“

”نہیں امی جی! میں نہیں جاتی۔۔۔۔۔ میں پھر کسی دن چلی جاؤں گی۔“

”تہا۔ کیا خیال ہے پھر کسی دن تم بچوں کو لے کر اپنے میکے چلی جاؤ گی، یہ خیال دل سے نکال دو، جانا ہے تو جاؤ، ورنہ آرام سے بیٹھ جاؤ۔“ اور وہ روتے ہوئے گاڑی میں بیٹھ گئی۔ ماما اسے دیکھ کر حیران رہ گئیں۔

”بچے کہاں ہیں۔۔۔۔۔ کیا تم اکیلی آئی ہو؟“

”امی جی نے بچوں کو نہیں آنے دیا۔“

”کیوں۔۔۔۔۔؟“

”وہ ان کے بغیر اداس ہو جاتی ہیں ناں۔“

”اور ہم۔۔۔۔۔ کیا ہم اداس نہیں ہوتے۔۔۔۔۔؟“

کیا تمہارے بچوں پر ہمارا کوئی حق نہیں ہے۔ عجیب لوگ ہیں۔“ پہلی مرتبہ ماما کے منہ سے اس نے ایسی باتیں سنی تھیں۔ ورنہ وہ تو ہمیشہ انہی کی طرف داری کرتی تھیں۔ وہ رہنے تو ایک ہفتے کے لیے آئی تھی سارا سامان بھی گاڑی میں رکھا تھا۔ مگر وہاں دو گھنٹے گزارنا بھی اس کے لیے مشکل ہو گیا۔ اسے ایک پل چنن نہیں آ رہا تھا۔ شیر سلیمان رو رہا ہوگا، اس کی فیڈ کا وقت ہو رہا تھا۔ دوسرے دودھ سے کہیں اس کا پیٹ ہی خراب نہ ہو جائے، کہیں۔۔۔۔۔ بچہ وہ ماما کو خدا حافظ کہہ کر چلی آئی۔۔۔۔۔ حالانکہ آج کل

ہمایوں گھر آیا ہوا تھا۔۔۔۔۔ ابھی وہ اپنے کسی دوست سے ملنے گیا ہوا تھا۔ بمبیں ابھی کالج سے نہیں لوٹی تھیں، بابا کے آنے کا بھی اس نے انتظار نہیں کیا۔۔۔۔۔ اور جب وہ گھر پہنچی تو اس نے اطمینان کی سانس لی۔ شیر سلیمان سو رہا تھا وہ اسے اٹھا کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ خدایا! کس طرح دل ٹوٹا تھا۔۔۔۔۔ یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ یہ لوگ اس کے ساتھ اس طرح بھی کر سکتے ہیں؟ یہ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ وہ شیر سلیمان کو گلے لگا کر روئی رہی۔۔۔۔۔ اور پتا نہیں کب تک روئی رہی۔۔۔۔۔ وہاں اس کے لیے پریشان ہونے والا کوئی نہیں تھا۔۔۔۔۔ اسے چپ کرانے والا کوئی نہیں تھا اور پھر اس نے ماما کے گھر جانا ہی چھوڑ دیا۔۔۔۔۔ کبھی کبھار وہی لوگ آ کر اسے مل جاتے۔۔۔۔۔ بچوں سے مل کر خوش ہو جاتے۔۔۔۔۔ اور اس نے جیسے حالات سے سمجھوتا کر لیا تھا اپنے بچوں کی خاطر اس ماحول میں خود کو ایڈجسٹ کر لیا تھا۔ وہ گھر۔۔۔۔۔ جہاں کوئی اس کا نہیں تھا۔ مگر اس کے بچے تو اس کے اپنے تھے۔۔۔۔۔ وہ اکیلی نہیں تھی شیر سلیمان اور شیر زمان اس کے ساتھ تھے۔۔۔۔۔ اور اس سے بڑھ کر اور کون سی اچھی بات ہو سکتی تھی۔ بہت عرصے کے بعد اس دن عالیہ نے شکرانے کے نفل پڑھے اللہ سے اپنی خطاؤں اور کوتاہیوں کی معافی مانگی۔ اللہ کی حمد و ثنا کرنے کے بعد اس نے اپنے رب کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا۔۔۔۔۔ جس نے اسے دودھ بیٹوں کی نعمت سے نوازا تھا۔ یہ اس کی کتنی بڑی مہربانی تھی۔ اس گھر میں اللہ نے اس کے لیے کتنی بڑی خوشی اور دلچسپی کا سامان پیدا کیا تھا۔ شیر سلیمان اور شیر زمان اگر نہ ہوتے۔۔۔۔۔ تو وہ کیا کرتی۔۔۔۔۔؟ کس طرح جیتی۔۔۔۔۔؟ وہ کتنی دیر تک جدے میں گر کر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتی رہی۔ اور جیسے اس کا دل سکون سے بھر گیا۔ وہ ماما اور بابا سے ہر روز فون پر بات تو کر سکتی تھی۔ ہمایوں۔۔۔۔۔ مہرین۔۔۔۔۔ امین اور فاطمہ کا فون

تو سن سکتی تھی۔ شکر ہے، فون کرنے پر اس پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ یہی بہت غنیمت تھا..... اور اس نے ہر حال میں خوش رہنا سیکھ لیا تھا۔ وہ اللہ کی کس کس مہربانی کا شکر ادا کرتی۔

☆☆☆

بچوں کی وہ پہلی سالگرہ تھی گھر میں جشن کا سماں تھا۔ باہر لان میں سارا انتظام کیا گیا تھا۔ بے حد خوب صورت لائٹنگ کی گئی تھی۔ پورا گھر جگمگ جگمگ کر رہا تھا۔ وسیع و عریض لان میں بہت خوب صورت اینچ بنایا گیا تھا۔ پتا چلا کہ ڈنر کے بعد ملک کے نامور گلوکاروں کو مدعو کیا گیا تھا۔ اس کے بھی گھر والے آرہے تھے اور اس شام بہت عرصے بعد وہ بہت اچھی طرح تیار ہوئی تھی۔

امی جی کا تو اصرار تھا کہ وہ ویسے والا جوڑا پہنے اور پورا زیور مگر وہ بچوں کے ساتھ اتنا بھاری جوڑا پہننے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی اور اس پر ان کی تاکید تھی کہ وہ پورا زیور بھی پہنے مگر اس نے ماما کی طرف کا ایک بہت ہی نفیس کام والا سیاہ جوڑا پہنا تھا۔ گہرے میک اپ اور ہلکے زیورات میں وہ سیاہ رنگ میں بہت اچھی لگ رہی تھی۔ اس دن سعود بھی بہت خوش تھے۔ بقول امی جی کے آج ان کی ساری سہیلیاں جو آرہی تھیں۔ اب ایسی باتوں پر اس نے اپ سیٹ ہونا چھوڑ دیا تھا۔ ان کی کسی بات پر اب اسے دکھ نہیں ہوتا تھا وہ جو مرضی کریں عالیہ کو کوئی سرورگار نہیں تھا۔

وہ شیر سلیمان کو برام میں بٹھا کر باہر لان میں لے آئی۔ موسم بہت خوشگوار تھا۔ انتظامات بہت اچھے تھے۔ شہر کے مشہور کیرے کیرنگ کروائی گئی تھی۔ ماما اور بابا اور سب لوگ آچکے تھے۔ بہت عرصے بعد اس طرح اکٹھے بیٹھنے کا موقع ملا تھا۔ وہ شیر زمان کو بھی اپنے پاس لے آئی تھی۔ وہ سب لوگ ان دونوں کو دیکھ بہت خوش ہو رہے تھے۔ ان کی پیاری پیاری باتیں اور حرکتیں انجوائے کر رہے تھے۔ کھانا بہت لذیذ تھا۔

باربی کیو کا بھی اہتمام تھا اور ویسی اور چائینز ڈشز بھی بے شمار تھیں۔ کھانے کے بعد موسیقی کا پروگرام شروع ہوا۔ پاپ سنگرز کے بعد صوفی کلام کا دور چلا اور رات ڈھلنے لگی تھی۔ جب وہ ماما اور بابا کو رخصت کر کے اندر آئی۔ بہت عرصے کے بعد وہ آج اس طرح اتنی خوش ہوئی تھی۔ شیر سلیمان سو رہا تھا اس نے کاٹ میں اسے سلا یا اور خود لباس تبدیل کرنے کے لیے ڈریسنگ روم میں آگئی اور ابھی وہ زیورات اتار رہی تھی کہ سعود بھی آگئے۔

”تم خود کو بھتیجی کیا ہو فضول عورت!“ وہ بے حد غصے میں تھے۔
”کیوں، کیا ہوا؟“ وہ حیرت سے بولی۔
”کچھ ہوائی نہیں۔“ وہ دھاڑ کر بولے۔
”کیا، کیا ہے میں نے؟“
”تم نے تو کچھ کیا ہی نہیں ہے نا فرمان عورت۔ جب امی جی نے کہا تھا کہ ویسے والا جوڑا پہننا ہے اور سارا زیور تو تم نے ان کا کہنا کیوں نہیں مانا؟“
”سعود..... وہ..... میں.....“

”وہ کیا.....؟“ انہوں نے تراخ سے اس کے منہ پر تھپڑ دے مارا۔ شدت تکلیف سے وہ ہلکا اٹھی۔
”کیا یہی میرا قصور ہے۔ میں اتنے بھاری کپڑے اور زیور نہیں پہن سکتی۔“
”کیوں نہیں پہن سکتیں۔ بکواس کرتی ہو۔“ پتا نہیں امی جی کب کمرے میں آگئی تھیں۔ ”جوتی اتار کے اس کے منہ پر مار، کہنا مانتے ہوئے اسے موت پڑتی ہے شوریٰ آواز سن کر اباجی اور دونوں بہنیں بھی آگئی تھیں۔

”کیا ہو رہا ہے؟“ وہ نیچے قالین پر بیٹھی تھی اور اس کی ناک اور منہ سے خون بہہ رہا تھا۔ اس کی ساس اس کی پیٹھ پر جوتے مار رہی تھیں اور وہ رورور کر کہہ رہی تھی۔

”مجھے مت ماریں..... پلیز مجھے مت ماریں۔“

”سعود کیا بات ہے۔“ اباجی غصے سے بولے۔ ”میں کیا پوچھ رہا ہوں کہ کیا ہوا ہے؟“
”اباجی آپ بیچ میں مت بولیں۔ نواب زادی امی جی کا کہنا نہیں مانتی۔“
”لڑکی اپنی ساس کا کہنا ماننا کرو۔“ وہ رونا بھول گئی یہ اباجی کہہ رہے تھے۔ کم از کم اسے ان سے تو اس رویے کی توقع نہیں تھی۔ وہ بہت غصے میں تھے۔
”آپ کیوں آگئے ہیں۔ آپ کا یہاں کوئی کام نہیں سعود اسے خود ہی سیدھا کر لے گا۔“

”بھتیجی پیے کالے سوٹ میں بڑی خوب صورت لگ رہی تھی..... ویسے کا سوٹ پہنتے ہوئے تکلیف ہو رہی تھی۔“ بڑی آپا شدید غصے میں تھیں۔
”آج اس نے ہماری ناک کٹوا دی ہے۔“
چھوٹی آپا بولیں۔

”چلو دفع کرو، جانے دو۔“ اباجی نے کمال مہربانی دکھائی۔ سعود نے جاتے جاتے اسے ایک ٹھنڈا مارا۔ عالیہ کو یوں لگا جیسے اس کے کوہنہ کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔ وہ منڈھال ہو کر آنکھیں بند کیے فرش پر پڑی تھی ان لوگوں کے چیخنے دھاڑنے کی آوازیں سن کر شیر سلیمان جاگ گیا تھا، وہ رور رہا تھا۔ سب لوگ کمرے سے باہر چلے گئے تھے۔ اس میں اتنی سکت نہیں تھی کہ وہ اٹھ کر دوسرے کمرے میں جاسکتی۔ پتا نہیں وہ کتنی دیر تک روتا رہا تھا۔ سارا جسم دکھ رہا تھا اور جسمانی تکلیف سے زیادہ اسے روحانی تکلیف تھی۔ لگتا تھا جیسے کسی نے اس کی روح کو زخم زخم کر دیا تھا۔ وہ ساری رات ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سو سکی تھی۔ دروہی اس کا بلا کا تھا ناقابل برداشت شدت تھی۔ رورور کر وہ تنگ چلی تھی۔ پیاس سے اس کے حلق میں کانٹے چبھ رہے تھے۔ کاش کوئی اسے پانی پلا دے پھر جیسے اس کے کانوں میں آواز آنے لگی۔

”اے اللہ وانا الیہ راجعون۔“ اس نے زور زور سے انا اللہ پڑھنا شروع کر دیا اور جیسے کسی نے اس

کے زخموں پر مہم رکھ دیا۔ دھیرے دھیرے درد کا احساس کم ہونے لگا۔ زخمی روح کو جیسے قرار آنے لگا۔ آہستہ آہستہ اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ اس پر جیسے نیند طاری ہو رہی تھی اور پھر وہ سو گئی۔ صبح اٹھنے کی اس میں ہمت تو نہیں تھی مگر شیر سلیمان کے لیے اسے اٹھنا ہی تھا اس نے یہ مشکل گھسیٹ کر خود کو اٹھایا اور واش روم چلی آئی اور آئینے میں خود کو دیکھ کر وہ حیران رہ گئی۔ اس کا پورا منہ سوجا ہوا تھا۔ نیل اور زخموں سے اس کا سارا وجود ہی چور چور تھا۔ منہ ہاتھ دھو کر اور کپڑے بدل کر جب وہ اپنے کمرے میں آئی تو اس نے دیکھا خانماں ناشتے کی ٹرائی اس کے کمرے میں ہی رکھ گئے تھے۔ وہ ایک بزرگ اور خاندانی آدمی تھے۔ وہ اس کا بہت خیال رکھتے تھے، اس کی بہت عزت کرتے تھے۔ صاف نظر آتا تھا وہ ایک اعلیٰ خاندان کی لڑکی تھی وہ بہت دکھ کے ساتھ سوچتے کہ اتنی اچھی لڑکی کہاں ان لوگوں میں آکر پھنس گئی۔ سارا اھیل مقدر کا تھا وہ کیا کر سکتے تھے۔ کوئی بھی کچھ نہیں کر سکتا تھا بعض اوقات قدرت بندوں کے صبر کا امتحان لیتی ہے شاید۔

اس رات سعود کمرے میں آئے ہی نہیں..... شاید انہوں نے رات باہر گزاری تھی وہاں ان سے کوئی پوچھنے والا تھا اور نہ باز پرس کرنے والا۔ کچھ بھی کھانے کو بھی نہیں چاہ رہا تھا۔ اس نے پانی کا گلاس پیا، شیر سلیمان کی پیپی چیچ کی اور اسے دودھ پلایا۔ نقاہت اور تکلیف کے مارے اس سے بیٹھا نہیں جا رہا تھا شکر ہے شیر سلیمان بہت ہی اچھا بچہ تھا۔ دودھ پی کر وہ پھر سو گیا تھا۔ وہ اسے بالکل بھی تنگ نہیں کرتا تھا دوسرے بچوں کی طرح اسے راتوں کو نہیں جگا تا تھا اور نہ دن میں تھکا تا تھا۔

درد دور کرنے کی دو گولیوں کے ساتھ اس نے نیند کی ایک گولی بھی کھائی اور دروازہ لاک کر کے سو گئی۔ فون کی کھنٹی کی آواز پر اس کی آنکھ کھلی تھی۔ اس

جائے۔“

”جی آپ فکر مت کریں۔“ ماما نے انہیں یقین دلایا۔ ”جلدی آجائے گی، آپ کی بڑی مہربانی آپ نے اجازت دے دی۔“ وہ نخوت سے کھڑی انہیں دیکھ رہی تھیں۔ عالیہ کا دل سہا جا رہا تھا۔ دل کو اس دھڑکا سا لگا تھا وہ جلد از جلد اس گھر کی چار دیواری سے نکل جانا چاہتی تھی اور گھر بچنے ہی وہ جیسے ہمت ہار گئی، وہ تھک چکی تھی۔ اب اس میں مزید برداشت کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

”ماما خدا کے لیے مجھے بچالیں۔ میں اب اس گھر میں واپس نہیں جاؤں گی۔“

”کیسی باتیں کرتی ہو عالیہ۔ وہ تمہارا گھر ہے وہاں تمہارے بچے ہیں۔ وہ تمہاری سرال والے ہیں۔“

”ماما پلیز ٹس کریں۔“ آج اس نے اپنا دل کھول کر ماں کے آگے رکھ دیا تھا۔ آج اس میں اتنی سکت نہیں تھی کہ وہ ماں سے کچھ چھپا سکتی۔ اس کی حالت زار پر اب وہ بھی اس کے ساتھ رو رہی تھیں اور مہرین بھی۔

”مجھے کچھ کچھ اندازہ تو تھا عالیہ مگر وہ اس قدر ظالم بھی ہو سکتے ہیں، یہ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔“

”میں آپ کو بتانا چاہتی تھی ماما مگر آپ کچھ سننے کے لیے تیار نہیں تھیں۔ میں نے مہرین کو بتایا تھا اس نے آپ کو کچھ نہیں بتایا؟“

”کیوں مہرین؟“ ماما نے مہرین کی طرف دیکھ کر کہا۔

”ماما میں آپ کو کیا بتاتی..... آپ کو دکھ ہوتا۔“ انہوں نے عالیہ کو اپنے سینے سے لگالیا۔

”آہ میری دکھی بیٹی۔“ انہوں نے غم سے سوچا۔ ”کاش میں تمہارا نصیب بدل سکتی۔“ وہ سخت صدمے کی حالت میں تھیں..... ان سے کچھ بولا ہی نہیں جا رہا تھا۔ انہوں نے پیار سے اس کے بال سنوارے

میں نہ اٹھنے کی ہمت تھی اور نہ فون ریسیو کرنے کو جی چاہ رہا تھا۔ کسی سے بات کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا مگر فون کی گھنٹی مسلسل بج رہی تھی۔ بادل ناخواستہ اسے فون اٹھانا پڑا۔ دوسری طرف ماما تھیں۔ ایک تو جب بھی وہ تکلیف کی حالت میں ہوتی تھی ماما کو پتا چل جاتا تھا۔ کیسے پتا چل جاتا تھا یہ وہ نہیں جانتی تھی۔

”السلام علیکم ماما۔“

”علیکم السلام، میرے بچے کیا حال ہے؟“ وہ اتنے پیار اور فکر مندی کے ساتھ بول رہی تھیں جانے اسے کیا ہوا وہ بے اختیار رو رہی تھی۔

”ماما خدا کے لیے مجھے آکر لے جائیں۔ میں یہاں نہیں رہ سکتی۔“

”کیوں عالی بیٹا، کیا ہوا میری جان؟“

”مجھے نہیں معلوم بس آپ آکر مجھے لے جائیں ورنہ میں مر جاؤں گی۔“ روتے روتے اس کی ہچکی بندھ گئی۔

”اللہ نہ کرے عالیہ۔ اچھا میں آتی ہوں۔“

اس کے آنسوؤں نے ماں کے دل پر کیا قیامت ڈھائی تھی، یہ وہ نہیں جانتی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد ملازمہ نے اسے آکر بتایا کہ مہرین اور ماما آگئے ہیں۔ مہرین اس کے کمرے ہی میں آگئی تھی۔ ماما ڈرائنگ روم میں بیٹھی تھیں۔ اس نے عالیہ سے کچھ نہیں پوچھا تھا اور نہ عالیہ نے کوئی بات کی تھی۔ اس کی حالت مہرین کے سامنے ہی مارے صدمے کے وہ ایک لفظ بھی نہیں بول سکی۔ مہرین نے اس کا اور شیر سلیمان کا ضروری سامان پیک کیا۔ گاڑی میں بیٹھتے وقت عالیہ نے دیکھا اس کی ساس یوں خوش اور مطمئن کھڑی تھیں جیسے رات کو کچھ ہوا ہی نہیں تھا اور ماما نے ان سے کچھ پوچھا بھی نہیں تھا۔ عالیہ کی حالت کو نظر انداز کر کے وہ ان سے اپنی اسی روایتی خوش اخلاقی سے مل رہی تھیں۔

”اسے جلدی بھیج دینا وہاں جا کر بیٹھی نہ رہ

ہو..... جو شوہر کی فرمانبرداری ہو..... جو سسرال کی عزت کرے..... اور ماما کے اس فیصلے نے جیسے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی تھی۔ وہ بالکل ہی ٹوٹ گئی..... ایک ہفتے کے بعد پھر وہ اپنے نام نہاد گھر میں آگئی تھی۔ اپنی بہنوں کے بہتر مستقبل کے لیے..... اس نے نئے سرے سے ہر نئی افاد کو برداشت کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا..... اس کے حالات تو نہیں بدلے..... اس نے ہی خود کو بدل لیا تھا..... وہ ان لوگوں کے اشاروں پر چلنے لگی تھی..... زندگی اتنی سہل تو نہیں تھی..... مگر اپنی مشکل بھی نہیں رہی تھی..... جب بھی زندگی میں کوئی مشکل مقام آتا..... وہ دی خواب والی آیت کثرت سے پڑھنے لگتی۔

☆☆☆

وقت بہت تیزی سے گزر رہا تھا..... مہرین کی ایک آرمی آفسر کے ساتھ شادی ہوگئی تھی..... اس کے سسرال والے بہت اچھے لوگ تھے ان لوگوں کی طرح بہت زیادہ دولت مند تو نہیں تھے مگر اخلاق اور محبت کے معاملے میں وہ بہت امیر واقع ہوئے تھے..... مہرین کو ان کے گھر میں بے حد عزت، محبت اور قدر و اہمیت ملی تھی..... وہ جب اسے خوش دیکھتی تو اس کے دل میں ایک اطمینان سا اثر آتا کہ اس کی قربانی رائیگاں نہیں گئی..... ہمیشہ کی طرح اس نے شکرانے کے نفل ادا کیے تھے..... پھر ہمایوں کی بھی شادی ہوگئی..... اس کی دلہن ڈاکٹر تھی اور وہ دونوں مزید پڑھنے کے لیے باہر جا رہے تھے۔ دونوں بہت خوش تھے..... اور عالیہ ان کی خوشیوں میں خوش تھی..... وہ ان کی خوشیوں میں پوری طرح شامل تو نہیں ہو سکتی تھی مگر وہ اندر سے خوش تھی..... بچے بڑے ہو گئے تھے..... دونوں اسکول جانے لگے تھے..... دونوں کو پڑھانے کی ذمہ داری اس کے سر تھی اور وہ بہت خوش تھی کہ تعلیم کے ساتھ ساتھ اسے ان کی تربیت کرنے کا موقع بھی مل رہا تھا..... شیر زمان

لوگوں کو ایسے ملبوسات نصیب ہوتے ہیں اگر اس دن تم ویسے والا جوڑا اور زیور پہن لیتیں تو یہ سارا جھگڑا ہی نہ ہوتا..... دراصل انہیں تم سے اس نا فرمانی کی توقع نہیں تھی..... سب ٹھیک ہو جائے گا..... بیٹا! ساس سر ہمیشہ نہیں رہیں گے..... تمہاری منڈوں کی بھی شادیاں ہو جائیں گی..... اچھا وقت آئی جائے گا..... شادی کے شروع شروع کے سال ذرا مشکل ہوتے ہیں..... پھر حالات ٹھیک ہو جاتے ہیں..... ”جی نہیں ماما.....! میرے حالات بھی ٹھیک نہیں ہو سکتے..... دراصل آپ کو صورت حال کا اندازہ ہی نہیں..... اور ان کی بہنوں کی شادیاں بھی نہیں ہو سکتیں..... اب اس عمر میں کون ان سے شادی کرے گا.....؟ اور جو لوگ ان کو جانتے ہیں وہ ان کی خصلتوں سے ان کی عادتوں سے واقف ہیں۔ آنکھوں دیکھی بھی کون نگلتا ہے۔“

”ایسے نہیں کہتے بیٹا..... وہ تمہاری نندیں ہیں۔“ ”میں جانتی ہوں..... وہ میری نندیں ہیں..... آپ تو کہا کرتی ہیں کہ سسرالی رشتے محبت کے رشتے ہوتے ہیں مگر یہاں محبت کہاں ہے.....؟ کسی کے دل میں میرے لیے نرم گوشہ بھی نہیں ہے..... محبت کہاں سے ہوگی..... ذرا دیکھ سے بولی..... ”بہر کیف آج کے بعد تم طلاق کا لفظ منہ سے نہیں نکالو گی اچھی لڑکیاں طلاق کا لفظ منہ سے نہیں نکالتیں..... آئندہ یہ لفظ میں تمہارے منہ سے نہ سنوں..... بے شک تمہارے حالات مشکل ہیں..... مگر مشکل کے ساتھ آسانیاں بھی بہت ہیں..... لڑکیاں تو اس سے کہیں مشکل ترین حالات میں گزارہ کرتی ہیں، گھر توڑنا تو بہت آسان ہے..... آگ ہو کر بیٹھ جاؤ..... دراصل نباہ کرنا بہت مشکل ہوتا ہے..... تمہاری تین بہنیں اور بھی ہیں..... تم طلاق لے کر آ جاؤ گی..... تو ان کو بیاہنے کون آئے گا..... اچھی عورت وہی ہوتی ہے جس سے اس کا شوہر خوش

گی..... میں سعود سے طلاق لینا چاہتی ہوں.....“ ”نہیں عالیہ! اتنا بڑا فیصلہ اتنی جلدی نہیں کرتے.....“ ”جلدی ماما.....؟ پورے دو سال ہو گئے ہیں۔“ ”پوری زندگی گزر جاتی ہیں بیٹا..... شادی کے بعد لڑکیوں کو بہت کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔“ ”اب اور کتنا برداشت کروں؟“ ”میں تمہاری ساس سے بات کروں گی۔“ ”نہیں، آپ ان سے کوئی بات نہیں کریں گی..... آپ ان لوگوں کو نہیں جانتیں..... وہ مجھے جان سے مار دیں گے۔“ ”ایسے کیسے مار دیں گے..... تم ابھی آرام کرو..... کوئی نہ کوئی حل نکل ہی آئے گا..... بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا پڑے گا۔“

اور پورے چار دن سوچنے کے بعد انہوں نے جو فیصلہ کیا تھا..... وہ عالیہ کی توقع کے بالکل خلاف تھا۔ ”عالیہ! میں نے بہت سوچا ہے ہر پہلو پر غور کیا ہے..... بات مردوں تک نہیں پہنچنی چاہیے..... تم ان کا ہر کہنا مانو گی ویسے بھی اس گھر میں سب تم سے بڑے ہیں..... بڑوں کا کہنا ماننا چاہیے..... وہ تمہاری ساس ہیں..... ان کا احترام تم پر لازم ہے۔ تم انہیں خوش رکھنے کی کوشش کرو..... اگر وہ تم سے خوش ہوں گی..... تو تمہارا شوہر بھی تم سے خوش ہوگا۔ تمہیں سالگرہ والے دن ان کی خواہش پر ان کی پسند کے کپڑے پہننے چاہیے تھے..... ویسے بھی لڑکی جب سسرال کی طرف کے کپڑے پہنتی ہے..... تو وہ لوگ بہت خوش ہوتے ہیں اگر بڑی کے کپڑے پسند نہ بھی ہوں تو عقلمندی اسی میں ہے..... کہ اپنی ساس منڈوں کو خوش کرنے کے لیے شوق سے ان کے بنائے ہوئے کپڑے پہنیں..... کیونکہ وہ انہوں نے بہت شوق اور محبت سے بنائے ہوئے ہیں..... اور تمہاری بڑی تو بہت خوب صورت اور قیمتی تھی..... بہت کم

اسے پانی پلایا اور اپنے پلنگ پر اسے لٹالیا.....“ ”تم کچھ کھا لو..... اور پھر سو جاؤ.....“ ”غیر کو مہرین سنبھال لے گی..... تم تھوڑی دیر آرام کر لو.....“ آرام..... کتنا اجنبی لفظ تھا۔ اپنی غلطی کا احساس تو انہیں دوسرے ہی دن ہو گیا تھا۔ وہ خوش نہیں تھی..... وہ ایک نظر میں ہی جان گئی تھیں۔ ان کی بیٹی کے چہرے پر ایک رات اور پورے ایک دن کی داستان رقم تھی..... خوشی کی رمت تک نہ تھی..... بس غم کے اندھیرے چھائے ہوئے تھے..... لیکن انہوں نے خود کو کسلی دے دی تھی..... ”یہ نظر کا دھوکا بھی تو ہو سکتا ہے..... سعید صاحب اپنی بیٹی کی زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ سوچے سمجھے بغیر تو نہیں کر سکتے تھے.....“ مگر بعض اوقات انسان لوگوں کو پہچان ہی نہیں سکتا بعض اوقات لوگ اوپر سے کچھ اور اندر سے کچھ ہوتے ہیں..... کتنی ہمتوں اور خوشامدوں کے بعد انہوں نے عالیہ کا رشتہ لیا تھا۔

”انہیں لوگوں کی ذرا بھی پہچان نہیں..... وہ سمجھ رہے تھے اتنی چاہت اور محبت سے وہ لوگ رشتہ مانگ رہے ہیں تو وہ یقیناً ان کی بیٹی کو بہت خوش رکھیں گے..... مگر کتنی بڑی بھول ہوئی تھی۔ اپنی اتنی پیاری بیٹی کو انہوں نے بالکل اجنبی اور غیر لوگوں کو سونپ دیا تھا۔ ایک مرتبہ ملنے یا گھر بار دیکھ لینے سے تو پتا نہیں چلتا کہ لوگ کیسے ہیں.....؟ مگر سعید صاحب جانتے تھے..... وقار صاحب تو ان کے پرانے دوست تھے..... پھر انہوں نے کتنے اصرار محبت اور چاہت کے ساتھ ہماری بیٹی کو مانگا تھا.....“ ”لگتا تھا جیسے دل پر دکھوں کا پہاڑ آن گرا تھا..... وہ بھاری بوجھ تلے دب گئی تھیں۔ اب کیا ہو سکتا تھا۔ سوچ سوچ کر ان کا دماغ ماؤف ہو گیا تھا.....“ ”اپنے ابا سے کچھ مت کہنا..... وہ یہ صدمہ برداشت نہیں کر پائیں گے.....“ ”ماما! میں اب اس گھر میں واپس نہیں جاؤں

اگرچہ دادی اور پچھو سے بہت مانوس تھا..... مگر وہ ماں سے بھی بہت محبت کرتا تھا..... وہ دونوں بچوں کو جی جان سے پڑھائی تھی..... دونوں بچے بہت لائق تھے..... کلاس میں ہمیشہ اول آتے تھے..... ان کی اچھی رپورٹس اور اچھے ریمارکس پڑھ کر اس کا دل خوش ہو جاتا تھا..... اس کی محنت رنگ لارہی تھی۔ ٹیچر جیٹس میٹنگ میں اسے اکیلے ہی جانا پڑتا تھا۔ ایک آدھ دفعہ عالیہ کے بوسا سود اس کے ساتھ نہیں جاسکے تھے اس کی مصروفیات ہی بہت زیادہ تھیں..... بچوں کے لیے ان کے پاس وقت نہیں تھا..... اس سال ایمن بھی پیادیں سدھاری تھی..... اور فاطمہ کو مہرین کی ساس نے اس کے دیور کے لیے مانگ لیا تھا..... ایک طرح سے ماما اور بابا تو فارغ ہی ہو چکے تھے..... ایمن اپنے گھر میں بہت خوش تھی..... کبھی کبھی تو عالیہ کو یقین بھی نہیں آتا تھا..... چنانچہ اس کی بہنیں صبح معنوں میں خوش بھی تھیں کہ نہیں.....؟ یا وہ عالیہ کی طرح خود کو خوش ظاہر کرنے کی اداکاری کر رہی تھیں..... جیسے دو سال تک اس نے ماما سے اپنے حالات چھپائے رکھے تھے..... اکثر اسے وہم ستانے لگتا..... آخر وہ اسی کی بہنیں تھیں..... ماما کی تربیت نے انہیں ہر حال میں ڈھل جانے کی صلاحیت سے مالا مال کر رکھا تھا۔ مشکل ترین حالات میں بھی انہوں نے خود کو بڑی آسانی سے ایڈجسٹ کر لیا ہوگا۔ اللہ کرے واقعی وہ خوش ہوں۔ وہ بے حساب دعائیں مانگا کرتی..... اور عالیہ اب جان گئی تھی کے ماما سے کتنا پیار کرتی تھیں۔ اس کے لیے وہ کتنی بے چین اور بے سکون رہتی تھیں۔ وہ ظاہر نہیں کرتی تھیں مگر اسے معلوم تھا وہ اس کے غم میں گھل رہی تھیں۔ ان کی صحت پہلے جیسی نہیں رہی تھی۔ ہائی بلڈ پریشر اور شوگر کے مرض نے انہیں بہت کمزور کر دیا تھا۔ وہ جانتی تھی یہ دونوں مرض انہیں اسٹریس کی وجہ سے ہوئے تھے اور اگرچہ اس نے اس دن کے بعد

سے کچھ نہیں بتایا تھا اور انہوں نے کبھی اس سے پوچھا بھی نہیں تھا مگر اسے معلوم تھا۔ وہ اس کے لیے بہت پریشان رہتی تھیں۔ اکثر اسے دکھ ہوتا کاش وہ ماما کو کبھی کچھ نہ بتاتی کبھی کبھی وہ بہت پچھتاتی کاش وہ ماما کو اس صدمے سے دوچار نہ کرتی مگر دس سال پہلے اس میں اتنا حوصلہ تھا نہ اتنا شعور اب تو اس نے سب کچھ اللہ پر چھوڑ دیا تھا۔ اللہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے اور اللہ جو کرتا ہے بہتر کرتا ہے۔ اس دوران عالیہ کی دوستی عذرا آپا سے ہو گئی۔ وہ سامنے والے گھر میں رہتی تھیں۔ ان کے حالات کا علم تو اسے آغاز ہی میں ہو گیا تھا۔ ان کے شوہر پرویز صاحب بیسویں گریڈ کے افسر تھے، ان کے تین بچے تھے۔ ان کے شوہر میں سب وہی اوصاف تھے جو سعود میں تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ سعود کے گھر میں اسے کھانے پینے کی کوئی تنگی نہیں تھی اور اب ماں باپ کے گھر جانے پر کوئی باندی نہیں تھی جبکہ عذرا آپا کو میکے والوں سے ملنے کی اجازت نہیں تھی اور روزمرہ کے اخراجات کے لیے وہ ایک پیسہ بھی نہیں دیتے تھے۔ ان کا میکا کونڈ میں تھا اور کونڈ جانے کے لیے وہ اتنا کرایہ برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اب والدین بھی نہیں رہے تھے اور بہن بھائی اپنے حالوں میں مست تھے بھی کبھی ان کی مدد کر دیا کرتے تھے۔ شکر ہے وہ بچوں کی فیس افرڈ کر رہے تھے ورنہ وہ کیا کر سکتی تھیں۔ پرویز صاحب ان کے ماموں زاد تھے مگر کسی رشتے دار کا انہیں کوئی احترام تھا اور نہ لحاظ۔ اکثر ان کے گھر میں فاقوں تک نوبت آتی تھی تو کھانا سعود کے ہاں سے جاتا۔ امی جی بہت خوش ہو کر ٹرے سجاسجا کر ان کے گھر کھانا بھیجتیں۔ ان کا کھانا بندہ کان بند اور زبان بند کر کے تو گزرا ہو جاتا تھا بالکل عالیہ کی طرح لیکن جب بھی عذرا آپا نے زبان کھولی ان کا سارا وجود ٹیل ویل ہو جاتا۔ جسم کے زخموں کے ساتھ ساتھ ان کی روح بھی لہولہاں ہو جاتی۔

اس دن بھی وہ کافی عرصے بعد ان کے گھر آئی تھیں۔ ”عذرا آپا خیریت ہے؟“ انہیں دیکھ کر عالیہ دھک سے گرہ گئی۔ ہاتھ پر گھرے زخم کا نشان تھا۔ دونوں آنکھوں پر درم اور سیل تھا۔ دونوں بازو بھی زخمی حالت میں تھے اور ان کے گھٹنے پر بھی چوٹ لگی تھی جس کی وجہ سے وہ لنگڑا کر چل رہی تھیں۔ عالیہ کو ایک گھر بے تاسف نے آن گھیرا۔ اتنے دن اگر وہ نہیں آئی تھیں تو کاش وہی ان کا حال پوچھ لیتی۔ ”کیا ہوا عذرا آپا، یہ چوٹیں کسے لگیں؟“ ”کسے لگیں تھے نہیں پتا کیسے لگیں۔“ امی جی طنز یہ بنی کے ساتھ بولیں۔ ”سعود سے مارا کر تیرا بھی یہی حال ہوتا ہے۔“ وہ یک دم چپ کر گئی۔ عذرا آپا کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو آ گئے۔ ”اب ہوا کیا تھا پرویز کو کیا موت پڑی تھی؟“ امی جی نے پوچھا۔ ”باجی وہی رانا سیایا۔“ عذرا آپا انتہائی دکھ کے ساتھ بولیں۔ ”گھر میں راشن بالکل ختم ہو گیا تھا بس مجھ سے یہی غلطی ہو گئی۔ جو ان سے کہہ دیا کہ گھر میں کھانے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ وال تک گھر میں نہیں تھی۔ میں کیا پکاتی بچے بھوک سے ہلک رہے تھے۔ انڈے ڈبل روٹی تک منگوانے کے پیسے نہیں تھے۔ بھائیوں سے میں کب تک خرچ منگواؤں اب تو وہ دے دے کر بھی تھک گئے ہیں مگر ان کا پیٹ نہیں بھرا۔ ان کو ذرا بھی شرم نہیں آئی۔ فقیر بنا چھوڑا ہے۔“ عذرا آپا زار و قطار رو رہی تھیں۔ ”عذرا نہ رو، میرے دل کو کچھ ہوتا ہے۔“ ”بھوکے آنسو دیکھ کر تو بھی آپ کے دل کو کچھ نہیں ہوتا۔ اسے لہولہاں دیکھ کر تو آپ کا دل خوش ہوتا ہے۔“ عالیہ کہنا جانتی تھی مگر وہ اپنے اندر اتنی جرات کہاں سے لاتی۔ عذرا آپا کے لیے اس کا دل کڑھ رہا تھا کاش وہ ان کے لیے کچھ کر سکتی۔ ”عذرا میری مان تو پرویز کو چھوڑ دے اور اس

کی اولاد کو دفع کر اور اپنے بھائیوں کے گھر چلی جا، ان پر تیری دو وقت کی روٹی بھاری نہیں ہوگی۔“ ”باجی آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں۔ میں بچوں کو کس طرح چھوڑ سکتی ہوں۔ خاص طور پر اپنی بیٹیوں کو..... کل کو ان کی شادیاں ہوئی ہیں۔ لوگ کیا کہیں گے کہ ان کی ماں چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ بے شک میرے بھائی امیر کبیر ہیں پر باجی اپنا گھر تو اپنا ہوتا ہے ناں۔ پرویز صاحب جیسے بھی ہیں اپنے گھر میں میری بادشاہی ہے اور میں اپنی بادشاہی چھوڑ کر بھائیوں کے در پر جائیٹھوں۔ کل کو بھابھیاں مجھے پوچھیں گی بھی نہیں۔ میں تو ایسی بات کبھی سوچ بھی نہیں سکتی۔“ عذرا کی بات سن کر امی جی شرمندہ سی ہو گئیں۔ ”دفع دور پھر اس سے جوئے کھاتی رہو اور خوش ہوتی رہو۔“ عذرا آپا نے اپنے آنسو پونچھے۔ ”باجی میری امی نے مرتے وقت وصیت کی تھی کہ حالات جیسے بھی ہوں کبھی خاوند کا گھر نہیں چھوڑنا۔ کتنی تھیں عورت کا اصل ٹھکانا اس کے خاوند کا گھر ہوتا ہے۔ میری ماں نے تو ہمیں یہی بات سکھائی ہے کہ خاوند اگر ٹوٹے ہوئے پھتر پر بھی کھانا رکھ کے دے تو سوسم اللہ کر کے کھالینا چاہیے۔ باجی جو عورت خاوند کا گھر چھوڑ دے اس کی بھی کوئی عزت ہوتی ہے۔“ عالیہ آج عذرا آپا سے بہت متاثر ہوئی تھی۔ ان کا دکھ اور پھر ان کا صبر اور شکر۔ اس رات اس نے بہت دنوں کے بعد شکرانے کے نفل پڑھے۔ اللہ کا شکر ہے کتنے لوگوں سے اچھے حالات تھے اس کے بندہ واقعی کتنا ناشکرا ہے۔ اللہ کی کتنی نعمتوں کا تو اسے ادراک ہی نہیں ہوتا۔ اس نے سچے دل سے اللہ کو پکارا۔ ”اے رؤف الرحیم، اے رب کریم اس نعمت کے لیے تیرا ڈیروں شکر جو تو نے عطا فرمایا اور ہر اس نعمت کے لیے بھی تیرا لاکھ لاکھ شکر جو تو نے نہیں عطا فرمایا کہ اسی میں میری بہتری ہے کیونکہ تو جانتا

”میرا دماغ خراب نہیں ہوا ہے ابھی اور نہ میرے پاس اتنا فلو وقت ہے۔“

”توبہ استغفر اللہ۔“ عالیہ نے دل ہی دل میں استغفار پڑھی۔ اسے سود کے سامنے اس قسم کی باتیں نہیں کرنی چاہیے جس کا جواب وہ اسی طرح دیں۔ وہ ان کے ساتھ ملائیشیا نہیں جانا چاہتی تھی۔ پہلے دن سے ان کے تعلقات میں ایک عجیب سی جھجک تھی وہ ان سے کبھی بے تکلف ہو کر بات نہیں کر سکتی تھی۔ نہ سودا سے پسند کرتے تھے اور نہ وہ اس حد سے آگے بڑھنا چاہتی تھی پھر بچوں کی چٹھیاں بھی نہیں تھیں۔ انہوں نے اسکول سے ایک ہفتے کی چھٹی لی تھی۔ وہ جانتی تھی بچوں کا بہت حرج ہو گا مگر دادا، دادی اور سود کو اس سے کوئی سروکار نہیں تھا اور اس کی کیا مجال کہ وہ ایک لفظ بھی بول سکتی اور اس کا حل اس نے یہ نکالا تھا کہ وہ بچوں کے اسکول بیک ساتھ لے کر جا رہی تھی اور وہاں پہنچ کر اپنی اس غفلت پر وہ خود کو شایاش دیے بنانا رہ پائی۔

وہ ملائیشیا کے ایک اعلیٰ ترین ہوٹل میں ٹھہرے تھے ان کے لیے دو کمرے بک تھے۔ دونوں کمرے بے حد آرام دہ اور خوب صورت تھے۔ سود صبح ہی اٹھ کر کام کے سلسلے میں چلے جاتے اور شام گئے لوٹتے۔ سارا دن عالیہ اور بچے ہوٹل میں ہوتے۔ صبح نیچے ڈائننگ ہال میں جا کر وہ ناشتا کرتے۔ وہ آرام سے جا کر بیٹھ جاتی اور شیر سلیمان اور شیر زمان دوڑ دوڑ کر اس کے لیے ناشتا لاتے۔

”ماما آپ جوس کون سالیس گی؟ سارے فریش جوسز موجود ہیں۔ اورنج، اپیل، لیمن، پیچی، پائن اپیل۔“ وہ بے شمار نام گنواتے۔

”ماما آپ انڈا کیسالیس گی۔ فرائڈ، آملیٹ یا بوائلڈ؟“

”ماما آپ پرائٹلین گی یا سلانز یا پھر فرنی ٹوسٹ؟“

نہت سے نواز دے۔

انہوں نے ایک نیا شوشا چھوڑ دیا تھا۔ ان کے خیال میں جڑواں بچوں کی پیدائش کے بعد عالیہ میں شاید کوئی نقص پیدا ہو گیا تھا جس کی وجہ سے وہ مزید بچے پیدا کرنے کی صلاحیت سے محروم ہو چکی تھی۔ اب اچھے بیٹھے اسے یہی سنایا جا رہا تھا۔

”میں ایک سال اور انتظار کروں گی اس کے بعد میں اپنے بیٹے کا دوسرا بیابہ ضرور کروں گی۔“ اور وہ سکتے کی حالت میں رہ گئی تھی۔ کیا جواز پیدا کیا تھا انہوں نے۔ اس کا جی چاہا وہ ان سے پوچھے کیا اللہ کے حکم سے اس نے انہیں دو پوتے نہیں دیے تھے مگر وہ خاموش رہی۔

اگلے ہفتے سود کی ضروری میننگ کے سلسلے میں ملائیشیا جا رہے تھے اور یہ سن کر تو اس پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے کہ وہ اسے اپنے ہمراہ لے جا رہے تھے۔ یہ ہو سکتا تھا.....؟ آج تک تو وہ اسے کبھی شہر میں اپنے ہمراہ کہیں لے کر نہیں گئے تھے اور یہ جان کر اسے اور بھی حیرت ہوئی کہ دونوں بچے بھی ان کے ہمراہ جا رہے تھے۔

”خدا یا یہ انقلاب کب اور کیسے آیا؟“ وہ جاننے سے قاصر تھی اسے یقین تو نہیں آ رہا تھا مگر یہ سچ تھا۔ پاسپورٹ بن کر آ گیا تھا اور اگلے چند دنوں میں ویزا بھی مل گیا جس قسم کے تعلقات ان دونوں کے درمیان تھے اس نے بھی بھول کر بھی نہیں سوچا تھا کہ وہ کبھی اسے اپنے ہمراہ ... بیرون ملک لے کر جائیں گے اور نہ ہی اس کے دل میں ایسی کوئی خواہش تھی البتہ اس خواب کے بعد اس کا بہت جی چاہتا تھا کہ وہ حج پر جائے یا عمرے کی سعادت حاصل کرے اور موقع غنیمت جان کر اس نے اپنی اس خواہش کا اظہار بھی کر دیا تھا۔

”سود میرا بہت جی چاہتا ہے کہ ہم حج پر جائیں۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم واپسی پر عمرہ کر کے آئیں؟“

”عالیہ، سعید صاحب کا فون آیا ہے فاطمہ کی شادی میں سب لوگ آگئے ہیں، آج تم بھی چلی جاؤ۔“

”جی اچھا۔“ سر کی اجازت کے باوجود اس نے امی جی اور سود سے بھی اجازت لی اور پھر خوشی خوشی جانے کے لیے تیار ہو گئی۔ پہلی ہی نظر میں اسے دیکھ کر ماما کو احساس ہو گیا تھا کہ وہ خوش تھی۔ اس کے سارے وجود پر ایک اطمینان سا چھایا ہوا تھا۔ ایک عرصے کے بعد اسے دیکھ کر ان کے دل میں خوشی کے جذبات جاگے تھے اور انہوں نے اللہ کا شکر ادا کیا۔ شیر سلیمان اس کے ساتھ تھا جبکہ شیر زمان اپنی دادی کے ہمراہ آنے والا تھا۔

سالوں کے بعد وہ سب لوگ اکٹھے ہوئے تھے۔ اس گھر کی آخری شادی تھی اور سب لوگ بے حد خوش تھے۔ کتنا اچھا لگ رہا تھا۔ فاطمہ رخصت ہو کر چلی گئی تھی۔ سب کو اطمینان تھا مہرین اس کے ہمراہ گئی تھی جبکہ باقی سب لوگ اگلے دن ویسے پر جانے والے تھے۔ ایک یقین تھا کہ انشاء اللہ تعالیٰ وہ بہت خوش رہے گی۔ مہرین ہی کی طرح جسے اس کے سرال والوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا تھا اور جسے نہ صرف شوہر بلکہ سرال میں سب لوگوں کا پیار، محبت اور توجہ ملی تھی۔ وہ لوگ صحیح معنوں میں عزت، قدر اور محبت کرنے والے تھے۔ ان سے رشتے داری کر کے بابا اور ماما کی قدرو قیمت میں اضافہ ہو گیا تھا۔

بہن کی شادی کے بعد جب وہ گھر آئی تو ایک نیا مسئلہ سر اٹھائے کھڑا تھا۔ اچانک امی جی کو تیسرے بچے کا خیال ستانے لگا تھا۔ سود نے اس سے بات کی تو وہ چپ کی چپ رہ گئی۔ اب امی جی قدرت کی باتوں میں بھی دخل اندازی کرنے لگی تھیں۔ توبہ نعوذ باللہ کیا اب وہ اللہ کے نظام کو بھی اپنے ہاتھ میں لینا چاہتی ہیں۔ کیا یہ بندے کے اختیار میں تھا۔ انسان کے چاہنے نہ چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔ یہ تو اللہ کے ہاتھ میں تھا وہ جب چاہے اور جسے چاہے اولاد کی

ہے اور میں نہیں جانتی۔“ اس رات اس نے کتنے سالوں کے بعد پھر وہ خواب دیکھا تھا۔ وہ خانہ کعبہ کا طواف کر رہی تھی۔ حرم لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ اتنے بے حساب اور بے شمار لوگوں کے درمیان اس نے محسوس کیا وہ اکیلی نہیں تھی۔ کوئی اس کے ساتھ تھا۔ سفید احرام میں وہ اس کے پیچھے چل رہے تھے۔ اس کی نظریں خانہ کعبہ کے سیاہ غلاف پر تھیں اور وہ آیت کریمہ پڑھ رہی تھی۔ چاروں طرف وہی مہک پھیلی ہوئی تھی جو دوسرے توبہ پہنے بھی محسوس کر چکی تھی۔ روح میں اتر جانے والی خوشبو..... وہ انہیں دیکھ نہیں سکتی تھی مگر وہ جانتی تھی۔ وہ وہی تھے وہ روشن پیشانی، بڑی بڑی جھلی ہوئی آنکھیں، سرخ و سفید مکتی ہوئی رنگت اور سنہری داڑھی۔ وہ مکہ طیبہ پڑھ رہے تھے طواف کعبہ کے بعد ان بزرگ ہستی نے ایک شخص کی طرف اشارہ کیا ابھی وہ ان کی ایک جھلک ہی دیکھ پائی کہ اس کی..... آنکھ کھل گئی تو وہ آیت کریمہ کا ورد کر رہی تھی اور اس کے دل پر ایک گہرا سکون نازل ہو رہا تھا۔ وہ عجیب سی کیفیت سے دوچار بھی ایک ناقابل بیان کیفیت.....! وہ اس سے بے خبر تھی کہ آج پھر انہوں نے اسے کچھ عطا کیا تھا۔ یقیناً اللہ اس سے خوش تھا۔

”یا اللہ میرا شمار شکر کرنے والوں اور عبادت کرنے والوں میں لکھ دے۔ یا اللہ تو مجھ سے راضی ہو جا اور مجھے اپنی رضا میں راضی ہونے کی توفیق دے دے۔“

☆☆☆

فاطمہ کی شادی میں چند دن رہ گئے تھے۔ سارے بہن بھائی اور رشتے دار آپکے تھے مگر ابھی تک اسے اجازت نامہ نہیں ملا تھا اور ان کی مرضی کے بغیر وہ کس طرح جا سکتی تھی۔ اگلے دن وہ اپنے کمرے میں بیٹھی تلاوت قرآن پاک کر رہی تھی کہ اس کے سر اس کے کمرے میں آ گئے۔

خرید کر اس کا دل خوش نہیں ہوا تھا۔ اپنی ذات پر اس نے بھی اتنا پیسہ خرچ نہیں کیا تھا۔ مہنگے ملبوسات اور قیمتی زیورات خرید کر اسے افسوس ہو رہا تھا۔ یہی رقم وہ اللہ کی راہ میں بھی خرچ کر سکتے تھے۔ کسی نیک مقصد کے لیے بھی استعمال ہو سکتی تھی مگر وہ سعودی ناراضی کے خیال سے چپ رہی۔

اگلی صبح وہ پاکستان واپس جا رہے تھے۔ رات کو وہ کمرے میں نیچے قالین پر بیٹھی ساری شاپنگ بکھرائے پینک کر رہی تھی۔ دونوں بچے کمپیوٹر پر کسی کھیل میں مگن تھے اور سعود کچھ فائلز کھول کر بیٹھے ہوئے تھے۔ پتا نہیں اچانک ان کے ذہن میں کیا خیال آیا تھا۔

”عالیہ دکھاؤ تمہارے ہاتھ میں وہ رنگ کیسی لگ رہی ہے۔“

”اوہ..... تو میں نے سوٹ کیس میں پیک کر دی ہے۔“

”سوٹ کیس میں..... بانی داوے ایسی قیمتی چیزیں فضائی سفر میں اپنے ہینڈ بیک میں رکھی جاتی ہیں۔“ وہ طنزیہ لہجے بولے۔

”اچھا میں رکھ لیتی ہوں۔“

”ویسے تم ثابت کیا کرنا چاہتی ہو؟“

”جی.....“ وہ حیرت سے بولی۔

”یہی ناں کہ تمہیں کسی چیز کی کوئی پروا نہیں ہے۔“

”سعود ایسی بات نہیں ہے۔“ وہ خواہ خواہ بات بڑھا رہے تھے۔

”پھر کیا بات ہے۔ تم ظاہر کرنا چاہتی ہو کہ تم بہت بے نیاز ہو۔ ہیرے جواہرات کی تمہاری نظر میں کوئی وقعت نہیں ہے۔ میرے تحفوں کی تمہاری نظر میں کوئی اہمیت نہیں ہے۔ وہ میں نے تمہیں سوٹ کیس میں بند کر کے رکھنے کے لیے خرید کر دی ہے؟“

”جی، میں ابھی پہن لیتی ہوں۔“ وہ بچوں کے سامنے بات بڑھانا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے

تھرملک تھا وہ۔ سڑکیں، پارک، ریسٹوران ہر جگہ صفائی کا اعلیٰ ترین معیار تھا۔ وہ بے حد خوب صورت پارک تھا۔ وہاں اس قدر اچھی لینڈ اسکیپنگ کی گئی تھی ایک ایک پودے پر بے حد محنت کی گئی تھی۔ پھولوں کی روشیں، گہری سبز گھاس، واکنگ ٹریکس، مصنوعی آبشار اور جھرنے۔ وہاں کس قدر مکمل حسن تھا اس پر ایک بحر طاری ہو گیا تھا۔ اسی کیفیت میں اس نے اپنی چادر بچھا کر نماز مغرب ادا کی۔ نماز پڑھ کر اس نے اللہ تعالیٰ سے سچے دل سے دعا مانگی۔

”باری تعالیٰ میری دعاؤں کو قبول فرما۔ اے رب کریم، اے رب العرش العظیم میری دعا کو شرف قبولیت بخش دے۔“ اور جب وہ اپنی دعاؤں کی لذتوں میں گم تھی تو چونک گئی۔

اس کے پاس کوئی تھا۔ وہ آئین کہنا ہی بھول گئی۔ وہی پاکیزہ مہک پھیلی تھی۔ دل کی گہرائیوں میں

اتر جانے والی مہک۔ روح کو چھو لینے والی خوشبو۔

ابھی کوئی یہاں سے ہو کر گزرا تھا۔ اس نے چاروں طرف دیکھا۔ وہاں بہت لوگ تھے مگر جنہیں وہ ڈھونڈ

رہی تھی وہ وہاں نہیں تھے۔ دل میں ایک عجیب سی سرخوشی کی لہر جاگ اٹھی۔ خواہ خواہ ہی ہنسنے سکرانے کو جی

چاہ رہا تھا۔ دونوں بچے وہی جانب سلاؤڈز لے رہے تھے۔ عالیہ کا جی چاہ رہا تھا وہ جھولا جھولے اور آسمان

کی بلندیوں کو چھو لے۔ تب ہی سعود ان کے لیے کھانے پینے کی ڈھیروں چیزیں لے کر آگئے۔

اگلے دن وہ کوالا لپور دینا کے بلند ترین ٹوئن ٹاورز دیکھنے گئے۔ بلندیوں کی طرف جاتے ہوئے

کتنّا اچھا لگ رہا تھا۔ دونوں بچے بہت انجوائے کر رہے تھے ہر جگہ پر ان کی دلچسپی کے بے شمار

سامان موجود تھے۔ اس رات سعود نے انہیں بے تحاشا شاپنگ کروائی۔ عالیہ کو بے حد قیمتی ڈائننگ

رنگ خرید کر دی۔ وہ لینا نہیں چاہتی تھی، زیورات سے اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور پھر اتنی مہنگی انگلی

کو سلا کر جب بیڈروم میں آئی تو اسے حیرت کے ساتھ ساتھ خوشی بھی ہوئی۔ آج وہ نشے کی حالت میں نہیں تھے اور ان کے چہرے پر ایک نرم سا تاثر تھا۔ وہ بالکل ایک بدلی ہوئی شخصیت لگ رہے تھے۔ آج پہلی بار ان کا اچھا دھما تھا اور وہ اسے کافی عزت سے مخاطب کر رہے تھے۔

”عالیہ میں اکثر سوچتا ہوں تم نے یہ سارا وقت میرے ساتھ کس طرح گزارا ہے، میں نے بھی تمہیں خوش نہیں دیکھا۔ ہنسنے بولنے نہیں دیکھا۔ کیا تم میرے ساتھ خوش بھی ہو؟“ عالیہ نے بہت حیران ہو کر انہیں دیکھا۔ خوش شکل تو وہ تھے ہی مگر اس وقت وہ بہت اچھے لگ رہے تھے۔

”ہٹاؤ ناں..... تم خوش ہو؟“ وہ کیا جواب

دیتی پتا نہیں کیوں اسے رونا آگیا۔ وہ رو رہی تھی اور

سعود اسے چپ کر رہے تھے۔

”روؤ نہیں پلیز عالیہ۔“ انہوں نے اسے اپنے

سینے سے لگا لیا۔ ”رو کیوں رہی ہو، تم خوش نہیں

ہو ناں؟“

”جی، میں بہت خوش ہوں۔“ اس نے بچ

بولتا تھا۔ اس وقت وہ بہت خوش تھی اور سعود اس کے

جواب سے اس قدر خوش ہوئے تھے کہ وہ حیران رہ

گئی تھی۔ ان کے چہرے کے تاثرات انہیں بے حد

وجہ اور خوب دہنارہے تھے۔ یہ اسے پہلی مرتبہ پتا چلا

تھا کہ اس کے ایک فقرے نے جیسے ان کی شخصیت ہی

بدل کر رکھ دی تھی۔ وہ کتنے مطمئن ہو کر سوئے تھے

اور ان کے چہرے پر ایک عجیب معصومیت تھی۔

زندگی میں بالکل پہلی مرتبہ وہ اسے بہت اچھے لگے

تھے۔ کچھ دیر لینے کے بعد وہ تہجد کی نماز کے لیے اٹھ

گئی۔ نہا کر اس نے سفید لباس پہنا۔ آج اسے

شکرانے کے نفل بھی تو پڑھنا تھے۔ اس شام سعود

انہیں شہر کے مشہور ریشٹل پارک دکھانے لے کر گئے

تھے۔ عالیہ کو وہ جگہ بے حد پسند آئی، انتہائی صاف

”ماما دلایا اور سارے سیریل بھی ہیں اور ہر قسم کی ورائٹی ہے۔ آپ اپنی پسند کا ناشتا کر سکتی ہیں۔“ اسے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ وہ دونوں بھاگ بھاگ کر اس کے لیے ناشتے کی میز سجاتے اور پھر وہ تینوں خوش ہو کر ناشتا کرتے کتنا مزہ آ رہا تھا۔ بلاشبہ وہ زندگی کے بہترین دن تھے۔

شیر و اور مانو تو اس کے پیارے بچے اس کے ہمراہ تھے اور کائنات کی ساری خوشیوں سے اس کا دامن بھر گیا تھا۔ وہ ہر لمحہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتی۔

ناشتے کے بعد وہ بچوں کو پڑھاتی۔ بیسٹ میں

خواتین کے لیے مسجد تھی اور بچوں کے لیے پلے لینڈ

اور دوسرے گیمز بھی۔ کمپیوٹر کی بھی سہولت تھی۔ بچے

مختلف کھیل کھیل سکتے تھے۔ وہ مسجد میں نماز اور نوافل

کے بعد تسبیحات میں مصروف رہتی اور گاہے بگاہے

بچوں کے ساتھ کسی کھیل میں بھی شامل ہو جاتی۔ کبھی

کبھی اسے یقین ہی نہ آتا کہ وہ اپنے بچوں کے ہمراہ

ملائشیا کے اس حسین اور آرام دہ ہوٹل میں ٹھہری ہوئی

ہے جہاں نہ امی جی کا ڈر تھا اور نہ بڑی آپا کی جھڑکیاں

اور نہ چھوٹی آپا کے طعنے اور نہ سعود کی گرم مزاجی۔

اس نے پہلی مرتبہ سوچا اگر امی جی اور بہنیں

سعود کو اس کے خلاف اس طرح بھڑکایا نہ کریں تو

شاید وہ اچھے شوہر بن بھی سکتے تھے۔ شام کو وہ انہیں

گھمانے پھرانے لے جاتے۔ ملائشیا کے مشہور اور

مخصوص مقامات کی سیر کرواتے۔ بہترین ڈنر

کراتے۔ بچوں کو دل بھر کر شاپنگ کراتے اور کافی

خوش نظر آتے۔ دو تین مرتبہ وہ اپنے دوستوں کے

ہمراہ بھی گئے اور ساری رات گزار کر صبح دم لوٹے اور

جس حالت میں لوٹتے تھے وہ عالیہ کے لیے بے حد

تکلیف دہ ہوتی مگر وہ صبر کرنے کے علاوہ کیا کر سکتی

تھی اور خاموش رہنا تو اس کا مقدر ٹھہر چکا تھا۔

اس رات وہ پہلی مرتبہ باہر نہیں گئے تھے اپنے

لیپ ٹاپ پر وہ کافی دیر سے مصروف تھے۔ وہ بچوں

اور کیا کہہ رہے ہیں مگر پھر بھی وہ انہیں اپنے طور پر قائل کرنے کی کوشش کرتی رہتی تھی۔

”سعود ابھی بچے بہت چھوٹے ہیں ایسی بات آپ سوچ بھی کیسے سکتے ہیں؟“

”کیوں..... سوچنے پر کوئی پابندی لگی ہے کیا۔“

میں بھی اے لیول کے بعد باہر چلا گیا تھا اور لاء پڑھ کر واپس آیا تھا۔ ”وہ خاموش ہو گئی۔ وہ ہر روز نماز حاجت پڑھ کر رورو کر اپنے رب سے دعا مانگتی مگر شاید اللہ کو بھی یہی منظور تھا۔ اس نے سعود کے اس فیصلے کو اللہ کی رضا جان کر مان لیا تھا مگر اندر سے جیسے کسی نے اس کا کلیجا جکڑ لیا تھا۔ وہ بچوں کے بغیر کس طرح جیے گی۔ اس گھر میں اس کی دلچسپی کا سامان اور اس گھر میں رہنے کا واحد جواز اس کے بچے تھے۔ رو کر اس کی آنکھیں سوچ گئی تھیں۔ جس دن وہ دونوں جا رہے تھے اس کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ پتا نہیں سعود نے اسے کیا کہا تو بھٹ بڑی تھی۔

”کیا ضرورت ہے بچوں کو اتنی چھوٹی عمر میں باہر بھیجے گی۔ وہ کیا خاک پڑھیں گے وہاں جا کر اپنا کوئی کام وہ اپنے ہاتھ سے کر نہیں سکتے۔ وہاں کون ان کی دیکھ بھال کرے گا۔ یہاں ان کے سارے کام میں کرنی ہوں۔ وہاں کون کرے گا یا تو مجھے بھی ان کے ساتھ بھیج دیجیے۔ میں ان کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ پلیز سعود مجھ پر یہ ظلم نہ کریں بچوں کو مجھ سے جدا نہ کریں۔“

”اپنی بکواس بند کرو اور یہ رونا دھونا بھی بچوں کے سامنے نمائش کرنے کی ضرورت نہیں تمہیں روتا دیکھ کر شاید وہ بھی جاننا چاہیں۔“

”کتنا اچھا ہو جو وہ نہ جائیں۔ سعود کیا آپ ان کے بغیر اداس نہیں ہوں گے کیا اباجی اور امی جی اداس نہیں ہوں گی؟“

”وہ جب بھی اداس ہوں گے جا کر ان سے مل آیا کریں گے۔“

بچوں پر ان لوگوں کا سایہ بھی نہ پڑ سکے مگر وہ انہیں کہاں تک بچا سکتی تھی۔ بچے بڑے ہو رہے تھے بہت سی باتیں وہ سمجھنے لگے تھے اور آگے چل کر وہ اور بھی اچھی طرح سمجھ جائیں گے۔ وہ جتنی کوشش کر سکتی تھی کر رہی تھی۔

اکثر وہ انہیں اپنے بیڈروم سے باہر ہی نہ نکلنے دیتی اچھی باتیں انہیں بتاتی۔ بری باتوں سے منع کرتی۔ رسول پاک کی سیرت پاک انہیں سناتی۔ دونوں کو نماز پڑھنا اس نے سکھا دی تھی۔ نماز پڑھنا ان کے ساتھ کھڑے ہو کر نماز پڑھتی۔ ہوم ورک کے دوران وہ انہیں قرآن اور حدیث کے حوالے سے چھوٹی چھوٹی باتیں بتاتی جو وہ بہت شوق سے سنتے مگر بہر کیف اس کے بیڈروم کے باہر کی دنیا ان کے لیے پرکشش تھی۔ جہاں ان کے لیے بہت زیادہ دلچسپیاں تھیں جو انہیں اپنی طرف کھینچتی تھیں اور ان کا باپ ان کو اس دنیا میں پوری طرح انوالو کرنا چاہتا تھا۔ بچوں کو چھوڑ کر سعود کے ساتھ فرانس جانے کو اس کا بالکل جی نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ سخت شش و پنج میں مبتلا تھی۔ وہ سعود کے سامنے انکار کس طرح کر سکے گی۔ اس نے منت کے نفل مان لیے تھے اور اللہ نے اس کی مشکل آسان کر دی تھی۔ سعود نے دوبارہ اسے ساتھ چلنے کو نہیں کہا۔

☆☆☆

شیر سلیمان اور شیر زمان نے ابھی اے لیول میں قدم ہی رکھا تھا کہ سعود نے کہنا شروع کر دیا کہ وہ اے لیولز کے بعد بچوں کو پڑھنے کے لیے انگلینڈ بھیج دیں گے۔ اکثر ان میں بحث رہنے لگی تھی اگرچہ وہ ان سے بحث کرنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ ان سے جھگڑا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ ان کے مزاج سے ڈرتی تھی انتہائی ناقابل یقین مزاج تھا ان کا۔ جانے کب وہ غصے میں آئے سے باہر ہو جائیں ایسے میں وہ کچھ نہیں دیکھتے تھے، کچھ نہیں سوچتے تھے کہ وہ کیا کر رہے ہیں

دفعہ سعود بھی ان کے ہمراہ جا رہے تھے۔ اس کی بچھ میں نہیں آ رہا تھا کہ فرانس جانے کی منطق کیا تھی۔ وہ ایک وکیل تھے اور ان کی وکالت بہت اچھی چلتی تھی۔ اگرچہ وہ زیادہ محنت نہیں کرتے تھے دراصل پیرامان کی ضرورت نہیں تھا وہ منہ میں سوٹنے کا بیج لے کر پیدا ہوئے تھے۔ اس لیے جب اور جہاں جی چاہے وہ جاسکتے تھے اور اسے یہ جان کر اور بھی حیرت ہوئی کہ وہ عالیہ کو بھی ساتھ لے کر جانا چاہتے تھے مگر امی جی نے انہیں سختی سے منع کر دیا تھا۔

”پردیس میں عورتوں کی کمی نہیں۔ عالیہ جیسی منحوس صورت عورت کو ساتھ لے جانے کی ضرورت کیا تھی۔“ ان کی گفتگو کا لب لباب یہ تھا۔

”امی جی، اپنی عورت کی تو بات ہی اور ہوتی ہے۔ بڑی فرمانبردار ہوتی ہے۔“

”رہنے دے دفع کر۔ جتنے پیسے خرچ کرے گا اتنی اشاروں پر چلنے والی عورت مل جائے گی۔“ اور عالیہ ماں اور بیٹی کی گفتگو سن کر دوگ رہ گئی۔ جب ماں ہی بیٹی کو اس طرح ترغیب دے رہی تھی تو بیٹی کا کیا تصور تھا۔ جب باپ سب کچھ جانتے بوجھتے آنکھیں بند کر لے اور سب کچھ سنتے ہوئے کان بند کر لے تو اس میں بیٹی کا کیا دوش تھا۔ اندر تک وہ لرز کر رہ گئی تھی۔ یہاں اخلاق کا نہ کوئی معیار تھا اور نہ کردار کا کوئی پیمانہ۔ سعود کی تعلیم اگرچہ بہت اچھے اسکولوں میں ہوئی تھی وہ باہر سے باریش لا کر کے آئے تھے لیکن گھر کے ماحول کی وجہ سے شخصیت میں وہ چیز پیدا نہ ہو سکی تھی جو اچھی تربیت کی مہمونت ہوئی ہے مگر اب کیا ہو سکتا تھا البتہ اب وہ شیر سلیمان اور شیر زمان کو اس ماحول سے بچانا چاہتی تھی۔ اس کی جان کو تو ایک ہمیشہ کے لیے روگ لگ چکا تھا پورے بارہ سال گزر چکے تھے روتے اور کڑھتے ہوئے اور دعائیں مانگتے ہوئے۔ جی چاہتا تھا بچوں کو لے کر وہ کہیں بہت دور چلی جائے جہاں اس کے

سوٹ کیس کھول کر جلدی سے انگوٹھی پہن لی۔

”یہ دیکھیں سعود کتنی اچھی لگ رہی ہے۔“

”بذ نعیمہ عورت۔“ وہ غصے میں دباڑے۔

”تم اس قابل ہو ہی نہیں کہ تمہیں کوئی تحفہ خرید کر دیا جائے۔“ بچوں نے مڑ کر ان کی طرف دیکھا۔

”پلیز سعود بچوں کے سامنے اس قسم کی باتیں نہیں کریں۔“

”کیوں نہ کروں۔“

”پلیز آہستہ بولیں۔“

”اپنا منہ چہرہ دفع کرو۔“ وہ چیخ چیخ کر بول رہے تھے۔ ”میں تمہاری شکل نہیں دیکھنا چاہتا۔ امی جی ٹھیک کہہ رہی تھیں تمہارے لیے یہ سب کچھ کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔“ بچے آ کر اس سے لیٹ گئے تھے۔ وہ انہیں جھک کر پیار کرنے لگی۔ وہ تو بچے تھے مارے خوف کے وہ خود لرز رہی تھی اور اس کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو آ گئے۔

”تو یہ دوز آج امی نے دی تھی۔“ سعود پیش کے عالم میں کمرے سے باہر نکل گئے اور وہ خود کو کمپوز کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ آنسو پونچھ کر اس نے مسکرائے کی کوشش کی۔

”کون سی ویڈیو گیم کھیل رہے تھے۔ آؤ مجھے بھی اپنے ساتھ کھلاؤ۔“ وہ انہیں مارل کرنا چاہ رہی تھی اور جب وہ واپس جا رہے تھے تو عالیہ کا کچی چاہ رہا تھا وہ وہیں پر رہ جائے۔ اس ملک کے کسی گناہم کو شے میں۔ اپنے دونوں بچوں کے ساتھ وہ کہیں چھپ جائے۔ کوئی اسے ڈھونڈ نہ سکے، کوئی اسے تلاش نہ کر پائے مگر ایسا کہاں ممکن تھا پھر وہی شب و روز تھے اور زندگی میں رچا ہوا بد مزگی کا احساس۔ وہاں کچھ بھی نہیں بدلاتھا وہی پرانے طور طریقے تھے۔

☆☆☆

اباجی بزنس کے سلسلے میں فرانس جا رہے تھے۔ وہ اکثر بیرون ملک دوروں پر جایا کرتے تھے مگر اس

کنجوس

ایک کنجوس شخص رکشے والے سے۔ ”بھائی عبداللہ شاہ غازی کے مزار پر جاؤ گے؟“

رکشے والا۔ ”ہاں جاؤں گا۔“

کنجوس آدمی۔ ”یہ پھول ان کے مزار پر ڈال دینا۔“

دھکا

ایک صاحب چابی سے اپنا کان کھجا رہے تھے کہ کسی بچے نے دیکھا تو بولا۔
”اٹکل اگر آپ چابی سے اشارت نہیں ہو رہے تو دھکا لگا دوں؟“

مرسلہ: مصباح رضا سعید، فیصل آباد

کریں گی۔ میں آپ کا گناہ گار ہوں۔“

”پلیز بابا ایسی باتیں نہ کریں۔ یہ میرا مقدر تھا اور مقدر کا لکھا تو انسان کو برداشت کرنا ہی پڑتا ہے۔

آپ ایسا کیوں سوچتے ہیں۔ اس میں آپ کا کوئی قصور نہیں تھا۔ یہ سب من جانب اللہ تھا۔ اللہ اپنے نیک بندوں کو آزماتا ہے۔ اللہ کے ہر فیصلے میں بہتری ہوتی ہے۔ انشاء اللہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔“

”انشاء اللہ۔“ بابا نے پیار سے اس کے ہاتھ کو تھپکا۔ ”اللہ تم پر اپنی رحمتوں اور برکتوں کا نزول فرمائے۔ میری ساری دعائیں تمہارے لیے ہیں میری بچی۔ تمہارے نصیب کی خوشیاں تمہیں ضرور ملیں گی۔ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے اور صبر کرنے والوں کو اللہ اجر عظیم عطا فرماتا ہے۔“

”بے شک بابا۔ ہاں ہمارا ایمان ہونا چاہیے“

تب ہی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ سعید صاحب نے

ریسیور اٹھایا اور وہ خوشی سے چلا اٹھے۔

کردی مگر وہ ہوش و خرد کی دنیا سے بے نیاز بے حس و حرکت پڑی تھی۔ بہت دنوں کے بعد وہ اس طرح سو رہی تھی۔ آرام و سکون کے ساتھ۔ برداشت کی انتہا جب ختم ہو گئی تھی تو یہ بے ہوشی بھی ایک نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں تھی۔ آہستہ آہستہ اس کا بلڈ پریشر ہارٹ بیٹ اور ٹریچر ٹارل ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر امید افزا باتیں کرنے لگے۔ ایک مرتبہ اس نے شیر کو پکارا تھا وہ مانو کو بلارہی تھی۔ اس نے ہاتھ ہلا کر اسے بلایا تھا اور پھر اسے ہوش آ گیا۔

اپنے سامنے بابا، ماما اور سارے بہن بھائیوں کو دیکھ کر اس کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی۔ ڈاکٹروں نے انہیں عالیہ کی زندگی کی نوید سنائی تھی۔ اللہ نے اسے نئی زندگی بخشی تھی۔ ماما نے شکرانے کے نفل ادا کیے تو بابا نے ڈھیروں مٹھائی منگوائی۔ سب لوگ کتنا خوش تھے۔ سب کے چہروں پر اس کے لیے بے پناہ محبت جگمگا رہی تھی۔ ان کی آنکھوں میں تشکر کے آنسو چمک رہے تھے۔ عالیہ نے گہرے سکون سے آنکھیں بند کر لیں۔

گھر آ کر وہ بالکل چپ تھی۔ کسی نے اس سے کچھ پوچھا تھا اور نہ اس نے کچھ بتایا تھا۔ سب لوگ اس کے آگے پیچھے پھر رہے تھے۔ ہر ممکن دلجوئی کی کوشش کر رہے تھے۔ ماما اس کے کھانے پینے کا بے حد خیال رکھ رہی تھیں۔ بابا سارا وقت اس کے قریب بیٹھے رہتے۔ اسے دیکھتے رہتے یوں لگتا تھا جیسے وہ اس سے کچھ کہنا چاہتے ہیں مگر کہہ نہیں سکتے۔ اس دن وہ اس کا ہاتھ پکڑے اس کے چہرے کی طرف بہت غور سے دیکھ رہے تھے۔

”عالی میری پیاری بیٹی، میں آپ سے معافی مانگتا چاہتا ہوں۔ میرے غلط فیصلے کا خمیازہ بہت سال آپ نے بھگتا..... تکلیف تو بہت معمولی لفظ ہے۔ جس اذیت سے آپ کو گزرنا پڑا اس کا ذمے دار صرف میں ہوں۔ کیا آپ اپنے بابا کو معاف

کے ڈرامے کا ڈراپ سین ہو گیا تھا سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ یہ کیا ہوا؟ کاش وہ کوئی سوال جواب نہ کرتی۔ اس نے ایسا تو کبھی نہیں چاہا تھا مگر وہ تو سب کچھ طے کر کے بیٹھے تھے۔ سارے کاغذات تیار کر کے..... ماں اور بیٹا پورا پورا گرام بنا کر اس لمحے کا انتظار کر رہے تھے یہ تو ہونا ہی تھا۔ وہ چپ بھی رہتی تب بھی ایسا ہی ہونا تھا۔ اس نے بند ہوئی پلکوں اور تاریکی میں ڈوبتے ذہن کے ساتھ سوچا۔ بچے چارہ ہیں۔ تین بجے رات ان کی فلائٹ تھی پتا نہیں کیا وقت ہوا تھا۔ معلوم نہیں کتنے گھنٹے رہ گئے تھے۔ اس نے حساب کرنا چاہا مگر اس کا ذہن جیسے گہری نیند میں جا رہا تھا۔

”شیرو..... مانو..... میرے بچے۔ شیرو، مانو۔“ پھر وہ بے ہوش ہو گئی۔

☆☆☆
سعید صاحب کو فون پر کسی ملازم نے اطلاع دی تھی۔ وہ خبر تھی یا قیامت لگتا تھا جیسے قریب ہی کوئی بم پھٹا تھا اور ان کی ذات کے پرچے اڑ گئے تھے۔ ماما نے وہ خبر سن کر دل تھام لیا تھا۔ وہ عالیہ کی مجرم تھیں پہلا خیال ان کے ذہن میں یہی آیا تھا۔ اگر یہی انجام ہوتا تھا تو بہت پہلے کسی اور انداز میں بھی اس کا اختتام ہو سکتا تھا۔ عالیہ کو اس حال میں چھوڑ کر سارے گھر والے اتر پورٹ چلے گئے تھے۔ بچوں کو نانانا سے ملانے اور خدا حافظ کہنے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی تھی۔

سعید صاحب نے عالیہ کو اسپتال میں شفٹ کیا۔ وہ آئی سی یو میں تھی اور ڈاکٹر کا خیال تھا کسی شدید ذہنی صدمے کے باعث نروس بریک ڈاؤن ہو گیا تھا۔ پورا ایک ہفتہ گزر گیا وہ ہوش میں نہیں آئی تھی، ہمایوں، مہرین، امین، فاطمہ بھی پہنچ گئے تھے۔ اسے ہوش کیوں نہیں آ رہا تھا۔ سب کی جان پر بنی ہوئی تھی۔ انہوں نے صدقات اور خیرات کی انتہا

”اور میں..... میں کیا کروں گی؟“
”تم کچھ نہیں کرو گی تم اسی طرح روؤ گی اور تڑپو گی اور میں تمہیں دیکھ کر خوش ہوا کروں گا۔“ وہ بے۔ ”پاکل عورت یہ ان کے مستقبل کا سوال ہے۔ اب وہاں سے یہ کچھ بن کر ہی لوٹیں گے۔“
”ہاں، جیسے آپ بن کر لوٹے ہیں۔ اسی طرح وہ بن کر واپس آئیں گے۔“ وہ ایک دم بولی۔
”کیا کہا تم نے..... ذرا پھر سے کہو۔“ انہوں نے اسے بالوں سے پکڑ کر کھینچا۔ ”میں کیا بن کر لوٹا ہوں بتاؤ..... بولو۔“ انہوں نے اس کا منہ پھٹروں سے لال کر دیا۔ ”بد نصیب عورت میں جانتا ہوں تم پہلے دن سے خوش نہیں ہو۔ پتا نہیں کس یار کی یادوں میں کھوئی رہتی ہو۔ پتا نہیں کس عاشق کو چھوڑ کر آئی ہو جو روتی رہتی ہو۔ میں پورے ہوش و حواس میں تمہیں طلاق دیتا ہوں..... سنا تم نے نفوس عورت میں طلاق دیتا ہوں، طلاق دیتا ہوں۔ امی جی بھی یہی چاہتی ہیں کہ میں تمہیں طلاق دے دوں اس لیے میں نے پہلے سے طلاق کے کاغذات تیار کر رکھے ہیں۔“ سعید نے اپنا بریف کیس کھول کر کاغذات نکالے۔

”ان پر دستخط کرو، امی جی کتنے دنوں سے پوچھ رہی ہیں کہ تم نے دستخط کروائے کہ نہیں..... کرو یہاں دستخط۔“ انہوں نے اس کے ہاتھ میں قلم تھمایا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہا تھا ایسے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

”کرو دستخط۔“ وہ اتنی زور سے دھاڑے کہ بغیر دیکھے اور بغیر سوچے سمجھے اس نے دستخط کر دیے۔ ”ویری گڈ؟“ وہ بے۔ ”میں پہلے ہی ان کاغذات پر سائن کر چکا ہوں اور اب تم یہاں سے دُج ہو جاؤ اپنی نفوس صورت کم کرو۔ میں تمہاری شکل دیکھنا نہیں چاہتا۔“ وہ اسے پاؤں سے ایک ٹھوک مار کر اس کے ہاتھ سے کاغذات لے کر چلے گئے اور کسی کو پتا بھی نہیں چلا کہ اندر کیا ہو رہا تھا۔ اس کی زندگی

کے پاس ضرور آتے۔

”آپ ان سے کیوں نہیں ملیں ماما؟“

”بس بھی اتفاق ہی نہیں ہوا۔ تمہارے بابا نے بھی کبھی ان سے نہیں ملوایا، میں نے خود بھی کبھی ان سے ملنے کی خواہش کا اظہار نہیں کیا۔“ وہ بابا کا بے چینی سے انتظار کر رہی تھی اور بابا تھے کہ آنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔ وہ عصر کی نماز پڑھ کر لوٹے اور اس دوران اس کی بے چینی اور شوق انتہا پر پہنچ گئے تھے۔

”بابا آج کون آیا تھا؟“

”آج عبداللہ صاحب آئے تھے۔“ بابا بہت خوش نظر آ رہے تھے۔

”عبداللہ صاحب کون؟“

”یہ میرے دوست ہیں۔ بہت نیک و دین دار ہیں چالیس پینتالیس سال کے قریب عمر ہے ان کی۔ عمروں کے فرق کے باوجود ہم اچھے دوست ہیں۔ پندرہ سال پہلے انہوں نے اسلام قبول کیا تھا۔ اسلام کا گہرا مطالعہ کیا ہے انہوں نے۔ بہت اچھے انسان ہیں اور اس سے اچھے مسلمان۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ پیشے کے لحاظ سے انجینئر ہیں۔ سعودی عرب میں رہتے ہیں۔ انہوں نے اپنے ماں باپ کو بھی دائرہ اسلام میں داخل کیا ہے۔ رسول پاک کی انہیں خواب میں زیارت ہو چکی ہے۔ تین چار حج کر چکے ہیں۔ ہر سال عمرے پر جاتے ہیں۔ اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے سلسلے میں وہ اس طرح مصروف رہے کہ ابھی تک انہیں شادی کرنے کی فرصت ہی نہیں ملی۔“ اور عالیہ کو اپنا وہ خواب یاد آ گیا۔ جب وہ ان بزرگ ہستی کے ہمراہ خانہ کعبہ کا طواف کر رہی تھی اور انہوں نے ایک شخص کی طرف اشارہ کر کے عالیہ کو کچھ بتانے کی کوشش کی تھی۔ تبھی اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔ اسے ایک عجیب سی سرخوشی نے آن گھیرا۔

”بابا آپ نے مجھے ان سے کیوں نہیں ملوایا؟“

کسی شخص کی طرف ان بزرگ نے اشارہ کیا تھا وہ سمجھنے سے قاصر تھی۔ ذرا ذرا سی تفصیل کے ساتھ کتنا عرصہ ہو گیا تھا۔ اس نے خواب میں انہیں نہیں دیکھا تھا جانے وہ کون تھے۔ شاید وہ اللہ کے ولی تھے یا کوئی نیک روح اور ان سے عالیہ کا کیا تعلق تھا۔ صبح سے بابا کے کوئی خاص مہمان آئے ہوئے تھے۔ اس دن انہوں نے خاص اہتمام سے کھانا تیار کروایا تھا۔ کھانے کے بعد وہ قریبی مسجد میں نماز پڑھنے چلے گئے تھے۔ مہمانوں کے جانے کے بعد اس کا معمول تھا وہ ڈرائنگ روم کو نئے سرے سے ٹھیک کرتی تھی۔ برتن سمیٹتی تھی۔ کسٹر ٹھیک کر کے رکھتی، پردے برابر کرتی اور جب اس نے کمرے میں قدم رکھا تو وہ ٹھٹھک کر وہیں کھڑی رہ گئی۔ یہ کمرے میں کیسی مہک تھی بالکل وہی خوشبو۔ روح میں اتر جانے والی اس مہک کو وہ بہت اچھی طرح پہچانتی تھی۔ وہ تو ایک پاکیزہ احساس بن کر اس کے دل اور دماغ میں بس چکی تھی۔ اس نے تو سوچا تھا شاید وہ جنت کی خوشبو بھی بھلا اس دنیا میں وہ اسے کہاں پاسکتی ہے۔ وہ خوشبو تو صرف ایک احساس تھا اور ایک احساس کو بھلا ادراک کے دائرے میں کس طرح لایا جاسکتا تھا۔ اس نے ایک لمبی سانس لے کر اس احساس کو اپنے اندر اتار لیا۔ کتنی تازگی اور خوشی کا احساس ہو رہا تھا۔ لگتا تھا جیسے کوئی بہت قیمتی کھوئی ہوئی چیز اسے مل گئی۔

وہ شدت سے بابا کی واپسی کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ اُن سے اس مہمان کے بارے میں جانتا چاہتی تھی۔ وہ کون تھے، کہاں سے آئے تھے، کہاں رہتے تھے اور آج سے پہلے وہ کیوں ان کے بارے میں نہ جان سکی۔ ماما نے اسے بتایا وہ بابا کے دوست تھے اور اللہ کے بہت نیک بندے ہیں۔ بابا انہیں پچھلے کئی سالوں سے جانتے تھے۔ وہ سعودی عرب میں رہتے تھے اور کبھی کبھار جب یہاں آتے تو بابا

”باری تعالیٰ میرے بچوں کو اپنے حفظ و امان میں رکھنا۔ پر دیس میں تیرے بھوان کا اور کوئی نہیں ہے۔ ان کو سیدھے راستے پر چلا۔ ان کو شیطان کے ہتھکنڈوں سے بچا۔ ان کو پانچ وقت کا نمازی اور پرہیزگار بنا۔ ان کے سینے قرآن کے نور سے معمور کر دے۔ یہ ایک بہت مجبور اور بے بس ماں کی دعا ہے۔ اے سبح البصیر میری دعاؤں کو شرف قبولیت بخش دے۔“ لمبی لمبی دعائیں مانگ کر اس کے بے سکون دل کو جسے قرار آ جاتا۔ بے چین مانتا کو جیسے چین مل جاتا۔ اس دیار غیر میں وہ اپنے بچوں کو اللہ کی حفاظت اور ضمانت میں دے کر جیسے بے فکر ہو گئی تھی۔ وہ پیچھے مڑ کر دیکھتی تو حیران رہ جاتی۔ اتنا سب کچھ اس نے کس طرح برداشت کر لیا تھا۔ اس میں اس کا کوئی کمال نہیں تھا یہ سب اللہ کی مہربانی تھی جس نے اس کی مدد کی تھی اور اسے اتنا حوصلہ عطا کیا تھا کہ اس نے صبر کے ساتھ سب کچھ برداشت کر لیا تھا اور نہ اتنا سب کچھ کس طرح سہہ سکتی تھی۔

کبھی کبھی اسے لگتا جیسے اس نے کوئی بھیانک خواب دیکھا ہو اور ابھی انہی وہ اس طویل خواب سے بیدار ہوئی ہو۔ آج بہت دنوں کے بعد اسے اپنا وہ خواب یاد آیا۔ وہ مہربان، ہستی، وہ نورانی چہرہ، وہ منور حجرہ، انہوں نے زندگی میں کس طرح اس کی رہنمائی کی تھی۔ اگر وہ اسے اللہ کا کلام پڑھنے کے لیے عطا نہ کرتے تو وہ کس طرح جی سکتی تھی۔ وہ اب بھی کثرت سے انا، انا، انا الیہ راجعون پڑھا کرتی اور آیت کریمہ جسے پڑھ کر اسے ہمیشہ ایک نئی طاقت ملتی تھی اور جینے کا نیا حوصلہ وہ خود کو اللہ سے بے حد قریب محسوس کرتی۔ وہ جانتی تھی اللہ اس سے محبت کرتا ہے تبھی تو اس نے اسے چن لیا تھا۔ وہ اللہ کے چنے ہوئے بندوں میں سے تھی اور اللہ جسے چن لیتا ہے اسے کبھی تنہا نہیں چھوڑتا، وہ اپنے ان خوابوں کو یاد کر رہی تھی۔ وہ آخری خواب میں غور کر رہی تھی کہ

”اوہ..... میرا شیر سلیمان کیسے ہو؟ میرے پیارے بچے اور بھائی کیسا ہے؟ لو یہ اپنی ماما سے بات کرو۔“ اور عالیہ جیسے دوبارہ جی اٹھی تھی۔ شیر سلیمان کی آواز سن کر اس کے جسم میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑ گئی تھی۔

”ماما کیسی ہیں آپ؟“

”میں بالکل ٹھیک ہوں میرے بچے، آپ سناؤ شیر زمان کیسا ہے؟“

”وہ بالکل ٹھیک ہے۔ ماما میں آپ کو بہت مس کرتا ہوں اور شیر زمان بھی۔“

”اچھا، آپ کی پڑھائی کیسی ہو رہی ہے؟“

”ٹھیک ہے ماما، میں نے آپ کو پہلے بھی ایک دن فون کیا تھا۔ کسی نے اٹھایا ہی نہیں، بابا نے بتایا کہ آپ نانا کے گھر میں ہیں۔“

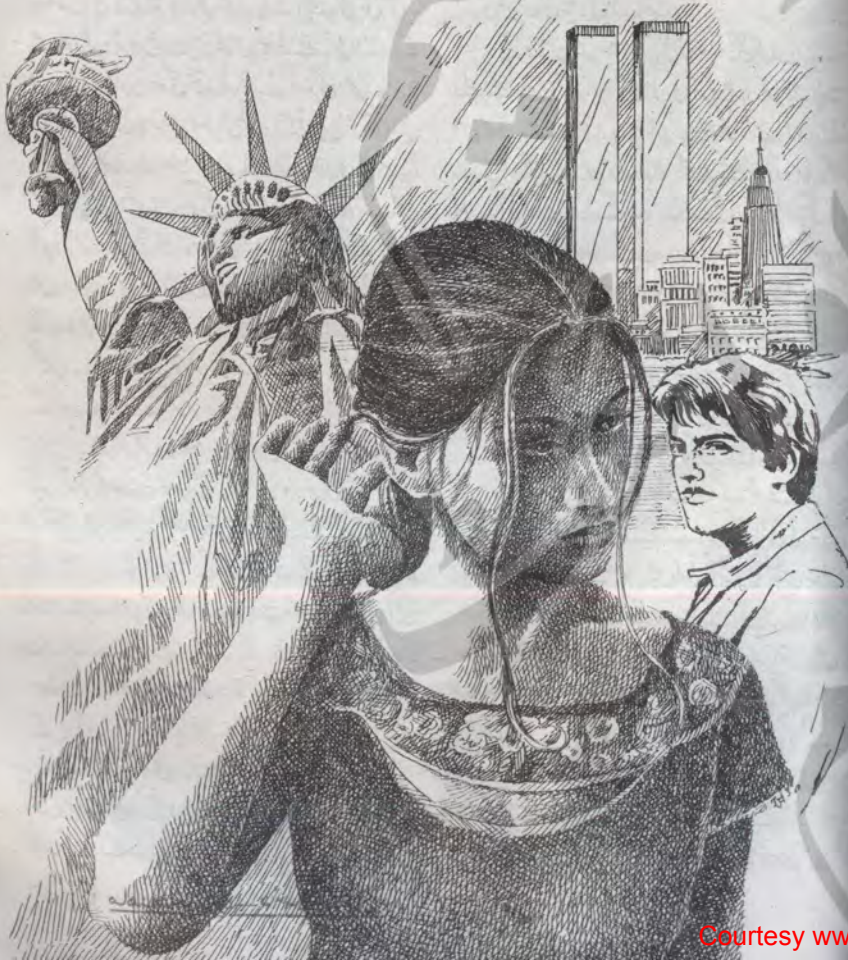
”جی بیٹے میں ادھر ہی ہوں۔ آپ کا نمبر سی ایل آئی پر آ گیا ہے۔ اب میں آپ سے بات کرتی رہوں گی۔ شیر زمان سے بات کراؤ۔“ اس دن بہت عرصے کے بعد وہ بہت خوش تھی۔ اللہ اس پر کس قدر مہربان تھا۔ سعودا اگر چاہتے تو بچوں کو بات کرنے سے منع بھی کر سکتے تھے۔ انہیں اس سے بدظن بھی کر سکتے تھے۔ انہیں علیحدگی کے بارے میں بھی بتا سکتے تھے مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ اس نے شکرانے کے نفل ادا کیے۔

رفتہ رفتہ وہ زندگی کی طرف لوٹنے لگی تھی۔ ہمایوں اور ہمیں اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے تھے۔ اس نے آہستہ آہستہ گھر کے کاموں میں دلچسپی لینا شروع کر دی تھی۔ ماما کی صحت بہت گر چکی تھی۔ وہ ان کا بہت خیال رکھتی تھی۔ جب جی چاہتا وہ اپنے بچوں سے بات کر لیتی اور جیسے اس کی مانتا تو قرار مل جاتا۔ وہ انہیں فون پر پانچ وقت نماز پڑھنے کی ہدایت کرتی، انہیں اچھی اچھی نصیحتیں کرتی۔ تہجد اور نماز حاجت پڑھ کر وہ اللہ سے التجا میں کرتی۔

نعت خواں ذرا دم لینے کو رکھی تو شاہین نے زپر لب
ناصرہ کو بتایا۔
”شرہ کی منگنی ہو گئی ہے۔“ ناصرہ نے چونک کر
شاہین کو دیکھا۔
”واقعی.....؟“
”ہاں شرہ کی منگنی ہو گئی ہے۔“ یہ زبیدہ کی آواز
تھی جو صرف چند کانوں تک ہی پہنچ سکی مگر جھوم جھوم کر
دروہ پڑھنے والی خواتین کے سلسل میں کی آگئی۔ جسے
نعت خواں نے فوراً نوٹ کیا۔ اس نے تنبیہ کی۔
”معزز خواتین! گفتگو سے پرہیز کیجیے۔ یہ حضور ﷺ
کی محفل ہے۔ درود کا ورد جاری رکھیے۔“
ایک بار پھر درود کی صدائیں بلند ہونے لگیں مگر

خارزار عشق

شع خانم



سادگی سے سنوارا۔ تب بابا نے اسے بتایا کہ عبداللہ
صاحب آگئے ہیں۔ ساری کائنات جیسے تھم گئی تھی۔
گھڑی کی سوئیاں پتا نہیں چل بھی رہی تھیں کہ نہیں۔
”عالیہ! تمہارے بابا تمہیں ڈرائنگ روم میں
بلا رہے ہیں۔“ ماما نے کہا۔ اس نے دوپٹا سر پر
اوڑھا اور جیسے خواب کے عالم میں چلتی ہوئی ڈرائنگ
روم میں آگئی۔ اسی پاکیزہ مہک نے بڑھ کر اس کا
استقبال کیا تھا۔
”السلام علیکم۔“ وہ اس کے احترام میں
کھڑے ہو گئے تھے۔
”وعلیکم السلام، پلیز آپ بیٹھیے۔“ وہ جب بیٹھ
گئے تو وہ بھی سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی۔ عالیہ
نے نگاہیں اٹھا کر جب انہیں دیکھا تو مارے حیرت
کے وہ گنگ رہ گئی۔ خدایا! کیا ایسا بھی ہوتا ہے
..... یہ تو وہی شخص تھے جن کی طرف ان بزرگ نے
اشارہ کیا تھا۔ لیپ کی روشنی ان کے آدھے چہرے
پر پڑ رہی تھی۔
اس پر ایک عجیب سی کیفیت طاری تھی۔ کیا یہ سچ
تھا، یہ کیسا بھید تھا یا وہ خواب دیکھ رہی تھی۔ ماما نے
انہیں شربت کا گلاس پیش کیا تو احتراماً جھک کر انہوں
نے گلاس تھام لیا۔
”شکریہ ادا جان، آپ تشریف رکھیے۔“ وہ ماما
سے مخاطب تھے تب عالیہ نے ان کا پورا چہرہ دیکھا۔
وہ نگاہ بھر کر انہیں دیکھ ہی نہیں سکی۔ وہ ملکونی حسن کے
مالک تھے۔ بے اختیار اس کی پلکیں جھپک گئیں۔ اللہ
اپنے بندوں کے حال پر کس قدر مہربان ہے وہ اس پر
ایمان رکھتی تھی مگر وہ اپنے بندوں کے دکھوں کا مداوا
کس طرح کرتا ہے یہ اسے آج پتا چلا تھا۔ اپنی خوش
بخئی پر اسے خود رشک آ رہا تھا۔ بابا اور ماما کے چہرے
خوشی سے دمک رہے تھے۔ یہ اللہ کی رضا تھی اور اس
نے اللہ کی رضا کے سامنے سر جھکا دیا تھا۔



”اب وہ آئے تو میں آپ کو ان سے ضرور
ملواؤں گا۔“ وہ تو نہیں آئے تھے مگر بابا نے جو خبر اسے
سنائی تھی وہ سن کر حیران اور پریشان رہ گئی۔ اسے
یقین نہیں آ رہا تھا بابا کیا کہہ رہے تھے۔
عبداللہ صاحب نے عالیہ کے لیے اپنا رشتہ بھیجا
ہے۔ وہ اس سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ وہ اس کے
حالات سے بہ خوبی واقف تھے۔ بابا نے انہیں اس
کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔
”عالیہ، اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں فرماتا ہے
نیک عورتوں کے لیے نیک مرد ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کا
انعام ہے تمہارے لیے مگر میں پھر بھی تم سے
پوچھنا ضروری سمجھتا ہوں۔ میں کوئی فیصلہ نہیں کرنا
چاہتا۔ اگر تمہاری رضامندی ہو تو مجھے عبداللہ
صاحب سے رشتے داری کر کے فخر ہوگا۔ یہ میرے
لیے ایک اعزاز ہے، میں چاہتا ہوں تم خوب سوچ
سمجھ کر فیصلہ کرو۔ وہ تم سے ملنا چاہتے ہیں اگر تمہارا
جواب ہاں میں ہوا تو ہم انہیں کل شام کھانے پر
بلا لیں گے۔“ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا وہ کیا
کریے۔ وہ کیا جواب دیتی۔ فرط اشتیاق سے وہ لہرز
رہی تھی۔ اس سے بولا ہی نہیں جا رہا تھا۔
”ٹھیک ہے بابا، آپ انہیں کل کھانے پر
بلا لیں۔“ ساری رات اس نے نوافل پڑھ کر گزاری
تھی۔ وہ بس ایک ہی دعا مانگے جا رہی تھی۔
”اللہ مجھے اپنے رنگ میں لے لے کہ تیرا
رنگ سب سے اچھا ہے۔“ سارا دن پتا نہیں کس
طرح گزرا۔ جوں جوں شام قریب آ رہی تھی ایک
گہرا سکون اور انبساط اس کے پورے وجود پر چھا رہا
تھا۔ سلاہ بنا کر اس نے کھانے کی میز پر سجائی، تازہ
سرخ گلاب تو ذکر گلدان میں سجائے۔ شمع دان میں
موم بتیاں جلائیں۔ نئے برے سے ڈرائنگ روم کو
ٹھیک کیا سارے سیپس روشن کیے۔ نہا کر اس نے
اپنا بہت پسندیدہ لباس پہنا۔ اپنے لمبے بالوں کو

وہ ان کی بہن تھی۔ اتنی عمر میں شادی ہو اور دوبارہ وہ ان کے دروازے پر آ بیٹھے۔ سب نے کئی طریقوں سے سرال والوں کو نالائکمان لوگوں کا رویہ اتنا ثابت تھا کہ سب کو ہتھیار ڈالنے ہی پڑے۔ اب وہ سب دعاؤں کے ساتھ اسے رخصت کرنے کی تیاریوں میں لگے ہوئے تھے۔ میں نے شمرہ کو دلادہ دینے کی کوشش کی۔

”دیکھو شمرہ! کبھی کبھی وہ ہو جاتا ہے جس کے بارے میں ہم سوچتے بھی نہیں۔ اب تم سارا معاملہ خدا پر چھوڑ کر خوش خوش اپنی نئی زندگی کی تیاری کرو۔“ میں نے اس کے ٹھنڈے ہاتھ تھام کر کہا۔

”رضیہ میں خود کو لاکھ بھائی ہوں مگر مردوں کا یہ فرق اس کی شکل صورت اور وجاہت میرا دل نہیں قبول کرتا۔“ وہ بالکل بھی مطمئن نہیں تھی۔

”اچھا یہ بتاؤ کہ تمہارا پاسپورٹ بنا ہوا ہے؟“ میں نے اس کا دھیان بناتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں، صادق کا فون آیا تھا اس نے شناختی کارڈ کی فوٹو کا پی اور کچھ اور کاغذات منگوائے تھے جو بھائی نے بھیج دیے ہیں۔“

”بڑی جلدی ہے بھی صادق کو..... ہر کام وقت سے پہلے ہو رہا ہے۔“ میں نے اسے چھیڑا..... وہ سر جھکائے اپنے ہاتھوں کو دیکھتی رہی۔

”کبھی تمہیں بھی صادق نے فون کیا؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ ہر کام کے سلسلے میں مجھے ہی فون کرتا ہے۔“

شمرہ نے انکشاف کیا تو میں نے انکھیں نکالیں۔

”اچھا تو یہ مزے ہو رہے ہیں یہاں۔“ وہ صرف مسکراتی رہی۔ اس وقت اس کے چہرے پر وہ ملکھوٹی نور تھا جو ایک پُر اعتماد بیوی کے چہرے پر اپنے جیون ساتھی کے لیے ہوتا ہے۔ میں دل ہی دل میں دعا مانگ رہی تھی۔

”خدا یا! شمرہ کو سرخوردہ کرنا۔“

”مذاق کیا..... تیری باقاعدہ منگنی ہوئی ہے ناں؟“ جواب میں شمرہ نے اپنا ہاتھ آگے کر دیا۔ اس کے نرم و گداز ہاتھ میں کالج کی سرخ چوٹیاں اور انگلی میں سادہ سی سونے کی انگلی چمک رہی تھی۔ میں نے محبت سے اس کے ہاتھ تھام لیے۔

”چل تو مجھے تفصیل سے بتا کہ رشتہ کیسے چلا اور کیسے طے ہوا؟“ اس پر شمرہ نے بتایا کہ ان کے آبائی گاؤں میں کسی شادی میں صادق کے والدین نے شمرہ کو دیکھا اور اگلے دن ہی وہ ان کے گھر آ بیٹھے اور اس وقت تک آتے رہے جب تک انہوں نے شمرہ کو منگنی کی انگلی نہ پہنادی۔ اس نے بتایا کہ صادق تین بھائیوں میں سب سے چھوٹا اور پیشے کے اعتبار سے ڈینٹل سرجن ہے۔ اسی سلسلے میں وہ امریکا چلا گیا اور وہیں کا ہو رہا۔ دو تین بار اپنے والدین سے ملنے پاکستان آیا مگر چند دنوں کے لیے البتہ اپنے گھر والوں کے لیے باقاعدگی سے خرچ بھیجتا ہے.....

تھے تحائف آتے رہتے ہیں مگر اسے مستقل باہر ہی رہنا ہے۔ اب تقریباً بارہ سال بعد اس نے اپنے والدین سے اس خواہش کا اظہار کیا ہے کہ وہ کسی پاکستانی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ اس نے کسی کے ذریعے شمرہ کے لیے پیغام بھیجا۔ صادق کے والدین نے بھی شمرہ کو بہت پسند کیا۔ اس لیے انہوں نے منگنی کر دی اور اب جلد ہی شادی کی تاریخ رکھی جانی ہے۔

میں بھی ساری تفصیل جان کر حیران تھی کہ کہیں کوئی غلط فہمی یا ابہام تو نہیں تھا۔

شمرہ مکمل طور پر ان کے سامنے تھی۔ چھوٹے بہن بھائیوں کی شادیاں ان کے بچے سب ان کے علم میں تھے۔ شمرہ کا ڈھلتا ہوا جسم اب اس کی عمر کی چٹکی کھانے لگا تھا مگر سرال والوں نے تو جیسے ہر چیز کو نظر انداز کر کے شمرہ کو لے جانے کا عزم کر رکھا تھا۔

شمرہ سے ایک بڑے بھائی خالد اور ایک بہن بڑی تھی۔ باقی سب بہن بھائی چھوٹے تھے۔ بہن بھائیوں میں اس رشتے پر کافی پریشانی رہی کیونکہ آخر کو

”مذاق کیا..... تیری باقاعدہ منگنی ہوئی ہے ناں؟“ جواب میں شمرہ نے اپنا ہاتھ آگے کر دیا۔ اس کے نرم و گداز ہاتھ میں کالج کی سرخ چوٹیاں اور انگلی میں سادہ سی سونے کی انگلی چمک رہی تھی۔ میں نے محبت سے اس کے ہاتھ تھام لیے۔

”چل تو مجھے تفصیل سے بتا کہ رشتہ کیسے چلا اور کیسے طے ہوا؟“ اس پر شمرہ نے بتایا کہ ان کے آبائی گاؤں میں کسی شادی میں صادق کے والدین نے شمرہ کو دیکھا اور اگلے دن ہی وہ ان کے گھر آ بیٹھے اور اس وقت تک آتے رہے جب تک انہوں نے شمرہ کو منگنی کی انگلی نہ پہنادی۔ اس نے بتایا کہ صادق تین بھائیوں میں سب سے چھوٹا اور پیشے کے اعتبار سے ڈینٹل سرجن ہے۔ اسی سلسلے میں وہ امریکا چلا گیا اور وہیں کا ہو رہا۔ دو تین بار اپنے والدین سے ملنے پاکستان آیا مگر چند دنوں کے لیے البتہ اپنے گھر والوں کے لیے باقاعدگی سے خرچ بھیجتا ہے.....

تھے تحائف آتے رہتے ہیں مگر اسے مستقل باہر ہی رہنا ہے۔ اب تقریباً بارہ سال بعد اس نے اپنے والدین سے اس خواہش کا اظہار کیا ہے کہ وہ کسی پاکستانی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ اس نے کسی کے ذریعے شمرہ کے لیے پیغام بھیجا۔ صادق کے والدین نے بھی شمرہ کو بہت پسند کیا۔ اس لیے انہوں نے منگنی کر دی اور اب جلد ہی شادی کی تاریخ رکھی جانی ہے۔

میں بھی ساری تفصیل جان کر حیران تھی کہ کہیں کوئی غلط فہمی یا ابہام تو نہیں تھا۔

نہیں۔ شروع شروع میں ایک دو اسکینڈلز بھی اس کے حوالے سے بنے مگر تیل منڈھے نہیں چڑھی۔

یہ خبر سن کر میں بھی اتنی حیران اور جنتیں تھی کہ صبح کا انتظار بھی مجھے دو بج رہا تھا۔ اللہ اللہ کر کے میں ناشتے سے فارغ ہوئی اور اپنی بڑی بیٹی کو جو کیمسٹری میں ماسٹرز کر کے ایک پرائیوٹ کالج میں پڑھا رہی تھی۔ دوپہر کے کھانے کا سبھا کر چادر اوڑھتے ہوئے شمرہ کی طرف چل دی۔ اتوار کی وجہ سے تینوں بچے گھر میں ہی تھے۔ بڑی رابعہ چھوٹی حسہ، اور بیٹا بلال تھا۔ حسہ نی اے میں اور بلال ایف ایس سی کر کے پروفیشنل کالج کے لیے انٹری ٹیسٹ کی تیاری کر رہا تھا۔

شمرہ آنگن میں کھڑی مل گئی وہ نہا کر نکلی تھی۔ اس کے لمبے گھنے بالوں نے آج بھی اس کی کمر کو چھپا رکھا تھا۔ البتہ اس کا آدمے سے زیادہ سرفیدہ ہو چکا تھا۔ جسے اس نے مہندی اور مکر سے چھپا رکھا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ بھاگتے ہوئے آئی اور میرے گلے لگ کر رونے لگی۔ میں گھبرا گئی۔

”شمرہ! شمرہ..... کیوں رو رہی ہو، کیا ہوا؟“ مگر وہ بولی کچھ نہیں..... بس روتی رہی۔ تھوڑی دیر بعد ٹرسکون ہوئی تو میں اس کے ساتھ اس کے کمرے میں آ بیٹھی۔

اس کی چھوٹی بھائی چائے اور لوازمات میز پر رکھ کر باہر چلی گئی۔ وہ جانتی تھی کہ ہم راز دار سہیلیاں ہیں۔

”چل اب تفصیل بتا اس اچھی خبر کی۔“ میں بے چین ہو رہی تھی۔ اس لیے تکلف کو ایک طرف رکھ کر پوچھنے لگی۔ شمرہ جواب دینے کے بجائے الماری سے ایک تصویر نکال لائی۔ تصویر میں کوئی چھتیس سینتیس سال کا ایک نہایت خوب صورت اور وجیہ جوان بڑے اچھے سوٹ اور ٹائی میں ملیں باوقار انداز میں مسکرا رہا تھا۔ میں حیران ہو کر کبھی تصویر کو اور کبھی شمرہ کو دیکھ رہی تھی۔ شمرہ بڑی مایوسی سے سر جھکائے اپنی انگلیوں کو دیکھ رہی تھی۔

”خدا یا! اتنا حسین اور کمزیل جوان اور تیرا منہ پھر بھی لڑکا ہوا ہے۔“ میں نے شمرہ کی تھوڑی اوچی گرتے ہوئے کہا۔

”رضیہ تم تو میرا مذاق نہ اڑاؤ۔“ وہ رونے والی تھی۔

صاف نظر آ رہا تھا کہ تقریباً سب خواتین تک یہ خبر پہنچ چکی ہے۔ وہ بل بل کر رو رہے تھے۔ ہونے مسکرا کر شمرہ کو دیکھ رہی تھیں۔ جو شرمندہ شرمندہ سی نظریں جھکائے تائیدی انداز میں گردن کو خم کیے بیٹھی تھی۔ جیسے ہی میلاد ختم ہوا اور کھانے کا دور چلا خواتین نے شمرہ کو گھیر لیا۔

”کیوں بھی شمرہ..... چپ چپاتے ہی منگنی کرانی۔“ وہ کیا جواب دیتی..... بس مسکراتی رہی۔

”کہاں ہوئی منگنی؟“

”کون ہے وہ خوش نصیب؟“

”شادی کب ہو رہی ہے؟“ ہر طرف سے سوالوں کی بوچھاڑ ہو رہی تھی۔ بات اچھنبے کی ہی تھی۔ میں اور شمرہ شروع سے ہی کلاس فیلوز تھے۔ نی اے کے بعد میری شادی ہو گئی جبکہ شمرہ نے ہسٹری میں ماسٹرز کیا۔ اتفاق سے میری سرال شمرہ کے قریب ہی تھی اس لیے کبھی کبھار ملنا جلنا ہوتا رہا۔ وقت گزرتا گیا سہیلیوں کی شادیاں ہو گئیں مگر اس گزرتے وقت میں شمرہ کے لیے خوشی کا وہ لمحہ نہیں آیا جسے شادی کہتے ہیں۔

ماں، باپ اس کی شادی کی حسرت دل میں لیے راہی ملک عدم ہوئے۔ شمرہ سے بڑی ایک اور چھوٹی دو بہنیں تھیں۔ ایک بڑا اور دوسرا چھوٹا بھائی..... ایک ایک کر کے سب بیاہے گئے مگر شمرہ کا نصیب نہ کھل کر دیا۔

یہ نہیں کہ شمرہ بد صورت یا بد سلیقہ تھی۔ وہ لمبے قد کی ایک بول صورت لڑکی تھی۔ خاص طور پر اس کا گلہ بڑا پرکشش تھا۔ اس پر گھٹنوں تک آئے ہوئے لمبے سیاہ بال مگر کہتے ہیں تاکہ جوڑے آسان پر بنتے ہیں مگر اس کا جوڑا شاید بنا ہی نہیں تھا اب تو سب بہن بھائی بھی اس کے بارے میں سوچنا چھوڑ چکے تھے۔ شمرہ نے خود کو اسمارٹ اور مصروف رکھنے کے لیے بیوٹیشن کا کورس کر کے بیوٹی پارلر کھول لیا تھا۔ رات آتی اور شادیاں طے پاتیں تو وہ ہر روز ہی اپنے ہاتھوں سے دلہنیں تیار کرتی، انہیں سجاتی سنوارتی اور ہاتھ جھاڑ کر کھڑی ہو جاتی۔ پتا نہیں اس کے دل میں اب کوئی حسرت یا ارمان تھا یا

”خدا یا! اتنا حسین اور کمزیل جوان اور تیرا منہ پھر بھی لڑکا ہوا ہے۔“ میں نے شمرہ کی تھوڑی اوچی گرتے ہوئے کہا۔

”رضیہ تم تو میرا مذاق نہ اڑاؤ۔“ وہ رونے والی تھی۔

”خدا یا! شمرہ کو سرخوردہ کرنا۔“

ماہنامہ پاکیزہ۔ دسمبر 2012ء

تھے۔ جبکہ صادق پوری طرح ہشاش بشاش تھا۔
 ائرپورٹ پر اتر کر شرہ چکر اگئی۔ اس نے زیادہ
 سے زیادہ لاہور کا ائرپورٹ دیکھا تھا وہ بھی عمرے یاج
 سے آنے والوں کو خوش آمدید کہنے کے لیے۔ نیویارک
 جیسا بڑا شہر اور اس کا بے ایف کینڈی جیسا بڑا بین الا
 قوامی ائرپورٹ..... لوگوں کا ایک ہجوم تھا جو ایک
 دوسرے سے بے نیاز جلدی جلدی اپنی قانونی کارروائی
 مکمل کرنے اور اپنا سامان حاصل کرنے یا باہر نکلنے کے
 لیے Exit کی طرف بھاگ رہا تھا۔ باہر کئی لوگ
 ہاتھوں میں کارڈ لیے آنے والوں کو پہچاننے کی کوشش
 کر رہے تھے۔ صادق نہایت مہارت اور سکون سے
 اپنے کام نمٹ رہا تھا۔ بالآخر وہ اپنا سامان ٹرالیوں میں
 لا کر باہر نکلے۔ صادق نے شرہ کو اور کوٹ اور گرم
 اسکارف پہنا دیا تھا۔ پاؤں میں گرم جرابیں اور بند
 جو تھے پھر بھی اسے سردی لگ رہی تھی۔ صادق بے
 چین نظروں سے ریسیو کرنے والوں کے ہجوم کو دیکھ رہا
 تھا۔ اچانک وہ نئے نئے ہاتھ بلند ہوئے۔

”ہائے پاپا!“

صادق تیزی سے آگے بڑھا۔ موٹے موٹے گرم
 لباس میں تقریباً آٹھ نو سال کا ایک لڑکا اور اس سے ذرا
 پیچھے ایک چھوٹی گڑیا جیسی لڑکی دونوں بھاگ کر صادق
 کی ٹانگوں سے لپٹ گئے۔ ان کے پیچھے پیچھے ہائی ہیل پر
 کھٹ کھٹ کرتی ایک اسمارٹ دیلی پٹی اور ذرا پست قد
 عورت تیزی سے آگے آئی اور صادق سے بگلیگر ہو کر
 بڑی محبت سے اسے پیار کیا پھر صادق کے ساتھ کھڑی
 شرہ کو بڑے لگاؤ سے اپنے ساتھ لگا کر بولی۔

”ہائے شرہ، میں امینہ صادق ہوں اور یہ ہمارے
 بچے جنید اور روبی ہیں۔“ پھر وہ بچوں کی طرف مڑی۔
 ”جنید اور روبی، آئی شرہ سے ملو۔“

بچے حیران نظروں سے شرہ کو دیکھ رہے تھے پھر
 انہوں نے جھپکے ہوئے شرہ کو ہائے کہا۔

شرہ اس کارروائی کے دوران بت بنی کھڑی تھی۔

شرہ پہلی بار جہاز کا سفر کر رہی تھی۔ ایک بہت
 بڑے جہاز میں جیسے ایک دنیا آباد تھی۔ بورڈنگ کی
 بلبل، جوتوں کی کھٹ کھٹ، بچوں کا شور..... وہ حیرت
 بھری نظروں سے ارد گرد دیکھ رہی تھی۔ جب جہاز ٹیک
 آف کرنے لگا تو شرہ کا دل بیٹھنے لگا۔ انجنوں کا شور اس
 کے کان بند کیے دے رہا تھا۔ وہ متوحش لگا ہوں سے
 ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ ایسے میں برابر کی سیٹ پر بیٹھے
 ہوئے صادق کی مہربان مسکراہٹ اور اس کے ہاتھ پر
 صادق کے ہاتھ کے اپنائیت بھرے لمس نے شرہ کا
 حوصلہ بڑھایا۔ وہ کچھ دیر ہلکان ہونے کے بعد واقعی
 پرسکون ہو گئی تھی۔ اسے لگا کہ جہاز اڑنے کے بجائے
 رک گیا ہے۔ صادق نے اسے سکون آدو گوئی کھلائی اور
 پھر ہلکا ہلکا کھانا کھا کر وہ سو گئی۔ پتا نہیں کتنے کتنے
 سونے کے بعد وہ جاگی تو بالکل فریش تھی۔ ساتھ والی
 سیٹ پر گود میں سینکڑین رکے صادق گہری نیند سو رہا تھا۔
 اس کا سر شرہ کے شانے پر ٹکا ہوا تھا۔ ہلکے ہلکے خراٹے
 اس کی گہری پرسکون نیند کا پتا دے رہے تھے۔ شرہ
 قدرت کے اس کرشمے اور فیاضی پر ابھی تک ششدر
 تھی۔ نکاح سے پہلے اور بعد کے سب اندیشے ہوا ہو گئے
 تھے۔ صادق ایک ڈسٹے دار اور با اعتماد ساتھی کا رول
 بہت اچھی طرح نبھا رہا تھا۔ ائرپورٹ پہنچنے سے لے کر
 اس وقت تک اس کے کسی عمل یا بات سے یہ محسوس نہیں ہوا
 کہ وہ کوئی کام جبراً یا بے دلی سے کر رہا ہے۔ شرہ کا اعتماد
 بحال ہو رہا تھا۔ اس نے جواباً پھر پور تعاون کا اظہار کیا۔

صادق زیادہ تر انگریزی یا پھر ٹوٹی پھوٹی پنجابی
 میں بات کر رہا تھا۔ شرہ کو انگریزی کے کورسز نے بڑا
 فائدہ دیا۔ وہ صادق کی ہر بات آسانی سے سمجھ رہی تھی
 اور جواب دے رہی تھی۔ اس بات سے صادق خاصا
 متاثر نظر آ رہا تھا بلکہ اس نے ایک دو بار اس بات کا
 اظہار بھی کیا تو شرہ مسکرا کر رہ گئی۔

بیس بائیس گھنٹے کا یہ طویل سفر ختم ہوا تو شرہ نے
 خدا کا شکر ادا کیا کیونکہ بیٹھے بیٹھے اس کے جوڑا کڑ گئے

اتنی دور رخصت کرنا تھا۔ اس دوران صادق کے فون
 اس کے ہمایوں کے پاس آتے رہے جس میں وہ
 سامان کی چیکنگ کے بارے میں اور شرہ کے لباس کے
 بارے میں خصوصی ہدایات دے رہا تھا۔ شرہ غم صمی
 کھڑی رشتے داروں سے مل رہی تھی۔ باوجود کوشش کے
 مجھے تنہائی میں اس سے بات کرنے کا موقع نہ مل سکا اور
 تیسرے دن صبح نو بجے وہ لاہور کے لیے روانہ ہو رہی تھی
 جہاں سے امریکا کی فلائٹ لینی تھی۔

اسے کار میں بٹھاتے ہوئے خالد بھائی رو دیے۔
 ”شرہ! میں نے جو کچھ کیا تمہارے بھلے کے لیے
 کیا۔ اب اس فیصلے کو نبھانا تمہارا کام ہے۔“
 شرہ، خالد بھائی کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر
 رونے لگی۔ باقی بہن بھائی بھی زار و قطار رو رہے تھے۔
 اس موقع پر صادق آگے آیا۔ اس نے بڑے آرام سے
 شرہ کو ان سے الگ کر کے کار میں بٹھایا پھر خالد بھائی
 کے شانے تھپتھا کر بولا۔

”خالد بھائی..... پریشان نہ ہوں، وہ ایک بڑھی
 لکھی سمجھدار عورت ہے۔ انشاء اللہ اپنے بارے میں صحیح
 فیصلہ کرے گی۔“ شرہ کچھ حیران ہو کر صادق کو دیکھنے لگی۔

”پتا نہیں ابھی اور کون سا فیصلہ کرنا پاتا ہے۔ شادی
 ہو گئی ہے۔ پر دیس جارہی ہوں..... اور مجھے کون سا
 امتحان دینا ہے؟“ اس کے اندیشے پھر اسے ڈسنے لگے۔
 وہ نڈھال ہو کر کھڑکی سے باہر کھڑے بہن بھائیوں کو
 دیکھنے لگی۔ آنسوؤں کی مالا پھر بننے اور ٹوٹنے لگی۔

پتا نہیں کب صادق اس کے پاس آ بیٹھا۔ کب
 گاڑی چلی مگر جب ایک مہربان ہاتھ نے نشو سے اس کی
 آنکھیں پونچھیں تو اسے پتا چلا کہ صادق اس کے برابر بیٹھا
 اسے پرسکون کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ سیدھی ہو بیٹھی۔

ائرپورٹ کی کارروائیوں میں شرہ زیادہ تر بیکار رہی
 رہی۔ صادق بڑے سکون سے تمام کام انجام دے رہا
 تھا۔ صادق کے ہی اصرار پر شرہ نے کورسز کر کے اپنی
 انگلش کو رواں کر لیا تھا۔

ساتھ امریکا جاسکے۔

نکاح نہایت سادگی سے لاہور کے کسی ہوٹل میں
 ہوا۔ صادق ایک ہفتے کے لیے آیا تھا مگر شرہ کے گھر والوں
 کے سوا اس کی کسی اور سے ملاقات نہیں ہوئی۔ شرہ سے
 بھی واجبی سا سامنا ہوا اور بس۔ نہ صادق نے ملنے کی
 خواہش کا اظہار کیا نہ ہی کسی قسم کا رابطہ کیا۔ شرہ مزید
 پریشان ہو گئی۔ صادق دو دن بعد ہی واپس امریکا چلا گیا۔

آخر شادی کی تاریخ رکھی گئی۔ ایٹن، مہندی، سب
 کچھ ہوا مگر شرہ کے اندیشے جوں کے توں رہے۔ مہندی
 کی رات میں دیر تک شرہ کے ساتھ رہی۔ لڑکیوں کے
 لیے یہ رات عجیب محسوسات کی حامل ہوتی ہے۔ اپنوں
 سے چھڑنے کا غم، آنے والے رنگین لمحات کی
 سرگوشیاں..... سکھپوں کی چیخیں چھاڑ..... پھولوں سے
 لدی ہوئی ڈالی جیسی گردن..... مگر یہاں تو معاملہ ہی
 الٹ تھا۔ شرہ بار بار میرے گلے لگ جاتی۔

”رضیہ کیا ہوگا؟ کیوں ہو رہی ہے یہ بے جوڑ
 شادی..... کیا ضرورت ہے صادق کو میری..... یہ کوئی
 بڑا فرائڈ تو نہیں ہے؟“ میں اسے بھلاتے بھلاتے تھک
 گئی تو سوائڈیشے لیے گھر آ گئی۔

آخر شرہ دلہن بن گئی۔ جدید لباس اور میک اپ نے
 اسے اپنی عمر سے کئی سال چھوٹا کر دکھایا تھا۔ خاصا روپ آیا
 تھا۔ سب ہی تعریف کر رہے تھے مگر سیاہ سوٹ، بھر خ ٹائی
 اور گلے میں پھولوں کا ہار ڈالے جب دو لھا آج پر آیا تو
 سب مسحور سے ہو گئے۔ ہر دل سے شرہ کے لیے دعا لگی۔

”یا اللہ اس بچی کی لاج رکھنا۔“ دلہن سسرال پہنچی تو
 دیہاتی رواج کے مطابق ڈھول اور باجوں سے اس کا خیر
 مقدم کیا گیا۔ رنگین پاپوں والے پلنگ پر بٹھا کر جو رسیمیں
 شروع ہوئیں تو صبح ہو گئی۔ کسی نے دو لھا کو دلہن کے پاس
 لانے کی زحمت کی نہ کوئی تجلید عروسی جایا گیا تھا۔

اگلے دن شرہ کے سینکے والے اسے لینے آ گئے۔
 اسے امریکا جانے کی تیاری بھی کرنا تھی۔ سب بہن
 بھائیوں کے ہاتھ پاؤں پھولے ہوئے تھے۔ آخر بہن کو

سے قبلے کا رخ پوچھ کر نماز پڑھنے لگی۔ صادق اور امینہ بے آواز چلتے ہوئے اس کے کمرے میں آئے اور اس کی نماز ختم ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ شمرہ نے دعا مانگ کر جا نماز تہ کی اور خاموشی سے ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ بات امینہ نے شروع کی۔

”شمرہ ڈیئر حیران نہ ہو، میں اردو اسپتالنگ فیلٹی سے تعلق رکھتی ہوں جبکہ صادق پنجابی اسپتالنگ ہے مگر گھر میں ہم بچوں کی وجہ سے صرف انگلش بولتے ہیں۔ انہیں اسکول میں اور باہر ہر جگہ انگلش بولنا ہوتی ہے۔“

شمرہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ امینہ پھر بولی۔

”تم اس بات پر شک میں ہو کہ صادق پہلے سے شادی شدہ ہے۔ تین بچوں کا باپ ہے، بیوی بھی موجود ہے تو تم سے اس نے شادی کیوں کی۔ تمہیں بات سمجھانے کے لیے مجھے ذرا تفصیل میں جانا ہوگا۔“ امینہ رکی اور پھر گویا ہوئی۔

”پیشے کے لحاظ سے میں نرس ہوں اور امریکا میں پیدا ہونے کی وجہ سے امریکن شہری بھی ہوں۔ میرے دادا، دادی کافی عرصہ پہلے امریکا آئے اور یہیں کے ہو رہے۔ ان کی تینوں اولادیں، ہمیں پیدا ہوئیں۔ میرے والد سید برہان الدین، چچا ریحان الدین اور میری چھوٹی سب کی شادیاں یہیں ہوئیں۔ چچا اپنی فیلٹی کے ساتھ کینیڈا شفٹ ہو گئے، چھوٹی اپنے میاں کے ساتھ آسٹریلیا میں ہیں جبکہ میرے والدین واشنگٹن میں سیٹلڈ ہیں۔ میرے والد بڑے کامیاب بزنس مین ہیں۔ ہمارا ایک پرائیویٹ اسٹور اور ایک Bar ہے۔ مکان بھی کافی بڑا ہے۔ مختصر کہ میرے والدین بہت ویل آف ہیں۔ ہم دو ہی بہن بھائی تھے۔ میں اور میرا چھوٹا بھائی سلطان۔“ یہ کہتے کہتے امینہ کی آواز بھڑک اٹھی۔ اس نے خود پر قابو پانے کے لیے خاموشی اختیار کی۔

”صادق dentistry کی مزید تعلیم کے لیے امریکا آئے تو نیویارک کے ایک اسپتال میں ہماری ملاقات ہوئی اور نتیجہ شادی پر جا پہنچا۔ میرے والدین واشنگٹن میں تھے۔ انہیں اس شادی پر کوئی اعتراض نہیں تھا

اور کچن میں گھس گئی۔ صادق اس کے ساتھ تھا۔ کچن خاصا بڑا تھا اور کھانے کی میز کچن میں ہی لگتی ہوئی تھی۔ سامان رکھ کر صادق نے بھی لباس بدلا اور امینہ کی مدد کے لیے کچن میں چلا گیا۔ آدھے گھنٹے بعد امینہ نے ڈنر کی تیاری کا اعلان کیا تو صادق ہاتھ پکڑ کر شمرہ کو اٹھانے آگے بڑھا۔ شمرہ نے شاکی نظروں سے صادق کو دیکھا تو اس نے بڑی محبت سے اس کی کمر کے گرد بازو جامل کر کے اسے اٹھایا اور ساتھ لے کر کھانے کی میز تک پہنچایا۔ بچے بھی چہنچہ کر چکے تھے اور نیپکین باندھ کر بڑی میز سے اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھ چکے تھے۔

کھانا بڑا پُر تکلف تھا۔ ظاہر ہے کہ پہلے سے تیار شدہ تھا جو گرم کر کے میز پر سجا دیا گیا تھا۔ کھانے سے پہلے سب نے دعا کی اور پھر اپنی اپنی پلیٹیں سیدھی کیں۔ شمرہ، امینہ کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھی تھی۔ امینہ نے اس کی پلیٹ سیدھی کی اور اس کی پلیٹ میں سلاد روٹ اور چرس ڈال کر کھانے کو کہا مگر وہ کھانے کے بجائے یونہی ہاتھ گود میں رکھے بیٹھی رہی۔ امینہ اور صادق نے ایک دوسرے کو دیکھا آخر امینہ بولی۔

”شمرہ تم ابھی تک شک میں ہو..... اور ہمارے بارے میں پتا نہیں کیا، کیا سوچ رہی ہو۔ ڈیئر خود کو ذرا کنٹرول کرو، کھانا کھاؤ پھر ہم بیٹھ کر ہر بات کی وضاحت کریں گے۔ بچے بھی تمہیں دیکھ کر پریشان ہو رہے ہیں۔ تم آن ڈیئر..... بی بریو.....“ امینہ نے تسلی بھرے انداز میں اس سے کہا۔ صادق بھی حوصلہ افزا نظروں سے شمرہ کو دیکھ رہا تھا۔ شمرہ نے سب کو دکھانے کے لیے کچھ نہ کچھ کھانا پھر کافی کا دور چلا۔ تھوڑی دیر بعد بچے اپنے بیڈروم میں چلے گئے۔ چھوٹی بچی جسے سب لارا کہہ کر پکارا رہے تھے امینہ اور صادق کے بیڈروم میں اپنی کاٹ پر سوچتی تھی۔

صادق نے شمرہ کو اس کا بیڈروم دکھایا جو بچوں کے ننھے ننھے بیڈروم کے ساتھ تھا۔ کمرے میں شمرہ کا سامان رکھا ہوا تھا۔ شمرہ نے لباس تبدیل کیا۔ وضو کیا اور صادق

نیچے اتر اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اندر گیا۔ تقریباً پانچ منٹ بعد سفید کمرے میں لپٹی ہوئی دو ڈھائی سال کی ایک گریسی بچی کو لے کر دوبارہ گاڑی میں آگیا۔ گاڑی پھر چل دی۔

”پاپا..... پاپا.....“ بہت ہی باریک سی آواز کمرے سے آئی تو صادق نے بڑے پیار سے بچی کے منہ سے کمرے میں لپٹی ہوئی دو ڈھائی سال کی ایک گریسی بچی کو لے کر دوبارہ گاڑی میں آگیا۔ گاڑی پھر چل دی۔

”پاپا..... پاپا.....“ بہت ہی باریک سی آواز کمرے سے آئی تو صادق نے بڑے پیار سے بچی کے منہ سے کمرے میں لپٹی ہوئی دو ڈھائی سال کی ایک گریسی بچی کو لے کر دوبارہ گاڑی میں آگیا۔ گاڑی پھر چل دی۔

سردی بہت بڑھ گئی تھی۔ کار سے اترتے ہی شمرہ کے دانت جتنے لگے۔ صادق نے آگے بڑھ کر شمرہ کا ہاتھ تھاما۔ امینہ نے دروازہ کھولا اور سب اندر داخل ہو گئے۔ گھر کے اندر خوشگوار سی حرارت پھیلی ہوئی تھی۔ شاید حرارت کا خود کار نظام کام کر رہا تھا۔

ٹی وی لاؤنج خاصا کشادہ اور نہایت خوب صورتی سے سجا ہوا تھا۔ صادق نے شمرہ کو واش روم دکھایا اور فریش ہونے کو کہا۔ خود بچی کو بی بی چیئر پر بٹھا کر سامان اندر لانے لگا۔ امینہ اور صادق نے شمرہ کا سامان ایک کمرے میں پہنچا دیا۔ شمرہ واش روم سے آکر ایک صوفے پر ٹنگ گئی۔ بچے ہلکی ہلکی شرارتیں کرنے اور دوڑنے بھاگنے لگے۔ امینہ نے لباس بدلا..... لیپرن پہنا

بہت دیر تک تو اسے سمجھ ہی نہیں آیا کہ کیا سمجھے اور کیا بولے۔ اس نے پتھرائی ہوئی نظروں سے صادق کو دیکھا جو اس کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہا تھا۔ شمرہ کو یوں لگا جیسے ساری دنیا گھوم رہی ہے۔ اس نے ماتھے اور آنکھوں کو اپنے ہاتھ سے ڈھانپا تو اس کی آنکھوں کے درمیان سے پانی کی دھاریں بہہ نکلیں۔ صادق اور امینہ نے معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ امینہ نے آگے بڑھ کر شمرہ کا شانہ تختہ پھایا اور پارکنگ کی طرف بڑھ گئی۔

امینہ پارکنگ سے ایک بہت بڑی جہازی ساز کی کارنگال لائی۔ صادق نے ڈکی میں سامان سیٹ کیا اور امینہ کے برابر آ بیٹھا۔ کار امینہ ڈرائیو کر رہی تھی۔

شمرہ اور دونوں بچے پیچھے تھے۔ راستے میں بچے کچھ نہ کچھ کھاتے اور شمرہ کو بھی کھلاتے رہے۔ شمرہ بھوک پیاس سے بے نیاز حالات کے اس عجیب و غریب موڑ پر بالکل گم صم ہو گئی تھی۔

اتنا بڑا دھوکا..... اتنا بڑا فراڈ..... وہ تو ابھی تک ذہنی طور پر خود کو اس شادی کے لیے تیار نہیں کر سکی تھی۔ اس کا ضمیر ہمیشہ مطمئن ہوا ہی نہیں تھا۔ وہ ہمیشہ یہی سوچ کر شرمندہ ہوتی تھی کہ ایک بھر پور جوان شخص کو ایک ڈھلتی ہوئی اڑتالیس سالہ عورت کے پلو سے باندھا جا رہا تھا۔ وہ بغیر کسی جرم کے خود کو مجرم اور چور گردانتی رہی تھی۔ اس کی ساری ہمدردیاں اس بے چارے شخص کے ساتھ تھیں مگر یہاں تو بازی ہی الٹ گئی تھی اور پھر یہ کہ یہاں کسی کو اپنے فراڈ پر نہ تو کوئی شرمندگی تھی نہ ان کے رویے میں ندامت کا کوئی عنصر تھا۔

میں کبھی کی نہیں آنے دوں گی۔“

شرمہ کیا بولتی..... پاکستان میں جو زندگی وہ گزار رہی تھی اس کے بعد تو صرف ناکارہ بڑھاپا ہی اس کی تقدیر تھا۔ یہاں اچانک ہی زندگی اتنی پر توجہ ہو گئی کہ لوگ اس کا فیصلہ مانگ رہے تھے۔ امید بھری نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ اس کی ایک ہاں یا نہ کی زندگیوں پر اثر انداز ہونے والی تھی۔

”اے منعم! تو بعض اوقات یوں بغیر مانگے بھی نعمتوں کی برسات کر دیتا ہے۔“ اس نے سوچا اور دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر امینہ کو کھڑا کیا اور اسے گلے لگایا۔

”امینہ تم مجھ سے بہت چھوٹی ہو مگر میں خود کو تمہارے سامنے بہت چھوٹا محسوس کر رہی ہوں۔“ صادق والہانہ انداز میں کھڑا ہو گیا۔ اس نے بڑی محبت سے شرمہ کا ہاتھ اور سر چومنا۔ امینہ روتے روتے شرارت سے مسکرائی۔

”شرمہ ڈیر! صادق کو بڑی فیملی پسند ہے۔ میں نے تو تین پیدا کر دیے ہیں۔ چوتھے کی کوشش تم کر لیتا۔ ابھی اتنی بھی بوزخمی نہیں ہوئی ہو۔“

شرمہ مسکراتی رہی۔ تھوڑی دیر بعد سب اٹھ گئے۔ شرمہ نے سونے سے پہلے حسب عادت اپنے لمبے بالوں کو اچھی طرح سلجھایا..... ابھی اس نے بال باندھے نہیں تھے کہ دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو صادق بغل میں دو نیکیے اور ایک کنبل لیے کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔

”واؤ.....“ اس نے شرمہ کے بالوں کو دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر اپنی ناک سے لگایا تو شیمپو اور تیل کی ہلکی سی مہک نے اسے مسحور کر دیا۔ وہ دیر تک اس کے بالوں پر ٹھوڑی رکھے اس حشر میں ڈوبا رہا پھر اس کی کمر میں بازو ڈال کر آہستہ آہستہ چلتا ہوا بیڈ تک لایا کیونکہ امینہ نے اپنا وعدہ پورا کیا تھا اور وہ خود بھی ایک اچھا خاوند تھا۔ ویسے بھی آج ان کی سہاگ رات تھی۔

”شرمہ..... میں صادق سے بہت پیار کرتی ہوں۔ میں کسی قیمت پر اسے کھو نہیں چاہتی تھی۔ اس کے بغیر زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ جب وحید بھائی، صادق کے بڑے بھائی جو وہیں پاکستان میں رہتے ہیں نے اس مسئلے کا حل بتایا اور تمہاری اور صادق کی شادی کی تجویز پیش کی تو میں نے بہت واویلا مچایا۔ بڑا ہنگامہ کیا مگر رفتہ رفتہ جب مجھے یہ احساس ہوا کہ اس صورت میں میرا گھر، بچے اور خود صادق ہر چیز جوں کی توں رہے گی تو میں نے ہتھیار ڈال دیے اور پوری رضامندی سے یہ شادی کروائی اور.....“

”کیا مجھے یا میرے گھر والوں کو یہ ساری صورت حال بتانا ضروری نہ تھا؟“ شرمہ نے پہلی بار زبان کھولی۔

”خالد بھائی نے روک دیا تھا۔“ اس دفعہ جواب صادق نے دیا۔

”خالد بھائی نے؟“ شرمہ حیران ہو کر بولی۔

”خالد بھائی جانتے تھے یہ سب.....؟“ شرمہ کو یقین نہیں آ رہا تھا۔

”جی ہاں، خالد بھائی کو وحید بھائی نے پہلے ہی دن ساری صورت حال بتادی تھی۔“

”انہوں نے مجھے ہوا بھی نہیں لگنے دی۔“ شرمہ شاک تھی۔

”ان کا کہنا تھا کہ مجھے اپنی بہن پر بھروسہ ہے۔ وہ صورت حال کو بہت اچھی طرح سمجھے گی اور معاملات کو سنبھال لے گی۔“ صادق نے پھر جواب دیا۔

شرمہ کو خالد بھائی کی آخری گفتگو یاد آگئی جب انہوں نے کہا تھا۔

”شرمہ! میں نے جو کچھ کیا تمہارے بھلے کے لیے کیا۔ اب میرے فیصلے کو نبھانا تمہارا کام ہے۔“ وہ چپ چاپ زمین کوکتی رہی۔ امینہ نے شرمہ کو جھنجھوڑا۔

”شرمہ! کچھ کہو..... کچھ بولو..... کیا تم ہماری مدد کرو گی؟ کیا تم اس گھر کو اپنا گھر سمجھو گی؟ کیا بچوں کو ماں والا پیار دو گی؟ میں وعدہ کرتی ہوں کہ تمہارے حقوق

کپہر ز بھی رکھیں۔ ایک نے تو صادق پر ہی ڈورے ڈالنے شروع کر دیے۔ دوسری نشے کی عادی تھی۔ ہمارے جاتے ہی وہ نشہ کر کے پڑ جاتی۔ لارا روتی رہتی۔ گھر یونہی پڑا رہتا۔ جب ہمیں پتا چلا تو اسے بنایا۔“ امینہ ڈراما لینے کو رکی پھر بولی۔

”اصل بات شرمہ جو میں نے اب تک تمہیں نہیں بتائی وہ میرے اور صادق کے تعلقات تھے۔ ہم نے محبت کی شادی کی تھی۔ شادی کے بعد بھی ایک دوسرے کو ٹوٹ کر چاہا۔ ایک دوسرے سے بھرپور تعاون کیا.....

گھر اور بچوں کی دیکھ بھال میں دونوں برابر کے شریک رہے۔ مگر پچھلے دو سال سے میرے گھر پر نہ ہونے سے حالات بعض اوقات ناقابل برداشت ہو جاتے تھے کہ ہمارے تعلقات میں دراڑیں بڑھنے لگیں۔ کئی بار ہم تلخ کلامی پر اتر آئے۔ جب صادق کو اکیلے رہ لانی ڈیوٹی،

گھر اور بچے سنبھالنے پڑتے..... تو وہ بہت پریشان ہو جاتے تھے۔ اسپتال سے چھٹی بھی نہیں کر سکتے۔ لارا کو ہر وقت ڈے کیئر سینٹر میں نہیں چھوڑ سکتے۔ پھر بڑے بچے اسکول کا کام صحیح طریقے سے نہیں کر پاتے، نہ ان کی صحت ٹھیک رہتی۔ ایسے میں صادق کی ساری جھنجھلاہٹ

میرے اوپر اترتی تھی۔ کبھی کبھی اتنی بڑھ جاتی کہ ہم کئی کئی دن ایک دوسرے سے بات نہیں کرتے تھے اور میں پھر واشٹن جلی جاتی۔ ہفتے میں دو دن میں اپنے ماں باپ کے پاس رہتی وہاں سے آتی تو ڈیوٹی، گھر اور بچوں کو پورا نامہ نہیں دے پانی کا پھر جانے کا نام ہو جاتا۔“

امینہ چپ ہو گئی۔ شاید بولتے بولتے تھک گئی تھی۔

صادق بھی کم محم تھا اور شرمہ حیران ہو کر اس کی کہانی کو سن رہی تھی۔ وہ کچھ کچھ سمجھ رہی تھی کہ اس سارے واقعے میں وہ کہاں فٹ ہوگی۔ مشرق ہو یا مغرب مسائل ہر جگہ تھے..... مگر مسائل کو حل کرنے کے طریقے دونوں سمتوں میں بالکل ہی الگ الگ تھے۔ وہ فتنہ خیزی کہ امینہ آگے کیا کہتی ہے..... مگر امینہ کچھ کہنے کے بجائے اٹھی اور شرمہ کے سامنے جا بیٹھی۔ اس نے شرمہ کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔

کیونکہ صادق ہر لحاظ سے ایک اچھے انسان تھے۔ البتہ انہیں اپنی شادی کو اپنے والدین سے چھپانا تھا کیونکہ وہ اپنی کزن سے منسوب تھے۔ میں مبینے میں ایک بار ضرور اپنے والدین سے ملنے واشٹن جانی تھی۔ بچے چھوٹے تھے تو ساتھ لے جاتی مگر جب وہ اسکول جانے کے قابل ہوئے تو انہیں صادق کے پاس چھوڑ جاتی۔ صادق بچوں کے معاملے میں بہت حساس ہیں اور بچوں کے معاملے میں کسی قسم کا کپہر و مانز کرنے کو تیار نہیں ہوتے۔ بہر حال سب کچھ ٹھیک تھا کہ اچانک ٹریفک کے ایک حادثے میں سب کچھ بگڑ گیا۔ میرا پیارا بھائی سلطان.....“

امینہ کی آواز رندہ گئی۔ آنسوؤں کے موٹے موٹے قطرے اس کے گالوں سے لڑھکنے لگے۔ صادق جلدی سے کھڑا ہو گیا اور امینہ کا سر سہلانا لگا۔

”easy darling easy“ امینہ کے رونے میں اور شدت آگئی، شرمہ بھی پریشان ہو کر کھڑی ہو گئی۔ صادق نے اسے اشارہ کیا۔ اس نے آہستہ سے امینہ کے ہاتھ تھامے تو امینہ نے اس کے ہاتھوں پر اپنا سر رکھ دیا۔ اس کی ہچکیاں آہستہ آہستہ ختم کیں۔ صادق نے اس کا چہرہ ٹٹو سے صاف کیا۔ پانی پلایا۔

”شرمہ! میں سلطان کو کیسے بھولوں؟ میرا ایک ہی بھائی تھا۔ اور بہت ہی پیارا بھائی تھا۔ اس حادثے میں وہ موقع پر ہی دم توڑ گیا۔ پاپا کی ریزہ کی ہڈی میں فریگر ہوا۔ ماں کی ایک ٹانگ اور گردن میں چوٹ آئی۔

دونوں بالکل اپناج ہو گئے ہیں۔ کئی مہینے تو وہ اسپتال رہے مگر پھر دونوں ہی اسپتال سے نکل آ گئے۔ میں انہیں گھر لے آئی۔ دونوں کی علیحدہ علیحدہ نرسیں ہیں۔ سب سے بڑی مصیبت بزنس کی ہے۔ سارا حساب کتاب دیکھنا، نئے آرڈرز دینا، پرانا اسٹاک چیک کرنا..... یہ سب کرنے کے لیے مجھے واشٹن جانا پڑتا ہے۔ بچوں کو ساتھ لے جانی نہیں سکتی۔ لارا اتنی چھوٹی ہے کہ اسے چھوڑنا بھی مشکل اور ساتھ لے جانا بھی مشکل۔

ہم بڑی پریشانی میں آ گئے تھے۔ ہم نے دو تین ہاؤس



ہیں بلکہ اب تو سیاست دان اور اینکرز سرپرست ہیں..... مگر قارئین ہم ان صفحات پر آپ کی بھرپور ملاقات اپنی رائٹرز سے بھی کروائیں گے۔ اگرچہ پاکیزہ کی پہلی اشاعت سے لے کر آج تک کئی مرتبہ کسی نہ کسی حوالے سے لکھاریوں سے بات چیت شائع ہوتی رہی ہے مگر اب ایک ایک مصنفہ سے آپ کی تفصیلی ملاقات کروائی جائے گی جس کی فرمائش کافی عرصے سے چلی آرہی تھی..... آج ہمارے ساتھ اسی سلسلے

پاکیزہ ✖..... اپنی موجودہ مصروفیات کے بارے میں کچھ بتائیے؟

رفعت سراج ✖..... موجودہ مصروفیات میں شوہر اور تین بچے ہیں۔ اس کے علاوہ ڈراموں کے اسکرپٹ لکھنا بھی بہت تھا کہ دینے والا کام ہے۔ مطالعے کا شوق میری سرشت میں ہے جو میں باقاعدگی سے کرتی ہوں۔ رات کو لکھنے کے ساتھ ساتھ کپڑے بھی دھو لیتی ہوں کیونکہ میں ماسی کے دھلے کپڑوں سے مطمئن نہیں ہوتی۔ اسی طرح صبح فجر ہو جاتی ہے۔ نماز پڑھ کر بچوں کے ناشتے، بچ باکس کی تیاری ہوتی ہے۔ میاں کو ناشتا وغیرہ کر کے چند ضروری کام نمٹا کر سونے چلی جاتی ہوں۔ باقی کام پھر ملازمہ کرتی ہے۔ ظہر کے وقت اٹھ جاتی ہوں اسی طرح پھر مصروف رہتے ہوئے اگلے دن فجر کا وقت ہو جاتا ہے۔

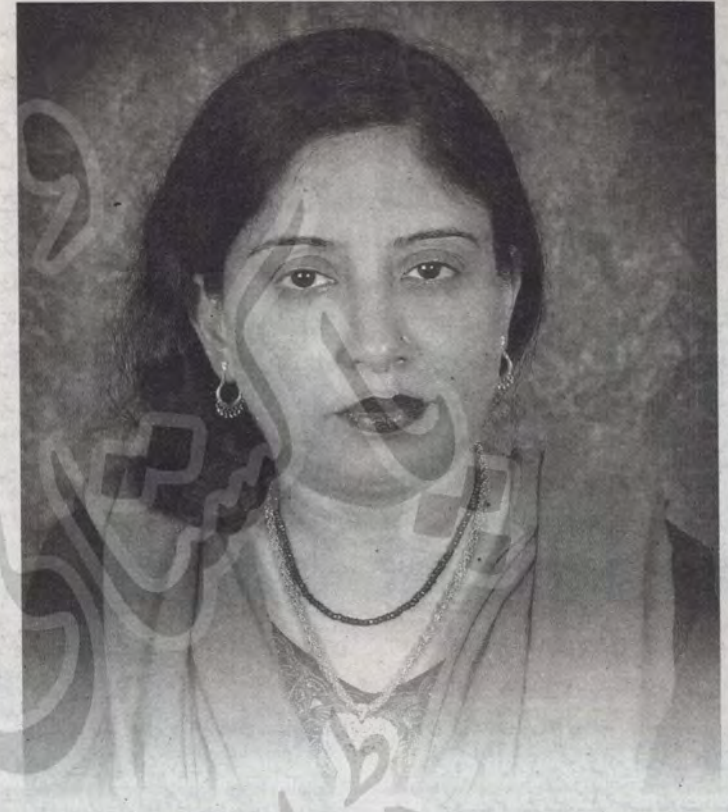
پاکیزہ ✖..... ابتدائی زمانے کی اگر بات کریں تو آپ کے اس قلمی سفر کا آغاز کب اور کیسے ہوا؟

رفعت سراج ✖..... قلمی سفر کا آغاز 1976ء میں ہوا جب میں 7th کلاس میں تھی۔ جنگ اخبار میں خواتین کے صفحے کی ادارت محترمہ سلطانہ مہر کے پاس تھی جو اس وقت خود بھی بہت معروف افسانہ نگار تھیں۔ انہوں نے میرے مختصر سے افسانے کی اتنی

مباحثی آپ کی جانی پہچانی نامور مصنفہ رفعت سراج ہیں۔ امید ہے ہمارے پیارے قارئین کو یہ خوب صورت و منفرد سلسلہ ضرور پسند آئے گا تو لیجیے ہم اپنی بات چیت کا آغاز کرتے ہیں۔

پاکیزہ ✖..... آپ کو اپنے اس نئے سلسلے ”وہ آئے بزم میں“ خوش آمدید کہتے ہوئے آپ سے یہ جاننا چاہیں گے کہ ایک عرصے بعد آپ قارئین کے لیے انٹرویو کی صورت..... اپنے خیالات کا اظہار کریں گی اس سلسلے میں آپ کے کیا تاثرات ہیں؟

رفعت سراج ✖..... محفل میں خوش آمدید کہنے پر تیردول سے شکر گزار ہوں۔ آج آپ کی مہربانی سے عرصے بعد اپنے پیارے قارئین سے رابطہ کر رہی ہوں۔ جنہوں نے اپنی محبتوں کی وجہ سے مجھے تخلیق کا عمل جاری رکھنے کا شوق اور حوصلہ دیا۔ میں اللہ تعالیٰ کا خود پر بہت بڑا احسان سمجھتی ہوں کہ مجھے اللہ کی مخلوق نے بے پناہ پیار اور عزت دی۔ اس روحانی مسرت کو ناپنے کا کوئی پیمانہ نہیں ہے۔ مگر میں اپنے چاہنے والوں کے لیے اسی طرح دعا کرتی ہوں جیسے کوئی ماں اپنی اولاد کے لیے سرتاپا یکسو ہو کر دعائیں کرتی ہے۔ اس لیے کہ سوائے دعاؤں کے محبت کا کوئی صلہ نہیں دیا جاسکتا۔



وہ آئے بزم میں ✖.....

نہیں! اصغر

زندگی کے بارے میں جاننے کا اشتیاق ان کے تمام مدامین کو ہر آن رہتا ہے..... بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ ہمارے ہاں لوگ زیادہ دلچسپی فی وی فلم کے فنکاروں اور گلوکاروں کے بارے میں جاننے میں رکھتے

عزیز قارئین! پاکیزہ! السلام علیکم مزاج بخیر!..... اس بات میں رہتی برابر مباغہ نہیں کہ معروف و ہر دلعزیز شخصیات کے ذاتی خیالات و افکار اور پھران کی نجی

اظہار عقیدت

کارل مارکس، لینن، اسٹالن، کاسٹرو
وشتوں کے وجود، نہ گہرائی نہ گہرائی
بس نمود

خدا کے وجود سے مخرف خدا بننے کے شیدائی
پچھلوں کے جینس انگوں کے سودائی
اک خلقت جوان کے پیچھے بھیگی آج شرمائی
ان پر کتابیں لکھنے والو... ان پر مقالے پڑھنے والو
میرے شاہ پر اس سے آدھا بھی سوچ لیتے تو
ذہن کے جالے کٹ جاتے

گتھیوں کے برے مل جاتے، سرخود ہو جاتے
کاوش: رفعت سراج



رفعت سراجؒ.....
بلا جھک لکھنا تو بہت
آسان ہے۔ مگر یہ دیکھنا
بھی تو از حد ضروری ہے
کہ آپ کی تحریر نے
قاری کے ذہن پر کیا
نقش کیا ہے؟ حاصل
مطالعہ ہے..... کہو
کھیت کی سنے کھلیان کی
اگر مصنف کو اتنا یقین و
اعتماد ہے کہ وہ جو کچھ
کہنے جا رہا ہے۔ وہ

تعمیری، مثبت یا اجالے کی پہلی دستک ہے اور وہ اس
لیے کہنا چاہتا ہے کہ اس امر پر ڈتے داری سے غور کیا
جائے۔ کوئی حل بھی نکالا جائے تو ضرور لکھے، بے نتیجہ
تخلیق دل کی بھڑاس ہوتی ہے۔ میں اسے ادب نہیں
گردانتی۔ تعمیری قدم اٹھاتے ہوئے جھجک کیسی؟
زندگی کے ہر موضوع پر بلاشبہ لکھا جاسکتا ہے مگر لکھنے

پاکیزہؒ..... عام طور پر کہا جاتا ہے اہل قلم
حساس ہوتے ہیں..... تو کیا عام لوگ یا دوسرے
شعبوں کے لوگ بے حس ہوتے ہیں؟
رفعت سراجؒ..... جو انسان بھی سینے میں دل
لیے پھر رہا ہے احساس سے عاری کیسے ہو سکتا ہے؟
ہماری حساس باتوں کو پڑھنے والے سمجھنے والے خود بھی
بلا کے حساس ہوتے ہیں۔ بات صرف اتنی ہے کہ کہانی
بننا ایک فن ہے اور فن ہمیشہ خدا داد ہوتا ہے۔ کہانی کار
کی نظر عمیق مشاہدے کا حاصل ہوتی ہے۔ بہت سے
لوگ دیکھتے ہیں محسوس کرتے ہیں اس کے باوجود اپنے
احساسات کو زبان نہیں دے پاتے۔ بحیثیت مسلمان
میں تو صرف اس بات پر یقین رکھتی ہوں کہ سب کچھ
توفیق باللہ ہے۔ ہر انسان میں کچھ نہ کچھ خاص بات

ضرور ہوتی ہے۔ بات صرف اپنی ذات کو پہچاننے یا
ذات کا عرفان حاصل کرنے کی ہے۔
پاکیزہؒ..... ادب میں اخلاقی اقدار و
روایات کی کس حد تک پاسداری کی جاتی ہے یا یوں
سمجھیں کہ کیا ادیب زندگی کے ہر موضوع پر بلا جھجک
لکھ سکتا ہے؟

ہونے کی وجہ سے ان پورٹ ان کا دوسرا گھر تھا اس
لیے پی آئی اے سے نوائے وقت مل جاتا تھا۔ یہ سب
بتانے کا مقصد یہ ہے کہ پڑھنے کی لت تھی اور پڑھنے
کو کیا نہیں ملا، قرآن کی تفاسیر، تراجم، اولیائے
کرام کی سوانح سب کچھ ہی پڑھ لیا۔ میں نے شاعری
بھی کی ہے اور کافی مقدار میں، ہائیکو، نثری نظم، غزل،
قطعات بھی لکھے ہیں۔

پاکیزہؒ..... جب پہلی تحریر سطح قرطاس کی
زیست بنی تو اس کا بنیادی موضوع کیا تھا اور آپ نے
اس وقت کیا محسوس کیا؟

رفعت سراجؒ..... صبح جب میری کلاس
فیولوا ایوینیو نے اسکول میں مجھ سے پوچھا رفعت کیا تم
نے پاکیزہؒ میں کوئی کہانی بھیجی تھی؟ تو میں خوشی سے
بے ہوش ہونے لگی کیونکہ اس کہانی کو لکھنے اور بھیجے کا
علم تو مجھے اور اللہ ہی کو تھا۔ صبا کا پوچھنا صاف دلیل تھی
کہ کہانی چھپ گئی ہے۔

پاکیزہؒ..... کیا چیز، کیا تحریک آپ کو ایک دم
لکھنے پر اکساتی ہے..... کوئی واقعہ، حادثہ یا فرمائش؟

رفعت سراجؒ..... کوئی بھی دل کو چھونے والا
واقعہ یا حادثہ۔ فرمائش پر اتنا کم لکھا سمجھیں لکھا ہی
نہیں۔ مجھے اپنی بہت بہت بلکہ بہت ہی جلدی شہرت پر
حیرانی اسی وجہ سے ہوتی تھی کہ میں تو سال میں دو تین
کہانیاں لکھتی ہوں وہ بھی بہت وقفے وقفے سے لوگ
مجھے بھولتے نہیں۔ سچی بات ہے مجھے تو اپنی شہرت پر
شرم آتی تھی۔ کبھی کسی رسالے کے دفتر نہیں گئی، کسی
ایڈیٹر سے نہیں ملی صرف اس وجہ سے کہ انہیں یقین
نہیں آئے گا کہ یہ چھوٹی سی لڑکی رفعت سراجؒ ہے۔
میں فرسٹ ایئر میں اردو ڈائجسٹ جیسے سنجیدہ اور
معیاری پرچے میں بھی چھپ چکی تھی۔ 1980ء میں
لاہور گئی تو اردو ڈائجسٹ کے سب ایڈیٹر ذوالفقار
کاظم نے ملنا چاہا میں نے دس بہانے بنا دیے مگر ان
سے نہیں ملی۔

حوصلہ افزائی کی کہ ساری رات خوشی کے مارے نیند
نہیں آئی۔ سلطانہ مہر صاحبہ کو اندازہ بھی نہیں تھا کہ یہ
افسانہ 7th کلاس کی طالبہ نے لکھا ہے۔

پاکیزہؒ..... آپ نے کافی کم عمری سے لکھنا
شروع کیا، اس کا اندازہ آپ کو خود ہوا یا کہیں سے
تحریک ملی؟

رفعت سراجؒ..... میں 1972ء سے چھپ
چھپ کر ڈائجسٹ پڑھ رہی تھی کچھ کہانیاں سمجھ آ جاتی
تھیں کچھ سرے گزر جاتی تھیں۔ کچھ کہانیوں کو پڑھتے
ہوئے ذہن میں آتا اس کو اس طرح لکھنا چاہیے تھا۔
میں اس سے زیادہ مضبوط الفاظ وہاں بٹ کر دیتی
تھی۔ تب مجھے اندازہ ہوا کہ میں کہانی لکھ سکتی ہوں۔
اشفاق احمد اور بشری رحمن نے میرے اندر زبردست
تحریک پیدا کی کہ لکھنے کے سوا چارہ نہ رہا۔ دوسری اہم
بات میں تنہائی میں گڑیاں بہت بھیتی تھی۔ میری ہر گڑیا
کا نام تھا۔ پھر میں نے اپنی ہر گڑیا کو ایک کردار بنا
دیا۔ ان کے درمیان واقعات ترتیب دیتی تھی۔ ان
میں مکالمات کرائی تھی۔ جس سے پتا چلتا ہے میں اس
عہد میں یونانی دیو مالائی داستان گو بن چکی تھی۔

پاکیزہؒ..... آپ نے نثر ہی کو کیوں ذریعہ
اظہار بنایا اور نثر کی اسی صنف ہی کو کیوں چنا؟

رفعت سراجؒ..... اس لیے کہ ہوش سنبھالتے
ہی بے تحاشا نثر پڑھی۔ میرے والد بچوں کے لیے
نکلتے والا ہر سالہ میرے لیے لاتے تھے۔ خود اردو
ڈائجسٹ، سیارہ ڈائجسٹ، عالمی ڈائجسٹ، سب
رنگ پڑھتے تھے۔ جبکہ عنایت اللہ، نسیم حجازی کے
ناول مکمل اقبالیات، شورش کاشمیری کا چٹان، اردو
ڈائجسٹ والوں کا ”زندگی“ جہاز، نوائے وقت،
جنگ، مشرق یہ تمام اخبارات ہمارے گھر میں آتے
تھے۔ نوائے وقت کی پسندیدگی کا یہ عالم تھا کہ جب یہ
کراچی سے نہیں نکلتا تھا تو والد صاحب لاہور سے
منگوا کر پڑھتے تھے۔ حکمہ موسمیات کی آبرویری میں

غزل

میرے نظر نواز مجھے نظر کا آئینہ دو
میرے دنواز مجھے دل کا آئینہ دو

احساب وفا سے ڈراتے رہتے ہو مجھے
لاؤ میرے ہاتھ میں آئینہ دو

وہ جو نظر چڑا کر بیٹھے ہیں
ذرا انہیں بھی ایک آئینہ دو

کچھ دیر مجھے پیار سے دیکھو تم
پھر میرے ہاتھ میں ایک آئینہ دو

عشق میں روپ کیا آیا ہے
ذرا دیکھوں تو مجھے آئینہ دو

شاعرہ: رفعت سراج

ہیں؟ کیا انہیں ان کا مقام مل رہا ہے؟

رفعت سراجؔ..... اس سوال کا جواب لینے
کے لیے آپ میرا ایک اور انٹرویو لیں جس کے دس
صفحات ہوں اور دس کے دس صفحات میں صرف اسی
ایک سوال کا جواب ہو۔

پاکیزہؔ..... ایک ادیب گھر بیٹھے اپنا وژن
کس طرح وسیع کر سکتا ہے؟ کیا صرف لکھنے کو خالص
گھریلو مسائل ہیں؟

رفعت سراجؔ..... میں تو وژن بڑھانے کے
صرف ایک ذریعے پر یقین رکھتی ہوں اور وہ ہے
قرآن مجید۔ نہیں، انسان کی دنیا صرف گھر تک محدود
نہیں ہے۔ اس سماجی جانور کے رابطے اس کنارے
سے اس کنارے تک ہیں۔ درمیان میں بے شمار
روپوں کا گہرا سمندر ہے۔ ہر روپ ایک کردار ایک
کہانی ہے۔

اور کیوں متاثر ہیں؟

رفعت سراجؔ..... میں کلاسیکی ادب میں
ممتاز مفتی، اشفاق احمد سے بہت متاثر ہوں اس سے
بھی پہلے، خواجہ حسن نظامی، پریم چند، رام لعل،
بیدی..... سرفہرست ممتاز مفتی اور ان کے بعد اشفاق
احمد، وجہ بے ساختگی، فطرت سے آشنائی کی جدوجہد۔
پاکیزہؔ..... پچھلے تیس پینتیس سالوں میں
ڈائجسٹ کے ادب میں آپ کے اپنے علاوہ کون سے نام



قابل ذکر ہیں؟

رفعت سراجؔ..... اپنی ہم نام، رفعت ناہید
سجاد، غزالہ نگار اور کزلی، فارحہ ارشد، عفت عزی
(مرحومہ) عذرا بانو عری (مرحومہ)، دردانہ نوشین
خان، کلثوم واحد، عمیرہ احمد نے بہت مشکل
موضوعات کا انتخاب کر کے قارئین کا ایک بڑا حلقہ
تعمیر کیا مگر ابھی نامکمل تجربات کی وجہ سے کچھ کمی
ہے۔ مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ابھی بہت کچھ
دے سکتی ہیں کیونکہ بات کہنے کا ڈھنگ جانتی ہیں۔
پاکیزہؔ..... آج ڈائجسٹ کی رائٹرز کی ٹیلی
جسٹس پر بہت پذیرائی ہو رہی ہے آپ کے کیا تاثرات

ضروری ہوتا ہے؟

رفعت سراجؔ..... مختلف تحریروں کا ایک جگہ
اکٹھا ہونا اس لیے ضروری ہوتا ہے کہ جس دور میں
کہانی لکھی گئی اس کا تاثر صرف اسی دور کے لیے
مخصوص نہیں تھا۔ افادیت یا گہرے تاثر کا سفر مختلف
نسلوں تک جاری رکھنے کے لیے ایسا کرنا ضروری ہوتا
ہے تاثرات و پیغام محفوظ ہو جاتے ہیں۔
پاکیزہؔ..... آج کا کہانی نگار اپنی تسکین کے
لیے لکھ رہا ہے؟ معاشرے کے لیے لکھ رہا ہے یا صرف
مادی نقطہ نگاہ اس کے سامنے ہے؟

رفعت سراجؔ..... 75 فیصد مادی نقطہ نگاہ
کے ساتھ اس لیے کہ ڈسپرین بھی پیسے سے ملتی ہے
ایک زمانہ تھا خاص طور پر خواتین کا لکھنا بہت غیر
معمولی بات ہوتی تھی۔ خواتین خالصتاً پڑھے جانے
کے لیے لکھتی تھیں۔ اسی لیے لکھنے کے معاوضے کے
لیے لفظ ”اعزازیہ“ تخلیق ہوا جو ادبی صرف اعزاز یہ
ہی ہوتا تھا۔ سو، پیچاس روپے میں کیا شاپنگ ہو سکتی
تھی۔ شاید خواتین مزید کاغذ قلم ہی خرید لیتی ہوں گی۔
دوسرے یہ کہ پہلے ادب برائے ادب یا ادب برائے
زندگی کے تناظر میں پرچے نکلتے تھے۔ اب کمرشل
بنیاد پر بے شمار میگزین، ڈائجسٹ نکلتے ہیں۔ یہی وجہ
ہے کہ یہ سسٹم جاری رکھنے اور سرکولیشن کو بڑھانے کے
لیے بہت اچھا لکھنے والوں کی ضرورت رہتی ہے جو
آمدنی میں اپنے حصے کا تعین بھی جانتے ہیں۔
پاکیزہؔ..... پاکیزہ سے اپنے اولین تعلق کی
بابت بتائیے کس طرح متعارف ہوئیں؟

رفعت سراجؔ..... پاکیزہ کے دسترخوان کے
لیے ایک ڈش کی ترکیب ارسال کی تھی..... ساتھ ہی
محفل میں ایک خط بھی لکھا تھا جس کا جواب بھی ملا تھا۔
ترکیب بھی شائع ہوئی تھی اس کے بعد یہی مختصر کہانی یہ
ستم یہ کرم شمارہ دسمبر 1977ء۔
پاکیزہؔ..... آپ کلاسیکی ادب میں کس سے

والے کو یہ خود ہی طے کرنا ہوتا ہے کہ اس نے بات کس
ڈھب سے کہنی ہے اور جو کچھ کہنا چاہتا ہے آخر اس کا
مقصد کیا ہے؟ فرائیز زندگی کے ہر رخ کو نیکیس کے
حوالے سے دیکھتا ہے، کارل مارکس مادے سے ہٹ
کر زندگی کو نہیں دیکھتا۔ دین اسلام امن، پیار، لواور
دو کے قانون کو زندگی کا مقصد بتاتا ہے۔ ہر تخلیق کار کو
اپنی تخلیق کا مقصد خود تعین کرنا ہوتا ہے۔ کسی بھی
موضوع پر مرکوز ہو کر فطرت کی سرگوشیاں سنتے ہوئے
جو تخلیق بھی بے ساختگی سے وجود میں آتی ہے وہ کبھی
بے مقصد نہیں ہو سکتی۔ جیسا کہ ایک مخصوص گروہ کا اس
بات پر یقین ہے کہ وہ جتنا مدہوش ہو کر لکھیں اتنا ہی
تخلیق میں دم ہوتا ہے۔ نیکل لائند وائر ان بھرتا ہے۔
فاتر انکل ہو کر کوئی کبھی کام کرنا تو ازان کھونے کے
مترادف ہے اور توازن کے بغیر ہر عمل ناپس ہے۔
پاکیزہؔ..... آپ جس جذبے یا محرک کے
تحت لکھتی ہیں تو اس میں کیا کیا رکاوٹیں پیش آتی ہیں
جو آپ کی تحریر کو متاثر کرتی ہوں؟

رفعت سراجؔ..... بنیادی رکاوٹ قاری کی
استعداد کا تعین کرتے ہوئے اپنی بات کرنے کا
ڈھب وضع کرنا ہے۔ ایک تخلیقی ذہن کے سامنے بے
شمار ذہن ہوتے ہیں جو اپنی استعداد، تعلیمی قابلیت و
ماحول کی بنا پر مختلف ہوتے ہیں آپ نے جس نیت و
جذبے سے اپنی بات پہنچانے کی کوشش کی ہوئی ہے
ضروری نہیں وہی تاثر منتقل بھی ہو جائے۔ حال ہی
میں، میں نے کچھ لکھا اس پر جو تنقید سامنے آئی اس پر
میں چکرا کر رہ گئی۔ دولہ کیوں کی معصومیت اور نادانی
کو جس منظر میں جانچا گیا اس نے میرے چودہ طبق
روشن کر دیے جو سوچ سامنے آئی وہ تو میرے وہم و
گمان میں بھی نہیں تھی۔

پاکیزہؔ..... آپ کی تحریروں مختلف رسائل و
جرائد کی زینت بنتی رہی ہیں اپنی تحریروں کو ایک
مجموعے کی شکل میں لانا کسی بھی لکھاری کے لیے کیوں

ہائیکو

لو چلی ہے طلق میں کانے سے پڑے ہیں
کسی کی اکھ میں ایک قطرہ آب نہیں
قطار در قطار سب رشتے کھڑے ہیں

☆☆

آؤ ٹوٹ کر محبت کر لیں
جو لمحے بیتے اک دو بے بن
وہ الگ کر لیں

جو باقی بچے ہیں، انہیں امر کر لیں
شاعری: رفعت سراج

پاکیزہ ✨..... سلسلے وار کہانی اور ایک مختصر
افسانے میں کیا فرق ہے؟ اور کیا چیز لکھنا زیادہ
مشکل ہے؟

رفعت سراج ✨..... اصل آرٹ مختصر کہانی
لکھنا ہے۔ مطالعے کا دورانیہ بیس منٹ اور بیس منٹ کا
حاصل لکھ دو غور و فکر۔ یہ محدود اور زکاؤن ڈے میچ
سمجھ لیں۔ جبکہ سلسلے وار کہانیاں ٹیٹ میچز۔

پاکیزہ ✨..... اچھا جو چاشنی، رچاؤ، سجاؤ
زبان و بیان اور ساتھ ساتھ رشتوں سے گندھی ہوئی
کہانیاں اے آر خاتون، رضیہ بٹ، خدیجہ مستور،
حاجرہ مسرور، قرۃ العین حیدر اور دیگر نامور قلم کاروں
کے قلم سے نکلی ہیں وہ تاثر آج کی لکھاریوں میں کیوں
نہیں؟



انٹرنیٹ پر یوں کی داستان تھی۔
آبادی کی کثرت، بھوک اور ظلم کی
انتہا..... ذہنوں میں اتنا سکون
کہاں کہ چھت پر چاندنی راتوں
میں چار پائیوں پر لیٹ کر چاند پر
نظریں جما کر رشتوں کو یاد کریں،
محسوس کریں، لطف اندوز ہوں۔
نہ وہ محلے ہیں، نہ وہ صبر و
قناعتیں ہیں، نہ ایثار و بے غرضی
ہے۔ رشتوں کو محسوس ہی نہیں کیا
جاتا، لطف اندوز کیا خاک ہوں
خمرے۔ خود غرضی، استحصال کے کیفر
نے پورے گلوبل معاشرے کو اپنی
لیٹیٹ میں لیا ہوا ہے۔ مادی دوڑ
نے انصاف کا شعور پھین لیا ہے۔
جو دل چاہتا ہے وہ بات کی جاتی
ہے۔ کلہو حق کہنے والا تو منصور

رفعت سراج ✨..... یہ تمام لکھاری اس عہد کی
ترجمان رہیں جب آبادی اتنی زیادہ نہیں تھی۔

بھاری معاوضے کا کہہ دیا..... جو منظور کر لیا گیا اور مجھے
لکھنا پڑا۔ اس کے باوجود کچھ لوگ آج بھی میرے
لاکھوں کے دین دار ہیں۔ شاید قیامت کے رش میں
یہ ڈوبی ہوئی رقم ملیں گی۔ مجھے شروع ہی سے اچھے
پیسے ملے مگر میں نے سال میں دو تین کہانیوں سے
زیادہ نہیں لکھا پھر سلسلے وار ناول چل پڑے تو پائیس
سال non stop لکھا۔ میں مکمل طور پر گھریلو
زندگی گزارنے کے باوجود سترہ سال کی عمر سے
خود مختار ہوں بلکہ سپورٹنگ پوزیشن میں رہی ہوں۔
میری پہلی کتاب بغیر کسی جدوجہد و فرمائش کے چھپ
کر میرے گھر آگئی تھی اس کی پہلی اشاعت
”2000“ تھی جو ایک کم عمر مصنف کے لیے بہت
بڑا اعزاز تھا۔ اللہ کا فضل و کرم رہا میں نے پسند کی ہر
چیز حتیٰ کہ ہیرے جواہرات تک کے لیے والد
صاحب، بھائی، شوہر کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلا یا۔ حتیٰ
کہ ذاتی پر اپنی و ذاتی کار کے لیے بھی کوئی ہیلپ
نہیں لی۔ مگر میں نے ان سب چیزوں کے حصول کے
لیے لکھنے کی کوشش نہیں کی بس لکھنا چاہا کتنی گئی اس
بات سے قطع نظر کہ لکھنے سے کمائی ہوئی۔ پاکیزہ نے
بھی ہمیشہ مجھے اچھا اعزاز دیا۔ جبکہ 1985ء سے
پاکیزہ کی طرف سے سلسلے وار ناول کی فرمائش آرہی
ہے جو 2012ء میں پوری کر رہی ہوں۔ اگر پیسوں
کے لالچ میں لکھی تو آج تک پاکیزہ میں پانچ ناول تو
لکھ ہی چکی ہوتی۔ دوسرے رائٹرز کیا سوچ کر لگتے یا
لکھتے ہیں اس پر تبصرہ کرنا میرے لیے ضروری
نہیں۔ (انشاء اللہ رفعت جی کا نیا ناول جنوری
2013ء سے شروع ہے)

پاکیزہ ✨..... کیا آپ نے آج تک تمام
موضوعات کا احاطہ کر لیا ہے یا اب بھی کچھ باقی ہے؟
رفعت سراج ✨..... نہیں..... جب تک اس
دنیا میں انسان کی پیدائش کا سلسلہ جاری ہے آپ
موضوعات کی حدود متعین نہیں کر سکتے۔

پاکیزہ ✨..... اگر آپ میں لکھنے کی صلاحیت نہ
ہوتی یا پھر وہ مواقع میسر نہ آتے تو آپ کیا کرتیں؟
رفعت سراج ✨..... لکھنے کی صلاحیت نہ ہوتی تو
کوئی اور صلاحیت ہوتی یہ نہ کر رہے ہوتے تو وہ
کر رہے ہوتے، زبیدہ طارق بن جاتے، بی جی بن
جاتے، بلیکس ایڈی بن جاتے، اور کچھ بھی نہ سبکی اپنے
بچوں کے منت نئے ڈیزائن کے کپڑے خود ہی سی رہے
ہوتے۔ سلائی تو آتی ہے مگر فرصت نہیں ہے۔ البتہ جو
کہتے ہیں شوہر کے دل میں جانے کے لیے اس کے
معدے کا راستہ اختیار کرنا ہوتا ہے۔ اس ٹریک پر کام
رہتا ہے مگر میرے میاں بہت مشکل کھانا کھاتے ہیں۔
ہر چیز بھون کر رکھ دینے سے ان کو بچ ہے۔ لال مرچ
استعمال نہ ہو۔ ہری مرچ کے بیج نکال دیے جائیں۔
تیل نظر نہ آئے اور پھر ”ٹیٹ“ بھی مکمل ہو..... اور
ٹمک نے تو مجھے ٹنگی کا ناچ بخار کھا ہے۔ ایک ذرہ بھی
زیادہ ہو تو..... بس سونے چاندی کی طرح تولتی
ہوں۔ لکھنے کی وجہ سے رعایت مل جاتی ہے۔ نہ لکھتے تو
کچن کے تجربات سے ہی گزرتے رہتے۔

پاکیزہ ✨..... ایک تنکھا سا سوال ہے کہ قلم کار
جب لکھنے کا آغاز کرتا ہے اور آہستہ آہستہ مشہور و
معروف ہونے لگتا ہے تو وہ منہ بولا معاوضہ طلب کرتا
ہے کیا یہ اس کا حق ہے؟ (معاف کیجیے گا یہ سوال
پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں پڑھا جائے گا مگر ہمیں پوچھنے
دیتے، ویسے تمام رائٹرز پر یہ کلیہ لاگو بھی نہیں ہوتا)

رفعت سراج ✨..... مجھے ڈائجسٹ کے ادب
میں سب سے زیادہ اعزاز یہ لینے کا اعزاز حاصل ہے
اور اس کی وجہ یہ نہیں کہ میں نے کمانے کے لیے
باقاعدہ پلاننگ کی اور سوچا کہ لکھوں گی تو اتنا لوگی۔
میں کمانے کے لیے لکھتی تو بیس سال میں میرے تیس
ناول ہوتے جب مجھ سے لکھنے کے لیے اصرار کیا گیا
اور میری دیگر مصروفیات آڑے آئیں معذرت کر لی
مگر اصرار ہوا ہو گیا۔ تب جان چھڑانے کے لیے

غزل

اللہ تمہیں بُری گھڑی سے بچائے
کانپتے لیوں سے دعا کر رہی ہوں میں
تمہارا زانو ہو اور میرا سر ہو
جن موت کی تمنا کر رہی ہوں میں
تم سے ملنے کی دعا کر رہی ہوں میں
یہ خطا ہے تو خطا کر رہی ہوں میں

شاعرہ: رفعت سراج

کیوں پسند ہے؟

رفعت سراجؔ..... بیاہل دل دریا تن صحرا،
نا تجربہ کاری کے عہد میں صرف خیال کا جادو، چھوٹی سی
عمر کی بڑی بات۔

پاکیزہؔ..... نثر کے علاوہ شاعری سے کس
حد تک لگاؤ ہے کبھی شعر بھی کہے؟ کوئی پسندیدہ
شعر.....

رفعت سراجؔ..... شاعری پڑھنا تو میری
فطرتِ ثانیہ ہے۔ خود بھی شاعری کرتی ہوں۔ شائع
بھی ہوئی ہے۔ کوئی مجموعہ کلام ترتیب نہیں دیا۔ ویسے
غالب کا شعر میرا پسندیدہ ہے۔

حسن غمرے کی کشاکش سے چُٹنا میرے بعد
بارِ آرام سے ہیں اہل جفا میرے بعد
پاکیزہؔ..... آپ کی پسندیدہ شخصیت اور
کیوں؟ اور نا پسندیدہ بھی؟

رفعت سراجؔ..... 25 سال پہلے اس سوال کا
جواب دیا تھا وہی آج بھی ہے۔ محمدؔ + علیؔ + جناحؔ۔
جناح کے اصول، حق پرستی، دینی غیرت۔

پاکیزہؔ..... پسندیدہ کھانا، لباس، رنگ،

نہیں، بہنوں کا کہنا ہے کہ ان سے اچھا بھائی کوئی نہیں
اور بچوں کا کہنا ہے کہ ان سے اچھا باپ کوئی نہیں تو
جب تمام رشتے خوش اسلوبی سے وہ نبھارے ہیں تو
شوہر کی حیثیت سے بھی اپنے فرائض اسی حسن و خوبی
سے انجام دے رہے ہیں بھی میں اتنا تخلیقی کام کر پاتی
ہوں۔ میری ایک دیواری نو بہار اتنی پیاری ہے میں
اسے اپنے افسانوں کی ہیروئن کہتی ہوں۔ ان سب
سے میری بہت اچھی دوستی ہے۔ بہر حال وقت کی کمی
کے باعث فون پر باتیں نہیں کر پاتی۔

پاکیزہؔ..... آپ کی کامیابیوں پر یقیناً یہ
سب خوش بھی ہوتے ہوں گے آپ کے گھر والوں
بالخصوص شوہر نامہ کے کیا تاثرات ہوتے ہیں؟

رفعت سراجؔ..... اس سوال کا جواب بھی
کسی حد تک دے چکی ہوں کہ شوہر کا تعاون ہی میری
کامیابی پر خوش ہونا ہے۔ خاموش رویہ ہے ظاہر ہے
سمجھ دار شوہر ہیں الفاظ کم اور تاثرات زیادہ..... بچے
نفر محسوس کرتے ہیں۔ میرے تین بچے ہیں بالترتیب
5th, 4th اور کلاس 7th میں ہیں۔ ماں کی
مصروفیات سے آگاہ ہیں اور خوش ہوتے ہیں اپنے
اپنے طور پر جو تعاون کر سکتے ہیں کرتے ہیں۔ بچے
چھوٹے تھے تو ان کی ذمے داریاں زیادہ تھیں مگر کام
متاثر نہ ہونے دیا اور نہ ہی بچوں کو دوری کا احساس
ہونے دیا سواں طرح خدا تعالیٰ کی مدد سے کام چلتا
رہا اور چل رہا ہے اور آپ کی دعاؤں سے انشاء اللہ چلتا
رہے گا۔

پاکیزہؔ..... اس قرطاس و قلم کے شوق نے
آپ کی دیگر دلچسپیوں کو کس حد تک نظر انداز کیا۔

رفعت سراجؔ..... ہمیشہ سے زندگی اتنی
مصروف رہی کہ لفظ ”بور“ میری لغت میں نہیں ہے
میری تمام دلچسپیاں لہادے بدلتی رہیں۔ کم یا مختصر نہیں
ہوئیں۔

پاکیزہؔ..... اپنی پسندیدہ تحریر بتائیے اور

لیے ساتھ لے گئے تھے کہ وہ آؤ ٹنگ کر لیں گے ویک
اینڈ منالیں گے۔ میں نے بتا دیا تھا کہ اندازاً اتنی دیر
میں فارغ ہو جاؤں گی۔ اتفاق سے میں مقررہ وقت
پر ہی فارغ ہو گئی اور کانفرنس روم سے باہر آ گئی اسی
وقت مجھے اپنے دونوں چھوٹے بچوں کی آوازیں سنائی
دیں۔ جو گاڑ سے باتیں کر رہے تھے۔ فاطمہ کہہ رہی
تھی (فاطمہ نو سال کی ہے) اٹکل ہماری امی کہاں
ہیں۔ فوزان (دس سالہ) نے چھوٹی بہن کو ٹوکا۔ بے
وقوف..... امی نہیں بولو..... اٹکل سے پوچھو رفعت
سراج کہاں ہیں؟

پاکیزہؔ..... پھر آپ کی اس مصروفیت کے
باعث آپ کے شوہر صاحب اور بچے اور ہاں سسرالی
رشتے کس حد تک متاثر ہوئے؟

رفعت سراجؔ..... جہاں تک شوہر صاحب
اور بچوں کے متاثر ہونے کی بات ہے تو ظاہر ہے اتنی
مصروفیت کے باعث کچھ نہ کچھ تو ضرور neglect
ہوتا ہے مگر میں نے ہر آن خیال رکھا کہ میری تحریری
مصروفیت سے ازدواجی زندگی متاثر نہ ہو چاہے اپنی
ذات پر سہ لوں مگر میں نے نجی مصروفیت کو کام میں
آڑے آنے نہیں دیا اور نہ ہی کام کو اپنے گھریلو ماحول
میں رخنہ بننے دیا۔ میں نے دونوں جگہ اپنی کمینٹس کا
پورا پورا خیال رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے اپنے شوہر
کا پورا تعاون حاصل رہا اور سسرالی رشتے داریوں کی
جہاں تک بات ہے تو ماشاء اللہ میری چھ نندیں، چار
دیور اور شفیق ساس ہیں یعنی کوئی تقریب ہوتی ہے تو
گھر کے ہی ساتھ بیٹھ افراد ہوتے ہیں۔ چند ماہ پہلے
میری نند کی بیٹی کی شادی ہوئی جس میں مہمان داری
میرے گھر سے ہی ہوئی اور پنڈی سے دو تہدیں ایک
بنوں سے اور دو حیدر آباد سے آئیں۔ اگر ان سے
ایچھے تعلقات نہ ہوتے تو کیسے وہ مان سے وہاں سے
آتیں میرے شوہر اپنی ماں کے سب سے بڑے بیٹے
ہیں اور والدہ صاحبہ کا کہنا ہے کہ ان سے اچھا بیٹا کوئی

رشتوں کے گداز کیسے محسوس کریں؟ محسوس کریں تو
پیش کریں..... اور ابھی بہت کچھ ہے کہنے کو مگر.....

بات کرتا ہوں تو لگتی ہے زباں میری
پاکیزہؔ..... ایک قلم کار ہر بات، ہر مسئلے، ہر
موضوع کو ایک الگ نظر نگاہ سے دیکھتا ہے کیا یہ سب
تحریر نگاروں کے ساتھ ہوتا ہے؟
رفعت سراجؔ..... جی بالکل..... کیونکہ ہر
انسان رب العالمین کا منفرد پروگرام ہے جو اپنا خاص
کردار ادا کرنے دنیا میں آیا ہے۔

پاکیزہؔ..... اچھا رفعت جی کچھ آپ کی اپنی
شخصیت و ذات کے متعلق گفتگو ہو جائے..... آپ کا
طرز زندگی نجی مصروفیات وغیرہ وغیرہ ویسے آپ کے
اس شوق اور جذبے کو گھر والوں نے کس حد تک سراہا؟
رفعت سراجؔ..... میرا طرز زندگی نہایت
سادہ ہے۔ میں موقع محل کے حساب سے پہننتی اور وحشی
ہوں۔ کیونکہ گھریلو زندگی بہت مصروف ہے زیادہ
سوشل نہیں ہو سکتی میری ملاقاتیں بہت کم ہیں۔ فون پر
بات کم ہوتی ہے۔ میاں کہتے ہیں کہ میرے پاس قہرما
میٹر لے کر آیا کرو۔ جبکہ اللہ کی مخلوق کو یہ شکایت ہے
کہ میں فون کا لڑ ریسو نہیں کرتی، آنا جانا کم رکھتی
ہوں۔ سگی، بہن، سگی بھائی سے ہفتوں بات نہیں ہوتی۔

میرا شوہر میری سب سے بڑی مصروفیت ہے اور میں
خوش ہوں کہ ہم ایک دوسرے کو وہ وقت دیتے ہیں جو
میاں بیوی کو دینا چاہیے۔ مجھے بہت سراہا گیا..... اتنا
زیادہ کہ صلے ستائش سے آگے نکل گئی ہوں۔ اللہ نے
بے نیازی کے راستوں پر ڈال دیا۔ اب مجھے بس یہ
شوق ہے کہ اللہ کی تعریف کرتی رہوں اس کی حمد و ثنا
میں ذہن مصروف رہے۔ میں نے آج تک کسی
انجان ملاقاتی کو خود سے نہیں بتایا کہ میں مصنفہ ہوں۔
شوہر بہت خوش ہیں، بچے بھی پرائڈ فیل کرتے ہیں۔
اس ضمن میں مجھے اپنے بچوں کی ایک مصو مانہ بات یاد
آ گئی۔ کسی چینل پر میٹنگ تھی۔ میر صاحب بچوں کو اس

کے ساتھ لکھیے..... دو گھڑی کی واہ
واہ ہسٹری نہیں بنتی۔

پاکیزہ..... آپ کا پاکیزہ میں
جلد شروع ہونے والا ناول
”امانت“ کا مرکزی خیال کیا ہے؟
رفعت سراج..... ”امانت“ میں
”احساسِ ذتہ داری“ کی اہمیت کو
اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے کیونکہ
چند غیر ذتہ دار لوگوں کی وجہ سے
کئی تسلیں روحانی مسرتوں سے
محروم رہ جاتی ہیں۔

”رجم“ کی سزا آنے والے نئے
معصوم انسانوں کے حقوق کا تحفظ
کرنے والی حد ہے۔

مجھے آنے والی نئی کونسل جیسی
معصوم رجحوں کے چہروں پر
روحانی مسرتوں کی چمک دیکھنے کی

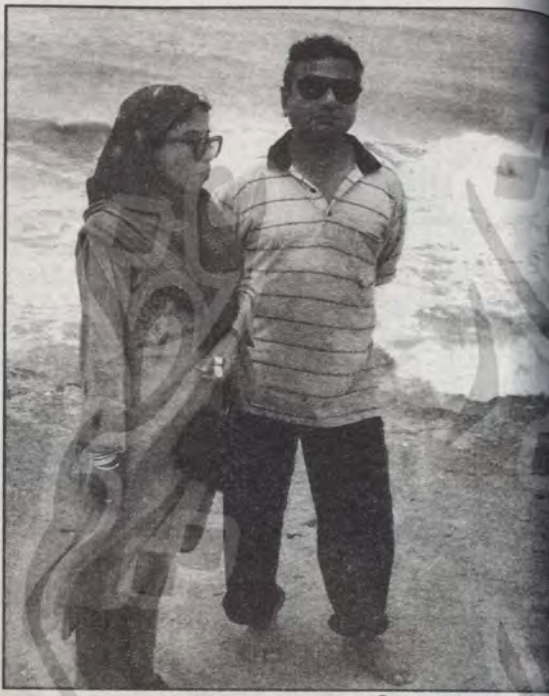
تمنا ہے اور میں یہ جدوجہد کرتی رہوں گی۔ کسی کو کیا
حق پہنچتا ہے کہ وہ انسانوں کے ابدی، فطری حقوق
غصب کرے؟

☆☆☆

اس کے ساتھ ہی ہم رفعت سراج صاحبہ کے
بہت شکر گزار ہیں جنہوں نے اپنی فلمی و گھریلو
مصروفیات سے پاکیزہ کے لیے وقت نکالا اور باذوق
قارئین کا ایک دیرینہ مطالبہ پورا کیا۔

عزیز ساتھیو! آپ کے قیمتی تبصرے اور آرا کا
انتظار رہے گا۔ خدا حافظ!

جنوں کے راستے یوں تو کٹھن سے لگتے ہیں
مگر یہ راستے منزلِ تلک نکلتے ہیں
زمانہ ہر قدم پہ راہ روکنے والا
عزائم پختہ ہوں جن کے وہ کب بھٹکتے ہیں



زیادہ زور ہے۔ معدہ بوجھل ہو تو ذہن سست پڑ جاتے
ہیں۔ مثبت ارادوں میں قوت نہیں ہوتی پھر ستم
ریموٹ ہاتھ میں۔ نہ جتنو نہ لگن، عیش و عیاشی کے
غالب رجحانات میں کتابِ تھامنا..... بہت مشکل کام
ہے۔ یہ کام ذتہ دار مائیں ہی کریں گی۔ جب
مائیں خود ہر وقت ریموٹ ہاتھ میں لیے بیٹھی رہیں
گی۔ موبائل فون پر Non stop باتیں کریں
گی۔ کیونکہ فلاں نے کہا ہے کہ سب کہہ دو۔ تو وہ اپنی
اولاد کو کیسے کنٹرول کریں گی۔

پاکیزہ..... نئی لکھنے والی بچیاں آج اپنی پہلی
تحریر سے ہی ”کلیک“ ہونا چاہتی ہیں ان کو کیا پیغام
دیں گی؟ پہلی تحریر کا چھپنا کیا تقاضے مانگتا ہے؟

رفعت سراج..... ارے بچپنوں یہ بہت
دشوار گزار، صبر آزما راستہ ہے۔ اچانک ملنے والی
شہرت اچانک ختم بھی ہو جاتی ہے۔ محنت، محبت، جتنو

پاکیزہ..... کیا ہمارے معاشرے نے اپنا وہ
مقام وہ مرتبہ پایا ہے جو ہونا چاہیے تھا اگر نہیں تو اس
سلسلے میں کیا کرنا ہوگا؟

رفعت سراج..... جس معاشرے میں
جذبات، انصاف کا پیمانہ ہوں۔ شارٹ کٹ، چور
راستے ڈھونڈنے کا رجحان ہو اسے فلاحی معاشرہ بننے
کے لیے بہت بڑے انقلاب کی ضرورت ہوتی ہے۔

پاکیزہ..... آپ کی تحریروں میں عصری
حالات و واقعات کس حد تک غلبہ پاتے ہیں کیا زمانے
کی نشاندہی کرنے کے لیے ان کا ہونا ضروری ہے؟

رفعت سراج..... 100 فیصد اپنے زمانے
میں ہی مکتبی ہوں۔ موجود، حاضر، غائب پر۔

پاکیزہ..... آج کے نئی دی رائٹرز کیا دکھانا
چاہ رہے ہیں، بے راہ روی، عورت سے عورت کی
دشمنی یا آزادانہ مخلوط ماحول..... یہ موضوعات نئی نسل
پر کیا اثرات مرتب کر رہے ہیں؟

رفعت سراج..... بے مقصد تحریروں سے
کچھ بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ تمام رائٹرز کو یہ بات سمجھ
لینی چاہیے۔ مسئلے کی نشان دہی کریں، حل بھی نکالیں
صرف چھپنے کے شوق میں نہ لگیں۔ یہ بے ایمانی
ہے۔ اپنے آپ سے۔ چاہے پرنٹ میڈیا ہو یا
الیکٹرانک میڈیا۔

پاکیزہ..... اب انٹرویو کے اختتامی مراحل
میں یہ بتا دیجیے آپ اپنے اس فلمی سفر سے کس حد تک
مطمئن ہیں؟

رفعت سراج..... بالکل بھی نہیں۔ بقول
شخصے جتنا آپ جانتے ہیں اس سے زیادہ تو ابھی
پوشیدہ ہے۔

پاکیزہ..... آج مطالعے کا رجحان قدرے کم
ہو گیا ہے؟ ہاں نہیں اگر ہاں تو کیوں؟ اور اس کے
لیے کیا کہنا چاہیں گی؟

رفعت سراج..... آج کل کھانے پینے پر

موسم، تفریح؟

رفعت سراج..... تیز مریج والی سندھی مٹن
بریانی، تمام شریفانہ ملبوسات، سرخ، گلابی، Sea
گرین۔ موسم گرمی کا۔ پانی کے سارے کام کھل کر
کرنے کا لطف آتا ہے۔ اپنے میاں کے ساتھ کار کا
سفر اور پسندیدہ نعمات کے ساتھ سفر۔ اگر شوہر ساتھ نہ
ہوں تو میں گیت نہیں سنتی۔

پاکیزہ..... کوئی یادگار لمحہ جو بہت خوشگوار
ہو۔ کوئی ایسا لمحہ جب خوف محسوس ہوا ہو؟

رفعت سراج..... میری شادی کا دن، نکاح
ناے پر دستخط کرنے والے لمحات۔ بارات آگئی کی
خوشگوار آوازیں۔ 1972ء میں جب پرائمری
سیکشن میں ٹاپ کیا تھا۔

پہلی بار ماں بننے کا تجربہ اس لمحے بہت ڈر لگ
رہا تھا۔

پاکیزہ..... کوئی ایسی بات، واقعہ، شخصیت
جو ذہن میں ہو مگر..... آپ بھولنا چاہتی ہوں؟

رفعت سراج..... تکلیف دہ باتیں
مصروفیات میں بھلا دیتی ہوں۔ ہاتھ آئے لمحات کو
کار آمد نتیجہ خیز بنانا چاہتی ہوں۔ زیادہ تر ہاتھ کے
ہاتھ بات کر کے ایک طرف کرنے کی عادی ہوں۔
Pending سے مجھے چڑ ہے۔

پاکیزہ..... اچھا آپ نے اس قدر
موضوعات پر لکھا اور یقیناً زن و مرد کے ذہن کو بھی
قریب سے پڑھا ہوگا..... عورت کی سب سے بڑی
خوبی کیا ہونی چاہیے۔ خامی کیا ہونی چاہیے۔ مرد کی
سب سے بڑی خوبی، خامی؟

رفعت سراج..... عورت کے لیے حیا خوب
ہے مرد کے لیے خوب تر۔ (حضرت علیؓ) عورت کی
خاطر اصول و وقار بھلا دینے والے مرد ہر گتے ہیں۔
حیا، ایمان کی جڑ ہے ایک شاخ ہے۔ جو بھی اس سے
محروم ہے اس میں کوئی خوبی نہیں۔

خواتین کی کامیابیوں کا سفر ۲۰۱۲ء میں

شائستہ زریں

کسی مفکر کا قول ہے ”عورت کا نازک ہاتھ جو بچے کے پنگوڑے کو حرکت دیتا ہے وہی اس کرۂ ارض کو چمکی چلا رہا ہے“ اور اتنی توانا ڈتے داری صنفِ نازک اپنے بلند عزم و حوصلے سے نباہ لیتی ہے بقول فاطمہ حسن

میرے عزم سفر تو نے تسخیر کر لیں
زمانے کی گردش مخالف ہوا میں

بلاشبہ یہ عزم سفر ہی کا کمال ہے کہ اس کی بنیاد پر عورت صبر آزمائیت طے کر کے بالآخر کامیابی کی منزل پالیتی ہے۔ ۲۰۱۲ء میں اپنے مقصد کے حصول کے لیے خواتین کی کاوشیں اور اس کے نتیجے میں حاصل کردہ کامیابیاں محض ان کا ہی نہیں ہمارا بھی فخر ہے۔ یہ سال اختتام پذیر ہے سو اس سال کے آخری شمارے کے لیے ہم نے مختلف شعبہ ہائے زندگی سے متعلق چند خواتین سے اس سال میں ملنے والی ان کی کامیابیوں کے بارے میں دریافت کیا۔ آپ بھی پڑھیے۔



حسینہ معین

کے مشاہدات اور تجربات میری آئندہ کسی سیریل کا حصہ بنیں گے۔ 123 اکتوبر کو آرٹس کونسل نے مجھے ٹریبیوٹ دیا۔ آرٹس کونسل کی طرف سے اعتراف کمال کی شیلڈ دی گئی۔ میری ادبی خدمات پر مبنی دستاویزی فلم ”ہماری حسینہ“ بھی پیش کی گئی۔ میرے گھر والے دوست احباب سہاسی فنکار، رائٹر، موجود تھے، میرے بارے میں اظہارِ خیال کیا گیا، مجھے سراہا گیا۔ جیمز آف کامرس کے چیئرمین نے اپنی جانب

حسینہ معین

ڈراما نویس

یوں تو قلم کے حوالے سے کئی کامیابیاں میرے حصے میں آئیں لیکن ۲۰۱۲ء اس لحاظ سے اہم اور یادگار ہے کہ پہلی مرتبہ ایک ساتھ میرے تین سیریلز..... سارے موسم اپنے، میری بہن مایا اور تنہائیاں کا sequel آن اڑا رہے ہیں۔ میری بہن مایا بہت اچھی جارہی ہے، تنہائیاں بھی مقبولیت

سے میسٹ رائٹر کی شیلڈ دی۔ سر دست تو ۲۰۱۲ء میں بھی کامیابیاں ہیں۔

نیلوفر عباسی

براڈکاسٹر، آرٹسٹ

اللہ کا بڑا کرم ہے کہ مجھے زندگی میں بہت سی کامیابیاں اور محبتیں ملیں، ریڈیو، ٹیلیوژن پر جتنا بھی کام کیا اسے بہت سراہا گیا اعزازات بھی ملے۔ عذرا رسول، قمر علی عباسی اور انجم انصاری کی فرمائش پر اپنی یادداشتیں لکھنا شروع کیں جو پاکیزہ میں قسط وار شائع ہوئیں۔ جب یہ سلسلہ ختم ہوا تو قمر علی عباسی



نیلوفر عباسی

نے کتاب کا مطالبہ کر دیا، طبع شدہ مواد پر نظر ثانی کے بعد ترمیم و تنقیح میرے لیے کڑی آزمائش تھی۔ بالآخر میں نے یہ معرکہ سر کر ہی لیا (یہ آزمائش میرے لیے کسی معرکہ سے کم نہیں تھی) ۲۰۱۲ء میں میری یہ یادداشتیں کتابی صورت میں شائع ہو گئیں اس لیے اپنی پہلی کتاب ”کبھی ان کبھی“ کو میں ۲۰۱۲ء کی اپنی بڑی کامیابی سمجھتی ہوں کہ اس سال میں صاحب کتاب کہلائی اور می ڈی کی قلم کی وراثت کا حق ادا کر دیا۔

شہناز رمزی

ایڈیٹر مصالحہ ٹی وی فوڈ میگ

۲۰۱۲ء مجموعی طور پر میرے لیے بہت اچھا ثابت ہوا۔ اس سال کے آغاز میں ہی سینٹ جوزف کانونٹ نے جو اپنے 150 سال مکمل ہونے



شہناز رمزی

کا جشن منایا گیا ہے ان سالوں میں سے 150 ویں آف سیمینٹس منتخب کیں جن میں ایک میں بھی ہوں۔ اپنے اسکول سے یہ اعزاز ملنا میرے لیے کسی ایوارڈ سے کم نہیں۔ میں بلا تردید یہ بات کہہ سکتی ہوں کہ میری سال کی سب سے اہم کامیابی میری کتاب ”فوڈ پرنس“ کی اشاعت ہے جسے آکسفورڈ یونیورسٹی پریس نے شائع کیا ہے۔ میں کئی سالوں سے اس کتاب پر دن رات کی تفریق کے بغیر کام کر رہی تھی۔ جب ”فوڈ پرنس“ میرے ہاتھ میں آئی اس وقت مجھے جو خوشی ہوئی اس کا بیان میرے بس سے باہر ہے۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے مجھے اس قابل بنایا کہ میں آج صاحب کتاب ہوں پھر اس کتاب کی تقریب رونمائی بے حد شاندار تھی۔ اس سال ”ہم نیٹ ورک“ کے پلیٹ فارم سے ایک نئے میگزین ”انسائل 360 کلیم“ کا اجراء کیا، میں اس



مغلحہ رحمان

سال کی نمائش کا موضوع بلا عنوان تھا جس میں موجودہ دور کے نوجوانوں میں نئے اور اسلحے کا بڑھتا ہوا استعمال ہے۔ اس نمائش کو قومی اور بین الاقوامی سطح پر سراہا گیا، جس سے بحیثیت فوٹو گرافر مزید شہرت ملی ساتھ ہی بحیثیت پروڈیوسر ترقی بھی ملی۔

عائشہ ناز

معاون استاد جامعہ کراچی شعبہ اردو
اردو ادب میں ایم اے اور پی ایچ ڈی کرنا میرا دیرینہ خواب تھا، معلمی کا پیشہ اختیار کرنے کی آرزو بھی بچپن سے میرے دل میں پروان چڑھ رہی تھی ۲۰۱۲ء میرے ان خوابوں کی روشن تعبیر اور آرزو کی تکمیل کی نوید لایا۔ ایم اے اردو میں نے دوسری پوزیشن حاصل کی اور پی ایچ ڈی کی اولین کڑی یعنی ایم فل میں داخلہ مل گیا، اسی سال جامعہ کراچی میں معاون استاد کی ملازمت بھی حاصل کی۔ یہ وہ اہم اہداف ہیں جن کے حصول کے لیے میں نے بہت محنت کی اللہ کا بڑا شکر ہے کہ مجھے اپنی کاوشوں کا صلہ بہترین کامیابی کی صورت میں ملا۔

☆☆☆



عنبرین حبیب

یہ ہے کہ ہم اپنے پیاروں، اپنے عزیز ترین رشتوں کو کوئی خوشی دے سکیں۔ ایسا ہی ایک موقع ۲۰۱۲ء میں ہمیں نصیب ہوا جب ہمارا پہلا شعری مجموعہ ”دل کے افق پر“ منظر عام پر آیا اور اسے ادبی حلقوں میں بے حد پذیرائی حاصل ہوئی۔ اس مجموعے کی اشاعت کے بعد ادب کی محترم اور معتبر شخصیات کا بھرپور اعتماد، حوصلہ افزائی اور بڑی توقعات ہماری اس کامیابی کا اہم حصہ ہیں۔ اس مجموعے کی تقریب اجرا پہلے لاہور اور پھر کراچی میں احباب نے منعقد کی۔ یہ دونوں تقاریب بہت کامیاب اور یادگار تھیں۔ اس موقع پر ہمارے اہل خانہ اور احباب کی بھد شوق شرکت، محبت بھرا اظہار خیال، نیک خواہشات ہمارے لیے سرمایہ حیات ہے۔ یقیناً انہی اس کامیابی پر ہم اپنے پروردگار کا جتنا شکر ادا کریں کم ہے۔

مغلحہ رحمان

پروڈیوسر انٹر ٹینمنٹ اے آر وائی نیوز
۲۰۱۲ء میں میری سب سے بڑی کامیابی فوٹو گرافی کی نمائش ہے۔ یہ تصویریں نمائش میں نے اور خرم اکبر خان نے مل کر آرٹس کونسل میں منعقد کی۔ اس

اللہ کا بڑا کرم ہے کہ اپنے حبیب ﷺ کے صدقے مجھے یہ کامیابی عطا کی۔ میرے والدین، مداحوں اور چاہنے والوں کی دعائیں میرے ساتھ ہیں۔ ۲۰۱۲ء میں میری سب سے بڑی، اہم اور یادگار کامیابی یہ اعزاز ہی ہے۔

شاہین ضمیر

ہیڈ آف مارکیٹنگ پی آر انٹرنیٹر شپ

ڈیولپمنٹ فرسٹ وومین بینک

سال ۲۰۱۲ء کی میری سب سے بڑی کامیابی فرسٹ ووومن بینک کے entrepreneurship development programme کا



شاہین ضمیر

کراچی اور لاہور میں کامیاب انعقاد ہے۔ اس پروگرام سے اب تک ۲۸۵ خواتین فائدہ اٹھا چکی ہیں اور بہت سی خواتین نہایت کامیابی سے کاروبار بھی کر رہی ہیں ان کی کامیابی ہی میری کامیابی ہے۔

عنبرین حبیب

شاعرہ

ہر انسان کے نزدیک کامیابی کے معنی مختلف ہوتے ہیں۔ ہمارے نزدیک سب سے بڑی کامیابی

ماہانہ فیشن میگزین کی ایڈیٹر ہوں۔ ”مصالحتی وی فوڈ میگ“ جسے پاکستان کا کثیر الاشاعت جریدہ قرار دیا جاتا ہے، نے بھی کامیابیوں کے کئی مراحل طے کیے۔ اس سال ایک اور اہم کامیابی ”من پسند لائیو ایٹ نائن وڈ شیف گلزار“ کا اجراء بھی ہے جس کی ادارت میرے ذمے رہی۔ اس کے علاوہ میں سال میں 2 فیشن کیٹلاگ بھی ایڈٹ کر رہی ہوں۔ اس اعتبار سے میں ۲۰۱۲ء کو اپنے لیے تصنیف و تالیف کے حوالے سے انتہائی کامیاب اور یادگار سال قرار دے سکتی ہوں۔

شیریں انور

شیف

کوئی بھی کامیابی اس وقت تک ہمارے حصے میں نہیں آتی جب تک ہم اپنے کام میں ایمانداری اور لگن کو شامل نہیں کرتے میں جس جذبے، محنت



شیریں انور

اور ایمانداری سے سکھائی ہوں اللہ نے مجھے اس کا انعام بھی دیا۔ حال ہی میں انٹرنیشنل شیف ڈے کے موقع پر لاہور میں ورلڈ شیف ایسوسی ایشن کی جانب سے مجھے بہترین شیف کے اعزاز سے نوازا گیا۔ مصالحتی چینل نے بھی مجھے بہت بڑا چکن انعام میں دیا۔

ہوں۔“ (آپ کی رائے ہماری نئی مصنفات کو پہنچانی جارہی ہے)

بھہ خالہ عجم، پو کے۔“ سب سے پہلے ادارہ پڑھا بہت اچھا لگا پھر بہنوں کی محفل..... ہر خط اپنا فلیور علیحدہ ہی رکھتا ہے۔ ابھی ناول اور افسانے نہیں پڑھ سکی ہوں کہ پورا مہینہ گزارنا ہوتا ہے اس لیے آہستہ آہستہ مزے لے لے کر پڑھا کرتی ہوں، میں بھی اور میری بیٹی ڈاکٹر جہنہ بھی۔“ (آپ کی رائے پہنچانی جارہی ہے)

بھہ شگفتہ ناصر، فیصل آباد سے۔“ اس ماہ کا ناول ام مرتیم کا بہترین رہا..... وہ لڑکیاں جو منہ پھٹت ہوئی ہیں جو بولنے سے پہلے کچھ سوچائیں کرتیں ان کی بہترین عکاسی کی گئی ہے۔ عکس ناول پڑھنے کی عادت ہو گئی ہے اب اگر وہ ختم ہو جائے گا تو ہم کیا پڑھیں گے۔ آپ کا افسانہ دستک درد ل پر بہت اچھا لگا۔ مکمل ناول بس ٹھیک ہی تھا۔ نادیہ جہانگیر نے بھی اچھا لکھا۔“ (پسندیدگی کا شکریہ..... عمیرہ احمد بہت جلد اپنا دوسرا ناول لے کر آئیں گی۔ ہاں آپ کو اس ماہ اپنی شادی کی سالگرہ بھی مبارک ہو)

بھہ شاز یہ جمال، کراچی سے۔“ نومبر کا پاکیزہ ناول منسل سمیت پسند آیا۔ سب سے زیادہ خوشی دستک درد ل کی وجہ سے ہوئی۔ عکس ہمارا نفورٹ ناول ہے۔ ان دنوں لی وی پر بھی عکس کے نام سے ایک سیریل چل رہا ہے۔ کیا اس ناول کا اس سے کوئی تعلق ہے؟ اس ماہ کا سب سے اچھا ناول ام مرتیم کا رہا۔ انہوں نے بولڈ لڑکیوں پر بالکل نیا قلم اٹھایا ہے۔“ (پیاری شاز یہ پاکیزہ کی تحریروں کی پسندیدگی کا شکریہ لی وی پر چلنے والے ڈرامے کا ہمارے ناول سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہمارے ناول کی مقبولیت کو دیکھ کر کوئی اس کا نام لے لے تو ہم کیا کر سکتے ہیں)

بھہ شگفتہ شبن، کراچی سے۔“ پاکیزہ کی ہر تحریر، ہر خط پسند آتی ہے۔ سب سے پہلے بہنوں کی محفل پڑھتی ہوں اور ہمیشہ تمام بیابانوں کے لیے دعا کرتی ہوں..... پیاری بہنوں اپنی دعاؤں میں آپ لوگ مجھے بھی یاد رکھا کریں۔ پھر جلتنگ پڑھا اور طبیعت فریض ہو گئی۔ اس کے بعد دیگر افسانے پڑھے۔ سب ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔ ام مرتیم کا ناول دستک درد ل پسند آیا اس میں ہیر و کافی شریف دکھایا گیا ہے ورنہ ایسی لڑکیوں کا انجام زیادہ تر برا ہوا کرتا ہے مگر یہ ایک اصلاحی تحریر ہے اس کو پڑھ کر بہت سی لڑکیوں کی آنکھیں یقیناً مکمل جاگن گی۔ باجی آپ کا افسانہ بھی اچھا لگا آخر تک سنبھل رہا اور پڑھ کر مزہ آیا۔ انجم باجی میرا پاکیزہ کے ساتھ بہت پرانے رشتہ ہے عرصہ دراز سے میں پڑھ رہی ہوں مگر آپ کے ساتھ میرا رشتہ بالکل بیٹی جیسا ہے اور آپ میرے لیے بالکل ماں جیسی ہیں۔“ (پیاری شگفتہ تم میری بیٹی ہی تو ہو..... اور یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا کہ محبت بھی یک طرفہ نہیں ہوا کرتی۔ اللہ تعالیٰ تم کو ہمیشہ خوش و خرم و صحت مند و توانار رکھے، دو دھو نہاؤ اور پلوں پہلواؤ آئیں، تم آئیں)

بھہ مسرت رانی حلیل، کراچی سے۔“ حسب عادت سب سے پہلے بہنوں کی محفل پڑھی اس کو پڑھ کر آگاہی رہتی ہے سدرۃ اچھی کا خط پڑھ کر بہت مزہ آیا مگر ان کے خط میں ایک بات عجیب سی لگی اس لیے اگر وہ برائے مائیں تو کہنا چاہوں گی..... کہ خواتین مزاروں پر جا کر نہیں بیٹھا کرتی ہیں..... اس ماہ تحریروں کا گلدستہ خوش رنگ بھی تھا اور مسرور کن بھی۔ آپ کا افسانہ حقیقت کا عکاس تھا کہ جہاں بہت زیادہ تحریف کی جاتی ہے وہیں کچھ نہ کچھ ضرور ہوتا ہے۔ ام مرتیم نے خالص بولڈ موضوع پر قلم اٹھایا..... مگر اس تحریر کو پڑھ کر لڑکیوں کو یہ سبق ضرور ملے گا..... کہ بے بہار بولنے والیوں کو کتنے نقصان اٹھانے پڑتے ہیں۔“ (تمہارے کا شکریہ)

بھہ فرحانہ عجم، حیدر آباد سے۔“ بہت مدقوں کے بعد آپ سے رابطہ کیا ہے۔ ناول چاندنی کی وجہ سے پاکیزہ سے ناتا جوڑا تھا جو آج تک قائم ہے۔ ناہید سلطانہ اختر اور عمیرہ احمد بہترین ناول نگار ہیں۔ دونوں کے ناول شاندار ہیں۔ اس ماہ بہترین ناول ام مرتیم کا رہا..... اور افسانہ آپ کا پڑھ کر بہت مزہ آیا۔ میونہ خورشیدی کی تحریر بھی پسند آئی۔ مجھے افسوس ہے کہ مکمل ناول کوئی مٹا نہیں رکھا۔ بہنوں کی محفل میں ہماری کہیں تحریریں چھان کر تبصرہ کرتی ہیں۔ اس لیے مزہ بہت آتا ہے۔ سدرۃ اچھی کا خط پڑھ کر میں بہت دیر تک ہنسی رہی نوے سال کی خواتین کی تو یادداشت جواب دے جاتی ہے۔ ذائقہ ختم ہو جاتا ہے اور سدرہ انہیں محسوئے پھر نے، شائینگ کرنے کا مشورہ دے رہی ہیں۔“ (گڑیا اللہ کے فضل و کرم سے لکھنے والوں کی یادداشت بھی بہت اچھی ہوتی ہے اور ذائقہ بھی قائم رہتا ہے۔ اس لیے ان کے لیے یہ مشورہ کافی اچھا ہے اور مناسب بھی)

بھہ سمیرا امجد، صادق آباد سے۔“ میں انشاء اللہ دسمبر میں کراچی آؤں گی۔ تو آپ سے آکر ضرور ملوں گی۔ نومبر کا پاکیزہ بہت بہت اچھا لگا..... یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ آپ نے اس ماہ لٹری عروج کے بارے میں مزید تحریریں شائع کی ہیں۔ تصویریں بھی اچھی لگیں۔ آپ کا افسانہ پڑھ کر بہت اچھا لگا۔“ (نوازش)

بھہ عمارہ، امریکا سے۔“ انجم باجی پاکیزہ کی خاموش قاری ہوں۔ عرصہ دراز سے پڑھ رہی ہوں آپ کی تحریروں کی خاص طور پر فین ہوں۔ نیو فریبائی کی تحریروں میں بھی بہت اچھی لگی تھیں۔ ایک مرتبہ ایک تقریب میں ان کو دیکھا تھا تو دل چاہا تھا کہ بھاگ کر ان کے پاس جاؤں اور گلے لگ جاؤں۔“ (تمہیں ان کے پاس ضرور جانا چاہیے تھا۔ نیو فریب سے حد بے حد اچھی عادات کی مالک ہیں اور ان سے مل کر اور باتیں کر کے مجھے تو ہمیشہ بہت خوش ہوتی ہے..... اور جب بھی پاکستان آؤ تو رابطہ کرنا)

بھہ صبا نور، لیٹ سے۔“ باجی آپ نے اپنا افسانہ دے کر میرا دل خوش کر دیا ہے۔ نومبر کے پاکیزہ کی کیا تعریف کروں ہر تحریر ایک سے بڑھ کر ایک ہے۔ ناہید سلطانہ اختر کا ناول ٹاپ پر رہا۔“ (شکریہ)

بھہ ارم احتشام، ملتان سے۔“ میں کوئٹہ سے اب ملتان آئی ہوں۔ نومبر کا ناول بہت خوب صورت ہے، اکتوبر کے مقابلے میں زیادہ اچھا ہے۔ ناہید سلطانہ اختر، میونہ خورشیدی کی تحریروں میں خصوصی طور پر پسند آئیں۔ لٹری عروج کے بارے میں تحریروں میں پڑھ کر اچھا لگا۔ پاکیزہ اپنی مصنفات کو نہ صرف ان کی زندگی میں بلکہ ان کے مرنے کے بعد بھی یاد رکھتا ہے۔ آپ کا لی وی سوچ چاندنی ختم ہو گیا ہے۔ آپ نے ہر خوشی کے موقع پر اپنے کرداروں سے شکرانے کے نفل پڑھنے کا تذکرہ کیا۔ انجم آپا اللہ آپ کو اس کی جزا دے۔“ (پسندیدگی کا شکریہ)

✉ نہنہ منظور علی خان، کراچی۔ آپ نے اپنے خط میں لکھا ہے کہ آپ کو عمیرہ احمد اور نرہ احمد سے ملنے کا جنون ہے اور ان کی ہر تحریر بہت پسند ہے اور آپ نے ان کی تحریروں سے بہت کچھ سیکھا ہے اور لوگوں کو پڑھنے کا سلیقہ آیا ہے۔ زینب بیٹا آپ کا پیغام اپنی ماہ نامز مصنفات تک پہنچایا جا رہا ہے اور عمیرہ احمد سے آپ کی ملاقات انشاء اللہ ضرور ضرور ہوگی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ عمیرہ احمد کب کراچی آتی ہیں۔

بھہ بیٹا عالیہ لوانہ، لاہور سے۔“ بہت مدت کے بعد آپ سے رابطہ کر رہی ہوں۔ لٹری عروج کے لیے آپ کو کچھ بھی لکھا تھا مگر شاید آپ کو نہیں ملا۔ پاکیزہ اور آپ کی محبت اتنی ہے کہ خط نہ لکھوں مگر اس کو پڑھ کر بغیر نہیں رہتی کہ بہنوں کی محفل کا مزہ علیحدہ اور انوکھا ہی لگتا ہے۔ چنانچہ آپ کو میں یاد ہوں بھی انہیں۔“ (پیاری بیٹا عالیہ لوانہ، تم مجھے بالکل یاد ہوا اور پہلے کی طرح اس محفل میں حاضری دو..... مجھے تمہارے آنے سے خوشی ہوگی)

بھہ نگہت خان، اسلام آباد سے۔“ گزشتہ بائیس سال سے پاکیزہ کی قاری بعد میں بنی ہوں آپ کی فین پہلے سے ہوں کہ آپ کی تحریروں سے شروع سے آشنا تھی۔ انجم آپ سے ملنے کی بڑی خواہش ہے۔“ (پیاری نگہت اس محفل میں خوش آمدید، میں کوئی ایسی توپ نہیں چھین ہوں جس سے ملنا کوئی مشکل کام ہو، جب کراچی آئیں، میرے غریب خانے پر آپ شریف لے آئیں، فروری یا مارچ میں..... میرا اسلام آباد جانے کا پروگرام انشاء اللہ ہوگا..... تب بھی آپ سے ملاقات ہو سکتی ہے۔ آپ پشاور کی مصنفات سے دوستی کی خواہش مند ہیں تو فریدہ اختر اور نسیم فضل خالق آپ کی بہترین دوست ثابت ہوں گی)

بھہ شہناز نسیم، کراچی۔ میں نے خط میں لکھے ہوئے آپ کے موبائل نمبر پر فون کیا تھا مگر آپ کا فون بند تھا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو کچھ محنت عطا فرمائے آئیں۔ ہاں آپ کے افسانے قابل اشاعت ہیں۔

بھہ سمیرا حمید فاروق، کراچی سے۔“ ادارہ بہت ہی اچھا ہے زندگی ناول بہت اچھا ہے مگر اس میں صرف تنہم کی کہانی چل رہی ہے وہ اپنے بیٹے کی کہانی بھی چلائیں۔ ذکی فیصل کا مکمل ناول خلاصہ لگ رہا ہے مگر اچھا ہے۔ عطیہ عمر..... کی تحریر تو ہمیشہ ہی اچھی لگتی ہے آپ کا افسانہ عام ڈگر سے ہٹ کر تھا اور اچھا لکھا ہے۔ میونہ خورشیدی نے اچھا لکھا۔ نادیہ جہانگیر نے بہت اچھا لکھا ہے اور حسب حال ہے ان کو میری مبارک باد پہنچادیں۔ ام مرتیم نے مٹا نہیں کیا اور آخر میں بات طلیغ کی تو وہ بہت ہی اچھا لگا۔“ (تمہارے کا شکریہ)

بھہ صائمہ ظفر، کراچی سے۔“ انجم باجی آپ سے ملنے کا بہت شوق تھا اور ہاں شاد بادی سالانہ تقریب میں آپ سے ملاقات ہو گئی۔ پاکیزہ ہماری پوری فیملی کا پسندیدہ میگزین ہے۔ جلتنگ اور عکس ہمارے پسندیدہ سلسلے ہیں۔ ہماری مبارک باد تمام مصنفات خاص طور پر ناہید سلطانہ اختر تک ضرور پہنچادیں۔“ (جی ضرور..... آپ کے ہمراہ مسز آصف جو ناہید سلطانہ کی فین تھیں..... ان کی بھی مبارک باد پہنچانی جارہی ہے..... کہ انہوں نے ناہید سلطانہ جیسی قابل اور نفیس شہسوار بھی نہیں دیکھی)

بھہ اقیقہ انا، پشاور سے۔“ سادہ سادہ ورق دل کو بھایا۔ انجم آپ! مجھے آپ کا بہنوں کی محفل میں درود شریف اور آیت کریمہ پڑھ کر آواز کرنا بہت پسند آتا ہے اور عمیرہ احمد کا عکس میں سب سے پہلے پڑھتی ہوں۔ ہر خط پہلے سے بڑھ کر سنی خیر

ہوتی ہے۔ شیردل کے ساتھ بہت مڑا ہوا پر شاید قسمت اسی کو کہتے ہیں لیکن عکس کا کردار یقیناً عمیرہ احمد نے بہت محنت سے لکھا ہے اور مجھے بہت پسند بھی ہے۔ اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے۔ زندگی کے رنگ واضح کرنا ناہید سلطانہ کا ناول خوب چارہ ہے۔ مونس اور غازیہ کے بارے میں پڑھ کر تو دل نے سرگوشی کی کہ مونس ضرور کسی بڑی انجمن کا شکار ہوگا۔ آگے جو بھی ہماری مصنفہ کو منظور۔ قیصرہ حیات کا ناول ہم بڑی دلچسپی سے پڑھ رہے ہیں۔ کوئی شہر ایسا خوب صورت عنوان لیے نگہت سیما کا خوب صورت ناول اپنے اختتام کو پہنچا۔ غزالہ عزیز کا مکمل ناول بھی بہت بھایا۔“ (تبصرے کا شکر ہے)

بھہ شازیر باب، ہند پور کا مونس ہے۔“ آئی میری ایک دوست زاہدہ نول نے ایک بار آپ سے رابطہ کیا اور میرے متعلق پوچھا تھا۔ میں نے سوچا کہ خط لکھوں۔ اب اللہ کرے کہ یہ خط آپ تک پہنچ جائے اور شائع بھی ہو جائے۔ اب بات کرتے ہیں پاکیزہ کی۔ عکس میرا بے حد پسندیدہ ناول ہے اور عمیرہ احمد کو پاکیزہ میں دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی تھی۔ زندگی، ناہید سلطانہ اختر کی کاوش بھی بہت اچھی جا رہی ہے۔ ایک بات اور آپ عمیرہ احمد کا انٹرویو جلد دے دیں۔ عکس میں عمیرہ احمد جو ناول شروع ہونے پر سب سے پہلے جو مستقبل کی ایک جھلک دکھاتی ہیں اسے پڑھ کر ہم ریلیکس ہو جاتے ہیں کہ انجام اچھا ہے اور عمیرہ کی طرح عکس کا کردار ہمارا بھی پسندیدہ ہے۔ قیصرہ حیات کا ناول دیکھ کر خوشی ہوئی۔ عام موضوعات سے ہٹ کر ہے۔“ (تبصرے کا شکر ہے)

بھہ ایشل شادیان پر گولارچی ہے۔“ بہنوں سے التماس ہے کہ وہ دین کا زیادہ سے زیادہ مطالعہ کریں کیونکہ بہت سی بہنیں بہت عجیب عجیب باتیں لکھتی ہیں جو کسی بھی احادیث میں نہیں ہیں۔ ڈاکٹر کوئل آپ کہاں ہیں میں آپ کی ہی اور کبھی کبھی کو بہت مس کر رہی ہوں، آجائیں۔ آئی میری دوست شادی کی حوصلہ افزائی ضرور کیجیے گا۔“ (جی ضرور)

بھہ سامعہ نسیم، ملتان سے۔“ تمام سلسلے ہمیشہ کی طرح اے ون..... سلسلے وار ناول بے حد عمدہ ہیں۔ بہنوں کے خط پڑھ کر بے حد خوشی ہوتی ہے۔ باجی فیضہ آصف خان سے کہنا ہے کہ رب اللہ تدرنی فردا وانت خیرا وار شین۔ بہت زیادہ پڑھا کریں کیونکہ اللہ کے ہاں دیر ہے اندر نہیں۔ انشاء اللہ تعالیٰ ان کی دلی مراد ضرور پوری ہوگی۔ چھوٹے بچوں کا بہت خیال رکھا کریں۔“ (آپ کی رائے پہنچانی جا رہی ہے)

بھہ ارم کمال، فیصل آباد سے۔“ اس دفعہ پاکیزہ کا شمارہ یعنی عروج کی یادوں پر مشتمل تھا۔ ان کی یادوں کی یہ کک ہمارے دلوں میں ان کو ہمیشہ زندہ رکھے گی۔ سرورق کی ماڈل نہایت پروقار لگ رہی تھی۔ سب سے پہلے عکس پڑھا، پڑھ کر بے اختیار منہ سے نکلا زبردست، لا جواب، شاندار۔ یعنی عروج کا افسانہ دہن بنتی ہیں ہمارے معاشرے کی ایک نہایت سفاک حقیقت تھی۔ بیٹیوں کے رشتے کرتے وقت بہت سوچ بچار کرنی چاہیے ورنہ زندگی داؤ پر لگ جاتی ہیں۔ ناہید سلطانہ اختر کا زندگی دلچسپ و مفید تھا کہ کو اجاگر کر رہا ہے۔ عام طور پر اتنی ہمت کا مظاہرہ بہت کم لوگ کرتے ہیں۔ غزالہ عزیز کا ناول بہت زبردست تھا لیکن اینڈ نے رد لایا۔ شائستہ زریں کا سروے بہت ہی دلچسپ اور زبردست تھا واقعی آج کل ماؤں کی بے جا مداخلت بیٹیوں کا گھر اجاڑ دیتی ہے۔ میری نانی اماں مرحوم کہا کرتی تھیں کہ بیانی بیٹی پڑوسن برابر۔ بہنوں کی محفل میں جہاں اپنا خط پا کر اور دوسری بہنوں سے مل کر دل میں خوشیاں جھلٹانے لگیں وہ ہیں پرفراز نہ سہیل کی وفات کا پڑھ کر دل کے اندر کے بادل تیرنے لگے۔ مستقل سلسلوں میں جلتے ہمیشہ کی طرح اے ون رہا۔“ (شکر ہے)

بھہ مس امین عندلیب، سلا نوالی سے۔“ سب سے پہلے بہنوں کی محفل میں گئی تو دیکھا میری محترم فوٹو رائٹر، ناول نگار رضیہ بٹ انتقال کر گئیں۔ اللہ تعالیٰ رضیہ بٹ کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، آمین۔ رضیہ بٹ کے ناول میں کان لائف سے پڑھتی آئی ہوں۔ افسانہ و تنقید دونوں میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، آمین۔ زندگی، عکس، زندگی، کہیں دیپ جلتے ہیں دل کیا کہنے تعریف کے لیے الفاظ کم پڑتے ہیں۔ باجی ناہید سلطانہ اختر ہمیشہ لڑکیوں کے مسائل پر قلم اٹھاتی ہیں۔ یہ صرف لفظ نہیں حقیقت پر مبنی کہانی ہوتی ہے۔ عذرا نول، ڈی جی خان کا خط پڑھ کر بہت ہی دل دکھ ہوا۔ اللہ تعالیٰ ان کی مشکلیں آسان کرے۔ باجی میری آپا مسز جیل صدیقی، ڈی جی خان۔ ان کے گھر سیلاب کی نذر ہو گئے۔ بہت مائی نقصان ہوا ہے۔ آپا کئی بٹے اتار دیں گی انہیں بہت حوصلہ دیا۔ اب کچھ ان کی ذہنی حالت سنبھلی ہے۔ 12 اکتوبر کو ان کے بیٹے محمد عدیل صدیقی کی شادی تھی۔ میری بیٹی کے ساتھ یوں دونوں گھر انے خاموش، انگار شادی ملتی کر دی گئی۔ ہر کام میں اللہ کی مصلحت ہوتی ہے۔ ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی کو اللہ تعالیٰ شفا کے کاملہ عطا فرمائے۔ بھائی جان معراج رسول کے لیے ہمیشہ خصوصی دعا کرتی ہوں۔

پاکیزہ کی پرانی بہنیں، رائٹر زکھا غائب ہیں حاضر ہو جائیں۔“ (تبصرے کا شکر ہے، آپ کی رائے پہنچانی جا رہی ہے) بھہ فیضہ آصف خان، ملتان سے۔“ ماہ نومبر کا شمارہ دلکش سرورق کے ساتھ جلوہ افروز ہوا۔ آپ کی پڑا ہا تین ہمیشہ کی طرح نیکو سے باندھ کر عمل پیرا ہونے کی کوشش کی ہے۔ بعسرت افروز اور ایمان تازہ کر دینے والے اسلامیات کے مضامین دل میں اتر گئے۔ عکس کی آخری قسط میں ہر چیز واضح ہوئی چاہیے خاص طور پر بیٹوں کا حوالہ۔ زندگی کی سطر سطر افروزہ کر رہی ہے۔ تنہم کے حالات پر دل گڑھتا ہے۔ ناہید جی جس بار یک مینی سے ان معاملات کی وضاحت کر رہی ہیں وہ ہم سب کے علم میں ہونا بہت ضروری ہے۔ قیصرہ حیات کا ناول اچھا ہے پر نہیں نہیں بچکانہ پن کا احساس ہونے لگتا ہے۔ حسین اختر کی عید قرباں اشک بارگشتی۔ ناہید جی کہانی کی قیامت ہی قیامت حالات حاضرہ کی کیج عکس کی۔ واہ جی واہ کیا خبر یہ آخر کبھی آپ نے۔ ردول بے دستک ایسے ہی ہمارے دل پر شکنہ میٹھی پیار بھری دستک گاہے گاہے دیتی رہا کریں۔ نصیبان کھول دے میرا بہت پڑا ہر تحریر بھی۔ عاجزہ سرور اور رضیہ بٹ (رضیہ بٹ میری والدہ کی دور کی کزن کبھی لکھی تھیں) کی وفات نے ادب میں جو خلا پیدا کیا ہے اس کا پڑھنا ناممکن ہے کیونکہ ہر انسان اپنی جگہ بس ایک ہی ہوتا ہے۔ نگہت سیما صاحبہ سے پچھلے دنوں فون پر بات ہوئی بہت اچھا لگا۔ عذرا نول نے سیلابی صورت حال سے جس طرح آگاہ کیا ہے سو فیصد سچ ہے کیونکہ پورا شہر ہی پانی پانی تھا۔ میری دونوں بہنیں بھی ہجرت کر گئی تھیں۔ چار چار فٹ پانی گھر میں آ گیا تھا نقصان بھی کافی ہوا۔“ (عذرا نول کی مائی مدد کے لیے ہم سے ایک بہن نے رابطہ کیا ہے۔ عذرا نول فوراً رابطہ کریں۔ اپنے مکمل ایڈریس کے ساتھ۔ ان کی والدہ کا شناختی کارڈ مجھے مل گیا ہے مگر اس پر مکمل ایڈریس درج نہیں ہے)

بھہ بشری باجوہ، اوکاڑہ سے۔“ اکتوبر کا شمارہ ملا فرائز نہ سہیل کی وفات کی خبر پڑھ کر بے حد شاک لگا۔ ان کی وفات کا پڑھ کر آنسوؤں پر قابو نہ رہا مینی بھی رو دیں۔ جب امی نے ان کے میاں کو بتایا تھا کہ ہم پاکیزہ کے حوالے سے ان کو جانتے ہیں اس لیے ملنے آئے ہیں تو وہ مسکرا دیے تھے یعنی کے بعد فرائز نہ آئی اور بینا حسن کی جواں سالہ بیٹی کا پڑھ کر بے حد افسوس ہوا۔ صائمہ قیصر کی والدہ کی وفات کا پڑھ کر دھک دھک ہوا۔ اللہ سے دعا ہے کہ وہ مرحومین کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور ان کے اہل خانہ کو صبر دے، آمین عکس پڑھا شہر دل اور عکس مل گئے ہیں دل کو اطمینان ہو گیا۔ زندگی میں رائٹر نے طلاق کے بعد عورت کا شوہر کے گھر عدت پوری کرنے کا جس خوب صورتی سے ذکر کیا ہے اس کی تعریف کے لیے الفاظ نہیں میرے پاس۔ باقی کچھ بھی نہیں پڑھا پلینڈو خضر و شائع کر دیں اور میرے مراسلات بھی لگا دیا کریں۔“ (میں لگتی رہتی ہوں)

✉ حدیقہ صاحبہ، لاہور سے۔ رسالے کی پسندیدگی کا اظہار کیا ہے اور کہتی ہیں کہ نئے آنے والوں کو کتنی پذیرائی ملتی ہے میں بھی کہانیاں لکھنا چاہتی ہوں۔ میری رہنمائی کر دیجیے۔ گڑیا! اس محفل میں خوش آمدید۔ ہماری محفل میں شامل ہونے والی ہر بہن ہمارے لیے اہم ترین ہے۔ کہانیاں لکھنے سے پہلے آپ ہماری شائع شدہ کہانیوں کو بغور پڑھیں اس کے بعد ہمیں لکھ کر ضرور بھیجیں آپ کی حوصلہ افزائی کر کے بے حد خوشی ہوگی۔

بھہ غزالہ طارق، سرگودھا سے۔“ پاکیزہ سے رشتہ جوڑے ایک زمانہ گزر گیا اب آج کی رائٹر کی تحریروں کو پڑھ کر اپنی پرانی مصنفات کی کہانیاں یاد آتی ہیں۔ سندھیوں کا سلسلہ مزید دلچسپ ہونا چاہیے۔ خوش ذائقہ میں تھوڑی بہت معلومات یا نوے کچھ شامل کر دیں۔ اس کے علاوہ آپ کے رسالے کی کہانیاں، ناول اور دیگر سلسلے سب اچھے ہوتے ہیں۔ ادارے میں آپ کی صفحہ امیر مکتگو اچھی لگتی ہے۔ ہماری دعا میں آپ کے ادارے کے ساتھ ہیں۔ ہاں پچھلے کسی شمارے میں آمنہ خان اور محبت مرزا کا انٹرویو تھا اب اس جوڑے کا انٹرویو آئے گا اگر ممکن تصاویر ہوں تو مزہ آجائے۔ اچھا میرا تبصرہ ضرور شامل کیجیے گا۔“ (بہت عرصے بعد آئی ہو۔ انٹرویو لکھتے رہتے ہیں آئندہ بھی لگیں گے مگر آپ کی شرکت لازمی ہونی چاہیے اور اس ماہ کے افسانے کیا آپ کو پسند نہیں آئے؟)

بھہ سائرہ عباس، بکراچی سے۔“ میری تہنہ صاحبہ نے میری شادی کا احوال لکھا تھا اور وہ آپ کے رسالے میں شائع بھی ہوا مگر تصویریں نہیں آئی تھیں کیا اب میں کسی موقع پر اپنی شادی والی تصویر دے سکتی ہوں یا نہ میں نے بھی باقاعدگی سے نہیں پڑھا اب پڑھنا شروع کیا ہے۔ مجھے بھی لکھنے کا شوق ہے اس کے علاوہ اگر لطیفہ بھیجوں تو لگا دیں گی۔ مجھے جلتے پڑھ کر مزہ آیا اور میرا خط ضرور لگائے گا۔“ (گڑیا، اپنی تصویر اپنے پیچھے انٹرویو کے ساتھ مجھے بھیج دیجیے میں ضرور لگاؤں گی۔ ہاں لطیفے اچھے اور نئے ہوں تو فوراً بھیج دیں) بھہ نگہت زیدی، بہارہ کبوسے۔“ ماہنامہ پاکیزہ سے میں کافی عرصے سے واقف ہوں۔ میری ساس مرحومہ بہت باقاعدگی سے پڑھتی تھیں اور ہم لوگوں کو اس میں سے سبق آموز باتیں بتاتی تھیں بلکہ ان کے بیٹے انہیں چھیڑتے تھے کہ امی کتنے

شوق اور دلچسپی سے پڑھتی ہیں۔ میں کبھی بکھار پڑھتی ہوں مگر اس میں شامل فنکاروں کے انٹرویوز ضرور پڑھتی ہوں۔ اس کے علاوہ بیوٹی کے مشورے پڑھتی بھی مگر اب آپ نے وہ سلسلہ کیوں بند کر دیا۔ (ہم نے بند نہیں کیا ہے وقتاً فوقتاً بیوٹی کاغذ قسم کی تحریریں لکھتی رہتی ہیں۔ محترمہ عذرا رسول کی ڈائری کے صفحات میں بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی جو آپ آئندہ بھی پڑھیں گی) میرے اسکول کی سمجھ بوجھ دیکھ کر دیکھ کر پائیز بھی پڑھتی ہوں۔ عتیقہ عمر، عتیقہ احمد، صائبہ اکرم اور فرحانہ ناز ملک کی کہانیاں اچھی لگتی ہیں۔ نمبر کے شمارے میں میمنہ خورشید نے آج کی معاشرتی کہانی لکھی ویسے وہیں نمبر کی کہانیاں دلچسپ اور سبق آموز تھیں۔ عتیقہ نے پھانس میں حقیقت بیان کی ہے“ (شکریہ)

بھو آتم ایمان، کوٹ چٹھہ سے۔ ”سب سے پہلے اپنے پسندیدہ ناول عکس کو پڑھا ہاں جہاں ایک طرف شیر دل اور عکس کے مل جانے کی خوشی ہوئی وہاں شہر بانو پر بھی انفسوس ہوا کہ وہ اب اپنی بقیہ ساری زندگی اپنی جلد بازی اور غلطی پر پچھتاتے ہوئے گزارے گی۔ زندگی میں طلاق اور عدت کے مسائل کو شروع اور دین کے حوالے سے بہت خوب صورتی سے اجاگر کیا گیا ہے۔ انہوں نے قرآن وحدیث کا مطالعہ تفصیل سے کیا ہو۔ میمنہ خورشید کا نصاباں کھول دے میرا بہت اچھا لگا خواب حقیقت اور مراب میں ان لوگوں کے لیے یقیناً سبق موجود ہے جو غیر ملک میں رہنے والوں کو کوئی آسانی مخلوق خیال کرتے ہیں، آیا آپ کا فسانہ بہت پسند آیا۔ پھانس بھی اچھا لگا۔ نادیہ جہانگیر کا قیامت سی قیامت اچھا تھا کہ انسان کو دوسروں کی مشکلات کا صحیح اندازہ بھوتا ہے جب اس کے اپنے اوپر گزرتی ہے۔“ (یہ تو ہے)

بھو نسیم منیر علوی، دہلی سے۔ ”انجم کے ادارے نے تمام مسلمانوں کو یکسو بننے پر ضرور مجبور کیا ہوگا۔ کاش ہم سب اس پر عمل پیرا بھی ہو سکیں۔ ہم نے عید کے موقع پر فون پر کی بار بار بات کرنے کی کوشش کی مگر سلسلہ بار بار ٹوٹتا بکھرتا رہا۔ نمبر کا ادراک اپنی نگاہوں کو دلچسپیوں سے مالا مال ہے۔ شکر ہے یہ عید پر باں نمبر نہ تھا کسی موقع مناسب سے ایک آدھ تحریر کا لگانا تو اچھا لگتا ہے لکرسا اشارہ ہی اسی کی نذر ہو جائے میرا ایسا ماننا بہت بچکانہ سا لگتا ہے۔ میرا خیال ہے اختلاف سب کا حق ہے۔ بہر حال عکس اپنی منزل پہ جا پہنچا۔ عتیقہ احمد کا طرز نگارش۔۔۔ اور چھوٹی چھوٹی جزئیات کی ہم آہنگی ان ناول کی جان تھا۔ ان سب نے مل کر ناول کو دو اتھ بنا دیا۔ اب ناول کے اختتام پر ایک بھر پور تعارف (انٹرویو) ہونا چاہیے۔ افسانوں میں عتیقہ عراپے خاص انداز میں نظر آئیں اور قوم کو قربانی کے مفہوم سے آگاہ کیا۔ ناہید کا ناول زندگی سے بھر پور ہے۔ قاری ٹھوڑی دیر تک اسی ماحول میں بچکتا ہے اور ہاں غزالہ رشید سارہ کی گڑیا کے ساتھ تمہاری وابستگی اچھی لگی۔ حالات کی تم گری کا ایک پرورد نقشہ کھینچا ویسے بھی ساری اچانک غیر حاضری پر ہم بہت پریشان تھے رابطے کی لاکھ کوشش کے بعد بھی ناکام رہے۔ اپنا رابطہ نمبر اگر ہو سکے تو ہمیں دور (پلیز انجم آپ ہمارا یہ کام کر دیں منایت ہوگی) کیونکہ کچھ اپنی کہیے کچھ میری سنیں۔ یوں چپ تو نہ رہیے۔ دستک دہر پر ایک خوب صورت موسم میں اک دل نہیں کہانی تھی۔ افسانہ خوب ہی جمنا۔۔۔ اب کے ذرا ہٹ کر لکھا۔ مگر کیا اچھا لکھا۔۔۔ یہ وقت ہے انجم بعض دفعہ ہم جو کچھ بکھرے ہوئے ہیں دراصل ایسا ہوتا نہیں ہے۔ نادیہ جہانگیر نے نوڈ شینگ احتجاج پر اچھا کیا۔ قرضوں سے لدا ملک اور پھر اس کو یوں لٹا اور تڑپا دیکھنا اتنا آسان نہیں ہے۔ احتجاج تو درست ہے مگر یہ احتجاج کرتے ہیں آپ اپنے مسلمان بہن، بھائیوں اور ان کی املاک کو نقصان نہیں پہنچانا چاہیے)

بھو سدرہ کلثوم، مکی مروت سے۔ ”انجم انصاف آئی بہت ساری جھڑپوں اور حوصلوں کو یکساں کیا اور ہندی ناچنے نے آپ کی دست میں حاضر ہونے کی جرات کی۔ امید کرتی ہوں آپ اس جرات کو قبول و منظور فرمائیں گی۔ زندگی میں بہت کچھ پڑھا پڑھا اس کو زندگی کا سرمایہ جان کر عمل کیا۔ نہیں معلوم پائیزہ سے رشتہ کب جڑا کیونکہ بہت عرصے تک اردو ہمارے لیے ہی نہیں تھا۔ جب پڑی تو خود کو اردو کے عشق میں مبتلا پایا۔ شعور کی آگہی ہوتی رہی جب ہم بھکاری کی طرف گامزن ہوئے تو خود کو یوں میں کم پایا۔ تمام کی تمام لکھنے والیوں کے لیے صرف اتنا کہوں گی کہ یہ روشن ستارے ہیں اور ستارے کبھی ماند پڑتے۔ آسمان کی تمام خوب صورتی ان درخشاں ستاروں کی وجہ سے ہے۔ ہمارے پرچوں کی خوب صورتی کو یہی ستارے جان دلتے ہیں۔“ (پیارے سدرہ خط کے ساتھ تمہارا انٹرویو بھی ہے۔ جو میں جلد پائیزہ میں لگاؤں گی۔ ہاں ہر ماہ پتھرے ساتھ شرکت کرو مجھے خوشی ہوگی)

بھو فریدہ فری یوسف زئی، لاہور سے۔ ”نمبر کا پائیزہ ملا ٹائل اچھا لگا۔۔۔ اس میں نہ میرا تبصرہ تھا نہ ہی کوئی نظم یا

غزل اور سندھیے میں بھی کچھ نہیں تھا یا تو میرا ایلیٹ ہو گیا یا کوئی اور بات۔۔۔ کیونکہ پائیزہ میں میری کوئی نہ کوئی تحریر ضرور ہوتی ہے اور میں اس میں رہتا جا رہی ہوں یہ میگزین مجھے جی جان سے پسند ہے۔ اس مرتبہ تمام افسانے اور ناول بے حد اچھے لگے مگر اُتریم نے تو کمال کر دیا میں ٹھوڑی سی پریشان ہوں۔ بس اتنا ہی لکھ رہی ہوں پلیز میرا خیال رکھا کریں۔ تمام رائٹرز اور دوستوں کو بے حد سلام دعا۔“ (گڑیا کیوں پریشان ہو۔۔۔ شکرانے کے نفل روزانہ پڑھو اور درودِ ابراہیمی باقاعدگی سے پڑھو۔ انشاء اللہ تمام پریشانیاں ختم ہو جائیں گی)

بھو گیلتی آرا، کراچی سے۔ ”پائیزہ ہاتھ آیا حسب معمول وعادت سب سے پہلے فہرست میں افسانوں کی فہرست میں اپنا نام ڈھونڈا مگر تو بکچھے ہمیشہ کی طرح جواب گول۔۔۔ آگے بڑھے تو عکس کا نا ناخیر دین کے خلاف احتجاج اور اگلے ماہ آخری قسط کا جان کر قارئین کو دبیر کے پائیزہ کے لیے چین دے تب تاب کر گیا ہو گیا لیکن آگے چل کر عتیقہ عمر نے واقعی صراطِ مستقیم کی راہ تحریر کے ذریعے خوب دکھائی واقعی میں اگر ہم سمجھتے تو یہ قربانی صرف جانور کی ہی نہیں بلکہ ہماری ہے۔ خواہشات اور نفس پر قابو پانے کی بھی ہوتی ہے۔ غزالہ رشید کی سارہ کی گڑیا ایک منفرد سی تحریر واقعی میں بھی ہماری کوئی ہر دلعزیز تحریر، گیت غزل یا نظم حادثاتی طور پر حقیقت میں بدل کر ہمیں حیران کر جاتی ہے۔ حسین اختر کی عید قریاں دلوں کو اداس کر دینے والی ایک ٹوٹتی تحریر بھی۔ نادیہ جہانگیر کی قیامت سی قیامت موجودہ حالات پر لکھی گئی ایک سبق آموز تحریر بھی۔ (اگر ہماری قوم سبق لینا چاہے تو) اور اب باری گئی اپنی ہر دل عزیز انجم باجی کی تحریر دستک درد پکی ویسے تو ان کی ہر تحریر دل کو چھو لینے والی ہوتی ہے۔ پڑھ کر مزہ آ گیا۔ عتیقہ اعلیٰ کی پھانس بس سوسو رہی۔ عالمیہ کی کرم فرمائیاں ایک ہلکی چھلکی تحریر تھی بس۔۔۔ میمنہ خورشید کی نصاباں کھول دے میرا۔ اس مینے میں ج کے لیے اللہ رسول ﷺ کے در پر پہنچنے کے لیے۔۔۔ کج گن اور جاہت رکھنے والوں پر لکھی گئی ایک خوب صورت اور دل کو چھو لینے والی تحریر تھی۔ اردو ادب کے ستارے میں محمد رضیہ بیٹ، ہاجرہ مسرور۔۔۔ جن کا خلا بھی پورا نہیں ہوگا۔ مانیکرو باکیلو جسٹ ڈاکٹر نجیہ طلعت نے قربانی کے گوشت کو محفوظ کرنے کے کو خوب بتائے بہنوں کی محفل میں رضیہ بیٹ کے انتقال کا پڑھ کر دکھ ہوا۔“ (پسندیدگی کا شکریہ)

بھو پروین افضل، بہاول نگر سے۔ ”اکتوبر کے پائیزہ میں جناب اوڑھے ہوئے حینہ بہت خوب صورت لگ رہی تھی اور ساتھ میں تصویر دیکھتے دیکھتے ایک ہم سر پرگرا کہ پائیزہ کا ساتھ کا ہو گیا ہے۔ ساتھ برس کا نہیں۔۔۔ ساتھ روئے کا ہو گیا ہے۔ اگر آپ اس کی قیمت ستر روپے بھی کر دیں، ہم نے تو پھر بھی پائیزہ پڑھنا ہی ہے۔ ہمیں پائیزہ سے عشق جو ہو گیا ہے۔ افسانے اور ناول سب ہی زبردست جا رہے ہیں۔ آپ نے جو میرے خط کا جواب دیا ہے پائیزہ میں وہ خط میرے میاں جانی چ۔۔۔ پرس افضل شاہن نے بھی پڑھ لیا ہے اب میں جب بھی مرغ روٹ، دیکھی بھی، سوہن جلاؤ کلو دو وہ ایک پاؤ بادام، آدھا کلو سیب وغیرہ کی فرمائش کرتی ہوں تو وہ کہتے ہیں کہ تم اسمارت ہی اچھی ہوور نہ بیٹھیں بن جاؤ گی۔“ (تمہارے پرس نکوس ہیں کیا؟)

بھو یاسمین کنول، پیرور سے۔ ”ماڈل اور عید کا چاند اور عید مبارک کے نیلے حروف بڑا اچھا تاثر دیتا سرورق بڑا خوب صورت لگا۔ عید کا لطف دہا بالا ہو گیا کیونکہ عید سے پہلے پائیزہ ہمیں مل گیا تھا۔ ذکیہ مکمل کا مکمل ناول خواب حقیقت اور سراب بے حد اچھا لگا۔ غزالہ رشید کی تحریر سارہ کی گڑیا پسند آئی علاوہ ازیں نصاباں کھول دے میرا نے بھی متاثر کیا۔ خصوصی مضامین اچھے لگے لٹری عروج کی بابت تحریر پڑھ کر ان کی زندگی کی تفصیل مل گئی۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے، آمین۔ اس کے علاوہ اردو ادب کے ستاروں کو بڑا خوب صورت خراجِ تحسین پیش کیا گیا۔ عکس کی تعریف نہ کرنا زیادتی ہوگی۔“ (شکریہ)

بھو پائیزہ کا آئندہ شمارہ سالِ نمبر ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو خیریت وعافیت کے ساتھ نئے سال میں قدم رکھنے کی توفیق عطا فرمائے اور ہمیں آسانیاں عطا فرمائے اور ہمیں آسانیاں بانٹنے والا بنائے۔ آمین مل کر دعا مانگتے ہیں۔ یا ارحم الراحمین میرے جسم کو شفا، دل کو اپنی ذات کا یقین کامل اور آنکھوں کو نور بصیرت عطا فرماتا اور جب تک زندہ رہوں اپنے ذکر کو صحت و شام میری زبان پر جاری فرمادے اور ایسی جگہ سے مجھے رزق دے جو بلا رکاوٹ ملتا ہی رہے، آمین۔۔۔ ختم آمین۔ یا عجیب یا عجیب یا عجیب!

دعا گو
آپ کی اپنی باجی
انجم انصار



نعتِ رسول مقبول ﷺ

ان کی مہک نے دل کے غم بھلا دیے ہیں
جس راہ چل دیے ہیں کو پے بسا دیے ہیں
اک دل ہمارا کیا ہے آزار اس کا کتنا
تم نے تو چلتے پھرتے مُردے جلا دیے ہیں
ان کے شمار کوئی کیسے ہی رنج میں ہو
جب یاد آگئے ہیں سب غم بھلا دیے ہیں
ہم سے فقیر بھی اب پھیری کو اٹھتے ہوں گے
اب تو غنی کے در پر بستر جما دیے ہیں
آنے دو یا ڈبو دو اب تو تمہاری جانب
کشتی تھی یہ چھوڑی لنگر اٹھا دیے ہیں
اللہ کیا جہنم اب بھی نہ سرد ہوگا
رو رو کے مصطفیٰ نے دریا بہا دیے ہیں
ملکِ سخن کی شاہی تم کو رضا مسلم
جس سمت آگئے ہو سکتے بٹھا دیے ہیں

شاعر: احمد رضا خان
مرسلہ: ایتھہ انا، چکوال

مقامِ فخر

اگر کوئی تمہیں صرف اپنی ضرورت کے وقت یاد
کرتا ہے تو پریشان مت ہوا کرو بلکہ فخر کرو کہ اسے
اندھیروں میں روشنی کی ضرورت ہے اور وہ روشنی تم ہو۔
قول: حضرت علی کرم اللہ وجہہ
پسند: فضہ بتول، بہارہ کہو

نصائحِ سقراط

☆ جس شخص کو تیرا دل برا خیال کرے یا دشمن
جانے اس سے بچتا رہ۔

☆ تحریر ایک خاموش آواز ہے اور قلم ہاتھ کی

تصویروں کی جگہ ایکسرے لیے جائیں اور کیا خوب
ہوا اگر کھانے میں وٹامن بی اور سی کی گولیاں ہوں۔
مہمانوں کو چائے یا بوتل کی جگہ او آر ایس دیا جائے
اور دولہا کے گلے میں ہار کی جگہ اسٹیوڈیو اسکوپ لٹکایا
جائے اور مزہ تو تب آئے کہ اباجی جہیز کے نام پر بیٹی
کو اسپتال پیش کر دیں لیکن ڈاکٹر دولہا کہیں نکاح
کے بعد یہ نہ بول دے کہ ”Next“

مرسلہ: ڈاکٹر نوید عفر، لاہور

عوامی پیکیج

”ڈیر کسٹمر اب واپڈا لایا آپ کے لیے نیا
عوامی زبردست پیکیج 5555 یعنی ہر گھنٹا پانچ منٹ
لائٹ استعمال کریں اور پچپن منٹ بجلی کی شاندار
بچت کا لطف اٹھائیں وہ بھی بالکل فری..... موبائل
چارج نہ ہونے پر تینس کی بھی بچت۔ ٹی وی نہ
دیکھنے پر گناہوں سے بچت۔ بجلی جانے پر صبر کرنے
پر صابریں میں شمار۔ بجلی اچانک آنے پر اللہ کا شکر ادا
کرنے پر شارک رین میں شمار یعنی جنت میں جانے کے
بے شمار مواقع وہ بھی ہر جگہ ہر وقت۔“
مرسلہ: قمر شمس الحق، جھنگ صدر

مکان اور مکین

اتنی بڑی ان دنیاؤں میں
اپنے نام کی سختی والی ایک عمارت
کتنے دُکھوں کی اینٹیں چن کر گھر بنتی ہے
پتھر پتھر جوڑ کے دیکھو
میں نے بھی اک گھر بنایا
رنگوں، پھولوں، تصویروں سے اس کو سجایا
دروازے کی لوح پر اپنا نام لکھایا
لیکن اس کے ہر کمرے میں تم رہتے ہو

شاعر: امجد اسلام امجد
مرسلہ: سامعہ تبسم، ملتان



ہم اپنے خالق و مالک کو بھول گئے
ہم اپنی موت اور قبر کو بھول گئے
ہم اپنی آخرت کے نفع و نقصان کو بھول گئے
ہم اپنے اوپر موت کے وقت کی سختی کو بھول گئے
ہم بیل صراط پر سے گزرنے کو بھول گئے
ہم دوزخ کے عذاب و خوف کو بھول گئے
ہم قبر میں مگر تکبر کے سوالات
اور وہاں کی بے کسی کو بھول گئے
ہم قبر کی سختی اور تارکی کو بھول گئے

مرسلہ: مسز فرح امجد، لاہور

خطرناک غلطیاں

☆ ہر ایک شیریں زبان کو دوست سمجھ لینا۔
☆ خود کو سب سے زیادہ عقل مند تصور کرنا۔
☆ اس نیت سے گناہ کرنا کہ دو چار کر کے چھوڑ
دیں گے۔
☆ والدین کی خدمت نہ کرنا اور اولاد سے اس
کی توقع رکھنا۔
☆ ہمیشہ تندرست، خوب صورت اور توانا رہنے
کے خواب دیکھنا۔

☆ اپنا راز کسی کو بتا کر پوشیدہ رکھنے کی التجا کرنا۔
☆ ظاہری خوب صورتی دیکھ کر ملے قائم کر لینا۔
☆ ہر ایک سے زیادتی کے بعد خود آرام میں
رہنے کی امید کرنا۔
☆ جو کام اپنے آپ سے نہ ہو سکے وہ دوسروں
کے لیے ناممکن خیال کرنا۔

مرسلہ: ارم کمال، فیصل آباد

ڈاکٹر کی شادی

ڈاکٹر کی شادی اس طرح ہونی چاہیے کہ ڈاکٹر
ہی کی شادی نظر آئے۔ ایٹن کی جگہ پونی ٹیکس اور
مہندی کی جگہ آئیوڈیکس استعمال کی جائے۔ بارات
ایوبیٹنس میں آئے اور نکاح اسپتال میں ہو،

زبان ہے۔
☆ خوبی اور نیکی دولت سے پیدا نہیں ہوتی بلکہ
دولتِ خوبی اور نیکی سے وجود میں آتی ہے۔
☆ نیک انسان کو زندگی میں یا موت کے بعد
کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتا۔
☆ زندگی کا وقفہ نہایت قلیل ہے لیکن اگر
مصیبت ہو تو کافی طویل ہے۔
☆ بچپن میں شرم و حیا نہ جوانی میں اعتدال اور
بڑھاپے میں کفایت شعاری اور عاقبت اندیشی
ضروری ہے۔
☆ خوب صورتی چند روزہ مہمان ہے یا پھر حکومت
مرسلہ: سامعہ تبسم، ملتان

نظم

اس دل کو کتنا
سنبھالوں میں
کبھی کبھی
چل چل جاتا ہے
فرمائش کرتا ہے
بچہ بن جاتا ہے
روٹھ روٹھ جاتا ہے
اس کی
گہرائیوں میں اُتروں
گر تو
زخم زخم ہو جاؤں

شاعرہ: طلعت رانا، چیچا وطنی

ہم بھول گئے

ہم اپنی اصل اور آخری منزل کو بھول گئے



وارداتیں

نام تو ان کا صفو تھا مگر سب صفو آپا کہا کرتے تھے بیٹھ پیچھے غصہ کھلاتی تھیں بعض دل جلے انہیں ٹھگو اور چنوبھی کہا کرتے تھے (یہ اوصاف ان پر قطعی فٹ تھے) عقل مند تو وہ ہمیشہ کی ہی تھیں کہ میکے کے تمام لوگ ان سے ہر ہر معاملے میں مشورہ لینے کو دوڑا کرتے تھے۔ شادی ہوئی تو ان کے میاں ان سے زیادہ عقل مند نکلے سو وہ دوسرے کی بات تول کر سنتیں اور خود بے بھاد کی کہتیں (کہ یہ طبیعت کا انداز قاطعاً نہ تھا) مرے پر سوڑے سلیقہ مند بھی بہت تھیں۔ دانا کہتے ہیں کہ عقل مندی اور سلیقہ مندی ساتھ ساتھ نہیں (مگر ان کے ہاں رہ رہی تھیں) اس لیے سب لوگ انہیں اپنے دل میں تجسوس مہا تجسوس اور کبھی چوس کہتے مگر زبان پر جمال ہے کہ کوئی نام دھر سکیں کہ صفو آپا کا پھوڑ پنا زبان کا ہی ہے کہ زبان سے خنجر کا کام لینا بھی جانتی تھیں۔ اپنے ہاں کوئی تقریب کر تیں تو مہمانوں کی لسٹ اپنے انداز میں بنتی کہ کوئی اپنے بارے میں پہلے سے ان کے جملے سن لے تو ان کے ہاں تھوکنے کو بھی نہ آئے (کہ ان کی باتیں واقعی اتنی گری ہوئی تھیں کہ کنویں سے بھی نیچے جاتی تھیں) اب ان کے بچے کا عقیقہ تھا تو مہمانوں کی لسٹ وہ اس طرح بنارہی تھیں۔

”وصلی پھو کو ہرگز نہیں بلانا ہے، ان کا کنبہ بھی بڑا ہے نیوتے کے پیسے کم دیتی ہیں اور تقریب میں ڈریس بھی اتنا تھرڈ کلاس پہن کر آتی ہیں کہ کسی دوسرے مہمان سے متعارف کراتے ہوئے شرم آتی ہے۔ ہاں سلی پھو کی ند کو بلاوا ان کے میاں تو بیماری کی وجہ سے نہیں آئیں گے، بچے دوسرے شہر میں

ہاسل میں پڑھ رہے ہیں مگر عادت کی اچھی ہیں اگر کسی وجہ سے نہ بھی آسکیں تو نیوتے کا لافذا بھیجنا ہرگز نہیں بھولتیں۔ ہارٹ کی تکلیف کی وجہ سے بڑی ممانی بہت کم کھاتی ہیں ان کی پوری فیملی کا بلاوا دے دو مگر صرف دو ہی آتے ہیں، فائدہ ہو جائے گا۔ بڑی چچی کو ہرگز نہیں بلانا۔ ان کے نیوتے دینے کا انداز بھی تنگ تقسیم پاکستان سے پہلے کا چل رہا ہے۔ بڑی خالہ کو بلاوا آج تک سارے گھر کے لوگ نہیں آئے، محفل میں بیٹھی ان کی لڑکیاں بھی اچھی لگتی ہیں اور پیسے بھی ٹھیک ٹھاک دے کر جاتی ہیں۔ تانی کو ہرگز نہیں، ہاں ان کی اماں کو بلاو۔“

اس کے برعکس جب وہ کسی کے گھر میں منعقدہ تقریب میں جاتیں تو نہ صرف اپنے پورے بچوں کو لے کر جاتیں بلکہ جیٹھا اور دیور جو ان کے گھر کے قریب ہی رہتے تھے ان کے بچوں کو ابھی ان خود لے جاتیں (ان پر احسان الگ دھرتیں کہ مفت میں کھلا لائے، رشتے داران کے تمام شعبدوں سے واقف تھے مگر رشتے داری کے پیش نظر خاموش رہتے تھے دل میں گالیوں کا گراف بہر حال بلند ہو رہا تھا) ایسی ہی ایک تقریب کا ذکر ہے کہ مہمانوں کی زیادتی کی وجہ سے کھانا کم پڑ گیا (میزبان نے ان ہی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے کھانا کم سے کم پکوا یا تھا) صفو نے چوٹی بھر کر پیلیٹ میں بریانی کی چٹان کھڑی کی تو معلوم ہوا کہ اس میں رائیہ بھی ملا ہوا ہے چپانی ہوئی بوئیاں بھی موجود ہیں سلا د کے قتبے بھی ہیں اور زردے کے اکا دکا چاول بھی۔ اپنی پیلیٹ دیکھ کر پہلے تو وہ بھونچکی سی ہوئیں کہ ایسی کیا کوئی نئی ڈش نکلی ہے یا مریضوں کا کھانا علیحدہ پکا ہے کہ انہیں بوئیاں، ہڈیاں چھانا بھی نہ

پڑیں اس لیے پہلے سے یہ کام کر دیا گیا پھر جب بچوں کی پلیٹوں میں پہاڑ کھڑے کیے تو یہ عقدہ کھلا کہ میزبانوں نے جھوٹا کھانا چلا دیا ہے اسی وقت میز پر پلیٹیں دھریں اور لافذا دیے بنا لوٹ آئیں مگر اگلے دن فون پر باتیں بنانے کو موجود تھیں۔

”ارے جب اتنا انتظام کرنے کی ہمت نہیں تھی تو لوگوں کو کیوں بلایا کہ جھوٹا کھانا تنگ چلا دیا، شرم کی بات ہے ہم تو بارے شرم کے ہمیں خدا حافظ بھی کہہ کر نہ آئے کہ تم آنکھ نہ ملا پاؤ کی کو ابھی پر ہم نے ہوٹل سے کھانا کھایا۔“ میزبان خاتون بھی زبان چلانے میں ان سے کسی طرح کم نہ تھیں فوراً ترخ کر بولیں۔

”جب پچاس مہمان بد تمیز قسم کے آجائیں تو تقریب میں جھگ تو ہوئی جاتا ہے۔ غضب خدا کا بلاوا دو آدمیوں کا دیا اور لے کر تم پندرہ آگئیں، کھانا تو کم پڑنا ہی تھا۔“

”ارے واہ، بچے بھی کوئی گنے جاتے ہیں بس والے تک بچوں کا کر یہ نہیں لیتے تم ان کو نظر لگانے کے لیے رگنے کے لیے بیٹھ گئیں جو بے چارے تمہاری تقریب سے بھوکے چلے آئے۔ چلو تم دو آدمیوں کا ہی کھانا کھلا دیتیں مگر تم نے تو انتہائی پھوڑ پین سے جھوٹا کھانا چلا دیا، شرم آنی چاہیے تھی ایسی ریک حرکت پر مہمانوں کے ساتھ کوئی ایسا سلوک کرتا ہے جو تم نے کیا۔“ (طعنہ کوئی ایسا غلط بھی نہ تھا بات تو بد تمیزی کی تھی)

”صفو آپا کم از کم آپ تو یہ بات نہ کہیں۔ ہم نے تو سنا تھا کہ آپ کے ہاں تقریب میں ایسا ہوتا ہے بلکہ ہماری ہمت آپ ہی کی وجہ سے بندھی ورنہ ہماری ساس تو کہہ رہی تھیں کہ اگر کھانا کم پڑ گیا ہے تو پڑوس کے میرج ہال کے پیروں کو کچھ پیسے دے کر ان کے ہاں سے دھیں اغوا کروالو۔“ (کہ اکثر تقاریب میں ڈاکے پڑے ہیں)

”ارے، ہمارے ہاں کی تقریبات اے ون

خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ

سپیشل سیریس

دسمبر 2012 سال ہلال

کے آخری شمارے کی ایک جھلک

چار سمت ایک چوراہا

رشتوں کے پیواریں چنابات کے سورے گن نہیں ہوتے..... یہی ایک احساس کتنے ہی دلگداز واقعات کو جنم دے گیا آخری صفحات پر

احمد اقبال کے قلم سے ایک دلچسپ کہانی

سومنا کے مندر پر فیصلہ کن حملہ کرنے والے دلیر حکمران کی شجاعت اور سخاوت کی داستان۔

ابتدائی صفحات پر **ڈاکٹر ساجد امجد** کی راقی بی بی..... جہاں محدود ایڈ ایک ہی مضمون کھڑے تھے

کشمکش

جرائم کی دنیا میں طاقتوں کے حصول اور اختیارات کی ڈگڈی پچانے والے چند مداریوں کا دلچسپ کھیل۔ **انوار صدیقی** کے قلم کا شاہکار

مسائل

جذبات میں تامل برپا کرے تاحیات اور زندگی میں تھلک بچاتے واقعات کا استخراج۔ **ناصر ملک** کے قلم کی روانی

لوگوں کے حلال

پہاڑ اور جمل میں ملک صفدر حیات کے کارنامے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سوانح حیات، محفل شعر و سخن اور آپ کے خط

”کاشف ذہن“ مریم کے خاتون منظر امام رضا اکٹر عبدالرب بھٹی اور تنویر ریاض کی کشنی خیر کہانیاں، قلم کاریاں

سندیسے

پاکیزہ پہنیں



سنہری بات

- ☆ زندگی کو غنیمت جانو موت سے پہلے۔
- ☆ فرصت کو غنیمت جانو مشغولیت سے پہلے۔
- ☆ جوانی کو غنیمت جانو بڑھاپے سے پہلے۔
- ☆ صحت کو غنیمت جانو بیماری سے پہلے۔

مرسلہ: جیں ہاشمی، بھکر

آج کے دور کی خامیاں

☆ ہم علم تو حاصل کرتے ہیں لیکن عمل کوئی نہیں کرتا۔

☆ ہم گناہ کرتا نہیں بھولتے مگر استغفار کرتا

بھول جاتے ہیں۔

☆ ہم میت کو تو دفن کرتے ہیں مگر عبرت

نہیں پکڑتے۔

مرسلہ: جیسر ہاشمی، بھکر

ایک اچھی خبر

☆ زم زم کا کنواں 1814 فٹ تقریباً گہرا

ہے۔ 4000 سال سے نہ سوکھا ہے نہ ذائقہ بدلا

ہے۔ 8000 لیٹر ایک سیکنڈ میں موٹر پمپتی ہے وہ

بھی 24 گھنٹے اور 11 منٹ میں کنواں پھر سے بھر

جاتا ہے۔

(سبحان اللہ)

مرسلہ: انعم حنیف، بھکر

ماں

ایک ماں سات بیٹوں کی پرورش کر سکتی مگر
سات بیٹے ایک ماں کی نہیں..... ماں تجھے سلام۔

مرسلہ: ڈاکٹر مقصود صفدر وڑائچ، مقام نامعلوم

چوکیدار

ایک سکھ کے موبائل پر رات دو بجے لڑکی کا فون
آیا۔۔۔ ”آپ سو تو نہیں رہے ناں.....؟“
وہ غصے سے بولا۔ ”ضروری نہیں کہ ہر شخص
چوکیدار ہو۔“

سرپرائز

☆ نرس نے ایک شخص سے کہا۔ ”مبارک ہو
آپ کے ہاں بیٹا ہوا ہے۔“
اُس نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ ”میری بیوی کو
مت بتانا میں اسے سرپرائز دوں گا۔“

سوال

میرے وطن کی دھرتی ماں
پوچھتی ہے اپنے جانوں سے
کیوں تل نا حق کرتے ہو
کیوں ردا میں سر سے جھین ہیں
کیوں جگر ماؤں کا چھلنی کیا
کیوں بوجھ میرے سینے پہ دھرتے ہو
کیوں آچھل میرا خون سے رنگیں کیا
ندیاں لہو کی بہا میں تم نے
کھیتیاں فصلوں کی جلا میں تم نے
کیوں مال تیبوں کا کھاتے ہو
کیوں آگ جنم کی بڑھاتے ہو
کیوں کشن اجاڑے تم نے
کیوں مسجدوں کو مسار کیا
کیوں مجھے اتنا آزردیا
کیوں مجھے تم نے برباد کیا
کیوں مجھے تم نے برباد کیا؟

مرسلہ: اشیش شادیاں، گولارچی

ہوتی ہیں۔ ہر کام سلیقے اور مہارت سے ہوتا ہے۔
کھانا ہمارے ہاں بھی کم پڑ جاتا ہے مگر آپ کی طرح
پھو ہڑ پنے اور گندی سے کام نہیں لیا جاتا بریانی،
بریانی میں ملائی جاتی ہے تو رومہ تورے میں ملایا جاتا
ہے اور سلاڈ کے ٹکڑے اور چپائی ہوئی ہڈیاں ضائع
کی جاتی ہیں اس کام کے لیے دو بیروں کی ڈیوٹی
لگاتے ہیں پیسہ خرچ کرتے ہیں۔ دیدہ دلیری ہو تب
سلیقے سے کام ہوتے ہیں۔“ (ان کے لہجے میں زعم و
غضب و زن ہو گیا جیسے اب ایمانی کے گرجھی اوصاف
میں آتے ہیں)

”ارے ٹھکو آپا بے ایمان تو تم ہو ہی مگر کبھی
اعتراف بھی کر لیا کرو۔“ ان کی خلیری بہن نے
ریسور پٹنے سے پہلے اپنے دل کی بات آخر کہہ ہی
دی۔ صفو آج حیرت سے یہ سوچ رہی تھیں کہ آج تک
مجھے کسی نے ٹھکو نہیں کہا، یہ یاسمین کی زبان پر کیسے آیا جو
روانی سے اس نے ادا کیا جیسے کہ ہمیشہ سے یہی کہتی چلی
آئی ہو (بہر حال یہ قطعی دوسری بات تھی کہ ان کا دل
پہلی دفعہ زور زور سے دھڑک کر یہ اعلان کر رہا تھا کہ تم
ہی ٹھکو ہو مہمانوں کو لوٹنے کے تمام وتیرے اپنانی ہو)

کھتر

نام تو ان کا شجاعت تھا مگر خاندان کے بڑے
چھوٹے سب انہیں شجہ کے نام سے پکارا کرتے تھے
حالانکہ ان کے گھر والے انہیں شہزادے کے نام سے
پکارا کرتے تھے جو کہ اُن کے چہرے اور جسامت پر
خاصا بہتان سا محسوس ہوتا تھا۔ شجہ کے پورے
خاندان میں بڑی بھداڑتی تھی حالانکہ ان کا شمار
دولت مندوں میں ہوتا تھا۔ تعلیم کے لحاظ سے بھی
خاصی چمکتی دھکی ڈگریاں ان کے پاس تھیں۔
لڑکے ہونہار تھے، لڑکیاں حسین تھیں مگر ان تمام
لوازمات کے باوجود ہمارے خاندان والے نہ صرف
ان کا تذکرہ مسخر آمیز انداز میں کیا کرتے تھے بلکہ ان
کے گھر میں رشتہ لینے یا دینے کو اپنی توہین سمجھا کرتے

☆☆☆



جادو، اثرات اور پریشانیوں سے باہر نکلنے کے لیے

آج کل ایک وہم جو ہم سب پر طاری ہو چکا ہے وہ یہ ہے کہ کسی نے مجھ پر کچھ کر دیا ہے۔ رزق میں رکاوٹ ہو گئی ہے۔ کام میں رکاوٹ آگئی ہے۔ لڑکیوں کے رشتے کسی دشمن نے باندھ دیے ہیں۔ اچھا بھلا گھر انا اب ایک دوسرے کی شکلوں سے بیزار ہو گیا ہے۔ بہن بھائی لڑتے بہت ہیں۔ میاں ظالم ہیں، بھادر جبری ہے، ساس خراب ہے، مندریں مکار ہو گئی ہیں اور بھی بہت کچھ ایسا سمجھتا ہمارا وہم بھی ہوتا ہے اور ایسا کچھ حقیقت میں بھی ہو رہا ہے کہ آج کل لوگوں کے پاس بڑے کاموں کے کرنے کے لیے کچھ زیادہ ہی وقت ہے یا وہ دوسروں کو ذہنی اذیت پہنچا کر خوش ہوتے ہیں۔ اپنی طرف سے ان کی یہ پوری کوشش ہوتی ہے کہ دوسرے کی راہوں میں کانٹے بچھا دیں مگر وہ نہیں جانتے کہ مارنے والے سے بڑا بچانے والا ہے۔ اس لیے میں اپنے قارئین بہن بھائیوں سے کہوں گی کہ سب سے پہلے آپ نماز پڑھنے کی عادت ڈالیں۔ وہ لوگ جو بالکل نماز ہی نہیں پڑھتے وہ سب سے پہلے یہ کوشش کریں کہ ان کا کوئی دن نماز پڑھے بغیر نہ گزرے۔ مثال کے طور پر ہم نے بہت سی بہنوں کو اور خود اپنے آپ کو بھی جب نماز پڑھنے کی عادت ڈالی تھی تو یہ فیصلہ کیا تھا کہ روزانہ مغرب کی نماز لازمی پڑھنی ہے۔ اس کے بعد عصر کی نماز بھی لازمی پڑھنی شروع کی اور جب نماز پڑھ کر لطف آنے لگے تو جسم خود بے چین ہو جاتا ہے اور اس وقت تک چین نہیں ملا کرتا جب تک کہ نماز کی ادائیگی نہ ہو۔ اس لیے ہم سب کو نماز کو باقاعدگی سے ادا کرنی ہوگی کہ بہت سارے غلط کاموں سے ہمیں نماز ہی روکتی ہے۔ نماز کے ساتھ ساتھ ہمیں استغفار

☆ صبا سجاد..... دینی ہر ورق پر داستانِ غم کوئی تحریر تھی ہم کتابِ زیت کے صفحے پلٹ کر رہ گئے ☆ سائرہ عباس..... کراچی وفا کے کھیل میں نظروں سے اوجھل کر دیا تھا کیوں ذرا سی بات پہ اس دل کو بوجھل کر دیا تھا کیوں اوسورے خواب کی تعبیر مشکل تھی، بہت مشکل مگر اس خواب کو تم نے مکمل کر دیا تھا کیوں ☆ ماہ نور قیصر..... راولپنڈی ہم وہ شب زاد کہ سورج کی عنایات میں بھی اپنے بچوں کو فقط کورنگاہی دیں گے جھوٹے کچھ ایسے تھکتے ہیں گلوں کے رخسار جیسے اس بار تو پت چھڑ سے بجائی دیں گے ☆ کائنات حلیم..... میرپور خاص ضروری ہو گئی اب دل کی زینت مکین پہچانے جاتے ہیں مکاں سے ☆ فاطمہ بلال..... کینیڈا اندھیرے میں بھی مجھے جگمگا گیا ہے کوئی بس اک نگاہ سے رنگ بدن بدلنے لگا ☆ صبا کمال..... فیصل آباد اس نے بھیجا ہے مجھے اپنی محبت کا خراج جا بجا خط میں ستارے سے نظر آتے ہیں ☆ ارم کمال..... فیصل آباد جو پھول کھل اٹھے اسے ڈالی سے توڑ لو ایسا ہمارے شہر کا دستور ہو گیا ☆ پروین افضل شاہین..... بہاول نگر تم نے روتی ہوئی آنکھوں کو ہنسایا اکثر اس سے بڑھ کر بھی کوئی اور عبادت ہوگی ☆ انیقہ انا..... چکوال ضبط کا عہد بھی ہے شوق کا پیالہ بھی ہے عہد و پیالے سے گزر جانے کو جی چاہتا ہے درد اتنا ہے کہ ہر رنگ میں ہے خشر برپا اور سکوں ایسا کہ مر جانے کو جی چاہتا ہے



میں اکثر گنگناتی ہوں

صغریٰ ذبیدی

☆ غزالہ طارق..... سرگودھا

میں چل رہی ہوں آج بھی اس بے وفا کے ساتھ جیسے چراغ جلتا ہے چلتی ہوا کے ساتھ ہم بھی تو کھو چکے ہیں دل و جاں کا اعتبار تم بھی لٹا دو اپنی انا اس گدا کے ساتھ ☆ ممتاز خانم..... کراچی میں کھل کے سانس بھی لیتا نہیں چمن میں رضا کہیں گراں نہ گزرتا ہو سبز ڈالی پر ☆ نگہت رضوی..... بہارہ کو کتاب عشق روایت میں مختلف ہے مگر حوالے ایک سے ہیں سارے باب ایک سے ہیں چھڑ رہا ہے تو پھر میرے آنسوؤں پہ نہ جا یہ سچ پر ہیں الگ، زیر آب ایک سے ہیں ☆ عرشہ حمید..... کراچی یہ وصل، جبر کی توفیق میں ملا ہے سلیم یہی وہ نفع ہے جس میں زیاں نہیں رکھتے ☆ شاہین رحمن..... کوئٹہ کیا عشق کی فرصت ہو میسر کہ جہاں وقت اک دوسرے کے عیب چھپانے میں گزر جائے جس پل ہمیں منزل پہ پہنچانا ہو وہی پل ایسا نہ ہو اسباب اٹھانے میں گزر جائے

کی تسبیح صبح شام پڑھنی چاہیے بلکہ تسبیح آپ کے بیڈ کے سرہانے، آپ کی گاڑی میں، آپ کے پرس میں لازمی ہونی چاہیے۔ جاب پر جاتے ہوئے کتنا وقت سفر میں بور گزرتا ہے۔ ایسے اوقات میں ہم کتنی آسانی سے تسبیح پڑھ سکتے ہیں۔ آج آپ کو بے حد آسان تسبیح بتا رہی ہوں جنہیں پڑھ کر آپ دلی طمانیت بھی محسوس کریں گے اور جن وائس کے شر سے بھی محفوظ رہیں گے۔ یہ ہم سب کو روزانہ پڑھنا ہے۔

نجر کی نماز کے بعد 11 مرتبہ درود پاک، ایک مرتبہ منزل، 11 مرتبہ درود پاک۔ آیت الکرسی سات مرتبہ۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم (1000) مرتبہ پڑھ کر گھر میں رکھے ہوئے آئے، نمک چینی اور پانی پر دم کریں۔

ظہر کی نماز کے بعد 11 مرتبہ درود پاک یا منعم (211) مرتبہ آخر میں 11 مرتبہ درود پاک۔

مغرب کی نماز کے بعد 11 مرتبہ درود پاک، ایک مرتبہ منزل 11 مرتبہ درود پاک روزانہ چلتے پھرتے کام کرتے ہوئے، سفر کے دوران بستر پر لیٹ کر یہ تسبیح پڑھیں۔

(1) کلمہ طیبہ (لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ) (100) مرتبہ۔

(2) تیسرا کلمہ 100 مرتبہ۔

(3) استغفار اللہ 100 مرتبہ۔

(4) سبحان اللہ و بحمدہ سبحان اللہ العظیم (تسبیح ملائکہ) 100 مرتبہ۔

نوٹ: ہر جادو، بُرے اثرات اور پریشانیوں کے جال سے آپ باہر نکل آئیں گے، انشاء اللہ۔ 41 دن تک بغیر ناخن کے پڑھیں اور بعد میں اسے پڑھنا اپنے معمولات کا حصہ بنا لیجیے۔



کہ مسئلہ آپ کے چہرے کا
بالواسطہ نہیں بلکہ یہ رحم کی
خرابی کی وجہ سے ہے۔ لہذا
ہماری پہلی کوشش یہ ہوگی کہ

آپ کو ایسی ادویات تجویز کی جائیں جو آپ کی
ماہواری کو نارمل کریں اور لیکور یا ختم ہو۔ متوازن
غذا استعمال کریں، خون کی کمی کی تہ ہونے دیں، بلکی
پھلکی ورزش کیا کریں۔ پانی کے کم از کم 8 گلاس
روزانہ پیا کریں۔ پھل اور سبزیوں کا استعمال
بڑھائیں۔ ڈاکٹر ولما رشوا بے جرمنی کی مندرجہ
ذیل ادویات کا استعمال کریں۔ Pulsatilla
30 کے 5 قطرے چوتھائی گلاس پانی میں دن
میں 3 مرتبہ اور Ashoka Q کے 10 قطرے
آدھا گلاس پانی میں 3 مرتبہ استعمال کریں۔ 2 ماہ
بعد کیفیت سے مطلع کریں۔

پیٹ کے کیڑے

قاسم دین..... کراچی

تھکن ہر وقت رہتی ہے۔ آرام کرنے سے
تھکن میں زیادتی ہوتی ہے، تھکن دور نہیں
ہوتی۔ سر میں اکثر درد رہتا ہے اور پیروں کے
تلوے جلنے ہیں۔ ناک میں یعنی ناک کی نوک پر
خارش ہوتی ہے، کسی وقت بھی گلے میں کچھ اٹکنے کا
احساس ہوتا ہے۔ بھوک مناسب لگتی ہے مگر جب
تھوڑا بہت کھا لوں تو متلی ہونے لگتی ہے۔ متلی میں
اگر اُلٹی کرنے کی کوشش کروں تو تھوک تھوڑا سا
آتا ہے۔ معدے کے مقام پر اُلٹی کا زور لگانے
سے شدید قسم کا درد ہوتا ہے۔ درد کے وقت
سانس لینا بھی مشکل ہو جاتا ہے اور کچھ ہی دیر بعد
درد ختم ہو جاتا ہے۔ معدے میں کبھی کبھی ہلکا درد

چھوٹی سی ہے لیکن صحیح تجویز دوا کے لیے ہمیں کتنی
باریکیوں میں جانا پڑتا ہے۔ اس لیے آپ سے
گزارش ہے کہ اپنی کیفیات کو تفصیل سے لکھ کر
بھیجیں۔

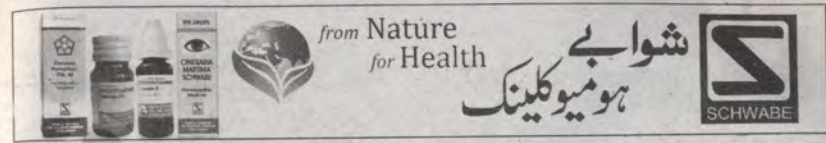
فی الحال آپ ڈاکٹر ولما رشوا بے جرمنی کی
Cala Carb 30 کے 5، 5 قطرے ایک
گھونٹ پانی میں ملا کر دن میں 3 مرتبہ استعمال
کریں۔

چہرہ نہیں رحم

شبانہ عارف..... گاؤں خاوری

سوال: السلام علیکم! میرے ساتھ جو مسئلہ
ہے وہ تقریباً سات آٹھ سال پرانا ہے۔ میرے
چہرے پر جھانیاں ہیں اور منہ کے ارد گرد دونوں
کے نشان ہیں۔ بہت کریمرز اور دوا میں استعمال
کی ہیں لیکن افادہ تو کوئی نہیں ہوا اُلٹا آنکھوں کے
نیچے سے اور گالوں کے اوپر سے بادامی داغ
نمودار ہو گئے ہیں۔ ان داغوں کو ایک سال ہوا
ہے اور آنکھوں کے گرد حلقے بھی ہیں۔ اسکن
بہت خشک ہے۔ میں ایک بات بتاتی چلوں
میرے مینز پورے 22 دن کے بعد آتے ہیں
لیکن وہ ایسے کہ دودن لیکور یا میں تھوڑی سی سرخی
شامل ہو جاتی ہے اس کے بعد تیسرے دن صبح
طریقے سے مینز آتے ہیں اور درد بھی بہت ہوتا
ہے۔ پلیرز میرے خط کا جواب ضرور دینا۔ شاید
میرا خط آپ کو اکتوبر کے شمارے کے بعد ملے
کیونکہ یہاں پر ڈاک کا بہت زیادہ مسئلہ ہے۔

جواب: شبانہ صاحبہ، آپ نے اپنی عمر اور
ازدواجی حیثیت نہیں لکھی اور وزن بھی نہیں
لکھا۔ آپ کی کیفیات سے جہاں تک ہم سمجھے ہیں



اس بات کی ضرورت کافی عرصے سے محسوس کرائی جا رہی تھی کہ کسی مستند ادارے کے تحت ماہر تجربہ کار
ہومیو پیتھک ڈاکٹروں کا پورڈ ہو جو لوگوں کی صحت کے مسائل کو اپنی ماہرانہ رائے اور تجربے کی روشنی میں
نہ صرف حل کرے بلکہ ان کی رہنمائی بھی کرے۔ لہذا اس سلسلے کے تحت ہماری کوشش ہوگی کہ ہم آپ کو
مختلف امراض کے متعلق آگاہی بھی فراہم کریں اور آپ کے جو صحت کے مسائل ہوں اس کو پورڈ کے ماہر و
تجربہ کار ڈاکٹر زکے ذریعے حل کرائیں تاکہ آپ کا معیار صحت بلند ہو لہذا آپ کے جو بھی صحت کے مسائل
ہیں انہیں ہمیں اس پتے پر لکھ بھیجیں، پوسٹ بکس نمبر 733 کراچی۔ ہم ماہنامہ پاکیزہ کے ذریعے آپ کی
بیماری کے متعلق آپ کی رہنمائی کریں گے لیکن اس کے لیے اپنا مکمل نام، عمر، پتہ اور جو کام کرتے ہیں اس
کے متعلق، ازدواجی حیثیت، بیماری کے متعلق، کب سے ہوئی، کیا علاج کیا؟ کسی قسم کی کوئی رپورٹس ہوں
تو اس کی فوٹو کاپی جو پڑھنے کے قابل ہوں ساتھ بھیجیں تاکہ صحیح تشخیص کی جاسکے اور دوا بھی صحیح تجویز ہو۔

سینے کی زیادتی

نصیر احمد..... آزاد کشمیر

سوال:- میری عمر اکیس سال ہے۔ مجھے
پسینا بہت آتا ہے۔ گرمی یا سردی میں اگر تھوڑا سا

ٹوکن

برائے شوا بے ہومیو کلینک

جنوری 2013

اپنا مسئلہ اس ٹوکن کے ساتھ روانہ کریں۔ ٹوکن کے
بغیر آئے ہوئے مسئلوں پر توجہ نہیں دی جائے گی۔ اپنا
مسئلہ جس میں بھیجیں اسی میں کا ٹوکن استعمال کریں۔

نام: _____

پتہ: _____

بھی تیز چلتا ہوں تو بھی پسینا آ جاتا ہے۔ لوگوں کو
بھی پسینا آتا ہے لیکن جو پسینا مجھے آتا ہے وہ کچھ
زیادہ ہے۔ مہربانی فرما کر مجھے حل بتائیں۔
جواب:- استاد نے شاگرد سے پوچھا تمہیں
آتا کیا ہے؟ شاگرد نے جواب دیا سر آپ کو دیکھ
کر پسینا۔ نصیر صاحب آپ نے سینے کی زیادتی
کی شکایت تو کر دی لیکن یہ نہیں بتایا کہ (۱) ایسا
کب سے ہو رہا ہے (۲) کسی بیماری یا حادثے کی
وجہ سے ایسا ہوا (۳) وزن کی زیادتی بھی اس کی
وجہ ہو سکتی ہے (۴) پسینا ٹھنڈا ہوتا ہے یا گرم (۵)
سینے میں کسی قسم کی بو آتی ہے (۶) پسینا زیادہ
کہاں آتا ہے ماتھے پر، بغلوں میں، ہاتھوں
پیروں میں یا جسم پر؟ (۷) کیا سوتے ہوئے بھی
پسینا آتا ہے (۸) شام یا رات کو بھی پسینا آتا
ہے؟
قارئین آپ نے دیکھ لیا کہ بات ایک



پہلے ہم سمجھ لیں کہ ہم کھانا کھاتے کیوں ہیں؟ کوئی کہے گا زندہ رہنے کے لیے۔ کوئی کہے گا مزے کے لیے۔ کوئی کہے گا طاقت کے لیے۔ آپ سب لوگ اپنے طور پر صحیح ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ زندگی کی بقا، جسم کی نشوونما اور ذمہ داریوں کی انجام دہی کے لیے ہمیں غذا کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہ غذا صاف ستھری، سادہ، تازہ، جراثیموں سے پاک اور متوازن ہوگی تو نہ صرف یہ ہماری زندگی کو قائم رکھے گی بلکہ جسمانی نشوونما میں بھی اپنا بھرپور کردار ادا کرے گی اور ہمیں اس قابل بنائے گی کہ ہم اپنی زندگی کی ذمہ داریوں کو احسن طور پر انجام دے سکیں۔ اس کے لیے یہ باتیں ذہن میں رکھیں۔ (۱) غذا صاف ستھری، تازہ اور سادہ ہو۔ (۲) صحت مند طور پر پکائی جائے۔ (۳) صحت مند طور پر کھائی جائے۔ (۴) متوازن ہو۔ (۵) موسم کے حساب سے غذا کا استعمال کیا جائے۔ مندرجہ ذیل باتوں کو سمجھیں تاکہ بہتر طور پر عمل کر سکیں۔

(۱) غذا جتنی صاف ستھری اور تازہ ہوگی وہ بیماریوں سے بچائے گی اور جتنی سادہ ہوگی اتنی ہی آسانی سے ہضم ہوگی اور جسم کو طاقت پہنچائے گی۔ مرغن غذا میں (قورمہ، بریانی، باری کیو، برگر، پیزا وغیرہ) مزے میں یقیناً بہت اچھی ہوتی ہیں، بار بار کھانے کو بھی جی چاہتا ہے لیکن یہ غذا میں بیماریاں پیدا کرتی ہیں۔ مثلاً تیزابیت، السر، کینسر، بد ہضمی، وزن کا بڑھنا، کولیسرول، شوگر، بلڈ پریشر، جگر اور دل

سے کم از کم یہ کیفیت نہیں ہوتی۔ اگرچہ میں آج کل تین سے چار گھنٹے سو رہا ہوں یہ میری کیفیت ہے۔ اب آپ جو مشورہ دیں اس کے مطابق عمل کر کے کلی طور پر شفا یاب ہو جاؤں۔

جواب :- بہت خوشی ہوئی کہ پہلے سے خود کو بہتر محسوس کر رہے ہیں۔ اللہ آپ کو مکمل شفا یاب کرے۔ آپ نے اپنی ذہنی کیفیت کے متعلق نہیں لکھا کہ وہ اب کیسی ہے؟ شک کی عادت کس حد تک ہے؟ دوستوں وغیرہ سے کوئی لڑائی جھگڑا تو نہیں کرتے؟ نیند کی کوئی دوا نہ کھائیں یہ ذہن پر اچھا اثر نہیں ڈالتی۔ جو ہدایات ہم نے آپ کو پہلے دی تھیں کیا آپ اس پر عمل کر رہے ہیں؟ عمل جاری رکھیں اور پچھلی دواؤں کو روک دیجئے اور ایک ہفتے کے بعد سب سے پہلے ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی **Thuja 200** کی ایک خوراک صبح اور ایک شام لیجئے پھر تیسرے دن سے دوپہر کے کھانے کے بعد ایک کپ پانی میں مندرجہ ذیل ادویہ کے 5,5 قطرے ڈال کر استعمال کریں۔

Gelsemium 30 + Passiflora Q + Ignatia 30 + Stramonium 30 ایک ماہ کے استعمال کے بعد پھر کیفیت سے آگاہ کریں۔ یاد رکھیں دوا میں ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی ہی کی استعمال کرنی ہیں۔

صحت مند رہنے کے لیے

متوازن غذا کی ضرورت

قبل اس کے کہ میں موضوع پر بات کروں

شام 6 بجے لیا کریں۔ ایک ماہ بعد اپنی کیفیت سے آگاہ کریں۔ یہاں خوراک سے مراد 5 قطرے چوتھائی گلاس پانی میں ڈال کر استعمال کریں۔

ذہنی کیفیت

جاوید تحسین..... کراچی

سوال :- آپ اور آپ کے بورڈ آف ڈاکٹرز نے میرے مسئلے کا حل بہت جلد ہیج کر مجھ پر ایک عنایت کی جس کے لیے میں تہ دل سے شکر گزار اور دُعا گو ہوں۔ تقریباً ایک ماہ ہونے کو ہے جو کیفیت اور فائدہ ظاہر ہوا وہ کچھ اس طرح سے ہے۔

(۱) شروع کے دو تین دن مجھ کو نیند سکون سے آجاتی تھی اور مجھے کسی قسم کی انگریزی دوائی کا سہارا نہیں لینا پڑا۔

(۲) میں نے انگریزی دوا ایک ماہ ہوا مستقل چھوڑ دی ہے اور خدا سے دُعا کرتا ہوں کہ اس سے مستقل نجات مل جائے۔

(۳) پچھلے ایک ہفتے سے میں نوٹ کر رہا ہوں کہ نیند مجھ کو بہت دیر سے آتی ہے یعنی ڈھائی سے تین بجے تک اور چونکہ مجھے صبح سویرے اٹھنا پڑتا ہے اس وجہ سے میں جلد ہی اٹھ جاتا ہوں۔ میں یہ بات قطعی طور پر نہیں کہہ سکتا کہ مجھ کو ان دواؤں سے فائدہ نہ ہوا ہو۔ خدا کے فضل سے مجھ کو ان دواؤں سے بہت فائدہ ہوا۔ پہلے میں اگر کبھی رات بھر جاگ لینا تھا تو صبح کو کام کرنے کی صلاحیت نہ ہوتی تھی۔ دن بھر خصوصاً ناگوں اور کسر میں بہت درد ہو جاتا تھا اور دماغ سائیں سائیں کرتا تھا۔ ان دواؤں کے استعمال

رہتا ہے خاص کر جب سو کر اُٹھوں یعنی آنکھ کھل جائے اس وقت تک درد نہیں ہوتا، جسم کے ہلاتے ہی اور اُٹھتے ہی معدے میں درد ہوتا ہے جو پانی پینے اور اس کے بعد ناشتا کرنے کے بعد ختم ہو جاتا ہے۔

حلق میں اور سوزھوں میں اکثر دھاگے رکھے ہوئے یا کسی چیز کے چپکے ہونے کا احساس رہتا ہے۔ دانت ہر وقت صاف کرنے کے باوجود گندے رہتے ہیں۔ دانت گندے رہنے سے مراد صاف کرنے سے صاف ہو جاتے ہیں مگر کچھ دیر بعد پھر گندے ہو جاتے ہیں۔ ویسے تو قبض نہیں ہے لیکن پاخانہ کبھی روزانہ کبھی دو تین دن بعد آتا ہے وہ بھی زیادہ نہیں آتا۔ میری امی کہتی ہیں کہ میں بچپن میں مٹی کھاتا تھا اور کیڑے تھے۔

جواب :- رات کو جلدی سوئے اور صبح سویرے اُٹھیں۔ فجر کی نماز پڑھ کر ورزش کیا کریں، صاف رہا کریں، روزانہ نہایا کریں۔ ہر چیز میں صفائی کا خاص خیال رکھیں۔ پانی بھی اُبلا ہوا پیا کریں۔ صبح ناشتے میں اور دوپہر کے کھانے میں پھلوں کو بھی شامل کر لیں۔ مثلاً صبح کیلا اور سیب۔ دوپہر کے کھانے میں مٹھا اور انار وغیرہ جو بھی مل جائے۔ سبزیاں بھی استعمال کریں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات صبح نہار منہ **Sulphur 30** کی ایک خوراک۔ روزانہ رات کو سونے سے پہلے **Nux Vomica 30** کی ایک خوراک۔ **Natrum Phos 30** کی ایک خوراک 11 بجے دن اور **Santoninum 30** کی ایک خوراک

کے مسائل وغیرہ۔

کریں۔

(و) کھانا کھاتے وقت ماحول کو پُر سکون رکھیں۔ نہ باتیں کریں، نہ ٹی وی دیکھیں، نہ کوئی اخبار یا کتاب پڑھیں۔ اچھی طرح چبا کر کھائیں۔ نوالہ اتنا بڑا بنائیں جس کو اچھی طرح چبا سکیں (بغیر پانی کے)

(۲) کچھ سبزیاں کچی مفید ہوتی ہیں اور کچھ پکانی ہوئی۔ کھانا کھاتے وقت یہ خیال رکھنا چاہئے جو چیز آپ پکا رہے ہیں اس کو کتنے گھی، تیل میں پکانا ہے اور کتنی دیر پکانا ہے۔ تلی ہوئی، بھنی ہوئی خصوصاً کوئلے پر بھنی ہوئی چیزیں صحت کے لیے زیادہ مفید نہیں۔

(۳) متوازن غذا سے مراد ایسی غذا جس

(۳) ہمارے کھانے پینے کے طریقے بھی ہماری غذا کی افادیت کو کم یا ختم کر دیتے ہیں۔ کھانا کھانے کا طریقہ بھی ذہن میں رکھنا چاہئے۔

میں گوشت (گائے، بکرا، مچھلی، مرغی) انڈا، دودھ، دالیں، سبزیاں، پیاز، مکھن، گھی، تیل، فروٹ اور پانی کی ایک مناسب مقدار کم از کم روزانہ شامل ہو کیونکہ ہمارے جسم کو لحمیات، نشاستہ اور حیاتین کی ضرورت ہوتی ہے۔ جسم کی نشوونما کے لیے توانائی اور بیماریوں سے دفاع اور حفاظت کے لیے متوازن غذا کا استعمال ضروری ہے۔

(الف) کھانا کھانے کا ایک وقت مقرر کریں اور اس کی پابندی کریں۔ پتے کی پتھری اور تیزابیت کی وجہ یہ بھی ہوتی ہے۔ (ب) کھانے سے پہلے ہاتھ دھوئیں اور ان کو تویہ سے نہ پوچھیں۔

(۵) موسم کے حساب سے غذا کا استعمال

کیا جائے اور کوشش کی جائے کہ موسم کی سبزیوں اور پھلوں کو زیادہ سے زیادہ استعمال کیا جائے۔

(ج) پانی کھانا شروع کرنے سے پہلے پئیں درمیان میں اور آخر میں ہر گز نہ پئیں۔ اس سے کھانا ہضم کرنے میں مشکل ہوگی اسی طرح کھانے کے بعد کوئلہ ڈرنک، کافی، چائے وغیرہ کا استعمال بھی نہ کریں۔ کم از کم دو گھنٹے بعد پانی یا مشروب کا استعمال کریں۔

کیونکہ اسی طرح ہم اپنے آپ کو بہت ساری بیماریوں سے نہ صرف محفوظ رکھ سکتے ہیں بلکہ جسم کی نشوونما بھی صحیح طور پر کر سکتے ہیں۔

آپ کو صحت کے متعلق کوئی مسئلہ ہو تو اس کے حل کی رہنمائی کے لیے آپ ہم سے لکھ کر پوچھ سکتے ہیں۔

(د) کھانے کے بعد فروٹ کا استعمال نہ کریں بلکہ اس کے لیے ایک الگ وقت بنائیں پہلے کھائیں یا کچھ دیر بعد۔

(ح) کھانا پیٹھ کر اور بسم اللہ پڑھ کر شروع

☆☆☆☆



Dr. Willmar Schwabe , Germany.

Available at All Leading Medical & Homoeopathic Stores